جلد 31 ❖ شمارہ 414 ❖ جولائی 2021ء

ماہنامہ کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذار رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◈◈◈

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◈◈◈

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرِ سالانہ 1500 روپے

پبلشر و پرنٹر : عذار رسول

مقام اشاعت : C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین وارسی روڈ کراچی 75500

پرنٹر : نبیل حسن

مطبوعہ : ابن حسن پرنٹنگ پریس

بائی اسٹینڈ کراچی

خط و کتابت کا پتہ ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
CPNH APNS

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

برصغیر پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال سے زائد حکومت کی مگر جب انگریزوں نے سازشوں کا جال بچھایا تو پہلا کام یہی کیا کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا۔ نواب سراج الدولہ کے لیے میر جعفر کو میسو سلطان کے مقابل نظام حیدر آباد کو کھڑا کر دیا۔ قیام پاکستان کے وقت کئی جید علماء کو میدان میں اتار دیا پھر جب خدا نے پاکستان کی صورت میں تحفہ بخش دیا تو مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کو وفاق سے غداری پر اکسا دیا۔ یعنی کہ مسلمانوں کی قوت کو منتشر کر کے اپاہج بنا کر اپنا مفاد حاصل کر لینے کی سازش جاری رہی۔ ہمارے سامنے اتنی مثالیں ہیں پھر بھی ہمیں ہوش نہیں آیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان کے دشمن دن رات سازشیں کر رہے ہیں۔ یہ بھی سازش کا حصہ ہے کہ مسلکی، صوبائی، لسانی تعصب کو پھیلایا جائے۔ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس سازش کو ناکام بنائے۔ انفرادی طور پر ہی نہیں عملی اتحاد کا ثبوت دے۔ ہر قسم کی گروہی، مسلکی، صوبائی، لسانی تعصب سے دور رہے۔ یہی ہماری کامیابی ہے۔

TAGPK.COM

غصیلہ شاعر

1898ء میں ملیح آباد کے محلہ میرزا گنج میں صبح کے چار پانچ بجے اس نے جنم لیا۔ وہ جاڑے کا موسم تھا پھر بھی اس وقت گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ رت جگے کا سماں تھا۔ دادی پوتے کو گود میں لینے کو بوجھیں مگر وہ اتنا کمزور، ایسا لاغر تھا کہ وہ ہاتھ لگاتے ہوئے ڈریں۔ امرا کی حویلیوں کا جو منظر ہوتا ہے وہی منظر اس حویلی کا تھا۔ زنانے میں لونڈیوں، باندیوں، ماماؤں، اصیلوں، اناؤں، دائیوں، کھلائیوں، مغلانیوں، پیش خدمتوں، استانیوں اور کہانی کہنے والیوں کا ایک لشکر چلتا پھرتا نظر آرہا تھا۔ تعلقے سے آنے والی رعایا کی ان عورتوں کا بھی جمگھٹا لگا ہوا تھا جو فرشی پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے، پانی گرم کرنے اور کنواں سے پانی بھرنے، انگیٹھیاں دہکانے، غلے کو صاف کرنے اور چکیاں پیسنے کی خاطر باری باری سے آیا کرتی تھیں۔ یہ سب اس دن بخشش کی آس میں جمع تھیں۔ بیٹا ہوا ہے، یہ خوشخبری مردانے میں پہنچی تو صندوقچی کھل گئی۔ انعامات تقسیم کیے جانے لگے۔ منھی بھر بھر کر روپے بانٹے گئے۔ بچے کی پیدائش کے بعد سے ہی اس کی تمام تر ذمے داری دادی نے اپنے سر لے لی۔ بچہ انہی کی نگرانی میں پلنے بڑھنے لگا مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا ضدی بنتا جا رہا تھا۔ خالص آفریدی پٹھان تھا اس لیے غصہ ناک پر دھرا رہتا۔ غصیلہ اتنا تھا کہ کسی کے قابو میں نہ آتا۔ اس کی سب سے زیادہ لڑائی چھوٹی بہن انیس جہاں سے ہوتی تھی۔ وہ بھی تند مزاج تھی۔ ذرا سی بات پر اس کا منہ نوچ لیتی پھر تو ایک جنگ کا سماں بندھ جاتا۔ وہ اسے چٹکیوں کے بعد پٹخنیاں دیتا بال پکڑ پکڑ کر جھٹکے دیتا۔ پوری حویلی اکٹھا ہو جاتی۔ بڑی بوڑھیاں اس کے شر سے انیس جہاں کو بچاتیں تو وہ ان سے الجھ جاتا کہ میں اسے مار ڈالوں گا۔ اس کی ''کھلائی'' نوّے برس کی عباسی خانم تھیں۔ وہ ان پر بھی رحم نہ کھاتا۔ اسے برفی بہت پسند تھی۔ روزانہ ''مکنجی'' حلوائی کے ہاں سے اس کے لیے برفی کا ''دونا'' آتا۔ وہ برفی لے کر کھلائی کے پاس پہنچ جاتا کہ آپ بھی کھاؤ۔ وہ ایک ٹکڑے برفی کے کھا کر عباسی خانم انکار کر دیتیں کہ اب اور نہیں تب وہ غصے میں آکر ان کے سفید بال پکڑ کر سر زمین سے ٹکرا دیتا کہ کیوں نہیں کھائیں گی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی مگر بعد میں اسے سینٹ پیٹرس کالج آگرہ بھیج دیا گیا جہاں سے اس نے 1914ء میں سینئر کیمرج کا امتحان پاس کیا۔ 1918ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور تعلیم گاہ ''شانتی نیکتن'' میں چلا آیا۔ چھ ماہ تک تعلیم حاصل کی پھر لوٹ آیا۔ اس کا خاندان سپاہانہ تھا مگر ادبی ذوق بھی خوب رکھتا تھا۔ اس کے پردادا نواب فقیر محمد خان گویا، دادا نواب محمد احمد خان، چچا امیر احمد خان، والد بشیر احمد خان یہ سب کے سب اپنے اپنے دور کے معروف شاعر تھے اس وجہ سے اسے بھی شاعری کا شوق ہوا پھر یہ شوق جنون میں بدلنے لگا مگر آفریدی خون شاعری پر غالب آکر اسے کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا کر دیتا۔ 1925ء میں اسے حیدرآباد دکن کے عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کا نگراں بنایا گیا۔ اچھا وقت گزر رہا تھا کہ اس نے نظام حیدرآباد کی مخالفت میں ایک نظم لکھ دی۔ وہاں سے نکلا تو کئی جگہ وقت گزارنے کے بعد دہلی پہنچا اور رسالہ آج کل کا مدیر منتخب ہوا۔ قیام پاکستان کے وقت بھی وہ دہلی میں رہا مگر 1956ء میں اس نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جواہر لال نہرو نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا جواب تھا کہ انڈیا میں اردو کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے۔ اپنی اولاد کو میں اردو پڑھتا دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے مجھے پاکستان منتقل ہونا پڑے گا۔ پاکستان آکر کراچی میں رہائش اختیار کی اور انجمن ترقی اردو سے منسلک ہو گئے۔ اس وقت تک وہ ادبی دنیا کی نامور شخصیت بن کر احترام کے حامل بن چکے تھے۔ انہیں ہم شبیر حسن جوش ملیح آبادی کے نام سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیر/قارئین



☆ نگاہِ حسیب کا تبصرہ راولپنڈی سے۔ ''اس ماہ کا شمارہ بہت ہی خاص اہمیت کا حامل تھا۔ ہر ورق پر تقریباً درا لکھاتون کی حیرت زدہ آنکھیں نہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ ''گلابی جوڑے'' میں ملبوس لڑکی شاید چشم تصور میں خود کو وہ لباس پہنے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ زویا اعجاز کی ''نوائے حق'' بہت خوبصورت تحریر تھی۔ ''بحری فراق'' توقع کے عین مطابق مہم جوئی سے بھرپور رہی۔ قدم قدم پر مشکلات سے لڑتے ہوئے بالآخر یہ قضیہ تمام ہوا۔ سید احتشام کا ''انصاف'' اپنی نوعیت کا منفرد کیس تھا، اگرچہ جرائم کی دنیا میں ایسی ہیرا پھیریاں خوب نظر آئیں گی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگلی لڑکیاں'' رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر تھی۔ انور فرہاد کی تحریر ''انمول'' میں پرانے گانوں کے مصرعے پڑھ کر خود کو اسی دور میں محسوس کیا، معلومات سے بھرپور تحریر رہی۔ قرۃ العین سکندر کی طلب اچھی تحریر رہی۔ شروع میں اندازہ نہ ہو سکا مگر جب رچرڈ کا داؤ اسی پر الٹ دیا گیا تو کہانی کا ٹوئسٹ اچھا لگا۔ سچ بیانیاں پڑھنا شروع کیں تو خالد شیخ طاہری صاحب کی ''کوثر کی حقدار'' نے صحیح معنوں میں رلا دیا۔ کچھ لوگ شاید صرف اپنا آپ وقف کرنے کے لیے دنیا میں آتے ہیں خود ان کے اپنے نصیب میں چاہے کانٹے ہی کانٹے کیوں نہ ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں بہترین اجر رکھا گیا ہے۔ بہت ہی دلگرفتہ، جذبات سے گندھی، دل سے لکھی گئی تحریر تھی۔ ساجد محمود صاحب کو پہلی دھماکے دار انٹری مبارک ہو۔ ''ردِعمل'' پڑھنا شروع کی، بہت ہی واضح اور عام فہم سے انداز میں ایک خاتون پر بیتنے والے چند غیر معمولی واقعات کا تذکرہ کیا گیا جس پر ابتدا میں بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ درحقیقت وجہ کیا ہوگی۔ آئزم کے موضوع کا بہت خوبی سے احاطہ کرتے ہوئے ''ردِعمل'' نے قاری کو کہانی میں ہی بہت اہم معلومات سے نوازا۔ کسی بھی تحریر میں اگر دیگر لوازمات کے ساتھ ساتھ مقصد کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہو تو سونے پر سہاگا والی بات ہو جاتی ہے۔ چونکہ تحریر کی بنیاد ''تحقیق'' ہے اس لیے میں کہوں گی کہ ایسی کہانیاں آئندہ بھی قاری کے مطالعے کی نذر ہوتی رہنی چاہئیں تاکہ ذہنی آسودگی کے ساتھ ساتھ معلومات کا خانہ بھی پُر ہوتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کرے زورِ قلم زیادہ (آمین) بینا راجپوت کی پہلی انٹری شاندار اور جاندار رہی۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ ''گلابی جوڑا'' کہانی کا عنوان روایتی ہونے کے باوجود خود میں کشش سموئے ہوئے ہے۔ گلابی جوڑے کی کہانی جاننے کے لیے کہانی پڑھنا شروع کی۔ سب سے پہلے تو لب و لہجے اور مکالمے میں الفاظ کے چناؤ نے خوب ماحول باندھا۔ ایک قاری کے لیے یہ بہت اہم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہو خود کو اس ماحول میں محسوس کرے۔ کہانی کی سچویشنز ایسی تحریر کی گئیں ہیں کہ ایک سے زیادہ معاملات زیرِ قلم لائے گئے جو کہ آسان بات نہیں ہے۔ کہانی کی بنت، مکالمے اور اندازِ تحریر یہ کچھ چیزیں ایسی تھیں جس نے قاری کو شروع سے آخر تک باندھے رکھا۔ مصنفہ کی گرفت قلم پر مضبوط ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ بینا راجپوت کے قلم میں مزید وسعت و برکت عطا ہو اور ہمیں ایسے ہی معیاری تحاریر پڑھنے کو ملتی رہیں۔ آمین۔ عمران قریشی کی ''فاطی ایک پہیلی'' دلسوز تحریر تھی۔ ''پکھی واس'' کی پہلی سطر ''اساں وی مسلماں ہاں کوئی کافر تے نئیں'' جیسے کسی نوکدار انی کی طرح دل میں گڑ گئی۔ دل کو

جکڑ دینے والی عمدہ تحریر تھی۔ ایم الیاس کی ''شہ مات'' نے واقعی چاروں شانے چت کر دیا۔ ایسی تحاریر جس میں سیر کو سوا سیر ملے مجھے بہت متاثر کرتی ہیں۔ مختار دانش کی ''شکست'' نے انسان کی کل حقیقت کو کھول کر بیان کر دیا کہ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ اللہ رکھا چوہدری کی ''چال باز'' اچھی تحریر رہی۔ دوسروں پر حد سے زیادہ اعتماد بھی خطرناک ثابت ہوتا ہے اور واقعی زندگی جو سبق سکھاتی ہے، یاد رہتا ہے۔ عارف مجید عارف کی ''میرا کیا قصور'' عمدہ رہی۔ گل صنوبر کی ''انتقام'' روایتی مگر اچھی تحریر تھی۔ تمام لکھنے والوں کے لیے نیک خواہشات۔''

[illegible] رضا احمد اعوان نے دریا خان سے کہا ہے۔ ''مئی کا شمارہ سامنے ہے، ڈاکٹر دلاور کی تحریر عہد ساز بہترین تحریر تھی۔ [illegible] قمر کی تحریر پہاڑوں کی قسم متاثر کن تحریر تھی۔ واقعی محمد علی سدپارا قابل فخر ہے جس نے ملک کا نام روشن کرنے کی خاطر جان قربان کر دی۔ نوشہرہ کی فلم بھی بہت زبردست تھی۔ کی بیانیوں میں تماشے زندہ متاثر کن تھی۔ شہر خیال میں عامر مشتاق قصور کا تبصرہ متاثر کن رہا۔''

[illegible] اعجاز حسین ستھار نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ ''لاک ڈاؤن، مزدوروں کی بندش اور مقامی ڈاکخانہ والوں کی نا اہلی کی وجہ سے پرچہ لیٹ مل رہا ہے۔ کئی پسندیدہ مضامین چھوڑ کر افراتفری میں تبصرہ لکھتے ہیں تاکہ حاضری مکمل ہو اور دوستوں کے ساتھ مل بیٹھ کر دکھ سکھ بانٹیں، مسائل پر بات کریں اور ٹینشن دور بھگائیں۔ ''انصاف'' میں رابرٹ چالاک اور عیار تھا اپنی ذہانت کا بروقت استعمال کرتا رہا یہی وجہ ہے کہ کتنے قتل کیے۔ مرد مومن مرد حق میں اور صاف بچتا رہا۔ فرض شناس اور رشوت نہ لینے والی پولیس کو دھوکا دینا آسان کام نہیں لیکن وہ یہ کارنامہ سرانجام دے کے کامیاب ٹھہرا۔ اس کی صلاحیتیں کمال کی تھیں۔ ''فسوں'' میں مسعود پرویز نے عروج و زوال دیکھے لیکن ہمت نہ ہاری، کام جاری رکھا۔ یہ قانون قدرت ہے اس لیے ہمت جوان رکھنی چاہیے۔ مالا کے گانے کے پسندیدہ، انہوں نے بھی روزگار کیتھ گانے جو فلموں کی کامیابی بنے اور کانوں میں آج بھی رس گھولتے ہیں۔ اعجاز درانی واقعی اپنی ذہانت، مردانگی اور قد کاٹھ کے حساب سے بنے بنائے ہیرو تھے ان پر فور بہنوں جیسی گلوکارہ، اداکارہ اور معدار عورت فدا ہو گئی اور آفرشوری کرتے دل کی دنیا آباد کر لی لیکن عمر کا فرق اور شوبز کی ایک سے بڑھ کر ایک جوان اور بھرپور خوبصورت اداکارائیں نے ذہن بدل دیا پھر ایسے فیصلے کرنے میں ہرگز کوئی آزار ہے۔ جب پیار کا خمار ہوتا ہے تو خوبی، خامیاں پس پشت چلے جاتے ہیں اور پھر وہ آوازیں تو قبیلے والوں کی کون پرواہ کرتا ہے۔ اعجاز درانی کی کئی فلمیں ٹی وی پر دیکھی ہیں ان کے ہیرو ہوتے اور بے مثال شخصیت میں کھو کھو جاتا ہے۔ نذر کا کام دیکھنے کا موقع نہیں ملا اس لیے کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ یہاں انور فرہاد کی محنت اور تحقیق کا اعتراف کر کے انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ یادداشتوں کے سہارے ہماری دلچسپی کا سامان کرتے ہیں شکریہ قبول کریں۔ ''حسب'' میں مونیکا اور لیزا کی چالاکی اور منصوبہ بندی دیکھ کر محو حیرت ہوں کہ [illegible] کی اور چالاکی ہوا نہ لگنے دی [illegible] کے [illegible] خوش ہوں کہ دولت کی ہوس میں عالیہ بیگم کو [illegible] کمال مہارت سے راستے سے ہٹا کر ہیئے فرک مکمل کرتا ہوا تھا لیکن خوش قسمتی کی چھلاوے میں آیا تو مزہ آ گیا پھر [illegible] نے تفریح کا موقع فراہم کیا۔ پہلی قسط ہی ''کوشش'' کو شدار'' لگے، دوسری ہوں [illegible] اور سکول [illegible] ہوتی ہے، کیا انسان پیک ساتھ اس قدر [illegible] بھی آتی ہیں کہ اوڑھنا بچھونا بن جاتی ہیں۔ اعلیٰ عہدے رکھنے والی غیر معمولی کردار کی اور صبر، شکر کا پیکر لڑکی تھی۔ کبھی تقدیر کا شکوہ کیا نہ مشکلات کے قصے چھیڑ کر ہمدردی سمیٹی، وہ جنت میں غیر مشروط طور پر داخل ہو گی بلکہ عیش کرے گی۔ عورت کی عظمت کو سلام کرتا ہوں جو ہماری بہن، بیٹی اس کی تقلید کرے گی وہ اجر عظیم کی حقدار ٹھہرے گی۔ ''پکھی واس'' کے بگا کی پگڑی تب سنورے گی جب اس کی ماں کے کام کاج اور مصروفیت کا سوچا جائے گا۔ اسے ٹھکانا ملے گا تو بگا کی قسمت خود بخود سنور جائے گی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں بس تھوڑا منصوبہ بندی، حوصلہ اور صبر کی بات ہے۔ یہ صدقہ جاریہ کمانے کے لیے اتنی قربانی دینا ہو گی یوں اس قبیلہ کے دوسرے لوگوں کو تحریک ملے گی بھلائی اور سنورنے کے لیے بے شمار در وا ہوں گے بس اندر داخل ہونے میں پہل کرنے والا منافع میں رہے گا۔ ''شہ مات'' میں بہن کا معاملہ نہ ہوتا تب بھی کنول جیسی عورت کو اس کا بھیانک چہرہ دکھانا ضروری تھا جو لاکھوں خرچ کرنے اور سو طرح کی سہولیات دینے والے شوہر کے قتل کی متمنی تھی۔ ایسی بے اعتنا عورت کے مزاج کا کیا

TAGPK.COM

پتا کہ کب لومڑی سے شیر کا روپ دھار لے۔ اس فطرت کی عورتیں وقتی چمک دمک دیکھ کر دوستی اور شوہر بدلتی رہیں تو معاشرہ میں غیرت وشخصیت تماشا بن جائے بلکہ کتنی جانیں چلی جائیں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ سہیل نے عقل مندی سے سارا معاملہ حل کرلیا اور کنول کو طمانچہ تو لگا ہے اگر وہ سبق حاصل کر کے سنبھل جائے اور اپنا گھر خلوص نیت سے بسالے تو حقیقی سکون پالے گی۔ ''شکست'' میں ساجد کا کیا قصور ہے یہ قسمت کا چکر تو اچھے اچھوں کو چاروں شانے چت کر دیتا ہے کبھی کے دن بڑے، کبھی کی راتیں کی مثال بلکہ حقیقت سب کے سامنے ہے۔ اندھیرے، روشنی کا کھیل ازل سے ابد تک جاری رہے گا لیکن محنت سے جی نہیں چرانا چاہیے یوں حالات کو شکست دی جاسکتی ہے۔ ''ردعمل'' قدرے عجیب واقعات ضرور ہیں لیکن اتنی اہمیت کی حامل روداد نہیں کہ فکر انگیز کہانی بنا دیا جائے میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ اسے ایک جوڑے کی نفسیاتی الجھنوں کے زمرے میں لوں، شوہر کے غصیلے پن کو سارے بگاڑ کا ذمے دار جانوں، یا بیوی کے بھلکڑ پن کو عائلی فساد کی جڑ گردانوں۔ اس کہانی کے واقعات نے ایسا الجھایا ہے کہ اپنا دماغ بھی خالی اور بانجھ ہو گیا ہے۔ اسے میرا اظہار بے بسی جان لیجیے ساتھ معذرت قبول کر لیجیے۔''

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ''جون کا شمارہ حسین دوشیزہ اور معاشرے کے مختلف کرداروں کے سرورق کے ساتھ ملا۔ اداریہ اہم موضوع پر تھا۔ اسرائیل نے حال ہی میں فلسطین پر جس وحشیانہ انداز میں بمباری کی ہے۔ اس کی فوٹیج دیکھ کر دل دہل جاتا ہے۔ آپ نے صحیح لکھا کہ اس ظلم کا واحد حل عالم اسلام کا اتحاد ہے۔ ہمیں فلسطینی قوم کے اس جذبہ حریت اور ہار نہ ماننے کے جذبہ ایمانی کو نصب العین بنالینا چاہیے۔ شاید یہ جذبہ ہی عالم اسلام کو متحد کر سکے۔ شہر خیال میں اللہ رکھا چوہدری نے تقریباً ڈھائی صفحات پر مبنی مفصل تبصرہ لکھا۔ (جب خطوط میں اہم نکتے ہوتے ہیں تو طویل کو بھی کاٹنے پیٹنے بغیر جانے دیا جاتا ہے لیکن مختصر ہی لکھنا چاہیے) سدرہ نعمان ناگوری کورونا کے حوالے سے آپ نے جو حالات لکھے ایسا تقریباً ساری دنیا میں ہے۔ ہاں اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹالیں گی تو ضرور کچھ سکون ملے گا... کیونکہ ٹی وی پر بریکنگ نیوز کے نام پر جو سنسنی پھیلائی جارہی ہے۔ اس سے معاشرے کا ایک بڑا طبقہ نفسیاتی امراض کا شکار ہو رہا ہے۔ سید امتیاز حسین بخاری کا رمضان المبارک میں عبادات کے حوالے سے پڑھ کر اچھا لگا کہ اس ماہ مبارک میں سبھی اللہ کو یاد کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ عبدالجبار رومی انصاری کا شکریہ کہ انہیں ''ہوائی مستقر'' پسند آئی۔ فریدہ افتخار ہمارے ہاں بہت زیادہ اشعار ہیں۔ جو حقیقت میں کسی اور کے ہیں مگر منسوب علامہ اقبال سے کر دیے جاتے ہیں۔ ظہیر ملک کا تبصرہ بھی اچھا تھا مگر طویل تھا۔ پاکستانی صحافت کی ایک منفرد شخصیت نصر اللہ خان کی زندگی کے بارے میں زویا اعجاز نے بہترین تحریر لکھی۔ ان کی زندگی کے بہت سے گوشے سامنے آئے۔ شمیم الدین غوری نے ''بحری قزاق'' کی صورت ایک دلچسپ تحریر لکھی۔ قانون تو صرف ثبوت کو ہی دیکھتا ہے۔ مگر چالاک مجرم یقیناً اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بچ نکلتے ہیں۔ انصاف کے لیے گتھیاں سلجھاتی سید احتشام کی تحریر زبردست تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی ایک عجیب وغریب قبیلے کی حیران کر دینے والی تحریر کے ساتھ موجود تھے۔ جنگلی لڑکیوں کی درندگی اس لحاظ سے دلچسپی کی حامل تھی کہ دنیا میں ایسے قبائل بھی ہیں۔ کمال خان کا سفرنامہ سفرنامے کے ساتھ معلومات بھی قارئین تک بہم پہنچا رہا تھا۔ یہ سفرنامے کی ہی خوبصورتی ہے کہ اس کے ذریعے وہ معلومات بھی قارئین تک پہنچتی ہیں جو عموماً کتابوں میں نہیں ملتیں۔ قرۃ العین سکندر اور فرزانہ عفت کی تحریریں ایڈونچر اور سسپنس سے بھرپور تھیں۔ ویسے انجم فاروق ساحلی کی تحریر ''خطرناک مجرم'' پڑھ کر حیرت ہوئی کہ کوئی مجرم اس حد تک بھی خطرناک ہوسکتا ہے کہ سال ہا سال تک جرم کرتا رہے اور دنیا کے بہترین اداروں کی گرفت میں نہ آسکے... مگر پھر یہ پڑھ کر یقین آگیا کہ جس شخص نے برسوں تک اپنے جرائم کی خبر اپنی بیوی تک کو نہ ہونے دی وہ بھلا پولیس کے ہاتھ کیسے لگتا۔ اس دفعہ شہر خیال کے لیے مختصر لکھ رہا ہوں تاکہ زیادہ افراد نظر آئیں۔ ہمیں اعجاز حسین ستھار، آفتاب نصیر اشرفی، روبینہ نفیس انصاری، بشریٰ افضل، نزاہت افشال اور منشی محمد مے کا انتظار ہے۔''

☆ ملتان سے عاطر شاہین کا محبت نامہ موصول ہوا ہے۔ لکھتے ہیں، ''سلام کے بعد اُمید ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی ٹیم اور پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ (ان شاء اللہ) گرمی کی شدت اتنی بڑھ گئی ہے کہ گھر سے باہر

TAGPK.COM

نکلنا محال ہو رہا ہے۔ سورج سوا نیزے پر ہے۔ ان سب کے باوجود اپنے پیارے رسالے ''سرگزشت، جاسوسی'' کے لیے باہر نکل جاتا ہوں۔ گرمی کی پروا بھی نہیں کرتا۔ ہر ماہ جیسے ہی فیس بک پر سرگزشت، جاسوسی کا اشتہار دیکھتا ہوں بس عجیب سی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ بار بار بک اسٹال والے کو فون کر کے دریافت کرتا ہوں کہ سرگزشت یا جاسوسی آیا۔ اس بار بھی میں نے اس سے پوچھا کہ جون کا سرگزشت آیا؟ وہ بھی تنگ آجاتا ہے اور ایک دن تو اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ بھائی، جب رسائل آئیں گے تو آپ کو بتا دیں گے۔ میں نے ایک ہاکر سے پوچھا تو اس کے پاس موجود تھا۔ اس روز سے اب ہاکر ہر ماہ دونوں رسائل گھر دے جاتا ہے۔ جون کا شمارہ ملتے ہی پہلے میں نے اپنا ناول ''روسیاہ'' پڑھا تا کہ اس میں کمی بیشی اور خامیاں دیکھ لوں۔ میرے لیے یہ ضروری ہے کیونکہ کامیاب رائٹر بننے کے لیے مطالعے کی بہت ضرورت ہے۔ شہر خیال میں خطوط بھی پڑھے۔ اللہ رکھا چودھری، رضا احمد اعوان، عبدالجبار رومی انصاری، ظہیر ملک، فریدہ افتخار اور ان سب کا بے حد شکریہ جنہوں نے میرے ناول ''روسیاہ'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اسے پسند کیا۔ فریدہ بہن نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''کوئی بھی عقل مند شخص اجنبی لوگوں سے کوئی مشروب کیسے قبول کرے گا جن کو پہلے سے جانتا ہی نہ ہو'' کے بارے میں عرض ہے کہ فرض کریں، کوئی بھی شخص کسی سے ملنے جاتا ہے، وہ اسے اپنے گھر میں بٹھاتا ہے تو کیا وہ مہمان نوازی نہیں کرے گا؟ یا تو وہ مہمان نواز نہیں ہوگا یا پھر کوئی اور بات ہوگی۔ علی تو ہلگا ڈیوک سے اس کے انکل سے ملنے جاتا ہے۔ اب اسے کیا پتا تھا کہ ہلگا ڈیوک بھی اپنے انکل سے ملی ہوئی ہوگی۔ کہانی سچوئیشن کے مطابق آگے بڑھ رہی ہے۔ ان شاء اللہ آپ آئندہ بھی تبصرہ کریں گی۔ نصر اللہ کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ صحافت ایک مقدس پیشہ ہے لیکن اس کی خوبصورتی اس وقت ماند پڑ جاتی ہے جب صحافی اپنے اصولوں کو پس پشت ڈال دے، حق کا ساتھ نہ دے۔ میں خود 23 سال صحافت کے شعبے سے منسلک رہا ہوں۔ بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں لیکن اپنے اصولوں سے روگردانی نہیں کی۔ صحافت میں اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بحری قزاق، انصاف، جنگلی لڑکیاں، طلب، پُراسرار خزانہ بھی دلچسپ تھیں۔ انمول بھی فلم انڈسٹری کے حوالے سے معلوماتی تحریر ہے۔ سچ بیانیاں بھی دلچسپ اور معاشرے کی عکاسی کر رہی ہیں۔''

☆ عارف مجید عارف کا خلوص نامہ حیدرآباد سے۔ ''ماہ جون کا شمارہ اس بار اٹھائیس مئی کو ہی حیدرآباد میں جلوہ افروز ہو گیا تھا۔ اس شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں میری کہانی ''میرا کیا قصور'' بھی شامل ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں یہ اس سال میری چوتھی کہانی ہے۔ اب کہانی کیسی ہے یہ قارئین ہی بتائیں گے۔ اس پر تبصرہ ہم بھلا کیسے کر سکتے ہیں۔ سرورق حسب سابق دیدہ زیب تھا۔ زویا اعجاز کی نصر اللہ خان کے متعلق کی گئی محنت قابل تعریف ہے۔ مجھے مہماتی کہانیاں ہمیشہ سے ہی پسند رہی ہیں۔ بحری قزاق اور پُراسرار خزانہ لطف دے گئیں۔ مترجم صاحبان کو مبارکباد۔ علی سفیان آفاقی مرحوم کے بعد محترم انور فرہاد نے فلم دیوانوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ اس بار ہدایت کار مسعود پرویز، گلوکارہ مالا بیگم اور خوبرو اعجاز درانی سے ملاقات کروائی گئی۔ ان کے متعلق مزید تفصیل بھی لکھی جا سکتی تھی۔ انور فرہاد صاحب سے درخواست ہے کہ پس پردہ دلچسپ قصے بھی بیان کیے جائیں جو اب تک سب کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مضمون ان فلموں کے متعلق بھی لکھیں جو مکمل یا کچھ حد تک نامکمل رہیں اور کبھی بھی پردہ سیمیں کی زینت نہ بن سکیں اگر ممکن ہو تو ان کی وجوہات بھی بیان کی جائیں۔ سچ بیانیاں ہمیشہ کی طرح بہترین تھیں۔ عمدہ انتخاب پر آپ کو مبارک باد۔ خاص طور پر گل صنوبر کی ''انتقام'' اور خالد شیخ طاہری کی ''کوثر کی حقدار'' بہت ہی متاثر کن تھیں۔ سلسلے وار کہانی ''روسیاہ'' اور باقی ایک دو تحاریر کچھ مصروفیات کی وجہ سے نہیں دیکھ سکا ہوں۔ ندیم اقبال صاحب بھی غیر حاضر ہو گئے ہیں۔ ان کے سفرنامے ان کی آپ بیتی بھی ہیں۔ ان سے آپ بیتی کی طرز پر ہر ماہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھوایا جائے۔ اُمید ہے میری تمام تجاویز پر غور کیا جائے گا۔''

☆ صنوبر اعجاز کا ای میل شارجہ یو اے ای سے۔ ''اس بار محکمہ ڈاک کو رحم آ گیا اور پرچہ بروقت پہنچ گیا۔ سب سے پہلے نصر اللہ خان کو پڑھا۔ لاجواب لکھا ہے۔ ایماندار صحافت کی زندہ مثال تھے۔ ہم نے انہی کے اسکول سے تعلیم حاصل کی ہے۔ لاجواب آدمی تھے۔ اصول پر سختی سے جمے رہنے والے۔ بحری قزاق بھی پسند آئی۔ شہر سبا یعنی یمن کی سیر

اچھی لگی۔ اصول میں انور فرہاد سے ماضی کی اداکاراؤں، اداکار سے خوب منوایا۔ روسیاہ بھی اچھی جا رہی ہے۔ کوثر کی حقدار نے رولا دیا۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ ایسی سچ بیانیاں زیادہ سے زیادہ شائع کریں۔ پھی واس بھی اچھی لگی۔ میرا کیا قصور اور انتقام بہت پسند آئی۔''

محمد اسلم کاتب و سرگودھا سے ''کہتے ہیں نشہ بہت بری چیز ہے جب لگ جائے تو بڑی مشکل سے جان چھوڑتا ہے۔ نشہ ضروری نہیں سگریٹ چرس وغیرہ کا ہو۔ ناول کہانیاں ڈائجسٹ پڑھنا بھی ایک نشہ ہے جس سے میں تقریباً 2001 میں چھوڑ چکا تھا اس کے بعد ایک لمبے عرصے کے بعد اب سرگزشت کا شمارہ جون 2021 پڑھا اور پھر سے پرانا لکھنے والا سوار ہو گیا اور پرانے وقت کو دوبارہ سے آواز دے دی، یعنی تبصرہ لکھ دیا۔ ڈائجسٹ کھولا تو فہرست دیکھنے کے بعد پہلی نظر اداریہ پر پڑی اور یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ حق کی آواز اٹھانے والے ابھی اپنے فرض سے غافل نہیں۔ پر افسوس کہ امت اسلامی کے حکمران یہ سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش ہیں۔ اب آتا ہوں سچ بیانیوں کی طرف۔ مگر پہلے میں یہ بتا دوں کہ مجھے تبصرہ نگاری چھوڑے عرصہ ہو گیا۔ اس لیے غلطیاں ہوں گی نظر انداز کیجیے گا۔ سب سے پہلے سرگزشت ڈائجسٹ کی نیم تعریف کے قائل ہے کہ بہت عمدہ انتخاب ہے۔ چاہے کہانیاں ہوں یا رسالے میں موجود چھوٹے چھوٹے واقعات سب لاجواب تھے جیسے جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی رسول کے واقعات زندگی لکھتے ہوئے تھے جو عمدہ اظہار تشکر کرنے کے لیے ایک واقعات جس میں ذکر تھا کہ کس طرح دانوں کی غلطیوں سے چیزیں ایجاد ہوئیں۔ کہانیاں سب جواب تھیں لیکن میں ان میں سے چند پر اپنی رائے دوں گا۔ ایک کہانی تھی ''جناب خلیق ظہیری صاحب'' کی صفحہ نمبر 174 پر ''کوثر کی حقدار'' اس سچ بیانی میں کوثر نامی لڑکی کے حالات بیان ہوئے ہیں کہ کوثر کی والدہ فوت ہو جاتی ہے اور دو بھائیوں اور ایک بہن کی ذمے داری کوثر کے کندھوں پر سونپ ہوتی ہے کیونکہ وہ سب سے بڑی تھی جس کو نبھاتے نبھاتے وہ اپنی خوشیاں بھول جاتی ہے۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں بے شمار پائے جاتے ہیں۔ کہانی میں کوثر کو کئی لوگوں نے بلیک میل کیا جیسے کہ محلے والوں نے لیکن سوتیلی ماں کے بھائی نے جس کو کوثر نے بچپن سے ماموں کہا تھا اس کے ماموں نے کوثر کی شادی اپنے بیٹے سے کروانے کا وعدہ کیا تھا اور کوثر نے ان دو کی صورت میں فرشتہ صفت انسان میسر تھے جن کی محبت نے کوثر کی بہن رفیقہ کی شادی کروائی۔ کہانی میں موجود کردار راشد کوثر کا بھائی جو نشے پر لگ جاتا ہے ایسے کردار بھی بے شمار پائے جاتے ہیں۔ کاش کوثر کا بھائی جو آوارہ گرد تھا لیکن بہت حساس لڑکا تھا آخر تک بہن کے ساتھ کھڑا رہا۔ جیتے کوثر کی والدہ والے ڈائیلاگ کوثر کو سونپ گئیں پتے کی کوثر کا شوق و سونپ [illegible] راشد کا کردار تھوڑا سا [illegible] رفیقہ اور [illegible] کوئی انعام پانے والی کہانی [illegible] ایک کہانی ''جناب ساجد محمود صاحب'' کی صفحہ نمبر 237 پر ''روشنی'' یہ کہانی ہے صائمہ اور رشید، مال (جم) کی جو آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا شروع کر دیتے ہیں۔ جس کا اثر یہ ہوتا کہ صائمہ ذہنی ٹینشن لے کر اپنے روزمرہ کے کام کرنا بھول جاتی ہے اور یہ عادت اس کی پختہ ہوتی جاتی ہے۔ کیا وہ اس کا علاج کر پائے گی؟ اس کہانی میں جو علاج ڈاکٹر نے بتایا ہے اصل زندگی میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر کسی کو اپنانا چاہیے کہانی کے ذریعے بہت عمدہ پیغام دیا گیا ہے۔ ''پیارا جیوت'' کی سچ بیانی صفحہ نمبر 243 پر گلابی جوڑا یہ کہانی ہے آسیہ کی جو گھروں میں کام کرتی ہے اس کی بیٹی سکینہ کی جو ماں کی جگہ ایک سیٹھ کے گھر میں کام کرنی ہے آتے جاتے اس کی نظر ایک گلابی جوڑے پر رہتی ہے اور وہ جوڑا حاصل کرنا چاہتی ہے۔ گلابی جوڑے کی جستجو میں اس پر چوری کا الزام لگ جاتا ہے حالانکہ غلطی تیمور کی ہوتی ہے یہ تیمور کون ہے؟ کہانی کے آخر میں سکینہ کا لیا گیا فیصلہ دنیا میں موجود لوگوں میں اکثر کا یہ ہی فیصلہ ہوتا ہے۔ ''رکھا چوہدری'' صفحہ نمبر 249 ''چال بازیہ''

کہانی موبائل پر لکھی گئی ہے کہ چھوٹی سی غلطی بڑے نقصان کا سبب بن سکتی ہے، جو کہ ایک بہت اچھی بات ہے سب سے پہلے انسان کو اپنی احتیاط کرنی چاہیے۔ کہانی ایک لڑکے کی ہے جو شہر میں نوکری کرتا ہے اور فیکٹری کی طرف سے دی گئی رہائش میں رہتا ہے جہاں دو لڑکے اور ہوتے ہیں۔ ''شانی اور دانی'' جن سے دوستی ہو جاتی ہے اور شانی کے موبائل سے اپنی مٹھیتر کو فون کرتا ہے اور باپ سے چناخ چناخ تھپڑ کھاتا ہے۔ اس کو باپ کیوں مارتا ہے؟ ''کمال خان'' کا سفرنامہ ''قوم سبا'' بہت معلوماتی تھا جس میں ملک یمن کی سیر کرائی گئی ہے اور تاریخی واقعات قلم بند کیے گئے ہیں جس قوم عاد کا ذکر ہوا ہے اور صنعاء، حریرہ، تعز، شہروں کی اہمیت وغیرہ بتائی گئی ہے اور ایک شہر ''زبید'' جس میں صحابی رسول ''ابوموسیٰ انصاری'' کا ذکر ہوا ہے اس کے علاوہ قوم سبا اور ملکہ بلقیس اور حضرت سلیمان علیہ السلام پرانے زمانے کا رہن سہن وغیرہ وغیرہ کافی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ معلومات کے خزانے پڑھنے کو ملے۔ جنگلی لڑکیاں، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر نے پرانے زمانے کے قبائل کا بہت اچھے انداز سے موازنہ کیا اور درپیش مشکلات جس میں تین شرائط شامل تھیں۔ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اس کہانی نے بھی بہت متاثر کیا۔ بحری قزاق، شمس الدین غوری کی کہانی بہت پسند آئی کہ کیسے کیسے لوگ دنیا میں پائے جاتے ہیں جو دیکھنے میں کچھ نہیں لگتے پر ہوتے بہت کمال کے ہیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حکمران کیسے کیسے چکر دیتے ہیں، بیان کچھ اور ہوتا ہے اور ردعمل کچھ اور ہوتا ہے۔ قزاقوں کا بحری جہاز کے عملے کو یرغمال بنا کر تاوان حاصل کیسے کرتا ہے؟ تاوان نہ ملنے کی صورت میں وہ کیا کرتے ہیں؟ اور قیدیوں کی مشکلات بہت عمدہ طریقے سے قلم بند کی ہیں۔ آرزو، میں یوسف حسین، جس کو آرزو لکھنوی بھی کہتے ہیں ان کا بہت اچھا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں اتنا ہی کہوں گا کہ ڈائجسٹ پڑھ کر لگتا ہے کہ نشہ دوبارہ شروع کرنا پڑے گا۔ ڈائجسٹ کی لکھائی چھپوائی اور سرورق سب بہت عمدہ سے ڈیزائن کیے گئے تھے ماشاء اللہ ڈائجسٹ انتظامیہ سب تعریف کی حقدار ہے۔''

☆ خوش بخت ملک۔ کا ای میل۔ ''آج سے پہلے سرگزشت کا نام ہی سنا تھا۔ پہلی بار سرگزشت پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے یہ میرا پہلا تبصرہ ہے۔ سرورق پر ایک سے زائد تصویریں جگمگا رہی تھیں جنہیں نہایت نفیس انداز میں جوڑا گیا ہے۔ سرورق دیکھنے کے بعد فہرست کھولی کچھ لوگوں کے علاوہ سارے نام میرے لیے نئے تھے۔ فلسطین کا ذکر پڑھ کے دل دکھی ہو گیا۔ دل سے بے ساختہ دعا نکلی کاش عالم اسلام متحد ہو جائے۔ مسلمانوں پر سے ظلم وستم نہ جانے کب ختم ہوگا۔ آرزو لکھنوی کی داستان حیات بھی لاجواب رہی۔ شہر خیال میں سب کے تبصرے اچھے لگے۔ گل صنوبر کی تحریر انتقام اور بدلے کی آگ کے گرد گھومتی ہوئی ایک عمدہ تحریر۔ بدلے کی آگ انسان کے اندر اتنا زہر گھول دیتی ہے کہ اسے خونی رشتوں کا پاس بھی نہیں رہتا۔ اللہ رکھا چوہدری کی تحریر میں ایک عزم ہے ہر کوئی آپ کا خیر خواہ نہیں ہوتا۔ ہر کسی کو راز داں بنا لینا اچھا نہیں۔ بیمار اچھوت کی کہانی گھریلو ملازمین اور ان کی مشکلات کی عکاسی کرتی ایک مختصر لیکن سبق آموز تحریر ہے۔ ''ردعمل'' از ساجد محمود، ایک ذہنی بیماری کو نمایاں کرتی تحریر تھی۔ جسمانی بیماریوں کا علاج تو کرایا جاتا ہے لیکن ذہنی بیماری کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتا۔ جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بیمار لوگوں کا علاج بھی بہت ضروری ہے۔ مختار دانش کی تحریر زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہ کر گئی۔ انسان ایک پل میں عرش سے فرش پر آجاتا ہے۔ کوثر کی حقدار پڑھ کے آنکھیں نم ہو گئیں۔ انسان کتنا ناشکرا ہے۔ ہمیشہ اپنے حالات کا رونا روتا ہے۔ اس طرح کی تحریر پڑھ کے اندازہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ہم سے بہت زیادہ مشکلات کا شکار ہیں۔ بیت بازی کا سلسلہ عمدہ سلسلہ ہے۔ مجھے یہ شعر پسند آیا۔ ''یہ چار دن کے تماشے ہیں آہ دنیا کے۔ رہا جہاں میں سکندر نہ اور نہ جم باقی'' انجم فاروق ساحلی کی تحریر پڑھ کے دل خوف سے کانپ اٹھا۔ ایسا شخص جو انسانیت کی سطح سے نیچے گر جائے انسان کہلانے کے لائق نہیں۔ اللہ پاک سب کی حفاظت فرمائے (آمین)۔ قرۃ العین سکندر کی تحریر اچھی لگی۔ اچھائی کا صلہ ملے نہ ملے برائی کا انجام بہت برا ہی ملتا ہے۔ دولت نے اتنا اندھا کر دیا جو گڑھا دوسروں کے لیے کھودا تھا اس میں خود جا گرا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر عجیب وغریب لگی۔ قبیلے میں ہر طرف عورتوں کی

TAGPK.COM

اجارہ داری اور کئی حد تک سفاک اور آخر تک سفاک ہی رہی مجموعی طور پر اچھا شمارہ پڑھنے کو ملا۔ (سرگزشت میں سچے واقعات کو اہمیت دی جاتی۔ عبدالرب بھٹی کی تحریر پر سچ پر مبنی ہے)''

☆ زرواگل کا تبصرہ ملاحظہ کریں۔ ''یہ میرا کسی بھی شمارے پہ پہلا باقاعدہ تبصرہ ہے۔ اگرچہ میں جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں مگر تبصرہ کرنے کی جرات آج ہوئی ہے۔ سرورق پہ لیٹی لڑکی مختصر تو تھی کسی کی مگر وہ ہم نہیں تھے۔ سو اس کو سراہتے ہوئے آگے بڑھے۔ شہر خیال میں بہت سے لوگ اپنی آراء کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک دن ہمارا تبصرہ بھی ان کے ساتھ شائع ہو یہ دعا کرتے ہوئے پہلی کہانی نوائے حق شروع کی۔ زویا اعجاز نے بہت تفصیل سے ہمیں ایک بہت ہی اہم بستی سے روشناس کروایا۔ جناب نصراللہ کے روز و شب ان کی جدوجہد سے آگاہی ہوئی۔ ایک نامور نام جو پہلے گمنام تھا ہمارے لیے اس کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ بحری قزاق ان لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بننے والی کہانی ہے جو ایڈونچر کو پسند کرتے ہیں۔ شمیم الدین غوری نے پورا انصاف کیا کہانی کے ساتھ۔ کسی جگہ کہانی نے اپنی دلچسپی کھودی مگر پھر بھی گرفت مضبوط رکھی۔ سید احتشام نے انصاف کا تعارف مختصراً کروایا مگر پسند آئی اور حیرت بھی کہ یہ کیسا انصاف ہے جس میں مجرم کو اتنی سہولت دی جاتی ہے کہ وہ خود کو بے گناہ قرار دے۔ خیر یہ تو معاشرتی سقم ہوا۔ مٹی پاؤ ان کے انصاف پہ کہہ کر جنگلی لڑکیوں کی طرف بڑھے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ایک جانا مانا نام ہیں۔ ان کی کہانی امزون کے جنگلوں سے روشناس کرواتی ہوئی تھی۔ کہانی کی حد تک ٹھیک تھا مگر ہمیں یقین نہیں کہ ایک عورت کی حکومت کو لوگ مانتے ہوں اور اس سے اتنا ڈریں۔ الینا کی دوسری عورت سے جلن نے ثابت کیا کہ عورت چاہے جنگلوں سے تعلق رکھتی ہو یا کسی مہذب معاشرے سے وہ دوسری عورت برداشت نہیں کر سکتی۔ کمال خان اگلے ہی صفحے پہ ہمیں شہر سبا کی سیر کروانے کے لیے تیار تھے۔ مزہ آیا مگر اس میں بے جا طوالت کے لیے شاید ٹیکنیکل باتیں شامل کی گئی تھیں جن کی وجہ سے مزہ خراب ہوا۔ میرے نزدیک ایک اچھے سفرنامے کا مقصد آپ کو ایک نئی جگہ کی معلومات دینا، آگاہی دینا ہوتا ہے نہ کہ اپنے ذاتی کام کی تفصیل بتانا۔ خیر اچھی کاوش رہی ان کی۔ انمول، انور فرہاد کی پاکستانی فلمی صنعت کی ان کہی کہانی تھی جس میں انہوں نے نامور ناموں کی زندگی کا تعارف کروایا۔ ان میں سے ہم بس ایک دو ناموں سے ہی واقف تھے۔ مگر پڑھ کر ان کے بارے میں جاننا اچھا لگا۔ قرۃ العین ایک روایتی موضوع کے ساتھ آئیں اور طلب کو اچھا نبھا گئیں۔ مغربی معاشرے کی بے راہ روی سے ہم سب واقف ہیں مگر کہانی کا اختتام پسند آیا۔ رچرڈ کے ساتھ بالکل ٹھیک ہوا۔ فرزانہ نگہت کا پراسرار خزانہ ہمارے ذوق کے مطابق تھا۔ کہانی شروع سے ہی اچھی رہی۔ مستقبل کو خوشحال تو ہر کوئی دیکھنا چاہتا ہے اور کوشش بھی بہت کرتا ہے مگر ہر کسی کو خزانہ ملے یہ ضروری نہیں مگر رابرٹ کا شوق آخر تک قائم رہا تو شاید اس نے خزانہ ڈھونڈ لیا ہو۔ انجم فاروق ساحلی کی خطرناک مجرم اچھی کاوش تھی مگر اسی موضوع پہ ہم ایک فلمائی گئی کہانی کو دیکھ چکے تھے تو زیادہ دلچسپ نہیں لگی۔ کم و بیش اسی فلم پہ لکھی گئی کہانی لگی۔ عاطر شاہین کی کہانی قسط وار تھی اور ہم ایسی کہانیوں کو دور سے سلام کرتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ ہاں جب کبھی کتابی شکل میں آئی تو پڑھ لیں گے۔ بیت بازی سے لطف اندوز ہوئے۔ اور کوثر کی حق دار تک جا پہنچے۔ خالد شیخ نے بہت اچھے سے ایک عورت کی ذمے داریوں کو بیان کیا۔ عورت اپنے فرض سے پیچھے نہیں ہٹتی چاہے ماں ہو بہن یا بیٹی۔۔ اور اس کو اپنی خوشیوں کی بھی قربانی دینی پڑے تو دے جاتی ہے۔ فاطی ایک سہیلی، عمران قریشی کی سہیلی ہی تھی۔ کیسے کیسے کردار دنیا میں ہوتے ہیں۔ اختر سردار نے مختصر الفاظ میں ایک پنچھی واس بچے کی حساسیت کو لکھا۔ واقعی اس بیچارے کا کیا قصور۔ افسوس کرتے ہوئے شہ مات تک جا پہنچے۔ ایم الیاس نے سہیل کے ذریعے کنول کو اچھے سے شہ مات کا مزہ چکھایا۔ مختار دانش کی شکست تشنہ سی لگی۔ کچھ کمی تھی۔ ساجد محمود ایک بہت ہی مختلف موضوع آئزم کے ساتھ حاضر تھے۔۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس موضوع پہ پہلی بار کوئی کہانی پڑھی۔ بہت اچھے طریقے سے لکھی گئی کہانی کو کیا خوب انجام دیا انہوں نے۔ مگر کہانی کو شاید آگے بڑھانا چاہیے تھا۔ مینا راجپوت گلابی جوڑا لیے پیش پیش رہیں۔ ایک غریب طبقے سے تعلق لڑکی کے جذبات ایک امیر گھرانے کا رویہ جو وہ اپنے ملازموں سے رکھتے ہیں۔ پڑھ کر دکھ ہوا۔ اور گلابی جوڑا اپنی قسمت کو روتا رہا، وہ لڑکی بیچاری آخر میں بھی حسرت کا ہی شکار بنی۔ اللہ رکھا چوہدری چالباز کو ہم سے ملانے

آئے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دوسروں کی باتوں میں آکر اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ زبیر کے پچھتانے سے اس کی زندگی نہیں بدل سکتی تھی افسوس۔ گل صنوبر کی کہانی انتقام کا موضوع اچھا تھا مگر اس میں کچھ چیزیں غیر حقیقی لگیں جیسے صنوبر کا ہر بات پہ چپ ہونا۔ بھائیوں کا اس حد تک اختلاف وغیرہ۔ اختتام بالکل اچھا نہیں لگا۔ مگر کاوش اچھی تھی سب اسی طرح لکھتے رہیں۔ یہ دعا ہے اور ہمارے اختتامی الفاظ بھی۔ خدا سرگزشت کی انتظامیہ کو اور زیادہ کامیابیوں سے نوازے (آمین)''

☆ فوزیہ نور نے بدین سے لکھا ہے۔ ''جون کی چمکتی دوپہر جیسا چمکتا دمکتا سرگزشت ملا، خوبصورت سا سرورق دل کو بھا گیا۔ کافی عرصے بعد کوئی رسالہ پڑھنے کو ملا تھا اور سرگزشت کو پڑھنے کا پہلی دفعہ موقع ملا اور پہلی مرتبہ ہی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اشتہارات کی باڑ سے چھلانگ لگا کر پہنچی فہرست پر جہاں پر رنگا رنگ سلسلوں کی کہکشاں بکھری ہوئی تھی۔ آرزو سے مستفید ہوتے ہوئے شہر خیال تک آئے۔ جہاں پر خوبصورت خطوط اور دل موہ لینے والے تبصرے موجود تھے۔ نوائے حق، ازز دیا اعجاز بہت پسند آئی۔ بحری قزاق کو پڑھتے اور سید احتشام کے انصاف کے قائل ہو گئے۔ جنگلی لڑکیاں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا دلچسپ لگا۔ بیت بازی اور ادب شناس بلاشبہ بہترین سلسلہ لگا مجھے۔ ساری کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ''ردِعمل'' پڑھی جسے ساجد محمود نے فرنگی لینڈ سے لکھا تھا۔ بلاشبہ ایک پُراثر اور چونکا دینے والی تحریر تھی۔ گلابی جوڑا بینا راجپوت کی تحریر غریبوں کی ناکام حسرتوں کی صحیح طور پر عکاسی کرتی ہے۔ سرگزشت کی تمام تحاریر اور سلسلے بہترین اور کسی تعریف کے محتاج نہیں یہ سلسلہ قلم یونہی پھلتا پھولتا رہے۔ (آمین)''

☆ افضل احمد کا تبصرہ جہلم سے۔ ''سرگزشت مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس میں سچے واقعات ہوتے ہیں۔ بحری قزاق نے خوب مزہ دیا۔ جنگلی لڑکیوں کے بارے میں ارتھ پلینٹ نامی ٹی وی چینل پر ڈوکومینٹری دیکھ چکا ہوں۔ سفرنامہ اچھا جا رہا ہے۔ انور فرہاد کی ''انمول'' واقعی انمول ثابت ہوئی۔ یہ سب تاریخ کا حصہ ہے۔ ہمیں ماضی کی یاد دلانے والی تحریر ہے۔ فرزانہ نگہت کی تحریر پُراسرار خزانہ بھی پسند آئی۔ کوثر کی حقدار بہت اعلیٰ سچ بیانی ہے۔ اسے میں نے دوبار پڑھی۔ بینا راجپوت کا گلابی جوڑا اور ساجد محمود کا ردِعمل اچھی رہی۔ انتقام کا ٹیمپو تیز تھا پسند آئی۔''

☆ عبدالمجید بٹ نے باغ آزاد کشمیر سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کی سچ بیانیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ اس بار کی پہلی سچ بیانی کوثر کی حقدار بہت پسند آئی۔ پڑھتے پڑھتے آنکھیں نم ہوتی رہیں۔ بہت عمدہ، ایسی سچ بیانیاں ہر ماہ لگایا کریں۔ پکھی واس بھی دلچسپ لگی۔ میرا کیا قصور بھی اچھی تھی۔ ردِعمل نفسیاتی گتھی کو سلجھانے والی روداد ہے۔ گلابی جوڑا کی مصنفہ بینا راجپوت نے بہت عمدہ کہانی لکھی ہے۔''

☆ ندیم نصرت کا خط لاہور سے۔ ''اس بار کا اداریہ دل پر لگا بہت عمدہ اشارہ ہے۔ ہر مسلم ملک کو میدان جنگ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ انتشار پھیلا جا رہا ہے تاکہ مسلم ممالک میں اتحاد نہ ہو۔ اگر اتحاد ہو گیا تو دنیا اسی طرح سر جھکا دے گی جیسا سلطنت عثمانیہ کے سامنے جھکتی تھی۔ سلطنت عثمانیہ کو توڑنے میں اپنوں کا ہی ہاتھ تھا۔ اگر مسلمان اتحاد برقرار رکھتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ آج بھی مسلمان متحد ہو جائیں تو کیا نہیں ہو سکتا۔ خطوط میں اللہ رکھا چوہدری کا خط طویل ضرور تھا لیکن بھرپور تھا۔ امتیاز بخاری اور عبدالجبار رومی انصاری کے خطوط بھی اچھے تھے۔ دوسرا طویل خط ظہیر ملک کا تھا جس میں روانی نہ تھی۔ ثمرین علی کا خط بھی پسند آیا۔ اب چلتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف لیکن نوائے حق پر بات ہو جائے۔ نصراللہ خان کا کالم جنگ میں اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ ایک لازوال شخصیت تھی۔ پہلی سچ بیانی کوثر کی حقدار بہت بہت بہت پسند آئی۔ پکھی واس بھی اچھی تھی۔ فاطی ایک پہیلی، اتنے واقعات کا مجموعہ ہے کہ ذہن بھٹک جاتا ہے۔ میرا کیا قصور بھی پسند آئی۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

سلمان شیخ، حیدر آباد۔ یاسین گجر، لاہور۔ ارسلان بدر، سرگودھا۔ رانا اسلام دین، گجرات۔ منیر شگفتہ، وہاڑی۔ ساجدہ پروین، سیالکوٹ۔ رانا خالد محمود، پھالیہ۔ اعجاز احمد، لاہور۔

TAGPK.COM

پابجولاں

زین مہدی

ہر شاعر کی شاعری سے ایک منفرد شاعرانہ شخصیت ابھرتی ہے جس کی تعمیر خارجی محرکات اور داخلی ردّعمل کے پیہم، تفاعل سے وجود میں آتی ہے۔ اس وقت کے شعرا طرب انگیزی اور والہانہ کیفیات کے اظہار میں الجھے ہوئے تھے۔ خود اس کی شاعری بھی نغمہ و نور کے سرمدی سرچشموں میں کھوئی ہوئی تھی کہ رشید جہاں نے اسے جھنجوڑ دیا۔ زندگی کی بے اطمینانی، مایوسی اور بیزاری کی جانب توجہ دلائی بتایا کہ زندگی جام و صبو نہیں زہر بھرا پیالہ بھی ہے اس لیے زندگی بامقصد گزرے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس ایک جملے نے اس کی شاعری کا رخ بدل دیا۔

ایک شاعر شعلہ بیاں کا احوالِ زیست

اردو ادب کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو ایک نام بہت اوپر نظر آئے گا۔ وہ نام کس کا ہے یہ بتانے سے پہلے اس کی زندگی کے پرت کھولتے ہیں تاکہ قارئین سمجھ سکیں کہ اونچا مقام ایسے ہی حاصل نہیں ہو جاتا۔ کس قدر محنت کرنی پڑتی ہے، اس نے کس قدر محنت کی یہ بتاتا چلوں۔

یہ سیالکوٹ کی تحصیل نارووال میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں کالا قادر، کا قصہ ہے۔ اس گاؤں میں صاحبزادہ خان رہا کرتا تھا۔ وہ غربت کے جال میں اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ دو وقت کی روٹی بھی اسے صحیح طور پر میسر نہ تھی۔ جب پیٹ کے لیے روٹی نہ مل رہی ہو تو تن پہ اچھے کپڑے کہاں سے آسکتے ہیں۔ وہ چیتھڑے نما پیرہن میں وقت گزارتا تھا۔ آمدنی کے لیے وہ جو کام کرتا تھا وہ بھی کوئی ارفع و اعلیٰ نہ تھا۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے اٹھ جاتا اور گاؤں کے مطلوبہ گھروں کے دروازے پر دستک دے کر بکریاں جمع کرتا اور انہیں لے کر جنگل میں چلا جاتا۔ سارا دن وہ جنگل میں کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا رہتا مگر اس کی آنکھیں بکریوں پر جمی رہتیں۔ ایک بھی بکری اِدھر اُدھر ہوتی تو وہ سوٹا سنبھال کر ان کے پیچھے دوڑ پڑتا۔ بکریاں اس کا اشارہ سمجھتیں۔ اسے آتا دیکھ کر خود ہی اپنے جھنڈ میں واپس آجاتیں اور سورج غروب ہونے کے بعد گاؤں لوٹتا۔ اس کڑی مشقت کے بعد اسے صرف اتنا سا اناج ملتا جو اس کے گھر والوں کی بھوک کو کچھ حد تک کم کر دیتا۔ اس آدھے پیٹ کھانے میں سلطان محمد خان بھی شریک تھا، صاحبزادہ خان کا بیٹا جب وہ کچھ اور بڑا ہوا تو صاحبزادہ خان نے اُسے بھی بکریاں ہانکنے پر مامور کر دیا۔ وہ باپ کے ساتھ صبح سویرے بکریاں لے کر جنگل کی جانب چل دیتا۔ سارا دن جنگل میں گزارتا وقت اچھا گزر جاتا لیکن وہ مطمئن نہ تھا۔ اس کام میں اسے عجیب قسم کی الجھن ہوتی۔ خاص کر اس وقت جب وہ مدرسے کے برابر سے گزرتا تو اس کا دل تڑپ اٹھتا اور وہ ایک بار اندر جھانک کر ضرور دیکھتا۔ قطار در قطار بیٹھے بچے اسے بہت اچھے لگتے۔ اس کا دل یہی کہتا یہ بچے تیری ہی عمر کے ہیں تو بھی ان کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتا لیکن وہ ان بچوں کے ساتھ بیٹھنے سے معذور تھا۔

TAGPK.COM

TAGPK.COM

اگر وہاں بیٹھ جاتا تو بکریاں آس پاس کے کھیتوں میں گھس جاتیں اور کھیتوں کے مالک اس سے ہرجانہ طلب کرتے۔

ایک دن اس نے اپنے باپ صاحبزادہ خان سے کہا ''میں بھی مدرسے میں پڑھوں گا۔''

''ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے ایک لفظ نہیں پڑھا تو کیسے پڑھ لے گا؟ اور اگر پڑھ بھی لیا تو کون سا منشی لگ جائے گا۔''

''آپ اجازت دے دیں، جو کام میرے بزرگوں نے نہیں کیا وہ میں کر دکھاؤں گا۔''

''لیکن پڑھائی میں بہت پیسے لگتے ہیں یہ خرچ کہاں سے پورا کروں گا۔'' باپ نے رکھائی سے کہا۔

''میں نے مولوی صاحب سے بات کی ہے، وہ مجھے پڑھا دیں گے۔''

''تو نے ان سے کب بات کر لی؟'' باپ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں ہر روز بکریاں لے کر جاتے وقت مدرسے کے سامنے کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاتا ہوں، مجھے ہر روز وہاں کھڑا دیکھ کر مولوی صاحب نے خود پوچھا کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں تو میں نے ہاں کر دی، انھوں نے آپ کو بلایا ہے، آپ بھی ہاں کر دیں ناں۔''

صاحبزادہ خان سوچ میں ڈوب گیا۔ پڑھائی لکھائی تو چودھریوں، ملکوں کا شوق ہے اس کے بیٹے میں یہ جراثیم کیسے پیدا ہو گئے، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ تبھی صاحبزادہ خان کی بیوی نے کہا کہ وہ بیٹے کو اجازت دے دیں شاید اس طرح سلطان محمد خان کا مستقبل سنور جائے۔ ملکوں میں بیٹھنے کا بھی کچھ فائدہ ہے، جب وہ بڑا ہو گا تو ملکوں کے یہ بچے بھی بڑے ہوں گے اس وقت یہ دوستی کام آئے گی۔

صاحبزادہ خان کو بیوی کی بات پسند آ گئی اور اس نے مولوی صاحب کو پڑھانے کی اجازت دے دی۔ اب سلطان محمد خان بہت تھوڑی سی بکریاں لے کر نکلتا۔ ان بکریوں کو وہ مدرسے کے سامنے پیڑوں سے باندھ دیتا اور پھر مولوی صاحب کی دی ہوئی کتاب لے کر پڑھائی میں لگ جاتا۔

خدا نے اسے ذوق و شوق کے ساتھ ساتھ اچھا ذہن بھی دیا تھا۔ اسباق اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شمار مدرسے کے ذہین ترین طلباء میں ہونے لگا۔ جبکہ وہ دوسرے بچوں کی طرح سارا دن مدرسے میں گزارنے سے قاصر تھا۔ بہت کم وقت کے لیے مدرسے میں رکتا اور نیا سبق لے کر جنگل میں چلا جاتا۔ جنگل میں پہنچ کر وہ بکریوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتا اور خود کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر سبق یاد کرنے لگتا۔ مولوی صاحب اسے اپنے ساتھ لے کر قریبی قصبہ میں گئے اور امتحان دلوا دیا۔ ذہن اچھا تھا تھوڑی سی محنت سے اس نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد بھی اسے آگے پڑھنے کا شوق مہمیز کرتا رہا۔ اس نے پھر اپنی ماں کا سہارا لیا اور ماں نے باپ سے کہا کہ اسے بدو کے اسکول میں داخلہ دلا دے۔ اب صاحبزادہ خان بھی بیٹے کے شوق کو پورا کرنے پر مجبور تھا کیونکہ سلطان محمد نے پرائمری کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ وہ اول آیا تھا اور اس کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں دو روپے کی بہت بڑی اہمیت تھی۔ بیٹے کو ہر ماہ دو روپے مل رہے تھے اس لیے صاحبزادہ خان نے اسے بدو کے اسکول میں داخل کرانے کی ہامی بھر لی۔

کالا قادر اور بدو کے درمیان چھ میل کا فاصلہ تھا۔ ملکوں کے بچے تو تانگے پر سوار ہو کر چلے جائیں گے لیکن سلطان محمد کیسے جائے گا؟ یہ فکر صاحبزادہ خان کو کھائے جا رہی تھی۔ اس مسئلے کا حل بھی سلطان محمد نے ڈھونڈ لیا۔ وہ اسکول کے وقت سے تقریباً گھنٹے دو گھنٹے پہلے نکلتا اور پیدل چلتا ہوا بدو پہنچ جاتا۔ اتنی کڑی مشقت وہ صرف اچھے وقت کی اُمید پر جھیل رہا تھا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ان ملکوں اور چودھریوں کے بچوں سے آگے بڑھ کر دکھائے گا اسی لیے وہ پڑھائی میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا۔ دن رات کی محنت رنگ لائی اور اس نے مڈل کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔

اس کامیابی نے اس کے طلب علم کے شوق کو مزید مہمیز کیا اور وہ آگے پڑھنے کے بارے میں سوچنے لگا لیکن آگے کی تعلیم کے لیے شہر جانا ضروری تھا۔ آس پاس کے کسی بھی گاؤں میں ہائی اسکول نہ تھا۔ ایک جانب غربت کا بوجھ اور دوسری جانب علم کا شوق۔ اس نے علم کے شوق کو پورا کرنے کے لیے لاہور جانے کی ٹھانی۔

لاہور کوئی چھوٹا موٹا شہر نہ تھا، انسانوں کا سمندر تھا۔ وہ آنے کو تو آ گیا تھا مگر ٹھہرے گا کہاں؟ یہ سوال اسے پریشان کرنے لگا۔ تبھی اس کی نظر اٹھی اور مسجد کے بلند مینار پر ٹھہر گئی۔ مسجد کے گلدستہ اذاں سے موذن نیک عمل کے لیے پکار رہا تھا۔ سلطان محمد کے قدم خود بخود مسجد کی سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ اس مسئلے کا حل خدا سے مانگنا چاہتا تھا۔ ظہر کا وقت تھا، موچی دروازے کی اس چینیوں والی مسجد میں لوگ جمع

TAGPK.COM

ہوتے چلے جارہے تھے۔ انہی لوگوں کے درمیان وہ بھی پہنچ گیا۔ وضو کرنے کے لیے حوض کے پاس بیٹھا تھا کہ مسجد کے امام آ گئے۔ امام صاحب ایک نئے چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے، پھر اس کے گرد آلود کپڑے بھی انھیں اس کی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ امام صاحب کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر آگے بڑھ گئے۔ وہ اسی انہماک سے وضو کرتا رہا، پھر جب جماعت کھڑی ہوئی تو وہ پہلی صف میں تھا۔

جماعت ختم ہوئی تو نمازی چلے گئے۔ وہ بھی مسجد سے نکل رہا تھا کہ امام صاحب نے روک لیا۔

''بیٹے! کہاں سے آئے ہو؟'' امام صاحب نے پوچھا۔

''سیالکوٹ سے آیا ہوں۔'' سلطان احمد نے جواب دیا۔

''بہت زیادہ پریشان لگ رہے ہو۔ مناسب سمجھو تو اپنی پریشانی بتا دو۔''

''علم کی طلب مجھے آپ کے شہر میں لے آئی ہے۔ اجنبی ہوں، سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کہاں ٹھہروں؟''

''جب سارے در بند ہو جاتے ہیں تو خدا کا در کھل جاتا ہے۔ کہاں داخلہ لینا چاہتے ہو؟''

''مڈل پاس کر چکا ہوں کسی ہائی اسکول میں داخلہ لوں گا۔''

''خدا کامیابی دے گا۔'' کہتے ہوئے امام صاحب کھڑے ہو گئے۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

سلطان محمد ان کے ساتھ مسجد سے باہر آیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر اپنے جاننے والے ایک ہیڈ ماسٹر کے پاس آئے۔ انھوں نے سلطان محمد کی اسناد دیکھیں اور داخلہ فارم دے دیا۔

داخلے کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا مگر سر چھپانے کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ اس نے لوٹتے ہوئے امام صاحب سے کہا: ''جناب آپ نے ایک مسئلہ تو حل کر دیا مگر دوسرا ابھی باقی ہے میں رات کہاں گزاروں گا؟''

''بیٹے یہ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ تمھیں رات گزارنے کے لیے کہیں بھٹکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے اور اس در سے کوئی مایوس نہیں جاتا۔ مسجد کے احاطے میں تم نے چند کوٹھریاں دیکھی ہوں گی۔ وہ مسافروں کے لیے بنائی گئی ہیں، میں ایک کوٹھری کھول دوں گا تم اسی میں رہنا۔ اس طرح کھانے کا خرچ بھی بچے گا اور تم دل لگا کر پڑھ سکو گے۔''

اس گمبھیر مسئلے کا حل اتنی جلدی نکل آئے گا سلطان محمد سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خدا کے اس کرم پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ایک گناہ گار بندے پر اتنا لطف و کرم؟ وہ سجدہ شکر میں گر گیا۔ پہلے روز جب عشاء کی نماز سے فارغ ہوا تو اس پر یہ بات آشکار ہوئی کہ ان کوٹھریوں میں ٹھہرنے والوں کے لیے کھانا محلے کے گھروں سے آتا تھا۔ آج تک اس نے محنت کی روٹی کھائی تھی۔ مساکین کے لیے جذبۂ ہمدردی کے تحت بھیجا گیا یہ کھانا دیکھ کر وہ رو پڑا۔ نوالہ اٹھانے کے لیے اس کے ہاتھ آگے بڑھنے پر تیار نہ تھے۔ اس رات مفت کی روٹیاں اس سے کھائے نہ بنی اور وہ بھوکا ہی سو گیا۔

امام صاحب کی نظروں سے یہ بات چھپ نہ سکی۔ انھیں سلطان محمد کی خودداری پر رشک آنے لگا۔ آدمی ذہین تھے انھوں نے فوراً ہی اس مسئلے کا حل تلاش کر دیا۔ اس کے ذمے مسجد کے کئی کام لگا دیے تا کہ وہ اس کھانے کو اپنی محنت کا معاوضہ سمجھے۔ سلطان نے اس بات کو پسند کیا اور وہ دلجمعی سے مسجد کا کام سنبھالنے لگا۔

اب وہ صبح سویرے اٹھتا، نماز ادا کرتا، اسکول کا کام کرتا اور دو روٹی کھا کر اسکول چلا جاتا۔ وہاں سے لوٹتا تو مسجد کے کام نمٹاتا پھر عشاء کی نماز با جماعت ادا کر کے اسٹیشن چلا جاتا۔ وہاں قلی کا کام کرتا۔ اس سے جو تھوڑی بہت آمدنی ہوتی اسے وہ اپنے گھر بھیج دیتا۔

چھوٹی سی عمر میں اتنا بوجھ، اس میں بردباری آتی چلی گئی۔ اس کی محنت اور لگن نے، اخلاق اور اخلاص نے نہ صرف اسکول میں بلکہ مسجد کے دور و نزدیک رہنے والوں کی نظروں میں بھی اسے قابلِ احترام بنا دیا۔ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس نے جان توڑ محنت کے بل پر صرف دو سال کے عرصے میں فارسی اور انگلش میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ وہ روانی سے فارسی اور انگلش بولتا۔ اس کی اس قابلیت نے بھی لوگوں کو مرعوب کر لیا تھا۔ اس نے رات دن کی محنت سے جو تعلیم حاصل کی تھی اس کا ثمر اسے ملنے لگا تھا۔ اس کی محنت رنگ لا رہی تھی۔

اسی دوران میں ایک روز بدقسمتی نے سلطان محمد کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

اس روز جمعہ تھا۔ نماز پڑھنے والوں کی تعداد ہر روز سے زیادہ تھی۔ پہلی صف میں سلطان محمد کھڑا تھا۔ اسے مطلق خبر نہ تھی کہ اس کے برابر جو شخص کھڑا ہے وہ کون ہے، وہ شخص کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ وہ حکومتِ افغانستان کا سفیر تھا۔ نماز ختم

TAGPK.COM

ہوئی تو امام مسجد نے سفیر افغانستان سردار امیر محمد خان کا تعارف سلطان محمد خان سے کرایا۔ سلطان محمد خان نے سفیر محترم سے اردو کے بجائے فارسی میں گفتگو شروع کی تو وہ انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ اتنی کم عمری میں اتنی عمدہ اور روانی سے فارسی بولنے والے کسی غیر زبان کے فرد کو انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ سلطان محمد خان میں خصوصی دلچسپی لینے لگے۔ باتوں باتوں میں امام صاحب نے یہ بھی بتا دیا کہ سلطان انگریزی بھی اسی طرح فراٹے سے بولتا ہے تو سردار امیر محمد خان مزید مرعوب ہو گئے اور انھوں نے فرمائش کر دی کہ سلطان ہر روز ان کے بنگلے پر آ کر انھیں انگریزی کی تعلیم دے اور اس طرح وہ ایک معمر شخص کا نوجوان معلم بن گیا۔ اس کی ذرائع آمدنی بڑھ گئی اور قسمت کی دیوی خود بخود مہربان ہوتی چلی گئی۔

سلطان نے امیر محمد خان کی فارسی تحریروں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو سفیر محترم مزید مہربان ہو گئے اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی ترقی کے لیے پوری کوشش کریں گے۔

اسی دوران 1906ء کا خوش نصیب سال آ گیا۔ شہنشاہ افغانستان نے سردار امیر محمد خان کو واپس کابل بلا لیا۔ جب وہ جانے لگے تو انھوں نے سلطان محمد خان سے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے۔ سلطان محمد خان فوراً تیار ہو گیا اور ان کے ساتھ کابل کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

کابل پہنچ کر امیر محمد خان نے بادشاہ امیر عبدالرحمن کے حضور اسے پیش کیا۔ کچھ ہی دنوں میں بادشاہ بھی اس کی قابلیت و فراست کے معترف ہو گئے اور اسے بحیثیت مترجم اپنے یہاں مقرر کر لیا۔ اس طرح ایک معمولی چرواہا اپنے علم و دانش کے سہارے شاہی دربار تک پہنچ گیا۔

سلطان محمد خان نے اپنی انتھک لگن کی بدولت بہت جلد بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا۔ بادشاہ امیر عبدالرحمن اس کی فہم و فراست کے قائل ہو چکے تھے انھوں نے اسے دربار میں خاص مقام دے دیا۔ وہ بحیثیت مترجم اپنے فرائض انجام دینے لگا۔

ایک معمولی چرواہا قسمت اور اپنی فہم و فراست کی بدولت ایک بادشاہ کا مقرب خاص بن گیا تھا۔

سلطان محمد نے دربار میں عہدہ سنبھالنے کے بعد آہستہ آہستہ ہر ایک پر اپنی قابلیت کا رعب ڈال دیا۔ تمام درباری اس کی عزت کرنے لگے۔ بادشاہ کی نظروں میں تو اس نے خاص مقام پہلے ہی بنا لیا تھا۔ جب درباریوں میں سے کئی افراد نے بادشاہ سے اس کی تعریف کی تو بادشاہ نے اس کے شایان شان عہدہ دینے کے بارے میں غور کیا اور پھر اسے دربار کا امیر منشی بنا دیا گیا۔

ساتھ ہی ساتھ اسے ایک اور عہدہ مل گیا تھا۔ اسے شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا۔ ان شہزادوں میں ولی عہد بھی تھا۔ یہ عہدہ بہت اہم تھا۔ دور رس نگاہوں کے حامل اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ آنے والے دنوں میں وہ بہت اہم شخصیت بن جائے گا۔ آج جو ولی عہد ہے کل کو اسے بادشاہ بننا ہے اور بادشاہ بنتے ہی وہ سلطان محمد کو خاص اہمیت دے گا اس کے مشورے پر تمام فیصلے کرے گا۔ اسی وجہ سے کئی درباری اس سے بغض رکھنے لگے تھے۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات حکومت برطانیہ کی سفیر ڈاکٹر ٹیلر ہملٹن سے ہوئی۔ لیڈی ٹیلر ہملٹن نے بھی اس کی فہم و دانش کا لوہا مان لیا۔ دونوں میں خوب نبھنے لگی۔ ٹیلر ہملٹن دربار پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ اسی نے ایک دن سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ ہوشیار ہو جائے۔ کچھ لوگ اس کی جان لینا چاہتے ہیں اور بادشاہ کو اس سے بدظن کرنے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس نے جب ان سازشی عناصر کا نام بتایا تو سلطان کا چہرہ اتر گیا۔ وہ بھی ان کے بدلتے ہوئے رویے کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے چپکے چپکے ان کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں تو تمام باتیں سچ نکلیں۔ اس کے مخبروں نے بتایا کہ بادشاہ ان سازشی عناصر کا ہم خیال بن چکا ہے اور کسی بھی وقت اس کے قتل کا حکم جاری کر سکتا ہے۔

یہ خبر معمولی نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی بوریا بستر باندھ لیا اور اپنے ایک وفادار ملازم امام بخش کے ساتھ رات کی تاریکی میں کابل سے فرار ہو گیا۔ کابل چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنے ہیرے جواہرات اور قیمتی مال اسباب لیڈی ٹیلر ہملٹن کے حوالے کر دیا تھا۔

سلطان اور امام بخش راتوں رات تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور پہنچ گئے۔ سلطان محمد لاہور پہنچا تو اس کے آنے کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ انگریز افسروں کو اس کا یوں چپکے سے آنا پُراسرار لگا اور انھوں نے سلطان محمد کو تفتیش کے لیے طلب کر لیا۔ وہ انھیں مطمئن نہ کر سکا انگریزوں نے مزید معلومات کے لیے ایک افسر کو افغانستان بھیجا اور سلطان محمد کو شاہی قلعے میں نظر بند کر دیا۔

سلطان محمد کے افغانستان چھوڑنے کے کچھ ہی دنوں بعد لیڈی ٹیلر ہملٹن کو بھی لندن بلا لیا گیا تھا۔ وہ ملکہ وکٹوریا کی

TAGPK.COM

رشتے دار تھی اس لیے حکومت برطانیہ میں اس کا خاص عمل دخل تھا۔ سلطان کی گرفتاری کی خبر اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے خبر ملتے ہی لاہور کے حاکم کو حکم بھیجا کہ فی الفور سلطان کو لندن بھیج دیا جائے۔

لندن طلبی کا حکم سن کر سلطان شش و پنج میں پڑ گیا۔ اسے پانی کے جہاز سے لندن روانہ کر دیا گیا۔ لندن پہنچنے پر اس کے استقبال کو لیڈی ہملٹن خود بندرگاہ پر آئی اور اسے عزت و تکریم کے ساتھ اپنے گھر لے گئی اور اس کے ہیرے جواہرات بھی اسے واپس کر دیے۔

اب وہ آسودہ حال ہو چکا تھا۔ یہاں اس کے لائق کوئی کام نہ تھا اس لیے وہ دوبارہ حصول علم میں کوشاں ہو گیا۔ اس نے کیمرج میں داخلہ لے لیا تھا۔ طلب علم کی لگن نے اسے جلد ہی فیلو آف رائیل جیوگرافیکل سوسائٹی کی سند دلا دی۔

شہنشاہ افغانستان کو اصلیت کا علم ہو چکا تھا۔ انھیں یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ سلطان اب لندن میں رہ رہا ہے۔ بادشاہ نے اس کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ وہ اسے لندن دربار میں اپنا سفیر بنانا چاہتا ہے۔ یہ عہدہ سلطان کو بہت بھایا اور اس نے رضامندی کا پیغام بھیج دیا۔

سلطان محمد نے کیمرج میں دو سال تک تعلیم حاصل کی، پھر اس نے لا کالج میں داخلہ لے لیا۔ بیرسٹری پاس کرنے کے بعد وہ واپس برصغیر آ گیا۔ پہلے اس نے جہلم میں پریکٹس کی لیکن وہاں جم نہ سکا اور واپس اپنے آبائی شہر سیالکوٹ آ گیا۔ وہاں آ کر اس نے ایک بہت بڑی حویلی خرید لی تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ شادیاں کی تھیں۔ سب سے چھوٹی بیوی کے بطن سے نو بچے ہوئے۔ طفیل احمد، عنایت اللہ، بشیر احمد، بیگم بی بی گل، بیگم نجیب اللہ خان، بیگم اعظم علی، بیگم حمید، رشیدہ سلطانہ اور فیض احمد خان۔

فیض احمد خان کی پیدائش 31 فروری 1911ء کو ہوئی تھی۔ اسے سبھی سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ہر وقت نوکروں کی فوج اس کے ناز و نعم اٹھانے کے لیے مستعد رہتی۔ گو کہ سلطان خان نے اپنا بچپن نہایت کسمپرسی میں گزارا تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کے بچے ہر غم و فکر سے آزاد رہیں۔ ابھی فیض کی عمر ہی کیا تھی صرف تین سال اور اسے مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے زیر تربیت دے دیا گیا تھا۔ اس نے مولوی ابراہیم کی نگرانی میں 1915ء تک قرآن شریف کے دو پارے حفظ کر لیے تھے۔ پھر اسے 1916ء میں اردو فارسی کی تعلیم کے لیے بٹھا دیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے اردو فارسی میں کافی کچھ پڑھ لیا، تب اسے 1921ء میں سیالکوٹ کے مشہور اسکول 'اسکاچ مشن ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخلہ دلوا دیا گیا۔

وہ ایک ذہین باپ کا بیٹا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسکول کے ہونہار بچوں میں شمار ہونے لگا۔ اسی اسکول سے اس نے 1927ء میں فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ وہ اردو فارسی اور انگریزی میں اچھی خاصی قابلیت حاصل کر چکا تھا۔ درسی کتابوں کے علاوہ غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتا رہتا تھا۔ اسے فارسی اور اردو شاعری سے عشق ہوتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں اس نے خود بھی شاعری کی کوشش شروع کر دی اور 1928ء میں اس نے پہلی غزل کہہ ڈالی۔ اب وہ چپکے چپکے شاعری بھی کر رہا تھا مگر کسی کو خبر نہ تھی۔ ابھی وہ طبع سخن کی سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا کہ امتحان سر پر آ گیا۔ اس نے بھرپور محنت کی اور 1929ء میں امتیازی نمبروں سے انٹرمیڈیٹ کر لیا۔

مرے کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وہ لاہور آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور اسی کالج سے اس نے 1931ء میں بی اے آنرز کیا۔ اسی دوران میں اس کی زندگی میں ایک بہت بڑا حادثہ رونما ہو گیا۔ اس کے والد محترم سلطان محمد خان اس دنیا سے گزر گئے۔

باپ کے انتقال نے اسے پاش پاش کر دیا تھا۔ وہ اپنے والد سے حد درجہ محبت کرتا تھا اسی لیے اسے صدمہ بھی زیادہ محسوس ہوا تھا۔ کافی دنوں تک وہ ملول رہا، پھر دوستوں کی دلجوئی اور رشتے داروں کے اصرار نے اسے پڑھائی پر توجہ دینے کے لیے مجبور کر دیا اور وہ ایم اے کی تیاری کرنے لگا۔ 1933ء میں اس نے گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ایم اے کیا۔

ایم اے کرنے کے بعد کیا کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب خود اس کے پاس نہ تھا اور اس کی سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو اس نے عربی میں ایم اے کرنے کے لیے داخلہ لے لیا۔

جان توڑ محنت، انتھک لگن اور نمایاں مقام حاصل کرنے کی چاہت نے اسے ایم اے ان عربی کی ڈگری بھی دلا دی۔ 1934ء میں اس نے دوسری بار ایم اے کیا اور اسی سال اس کا پہلا مضمون بھی شائع ہوا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اس نے نوکری کرنے کی ٹھانی، کسی سرکاری محکمے میں قلم گھسیٹنا اسے کبھی پسند نہ تھا۔ بہت

TAGPK.COM

سوچ بچار کے بعد اس نے امرتسر کے ایم اے او کالج میں لیکچرار شپ کے لیے عرضی بھیج دی۔ تعلیمی کیریئر شاندار تھا اسے فوراً منتخب کرلیا گیا۔

اس کالج میں دو مشہور افسانہ نگار محمود الظفر اور ڈاکٹر رشیدہ جہاں بھی تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی ترقی پسند تحریک کے پرجوش حامیوں میں سے تھے۔ محمود الظفر کا تعلق رام پور کے نواب گھرانے سے تھا اور ساری تعلیم وتربیت انگلستان میں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے بھی وہ فرسودہ رسموں کو وبال جان سمجھتے تھے۔ اپنی تحریروں سے ان رسموں پر ضرب کاری لگانا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ بیوی ملی تو وہ بھی ان کی ہم خیال تھی۔ 1933ء میں ترقی پسند مصنفین کے افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں چوٹی کے افسانہ... نگاروں کے علاوہ ان دونوں کے بھی افسانے تھے۔ افسانوں کے پلاٹ اتنے تیکھے تھے کہ رجعت پسند حلقے میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ عریانی اور فحاشی کا الزام لگا کر حکومت سے اس مجموعے کو ضبط کر لینے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ ڈاکٹر رشیدہ جہاں کو بھی اغوا اور قتل کی دھمکی ملی تھی۔ اسی ڈاکٹر رشیدہ جہاں نے فیض احمد خان کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو پہچان لیا اور انھوں نے فیض کو اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا۔

فیض احمد خان سرِشام ان کے گھر چائے پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر رشیدہ جہاں لان میں منتظر تھیں۔ چائے کے دوران میں انھوں نے فرمائش کی ''فیض! میں نے سنا ہے تم شاعری بھی کرتے ہو کچھ سناؤ ناں۔''

فیض نے اپنے مخصوص انداز میں شعر سنانا شروع کر دیئے۔ شعر بے زبانی کا کلام ہے، وہ سیدھا دل میں اترتا ہے۔ ڈاکٹر رشیدہ جہاں خاموش ہوگئی تھیں۔ فیض کی رومانی غزلوں کا سحر ان پہ طاری ہوگیا تھا۔ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ فیض سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہے اور رشیدہ جہاں خیالوں میں گم رہیں۔ کچھ دیر بعد رشیدہ جہاں نے کہا ''فیض! مجھے رومانی شاعری سے چڑ نہیں ہے۔ یہ بھی زندگی کا ایک حصہ ہے مگر سوچ کر دیکھو زندگی میں صرف غم جاناں نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ شاعر ہو یا افسانہ نگار ہر قلم کار کا یہ فرض ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو پیغام دے۔ قلم کار تو راہبر ہے۔ بھٹکے ہوئے انسانوں کو منزل کا پتا بتانا اس پر فرض ہے۔ غور سے دیکھو یہ غم دنیا کیا کہتی ہے؟ یہ بھوک سے تڑپتے ہوئے بچے، یہ ننگی انسانیت، ان کا بھی کچھ تقاضہ ہے ان پر بھی کچھ لکھو۔''

اس دن دونوں کے درمیان میں بہت دیر تک بحث ومباحثے کا دور چلا اور فیض نے ایک نئی منزل کا نشان پالیا۔ اس ملاقات نے فیض کے دل پر انمٹ نقوش ثبت کر دیئے تھے۔ اسے ایسا لگا تھا کہ بچپن کی وہ محبت جسے حالات کی گرد نے چھپا لیا تھا، رشیدہ جہاں کے روپ میں پھر سے سامنے آ گئی ہے۔ اس پہلے عشق نے فیض کو حسرت ویاس کے سمندر میں ڈبو دیا تھا جو ان کی شاعری کا جوہر بن رہا تھا مگر رشیدہ جہاں کی محبت نے اسے غم جاناں سے نکھیٹ کر غم دنیا کے روبرو لا کھڑا کیا تھا۔

جنگِ عظیم اول کے خاتمے کے ساتھ روس کے قدیم رومانوف خاندان کی بادشاہت بھی ختم ہوگئی اور روس میں ایک نئے نظریے نے جنم لیا۔ مارکس اور اینجل کے فلسفے کو فروغ حاصل ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ فلسفہ دور دور کے ملکوں پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ جس پر اب غم دنیا کا مکروہ چہرہ عیاں ہو چکا تھا اس پر بھی اس فلسفے کا جادو چل گیا۔ اس فلسفے کی بنیاد ہی دولت کی غیر مساوی تقسیم اور طبقات کے درمیان چلنے والی کشمکش تھی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ تبدیل کرنے میں معاشی مسائل نے ہمیشہ ہی اہم رول ادا کیا ہے اور اسی وجہ سے مارکس کا فلسفہ کامیاب ہو رہا تھا۔ برصغیر میں بھی طبقاتی کشمکش کا دور دورہ تھا اور اسی نے فیض کو بھی مارکس کی باتوں پر یقین کر لینے کے لیے اکسایا۔ اسے سوشلزم کی جانب جھکنے پر طبقاتی کشمکش دولت کی غیر مساوی تقسیم اور رشیدہ جہاں کی محبت بھری پُرخلوص صحبتوں نے مجبور کیا تھا اور اس کی شاعری میں نمایاں تبدیلی آنے لگی۔

1935ء میں ڈاکٹر ملک راج آنند، صاحب زادہ محمود الظفر، سید سجاد ظہیر اور ڈاکٹر تاثیر نے لندن میں منصوبہ بنایا کہ وطن لوٹ کر ترقی پسندوں کی ایک تنظیم بنانا چاہیے۔ 1936ء میں سجاد ظہیر نے وطن لوٹ کر ملک کے ممتاز ادیبوں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ان کی آواز پر بہت سارے لوگ جمع ہوگئے نیاز فتح پوری نے بھرپور حوصلہ افزائی کی منشی پریم چند نے تو تائید کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے انعقاد کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ لکھنو میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کی صدارت کے لیے بھی منشی جی کو چنا گیا۔ فیض کو اس انجمن سازی کی خبر ہوئی تو وہ بھی اس میں شامل ہوگئے اور پھر آہستہ آہستہ اس انجمن کے روح رواں بن گئے۔ اسی دوران ... میں ڈاکٹر ڈی ایم تاثیر، ایم اے او کالج کے پرنسپل بن کر آئے (سلمان تاثیر کے والد) ڈاکٹر ڈی ایم تاثیر نے ایک یورپین لڑکی سے شادی کی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد سلمان تاثیر

کی خالہ بھی ڈاکٹر تاثیر کے پاس آ گئیں، ان کا نام ایلس تھا فیض ڈاکٹر تاثیر سے ملنے پہنچے تو ان کی ملاقات ایلس سے ہوگئی۔ پہلی ہی نظر میں ایلس انھیں بھا گئی اور وہ اس پر دل وجان سے فدا ہوگئے۔ چونکہ مرنجاں مرنج اور شرمیلے قسم کے نوجوان تھے اس لیے اپنی محبت کو چھپا گئے لیکن ڈاکٹر تاثیر کے ہاں جانے کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ ایلس کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لیے شام ہوتے ہی پہنچ جاتے۔ کبھی خاموشی بھی زبان بن جاتی ہے۔ فیض کی خاموش محبت کی گرمی ایلس نے بھی محسوس کر لی اور پھر دونوں قریب آتے چلے گئے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی جانے لگیں۔ ایک نیا گھر بسانے کا خواب دیکھا جانے لگا۔

ایلس مغربی تہذیب کی پروردہ تھی، اپنی مالک آپ تھی لیکن فیض کا گھرانا مذہبی تھا اس لیے فیض نے گھر والوں کی رضامندی ضروری سمجھی اور ماں کے پاس پہنچ گئے۔ ماں نے ایک میم سے شادی کرنے کی بات سنی تو اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی مسلمان لڑکی سے شادی کرو۔ فیض روٹھ کر واپس امرتسر چلے گئے۔ اس دوران میں انھوں نے کئی بار کوشش کی مگر ماں کی نہ ہاں میں نہ بدلی۔ تھک ہار کر فیض خاموش بیٹھ گئے۔ اگر وہ چاہتے تو کورٹ میرج کر سکتے تھے مگر انھوں نے ماں کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا۔ اسی کشمکش میں دو سال گزر گئے اور ماں کو بیٹے کی خواہش پوری کرنا پڑی۔ اجازت ملتے ہی فیض ایلس کو لے کر سرینگر پہنچ گئے ان کے ساتھ بڑے بھائی بھی تھے۔ اس شادی پر مشہور پنجابی ادیبہ امرتا پریتم نے انٹرویو لیا تھا۔ امرتا پریتم خود بھی ایک دوسرے دھرم کے لڑکے ساحر سے محبت کر چکی تھیں اس لیے انھیں یہ محبت کی شادی دلچسپی کی حامل نظر آئی اور انھوں نے اس پر لمبا چوڑا مضمون لکھا۔

''ایلس کیا تمہاری فیض سے ملاقات یعنی پہلی ملاقات تمہارے ہی دیس انگلستان میں ہوئی تھی؟''

''نہیں، میری بہن ہندوستان میں ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ بیاہی تھی۔ ان کی ملاقات انگلستان میں ہوئی اور وہ یہاں آ گئی۔ میں 1938ء میں ان سے ملنے یہاں آئی تھی۔''

''مگر تمھیں تو اردو لکھنا پڑھنا آتا نہیں تھا پھر فیض کی شاعری سے عشق کیسے کر لیا۔''

''تمہاری بات صحیح ہے، میں آج تک اس کی شاعری کی گہرائی تک پہنچ نہ سکی۔ وہ شخص مجھے اچھا لگا تھا اور میں نے

فیض کی کل چودہ کتابیں شائع ہوئیں۔
سرِ وادیِ سینا کے بعد ''صلیبیں مرے دریچے میں''
(خطوط 1975ء)
متاعِ وقلم (نثر 1973ء) ہماری قومی ثقافت
(نثر 1976ء)
شامِ شہرِ یاراں (1978ء)
مہ وسال آشنائی (اداداشتیں) مرے دل مرے
مسافر (1981ء)
سارے سخن ہمارے (1983ء)
نسخہ ہائے وفا (1985ء)

اسے پسند کر لیا۔''

''برات میں کون کون شامل تھا؟''

''فیض، ان کے بڑے بھائی اور ایک دوست نعیم۔''

ایلس نے جواب دیا۔ ''جب تینوں آ گئے تو میں نے فیض سے پہلی بات جو پوچھی تھی وہ یوں تھی کہ انگوٹھی لائے ہو کہ نہیں۔ اس پر انھوں نے جواب دیا تھا ہاں لایا ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ نکاح کے بعد مشاعرہ بھی ہوا تھا؟''

''پہلے شیخ عبداللہ اور ان کی بیوی کے ساتھ کھانا کھایا پھر مشاعرہ ہوا اور شعر سنائے گئے۔''

''فیض کے رشتے داروں سے کب ملاقات ہوئی؟''

''کشمیر میں تین دن ٹھہر کر ہم لاہور آ گئے وہاں دعوتِ ولیمہ ہوا۔''

''ساس کی بزرگانہ دعائیں کیسے لیں؟''

''سر جھکا کر گھونگٹ نکال کر۔''

''ایمان سے..... سچ، گھونٹ اٹھانے کی رسم بھی ہوئی تھی؟''

''ہاں امرتا، چاندی کے روپوں کی سلامی ملی تھی۔''

''ساس نے تمہارا نام نہیں تبدیل کیا؟''

''ہاں تبدیل کیا تھا، کلثوم رکھا تھا میرا نام مگر مجھے پسند نہ آیا۔''

''اردو زبان کہاں سے سیکھی؟''

''گھر میں فیض کے بھتیجے سے، ان کو انگریزی سکھائی اور ان سے اردو سیکھی۔''

''اس وقت تک فیض کا پہلا مجموعہ کلام ''نقشِ فریادی'' چھپ چکا تھا؟''

''ہاں شاید ایک سال پہلے۔''

''فیض نے تمھیں اپنے پہلے عشق کی داستان سنائی تھی جس کے متعلق نقش فریادی کی نظمیں لکھیں۔''

''ہاں امرتا! انہوں نے خود ہی اپنی اس ناکام محبت کی روداد سنائی تھی صرف وہی نہیں دوسری دوستوں کا احوال بھی سنایا تھا لیکن میری زندگی پر ان کا کوئی اثر نہ پڑا۔''

فیض نے امرتسر کے ایم اے او کالج سے پہلے ہی استعفا دے دیا تھا اور اب لاہور کے ہیلی کالج آف کامرس کے لیکچرار بن چکے تھے۔ اسی دوران میں ایلس نے فیض کو سلیمہ کے روپ میں ایک انمول تحفہ دیا۔

1942ء میں سلیمہ کی پیدائش ہوئی اور اسی سال انھوں نے ہیلی کالج آف کامرس سے استعفا دے دیا اور فوج میں شامل ہوگئے۔ انھوں نے فوج کے شعبہ نشرواشاعت میں ملازمت کرلی تھی اور لاہور سے دہلی چلے آئے تھے۔ انھیں کرنل کا عہدہ ملا تھا۔

ایک دن کرنل صاحب کے پاس سول عدالت سے سمن آیا کہ آپ کو عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ دراصل کرنل فیض احمد فیض نے ریڈیو تو خرید لیا تھا مگر اس کا لائسنس نہیں بنایا تھا اسی سلسلے میں طلبی ہوئی تھی۔ فیض صاحب عدالت پہنچے۔ مجسٹریٹ نے انھیں دیکھتے ہی اپنے خاص کمرے میں بلالیا۔ پہلے چائے پلائی پھر نہایت عاجزی سے بولے: ''فیض صاحب میں بڑے دنوں سے آپ کی تلاش میں تھا۔''

''بھئی میں مفرور مجرم تو نہیں ہوں۔ میرا ٹھکانا سب کو پتا ہے۔ خیر جرم بتایا جائے۔''

''شرمندہ نہ کریں۔ لائسنس تو بس ایک بہانہ ہے۔ دراصل میری بیوی کو آپ کی وہ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' بہت پسند ہے وہ ہر وقت طعنے دیتی ہے کہ تم دھرتی کے مجسٹریٹ ہو۔ ایک شاعر سے مجھے نظم نہیں سنوا سکتے کیا خاک مجسٹریٹی کروگے۔ آپ سے بس اتنی سی گزارش ہے کہ میری عزت بچا لیجیے ایک بار میرے غریب خانے پر حاضر ہوکر چائے پیجیے اور نظم سنا دیجیے۔ بہت بڑا احسان ہوگا۔''

فیض صاحب نے مسکرا کر پوچھا: ''اور لائسنس؟''

''فیض صاحب کیوں شرمندہ کرتے ہیں، خدا بھلا کرے لائسنس کا جس کی وجہ سے مجھے موقع ملا — آپ نے لائسنس نہ بنوا کر مقدمے کا نہیں بلکہ مقدمے کے روپ میں ملاقات کا اور میری عرضی سننے کا موقع فراہم کردیا۔ آپ تو جانتے ہیں بڑے لوگ اگر گھر پہ آتے رہیں تو بیویوں پر رعب پڑتا ہے۔ آپ بہت بڑے شاعر ہیں کیا میری یہ چھوٹی سی آرزو پوری نہیں کریں گے۔''

''بھئی میں نے پوچھا تھا لائسنس کے بنوانے کا جرمانہ کتنا بھروں؟''

''آپ صرف اتنا کریں کہ لائسنس بنوالیں، یہی جرمانہ ہوجائے گا۔''

دلی کا ایک واقعہ فیض کو جب بھی یاد آتا وہ مسکرائے بغیر نہ رہتے۔ یوں تو دہلی کا ہر دن ان کے لیے یادگار دن تھا کیونکہ دہلی ادب وادیبوں کا شہر اور سیاست کا مرکز تھا۔ وہ تو پہلے ہی کمیونزم سے متاثر تھے۔ اس دوران میں ان کے ترقی پسند احباب بھی انھیں سبق پڑھاتے رہے اور وہ پوری طرح مارکس کے فلسفے پر اعتقاد لے آئے۔ جنگ عظیم دوئم شباب پر تھی اس لیے وہ کھل کر کوئی تحریک چلا نہیں سکتے تھے صرف خواب ہی خواب دیکھتے رہتے۔

1945ء میں وہ ایک اور بیٹی منیزہ کے باپ بن گئے لیکن بردباری کا اب بھی فقدان تھا۔ وہ گھر کی بجائے غریبوں کے بارے میں زیادہ سوچتے۔ تحریک پاکستان عروج پر تھی مسلمانانِ ہند اپنا حصہ مانگ رہے تھے اور ہندو بنیے منہ چھپا رہے تھے، گھرکی دے رہے تھے لیکن فیض صرف غریبوں کے بارے میں سوچتے تھے۔ اپنے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے فوج سے استعفا دے دیا۔ دوران ملازمت انھوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ انگریز حکومت نے حسن کارکردگی پر انھیں ایم بی ای کے اعزاز سے نواز دیا۔

فوج سے مستعفی ہوکر وہ لاہور چلے آئے اور ''امروز'' کے ادارت میں شامل ہوگئے۔ اسی دوران میں کلکتہ کے قلب میں ایک چنگاری بھڑکی، مسلمانوں پر حملے ہوئے جس کا جواب مسلمانوں نے بنگال کے شہر نواکھالی میں دیا اور نواکھالی کے شعلوں میں پورا مشرقی بھارت جلنے لگا۔ مسلمانوں کی املاک لٹنے اور جانیں تلف ہونے لگیں۔ لاہور میں بھی مسلمان بستے تھے۔ وہ آخر کب تک خاموش رہتے؟ انھوں نے بھی جوابی کارروائی شروع کردی۔ اس ہندو مسلم فسادات کا فیض پر بہت برا اثر پڑا۔ وہ ہر روز تعصب کے خلاف پاکستان ٹائمز اور امروز میں اداریہ لکھتے۔

فسادات کے نام پر انسانیت کی تذلیل ان کی طبع نازک پر گراں بار تھی۔ قتل ہوتے انسان، اجڑی بستیاں اور ننھے بچوں کے چھدے ہوئے حلقوم دیکھ دیکھ کر وہ پاگل ہوئے جارہے

TAGPK.COM

تھے لیکن ان کی سننے والا کوئی نہ تھا۔

پاکستان کی تشکیل کے بعد یہ خوں ریزی تھم گئی۔ انھیں بھی کچھ چین مل گیا اور وہ پھر سے غریبوں، مزدوروں کے لیے جنگ کرنے کا لائحہ عمل بن چکے تھے، 1948ء میں جب سان فرانسسکو میں مزدوروں کا عالمی اجتماع ہوا تو وہ پاکستانی مزدوروں کی نمائندگی کے لیے جا پہنچے۔ آئی ایل او کے اجلاس سے لوٹ کر انھوں نے مزدوروں کے حقوق کی جنگ مزید تیز کر دی حکومت نے دوسرے کمیونسٹوں کی طرح ان کی بھی نگرانی شروع کرا دی تھی، پھر بھی وہ خوفزدہ نہ تھے اور مزدوروں کے حقوق کی خاطر آواز بلند کیے جا رہے تھے۔ سان فرانسسکو سے لوٹے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ وہ 1949ء میں پھر وہ مزدوروں کے جلسے میں شرکت کرنے کے لیے جنیوا پہنچ گئے۔ سوئزرلینڈ سے لوٹ کر وہ کوئی کارنامہ دکھا بھی نہ پائے تھے کہ 9 مارچ کو انھیں راولپنڈی کیس میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے ساتھ سجاد ظہیر، میر محمد اسحاق، محمد حسین عطا، جنرل اکبر خان، کرنل ضیاء الدین، بریگیڈیئر صادق خان، کرنل نیاز محمد ارباب، میجر حسن خان، کیپٹن ظفر اللہ پوشی، کیپٹن خضر حیات خان، جنرل نظیر احمد، کموڈور جنجوعہ، بریگیڈیئر لطیف خان اور بیگم اکبر خان شامل تھیں۔ ان پندرہ ''مجرموں'' کو تین جگہ قید کیا گیا تھا۔

گرفتاری کے بعد فیض کو فیصل آباد کی جیل پھر وہاں سے سرگودھا جیل بھیج دیا گیا۔

سرگودھا جیل میں ان کی ملاقات فخے سے ہوئی۔ اسے دیکھ کر انھیں ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ کلاس میں حاضری لے رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی تھی'' ذرا ادھر وی دیکھو سرکاراں وی فیساں بھریاں ہوئیاں نیں'' شریر لڑکے فیض نے جس کا دل پہلی محبت کی ناکامی سے فگار تھا اور جو مونس و غمخوار تلاش کر رہا تھا، آنکھیں اٹھائیں اور کلاس کے بعد اس سے ملنے کو کہا پھر دوستی ہو گئی۔ وقت کے ساتھ یہ دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ فیض بہت بڑے شاعر ہو گئے اور وہ بہت بڑا بدمعاش۔ وہی بدمعاش اس جیل میں موجود تھا اس نے فیض کو دیکھتے ہی پوچھا'' اوے تسی اتھے کی کرن آئے ہو سرکاراں۔ اسی تے قاتل تے واردائی میں' تسی کی واردات کیتی اے۔''

فیض نے کہا'' ہمیں کیا معلوم پکڑ کر لے آئے ہیں کہتے ہیں ہم نے کوئی سازش کی ہے۔''

'' بکواس کردے نیں۔ میں انھاں دیاں چالاں جاندا آں۔ اینوں خود سازش کیتی اے تے تہانوں اندر کردتا اے۔'' اور اس دن سے فیض جیل میں دولہا بن گئے۔

فیصل آباد جیل میں تین ماہ تک قید تنہائی کاٹنا پڑی پھر وہاں سے انھیں حیدرآباد منتقل کر دیا گیا، حیدرآباد جیل میں باقی ''مجرموں'' کو بھی لایا گیا۔ سات سات ''مجرموں'' کے لیے ایک ایک احاطہ اور بیگم اکبر خان کو ایک الگ کوٹھری دی گئی، کھانا پکانے کے لیے دو قیدی بھی ملے۔ ظہور احمد اور عادل خان نامی یہ دو برداشتی ان سب کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد رہتے۔

کہنے کو وہ سب قیدی تھے، سیاسی قیدی اور انھیں سزائے موت بھی دی جا سکتی تھی مگر کسی کے چہرے پر شکن نہ تھی، وہ سب ایسے مطمئن تھے گویا پکنک منانے جمع ہوئے ہیں۔ ہر روز شام میں والی بال، بیڈمنٹن یا ٹینس کا مقابلہ ہوتا۔ قیدیوں کو کتابیں اور کاغذ قلم رکھنے کی خصوصی اجازت حاصل تھی اس لیے مطالعہ اور لکھنے لکھانے کا معمول بھی جاری تھا۔ ہر پندرہ روز پر طرحی مشاعرہ ہوتا۔ ان مشاعروں کے ذریعے فیض کے کئی معرکتہ الآرا نظمیں سامنے آئیں۔

راولپنڈی سازش کیس کا مقدمہ کھل چکا تھا۔ جیل میں ہی عدالت لگتی اور تمام کارروائی پوری کی جاتی۔ فیض کی جانب سے حسین شہید سہروردی پیروی کر رہے تھے۔ اس مقدمے کی پیروی کے لیے وہ ڈھاکا سے آتے تھے۔ تمام قیدیوں کو دو صفوں میں بٹھا دیا جاتا۔ وہ سب سر جھکا کر اونگھتے رہتے اور وکلاء کے درمیان بحث جاری رہتی۔ جو ''مجرمین'' تھے انھیں ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ سب سرکاری وکیل کے دلائل سن کر زور زور سے ہنسنے لگتے شورسن کر جج صاحب کی پیشانی پر بل پڑ جاتے اور انھیں ٹوکنا پڑتا۔ مجرمین سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ قانون کا علم رکھنے والے وہ سب اس مقدمے کو کھیل سمجھ رہے تھے۔

یہ مقدمہ پورے دو سال تک چلا اور فیض کو ڈھائی سال کی سزا سنا دی گئی۔

سزا کا ذکر وہ اپنی بیوی کے نام 5 جنوری 1953ء کو لکھے گئے خط میں اس انداز میں کرتے ہیں'' اب تک تمھیں بری خبر پہنچ چکی ہوگی۔ اس سے دل زیادہ پریشان نہ ہونے دینا۔ ہم نے دو سال گزار دیے اب ڈھائی سال بھی گزار لیں گے۔ دراصل کوئی مصیبت بھی اتنی بڑی نہیں ہوتی جیسی کہ بظاہر نظر آتی ہے اور جب گزر جائے تو بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم اس بارے میں اتنے ہراساں کیوں تھے؟ ذرا سوچو تو اس نئی مصیبت کے آخر کیا معنی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال کی

TAGPK.COM

مزید جدائی۔''

جواب میں ایلس نے لکھا کہ تمھیں معلوم ہے اب بچیوں کو یہ وقت ماں اور باپ کا پیار دے کر پال رہی ہوں۔ اس کے جواب میں فیض نے لکھا:'' اس سے بڑھ کر میری بچیوں کی خوش نصیبی کیا ہوگی کہ انھیں تمہاری ایسی ماں ملی۔''

ڈھائی سال کی سزا سنا کر انھیں ساہیوال جیل بھیج دیا گیا۔ حیدرآباد اور ساہیوال کی جیل میں بہت زیادہ فرق تھا۔ حیدرآباد سے انھیں کراچی بغرض علاج کے لیے لایا جاتا تھا اس طرح انھیں دوستوں سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا مگر ساہیوال آکر اس ''عیاشی'' سے بھی وہ محروم ہوگئے۔

ساہیوال جیل میں وقت گزارنا دوبھر تھا۔ اس مسئلے کا حل ان لوگوں نے یہ نکالا کہ جیل میں ہی پھلواری لگالی۔ سب کے سب اس کی نگہداشت کرتے، جب کوئی کلی کھلتی تو سب کے چہرے کھل اٹھتے۔ ان کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر سب سے زیادہ فیض خوش ہوتے۔ پھول ان کی کمزوری بنتے جارہے تھے۔ نفاست تو انھیں ہمیشہ سے پسند تھی جن دنوں وہ حیدرآباد جیل میں تھے، وہاں ایک روز ساتھیوں نے دیکھا کہ وہ اپنا بستر اٹھائے برآمدے میں چلے آئے ہیں۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ وہ حبس بھری راتوں میں بھی کمرے سے باہر نہیں آتے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے بارے میں سبھی جاننے کے لیے جمع ہوگئے۔ پہلے تو انھوں نے کچھ نہ بتایا لیکن جب تمام ساتھی بہت زیادہ اصرار کرنے لگے تب انھیں بتانا پڑا۔

''میں اس کمرے میں کیسے سوسکتا ہوں۔''

''آخر اس کمرے میں آج ایسی کون سی نئی بات ہوگئی روز تو اسی کمرے میں سوتے تھے۔''

''اس کمرے میں ایک چھپکلی ہے۔ ایسی مکروہ شکل جس کمرے میں ہو میں وہاں کیسے ٹھہر سکتا ہوں۔''

ایسے نفیس طبع کے مزاج پہ پھولوں کی شگفتگی کیوں نہ اثر انداز ہوتی۔ وہ پھولوں کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں ان سے ہم کلام رہتے۔

انھی دنوں جان محمد نامی ایک قیدی ان لوگوں کے بہت زیادہ قریب آگیا۔ وہ موقع نکال کر ان لوگوں کے پاس آجاتا۔ وہ نہایت باتونی تھا۔ بولنے پر آجاتا تو نان اسٹاپ بولتا۔ بقول اس کے وہ ادب نواز تھا اور ادیبوں سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ اسے غالب سے چرکین تک کے بے تحاشہ اشعار یاد تھے۔ وہ موقع بے موقع اشعار سنائے چلا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے اشعار کا جواب صرف فیض کے پاس تھا۔ انھیں سینہ بہ سینہ چلنے والے اشعار بھی ہزاروں کی تعداد میں یاد تھے۔ وہ جواباً اسے سنا دیتے۔

ان دنوں کا ایک واقعہ سلیمہ ہاشمی سناتی ہیں۔ ''ہم ابو سے جیل میں ملنے خوب بن ٹھن کر جاتے، وہاں ابو بھی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک کمرے میں آتے تھے۔ ملاقات کے اختتام پر میں چاہتا تھا کہ جیل کی سلاخیں توڑ کر یا تو انھیں ساتھ لے جاؤں یا ان کے ساتھ خود بھی جیل میں رہ جاؤں مگر میں نے امی سے اس کا ذکر کبھی نہ کیا۔ میری آٹھویں سالگرہ پر ابو نے جیل سے ایک نظم بھیجی اور لکھا کہ بجز اس نظم کے میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ اس سے اچھا تحفہ مجھے آج تک کوئی نہیں ملا۔

کل چار سال گیارہ دن کی اسیری کے بعد 20 اپریل 1955ء کو فیض صاحب رہا ہوگئے، انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے ایلس، سلیمہ اور منیزہ گیٹ کے باہر کھڑی تھیں۔ دونوں بچیاں دوڑ کر باپ سے لپٹ گئیں۔ فیض نے انھیں جی بھر کر پیار کیا۔ ایلس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ وہ مشرقی ماحول کی پروردہ نہیں تھی۔ اس نے مغربی ماحول میں ہوش سنبھالا تھا مگر اس نے وفا کی دیوی بن کر ثابت کردیا تھا کہ شوہر کے دکھ درد میں شریک ہونا صرف مشرقی عورتوں کا شیوا نہیں بعض مغربی عورتیں بھی شوہر پرست ہوتی ہیں۔

سلیمہ اور منیزہ کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ وہ اپنے درمیان باپ کو پاکر پھولے نہیں سمارہی تھیں۔ سلیمہ بڑی تھی۔ اسے احساس تھا کہ لوگ اس کے باپ سے خوش نہیں ہیں۔ ابھی کچھ ہی دنوں پہلے کی بات اسے اچھی طرح یاد تھی، اردو کی ٹیچر مسز شجاع حاضری لے رہی تھیں۔ نام پکارتے پکارتے جب وہ سلیمہ فیض کے نام پر پہنچیں تو ٹھہر گئیں، پھر سلیمہ سے پوچھا ''تم مشہور شاعر فیض احمد فیض کی کچھ لگتی ہو؟''

سلیمہ نے کھڑے ہوکر کہا ''جی وہ میرے والد ہیں''

مسز شجاع نے فیض کے شعر سنانا شروع کیے تو سلیمہ خوش ہوگئی اسے فخر کا احساس ہورہا تھا۔ اس کے دل میں باپ کے پیار کا سمندر موجیں لے رہا تھا۔ تبھی مسز شجاع کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور انھوں نے فیض کو گالیاں دینا شروع کردیں، شاید مسز شجاع کو یاد آگیا ہو کہ فیض صاحب جیل میں ہیں اور حکومت ان کے خلاف ہے۔ یہ ملازم پیشہ لوگوں کا ازلی المیہ ہے مگر سلیمہ سمجھ نہ پائی اور اسے مسز شجاع پر غصہ آنے لگا لیکن جب باپ کو اپنے درمیان پایا تو سب کچھ بھول گئی۔

فیض کی ''نقش فریادی'' 1941ء میں اور ''دست صبا''

1953ء میں آ چکی تھی۔ اب وہ ''زنداں نامہ'' پیش کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ اسی دوران میں انھیں پروگریسو پیپرز کی جانب سے دوبارہ ادارت کی پیشکش ہوئی اور رہائی کے فوراً بعد ہی انھوں نے لاہور آ کر پاکستان ٹائمز کی ادارت سنبھال لی۔ فیض کا قلم سنبھالنا کوئی انہونی بات نہ تھی۔ انہونی بات تو تب ہوتی جب ان کا قلم شعلے نہ اگلتا۔ انھوں نے خوب خوب لکھا، اتنا لکھا کہ دوستوں کی تعداد گھٹ گئی اور دشمنوں کی تعداد بڑھ گئی۔ دفتر کے ساتھیوں میں بھی دشمنی سر ابھارنے لگی اور ان کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ لوگ مزے لے لے کر کچھ سچی، کچھ جھوٹی باتیں یہ کہہ کر سناتے کہ کسی سے کہنا نہیں۔ ان دنوں ایسی اوچھی حرکتوں سے فیض اتنے زیادہ ڈسٹرب رہے کہ ان کے مزاج میں حد سے زیادہ تلخی آ گئی۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر جھگڑ پڑتے۔ 1957ء، 1958ء کے سال شاید ان کی زندگی کے سب سے بھاری سال تھے۔ ان دو برسوں میں فیض نے صرف دو نظمیں لکھیں۔ جب یہ حرکتیں برداشت سے باہر ہو گئیں تو انھوں نے پروگریسو پیپرز سے استعفا دے دیا۔

وہ دل شکستگی کی زندہ تصویر بن کر گھر میں بیٹھ گئے تھے۔ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ اب قلم سے رشتہ توڑ لیں گے۔ جن لوگوں کے لیے وہ لکھتے ہیں وہی جب دشمن بن جائیں تو پھر دل کیوں نہ ٹوٹے۔

وہ گھر میں بیٹھ تو گئے تھے مگر دل کو چین نہ تھا۔ لکھنا لکھانا تو ایک نشہ ہے۔ اس نشے کا عادی کیسے خاموش بیٹھ سکتا ہے۔

انھی دنوں فیض کے دوست عالمی شہرت یافتہ فلمی ہدایت کار اختر کاردار نے فلم ''جاگو ہوا سویرا'' شروع کی اور انھوں نے فیض کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس فلم کی زیادہ تر شوٹنگ مشرقی پاکستان میں ہو رہی تھی۔ فیض نے بھی کئی ماہ اسی صوبے میں گزارے۔ وہاں سے فرصت ملی تو افروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کرنے روس کے شہر تاشقند چلے گئے۔ ان کے ساتھ حفیظ جالندھری بھی تھے۔

تاشقند کی سیاحت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ سمرقند پہنچے۔ سمرقند میں ابھی دوسرا ہی دن تھا کہ پاکستان سے ایک ایسی خبر آئی کہ وہ رو پڑے۔ یہ خبر انھیں باوثوق ذرائع سے ملی تھی اس لیے اسے جھٹلا بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے پاکستان سے رابطہ کیا تو تصدیق ہو گئی کہ واقعی مارشل لاء لگ چکا ہے۔ ایوب خان نے حکومت کا تختہ الٹ کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ پاکستان نہ جائیں اور جلاوطنی میں وقت گزاریں مگر وہ نہ مانے اور وطن لوٹ آئے۔ یہاں ان کے مخالفین پہلے سے منتظر بیٹھے تھے۔ پاکستان آتے ہی ان پر وطن دشمن سرگرمیوں میں حصہ لینے کا الزام لگا کر پھر ایک بار اسیر زنداں کر دیا گیا۔

جیل پہنچے تو وہاں پہلے سے سبط حسن اور سی آر اسلم موجود تھے۔ وہ دونوں انھیں دیکھتے ہی لپکے اور باری باری بغلگیر ہوئے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا انھیں یقین ہو کہ فیض ضرور آئیں گے اور اسی دن کے وہ منتظر تھے۔

فیض کس شان سے جیل آئے تھے وہ منظر بھی کم دلچسپ نہیں، ہونٹوں میں جلتی ہوئی سگریٹ، آنکھوں میں خوشی کی چمک، پیچھے پیچھے آدھا درجن جیل کا عملہ، ان میں سے دو کے سر پر بڑے بڑے دو بکس۔

''یہ کیا ہے بھائی!'' سبط حسن نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں کتابیں ہیں، باہر تو پڑھنے کا موقع ملتا نہیں۔ سوچا جیل میں چل کر پڑھ لوں۔''

لاہور کی یہ جیل آہستہ آہستہ سیاسی قیدیوں سے بھر گئی۔ جیلر نے ان قیدیوں کے لیے بی کلاس کا ایک وارڈ اخلاقی قیدیوں سے خالی کرا لیا تھا۔ دادا فیروز الدین کو بہاول نگر سے، قصور گردیزی کو شاہی قلعہ لاہور سے اور دادا امیر حیدر آباد کو راولپنڈی سے لایا گیا تھا۔ ان سب نے ایک عرصے بعد ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ یہ سب اتنے خوش تھے گویا حکومت کی دعوت پر آئے ہیں۔ ادبی و سیاسی مباحثے، لطیف جملے، کٹیلے لطیفے، کسی بھی رخ سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ یہ لوگ قید ہو کر آئے ہیں، وقت گزرنے کا احساس ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

اس محفل دوستاں کے چرچے جیل بھر میں پھیل رہے تھے۔ انھی دنوں فیض صاحب کے دانت میں تکلیف شروع ہو گئی۔ اس واقعے کا ذکر ایوب مرزا اپنی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں اس طرح کرتے ہیں۔ ''ایک دن درد دل کی جگہ فیض کے دانت میں بے پناہ درد اٹھا'' کہنے لگے۔ صبح ہمیں پولیس کی گاڑی میں ڈینٹل ہاسپٹل لایا گیا۔ لاہور شہر کے گلی کوچوں سے گزرے، تازہ ہوا کو بار بار INHALE کیا۔ خوانچے والے، تانگے والے، ریڑھے، بیل گاڑیاں سب بچھڑے یاروں کی طرح میرے قریب سے گزرے۔ بہت مزہ آیا۔ پھر یہ معمول ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں روزانہ بلوا لیتے۔ ہمارے دانت میں کوئی دوا لگا دیتے اور دوسرے روز

پھر بلوا لیتے۔

ایک دن نہ جانے کیوں جیل والوں کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ جیلر نے معذرت کی، آج گاڑی نہیں ہے۔

ہم بضد کہ ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔

جیلر نے کہا ''فیض صاحب پھر صورت یہی ہے کہ آپ تانگے میں جائیں مگر ہتھکڑی پہننا پڑے گی۔''

میں نے کہا ''منظور'' اور میں تانگے میں سوار ہو گیا۔ ہتھکڑی تو خیر نہیں پہنائی گئی لیکن پولیس والے سنگین تانے دونوں طرف یوں بیٹھ گئے کہ جیسے میں ابھی جست لگا کر یہ گیا وہ گیا۔ عجیب منظر تھا۔ ہم لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں سے گزر رہے تھے اور لاہور ہمارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ پھر لوگوں نے ہمیں پہچان لیا۔ بازار میں ہمارا تانگا رواں تھا اور اس کے اردگرد یاران باوفا کا ہجوم۔ اس میں تانبائیوں سے لے کر مقتدر صحافی تک سبھی شامل تھے۔ بالکل جلوس کی سی شکل بن گئی۔ میں نے زندگی میں ایسا دل کش جلوس نہیں دیکھا۔ بھئی اسی کے بعد تو یہ نظم ہوئی تھی۔

''آج بازار میں پا بہ جولاں چلو''

تقریباً دو ماہ کی اسیری کے بعد رہائی کا حکم نامہ موصول ہوا۔ فیض آزاد فضا میں آئے اور گھر میں مقید ہو گئے۔ یہ عرصہ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ ان کے پرستار ہر محکمہ میں تھے۔ وہ حکومت کی نظر میں تو مجرم تھے لیکن عام لوگوں کے لیے وہ ان کی آواز تھے۔ ایسے ہی دوستوں کی کوشش سے ان پر ڈھائے جانے والے ظلم کے پہاڑ میں نرمی آ گئی اور انھیں الحمرا کا سربراہ بنا دیا۔

انہی دنوں سان فرانسسکو سے پھر بلاوا آ گیا اور وہ مزدوروں کے جلسے میں شرکت کرنے جا پہنچے۔

سان فرانسسکو کے پہلے سفر سے واپسی کے بعد وہ 1949ء میں جنیوا چلے گئے اور جنیوا سے واپسی کے صرف دو سال بعد 1957ء میں وہ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہو گئے تھے۔ جس کا ذکر پہلے ہی آ چکا ہے۔ اسی کیس میں جب وہ گرفتار تھے تو نو مہینے کی جدائی کے بعد منیزہ ان سے ملنے جیل پہنچی تھی۔ اس وقت اس کی عمر صرف ساڑھے چار سال تھی۔ اس نے فیض کو دیکھتے ہی کہا تھا۔ ''ابو آپ تو بالکل بوڑھے ہو گئے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی آپ کی عمر بہت کم ہو گی اور آپ بڑے خوبصورت ہوں گے۔ ارے آپ کے تو بال بھی سفید ہو گئے۔''

باپ نے بیٹی کی بات سنی تو آنکھیں بھر آئیں اور انھوں نے اسے گود میں اٹھا لیا پیار کیا پھر بولے۔ ''بیٹی یہی تو تحفہ ہے سچ بات کہنے کا۔''

''آپ گھر نہیں چلیں گے ابو۔ امی مجھے مارتی ہیں۔'' دراصل وہ معصوم انداز میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ جلد سے جلد گھر آ جائیں۔

1955ء میں انھیں سازش کیس کی قید سے رہائی ملی اور وہ 1956ء میں چین کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اسی سال ان کے زنداں نامے کی اشاعت کا ہے۔ نقش فریادی 1941ء میں اور دست صبا 1952ء میں آ چکی تھی۔ ان کی شہرت بھی اب آسمان کو چھو رہی تھی۔ اسی شہرت کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں ''الحمرا'' کا سربراہ بنا دیا گیا تھا۔

الحمرا کی سربراہی سنبھالتے ہی انھوں نے اس کی تعمیر و ترقی کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے الحمرا اس قابل ہو گیا کہ کسی بھی معزز مہمان کو وہاں مدعو کیا جا سکتا تھا۔ وہ فنکار جو الحمرا آنا کبھی پسند نہ کرتے تھے وہ بھی اب وہاں آنا اپنی شان سمجھتے۔ الحمرا کی ترقی دیکھ کر ان سے جلنے والے پھر سے میدان میں آ گئے اور کوشش شروع ہو گئی کہ کسی طرح اسے بھی قومیا لیا جائے۔ اسی دوران میں حکومت کی طرف سے پشاور، راولپنڈی، کراچی اور لاہور کی آرٹس کونسل کی ایک میٹنگ مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکا میں منعقد ہوئی۔

اس نئی صورت حال نے فیض صاحب کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ سب تحریر و تقریر کی آزادی پر حملہ ہے۔ فنون لطیفہ کو بیڑیوں میں جکڑنے کی سازش ہے لیکن اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ڈھاکا کانفرنس میں شرکت کے لیے انھیں بھی جانا پڑا۔ وہاں جو کچھ کہا گیا یہ ان کے طبع نازک پر گراں بار تھا۔ فیض کی زبان خاموش تھی مگر دل میں ایک طوفان تھا۔ دماغ میں جو جوالا مکھی سا پک رہا تھا بالآخر یہ غصہ ایک نئے روپ میں ظاہر ہو گیا۔

ڈھاکا سے واپسی کے وقت ان پر دل کا پہلا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے سخت احتیاط کی تاکید کی مگر وہ کس کی سننے والے تھے۔ اسی دوران میں انھیں حکومت روس نے اعزاز دینے کا اعلان کیا اور انھیں روس آنے کی دعوت دی۔ فیض کی ادبی و سماجی خدمات کے اعتراف میں حکومت روس لینن ایوارڈ سے نوازنا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹروں نے ہوائی سفر سے منع کر رکھا تھا۔ ماسکو پہنچنا بھی ضروری تھا اس مسئلے کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ اپنی بیٹی سلیمہ کو ساتھ لیا اور بحری سفر کے ذریعے بیروت پہنچ گئے اور پھر وہاں سے بذریعہ کار ماسکو کے لیے روانہ ہو گئے۔

TAGPK.COM

ماسکو سے وہ لندن چلے گئے۔ اس بار انھوں نے ایک نیا فیصلہ کیا تھا۔ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ جلاوطنی کی زندگی گزاریں گے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایلس کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ ایلس چھوٹی بیٹی منیزہ کو ساتھ لے کر لندن آ گئی۔ سلیمہ اور منیزہ کو لندن کے اسکول میں داخلہ دلوا دیا گیا۔ اخراجات کی پریشانی سے نجات کے لیے ایلس نے وہاں نوکری کر لی تھی۔ فیض بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ لندن میں ان کے شیدائیوں کی کمی نہ تھی مگر وہاں کی مصروف زندگی میں کون کس کی تنہائی دور کرتا ہے۔ مجبوراً انھیں برٹش میوزیم لائبریری کا سہارا لینا پڑا۔

وہ صبح سے شام تک لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے رہتے۔ خود کو مصروف رکھنے کی اتنی تگ و دو کے بعد بھی وہ وطن کی یاد بھلا نہیں پا رہے تھے۔ انھیں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آ رہی تھیں جنھیں عام حالات میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لندن کی صاف شفاف سڑکیں، چمکتی ہوئی گلیاں، اونچی نیچی پر شکوہ عمارتیں دیکھ کر انھیں وطن کی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، بج بجاتی نالیاں، اندھیری کوٹھریاں، چھوٹے چھوٹے مکانات تڑپا رہے تھے۔

دل میں تڑپ ہو، جذبہ صادق ہو تو راہیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ انہی دنوں کراچی کے ہارون کالج سے پرنسپل شپ کی آفر آ گئی۔ فیض کی گویا دلی مراد بر آئی اور انھوں نے وطن لوٹنے کی تیاری شروع کر دی اور 1964ء میں وہ بیوی بچوں سمیت کراچی آ گئے۔

کراچی میں انھیں دوستوں نے ہاتھوں لیا، خاص طور پر لیڈی شوکت ہارون نے۔ ڈاکٹر شوکت ہارون لیڈی میک لی کن زنانہ اسپتال کی سربراہ تھیں۔ غریب مریضوں کی مسیحا، دکھی دلوں کی دوا۔ امیروں پر غریبوں کو ترجیح دینے والی ڈاکٹر شوکت ہارون کی انہی خوبیوں نے فیض کو ان کے قریب کر دیا تھا۔ فیض کو ان سے کتنی عقیدت تھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے ''سر وادی سینا'' میں شامل 1968ء کی وہ چھوٹی چھوٹی نظمیں کافی ہیں جسے فیض نے ان سے منسوب کیا ہے۔ ''زنداں نامے'' میں بھی کئی ایسی نظمیں ہیں جو انہی کے بارے میں کہی گئی ہیں۔

1965ء میں فیض کا چوتھا مجموعہ ''دست تہ سنگ'' شائع ہوا جسے ادبی حلقوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ''میزان'' بھی آ چکا تھا۔ اس طرح ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔

انہی دنوں ڈھاکا سے مشاعرے کی دعوت آ گئی اور وہ

قارئینِ بیرونِ ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ **بیرون ملک ڈاک خرچ** پر
تقریباً 200 سے 250 فیصد اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے
ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ **نومبر 2020** سے لاگو ہو گا جس کی
تفصیل تمام رسائل میں فراہم کر دی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

شرکت کے لیے جا پہنچے۔ ڈھاکا وہ اس سے پہلے بھی آ چکے تھے مگر وقت اب اس شہر میں خاصی تبدیلی لے آیا تھا۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام شاہ باغ ہوٹل میں کیا گیا۔ منتظمین میں افسر ماہ پوری بھی شامل تھے۔ ایک صاحب نے فیض صاحب سے پوچھا۔ ''کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''تکلیف یہ ہے کہ مجھے سکون کی تلاش ہے کہیں سے لا دیں گے۔'' فیض نے مزاقاً کہا۔

اس شخص کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا اور وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فیض صاحب نے خیر پور (سندھ) کے ایک مشاعرے کا واقعہ سنانا شروع کیا۔

''ان دنوں میں پاکستان ٹائمز کا چیف ایڈیٹر تھا۔ خیر پور میں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست ایک انجینئر صاحب کے گھر میں کیا گیا۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی میں چند روز شعرا کے ساتھ انجینئر صاحب کے گھر کی جانب چل پڑا۔ صاحب خانہ گھر میں موجود نہ تھے۔ ہم لوگ جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انجینئر صاحب تشریف لائے۔ پروفیسر شور نے تعارف کرایا۔ ''یہ فیض ہیں۔''

انجینئر صاحب نے سرسری نگاہوں سے دیکھا اور ''ہوں'' کہہ کر مصافحہ پر اکتفا کر لیا۔

شور صاحب جز بز ہو گئے کہنے لگے۔ ''بھئی یہ فیض احمد فیض ہیں، بہت بڑے شاعر۔''

انجینئر صاحب نے اب دوسرتبہ ''ہوں، ہوں'' کیا۔

شور صاحب مزید بلبلا اٹھے اور کہنے لگے۔ ''بھئی فیض احمد فیض بہت بڑے آدمی ہیں۔ یہ پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں۔''

انجینئر صاحب چونکے۔ جیسے کوئی بچہ شور سے اٹھ جائے۔ کہنے لگے۔ ''آپ پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔''

''مگر وہ تو انگلش اخبار ہے۔'' انجینئر صاحب نے انگلش پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔''

''مگر آپ مشاعرے میں تشریف لائے ہیں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں۔''

کہنے لگے۔ ''مشاعرہ تو اردو میں ہے۔''

عرض کیا۔ ''جی ہاں۔''

وہ بولے۔ ''آپ اردو میں شعر کہہ لیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔''

انجینئر صاحب نے کہا۔ ''فیض صاحب آپ کس چکر میں پڑ گئے۔ پاکستان ٹائمز کہاں اور یہ شعر اور مشاعرہ کہاں آپ کیوں اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔ جائیں اخبار کو ٹھیک طریقے سے چلائیں یہ بہت بڑا کام ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔'' اور لیٹ کر چادر اوڑھ لی۔ تو جناب مشاعرے کے منتظمین میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔

اب آپ ہی بتائیں میں خود کیسے بتاؤں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ تمام ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں تو پھر اس سوال کا کیا تک ہے۔

یہ واقعہ سنا کر انھوں نے قہقہہ لگایا۔

ڈھاکا سے واپس آ کر فیض صاحب پھر سے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ 1968ء میں ادارہ یادگار غالب قائم کیا اور اسی سال پھر روس کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ان دنوں ملک پھر سیاسی بحران کا شکار ہو رہا تھا۔ ہر طرف جلسے جلوس کا زور تھا۔ ایوب خان کے خلاف نئے نئے محاذ کھل رہے تھے۔ انھیں کرسی سے اتارنے کے لیے کوششیں ہو رہی تھیں۔ بالآخر ایوب خاں کو عنان حکومت یحییٰ خان کو سونپنا پڑی۔

یحییٰ خان نے حکومت سنبھالتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ بہت جلد جمہوریت بحال کر دیں گے اور پھر 1970ء میں عام انتخاب بھی کرا دیے۔ عام انتخابات کے بعد کیا حالات ہوئے یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

1971ء میں فیض نے سر وادی سینا کو شائع کیا اور اسی سال ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ لاکھوں جانوں کی قربانی رائیگاں گئی اور ایک بازو سازش کی نذر ہو گیا۔ اس سانحہ عظیم پر فیض نے بہت کچھ لکھا۔ چند شعر سن لیں۔

نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے ہمت بے درد لمحے ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

فیض صاحب اس سانحے پر اس قدر دل شکستہ ہو گئے تھے کہ وہ پھر سے ملک چھوڑنے پر غور کرنے لگے۔ 1972ء میں انھوں نے مکمل تیاری کر لی تھی لیکن تب تک پیپلز پارٹی برسر اقتدار آ چکی تھی۔ پیپلز پارٹی کا نعرہ بھی وہی تھا جو فیض صاحب کا تھا۔ وہ بھی سوشلزم کے حامی تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی لوگوں میں شمار کیے جا رہے تھے۔ جب اس بات کی خبر بھٹو صاحب تک پہنچی تو انھوں نے فیض صاحب کو باہر جانے

TAGPK.COM

سے روکنے کی خاطر انھیں اسلام آباد بھیج دیا۔ وہاں انھیں نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔

فیض نے خود کو اس کام میں پوری طرح مگن کر لیا مگر انھیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ اسلام آباد محلاتی سازشوں کا مرکز تھا اور یہی بات انھیں کھل رہی تھی۔ وہ بیزار بیزار سے رہنے لگے تھے۔ انھوں نے کئی بار چاہا کہ اس کام سے استعفا دے دیں مگر ہر بار انھیں بھٹو صاحب روک دیتے۔

اس دوران میں فیض اتنے زیادہ بددل ہو گئے تھے کہ ان سے کچھ لکھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ کبھی کبھی کچھ لکھ دیتے تو بعد میں خود ہی اسے کاٹ بھی دیتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا قلم رکنے لگا۔

اسی دوران میں انھوں نے الماتا کی افرقی ایشیا ادبی کانفرنس میں شرکت کی اور اسی سال 73ء میں فلپائن انڈونیشیا کا سفر کیا۔

1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور جنرل ضیاء الحق برسر اقتدار آ گئے۔ ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ سب ہی کو خوف تھا کہ اب فیض صاحب کو جبری طور پر عہدے سے برطرف کر دیا جائے گا لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ افرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم نے ''لوٹس'' کا ایڈیٹر بنا کر 1977ء میں بیروت بھیج دیا۔

فیض نے بیروت پہنچ کر عجب منظر دیکھا۔ فلسطینیوں کے ساتھ جو ظلم ناروا ہو رہا تھا یہ ان کی قوت برداشت سے باہر تھا مگر وہ مجبور تھے۔ لوٹس کا دفتر مرکزی علاقے میں تھا۔ پھر بھی وہاں آ کر گولے گرتے رہتے تھے۔ ایک بار تو اسرائیلیوں کا پھینکا ہوا گولا دفتر کی چھت پر بھی گرا تھا۔

لوٹس کی طباعت کے لیے انھیں برابر جرمنی جانا پڑتا تھا۔ گویا ان کے پیر میں چکر سا بندھ گیا تھا۔ آج بیروت میں ہیں تو کل جرمنی میں اور پرسوں ماسکو میں اور پھر پاکستان کی کسی تقریب میں۔

جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

بیروت میں ان کی ملاقات ایک ایسی رحم دل ڈاکٹر مریم سے ہوئی جسے دیکھ کر انھیں لیڈی شوکت ہارون یاد آ گئیں اور دونوں میں اسی طرح شفقت بھرا رشتہ استوار ہو گیا جیسا فیض اور لیڈی ہارون کے درمیان تھا۔

جب وہ پاکستان واپس آ گئے تو ڈاکٹر صاحبہ کا ذکر لیڈی ہارون سے کرتے۔ وہ لیڈی ہارون سے کتنے قریب تھے اس کا

کچھ ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں جن پر برسوں تک یقین رکھا جاتا ہے۔ یعنی وہ غلطیاں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ ایسی غلطیوں کی تعداد گرچہ بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ غلطیاں بہت عظیم الشان قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ اور ایسی غلطیوں میں پوری قوم مبتلا ہو جاتی ہے۔ آئیں ہم آپ کو ایک ایسی ہی غلطی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ زمانہ ہے 1553 کا۔ اس وقت اسپین میں فورٹین نام کا ایک آدمی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ملاح تھا۔ اس نے کوئی جرم کیا تھا جس پر اسے قید کی سزا ہوئی تھی لیکن وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک بحری جہاز چرا کر فرار ہو گیا۔

بہت دنوں کے بعد یہ جہاز کیلی فورنیا کے ساحل سے آ لگا۔ فورٹن نے سمجھا کہ اس نے کوئی بہت بڑا جزیرہ دریافت کر لیا ہے۔ اپنی اسی ''دریافت'' پر فورٹن کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر جزیرہ کیلی فورنیا کا ایک نقشہ بھی تیار کر لیا۔ کچھ دنوں کیلی فورنیا میں گزار کر وہ اسپین واپس آ گیا۔

ایک بہت بڑے جزیرے کی دریافت پر نہ صرف اس کی سزا معاف کر دی گئی۔ بلکہ اس کی نگرانی میں کیلی فورنیا کے ہزاروں نقشے بھی تیار کروائے گئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ غلطی پورے دو سو برسوں تک برقرار رہی تھی۔ اس دوران اسپین سے ہزاروں افراد کیلی فورنیا آئے لیکن کسی نے آگے جا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ علاقہ مکمل طور پر جنوبی اور شمالی امریکا سے ملا ہوا ہے۔ بہرحال اس غلطی کی اصطلاح 1776 میں اس وقت ہوئی جب جوان ڈی انزا نے جا کر اصل صورت حال بتائی اور یہ کہا کہ کیلی فورنیا جزیرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ نقشے واپس لیے گئے جو دو سو برسوں تک رائج رہے تھے۔ دیکھیں تاریخ کی کیسی عظیم الشان غلطی ہے جو دو سو برسوں تک دہرائی جاتی رہی۔

مرسلہ: نگار وسیم، کراچی

TAGPK.COM

اندازہ اس واقعہ سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔

لیڈی شوکت ہارون صبح یورپ سے کراچی آئی تھیں سارا دن اپنی والدہ بیگم عبداللہ ہارون کے ساتھ گزارا۔ گھر لوٹیں اور دل کا دورہ پڑا۔ یہ دورہ اتنا زبردست تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ فیض صاحب ان دنوں پاکستان میں ہی تھے اور کسی ضروری کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ انھیں جب یہ روح فرسا خبر ملی تو وہ بھاگے ہوئے آئے اور جنازے میں شریک ہونے کے لیے لیڈی شوکت ہارون کے گھر پہنچے۔ تیاری مکمل ہورہی تھی لیکن فیض میں اتنی تاب نہ تھی کہ وہ اندر جاتے۔ باہر ہی فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا چہرہ ضبطِ غم سے سرخ ہورہا تھا اور وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جارہے تھے۔

جنازہ باہر نکلا تو فیض دل تھام کر رہ گئے۔ سی دوست نے سہارا دیا ورنہ وہ گر جاتے۔ جنازے کا جلوس کچھ دور تک پیدل چلا۔ فیض بھی سینہ پکڑے ساتھ ساتھ چلے۔ ڈاکٹر شوکت ہارون صاحبہ کو ہارون کالج کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ یہ ایک اور قیامت تھی کیونکہ فیض اسی کالج میں پڑھاتے تھے۔

ہر روز وہ کالج سے نکلنے سے پہلے اس مہربان وجود کی قبر پر ضرور رکتے۔ ایک دن جب وہ اس قبر پر پہنچے تو ضبط نے دم توڑ دیا اور انھوں نے ایک نہایت دردناک قطعہ لکھا۔

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

بیروت میں جب فیض کی ملاقات ڈاکٹر مریم سے ہوئی تھی تو انھیں بے ساختہ لیڈی شوکت ہارون یاد آ گئیں تھیں۔ کتنی مماثلت تھی دونوں کے کردار میں مریم بھی بے لوث بن کر مظلوموں کی امداد کررہی تھیں۔

یہ بھی اک عجب اتفاق ہے کہ فیض کی دوستی کئی مریموں سے ہوئی اور سب نے اپنا نقش چھوڑا۔ ایک مریم، مریم سلگائیک روسی ادیبہ جنھوں نے روسی زبان میں فیض پر مضمون لکھا اور دوسری مریم، مریم بلگرامی، نواب امداد الملک کی پوتی، نواب مہدی یار جنگ کی بیٹی اور نقی بلگرامی کی بیگم۔ جن کے بارے میں مرزا ظفر الحسن مرحوم لکھتے ہیں۔ ''ایک مرتبہ مریم اور رضیہ دونوں بہنیں اپنے والد نواب مہدی یار جنگ کی موٹر میں بیٹھی نشرگاہ حیدرآباد (ریڈیو حیدرآباد دکن) کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ ویسے تو وہ لمبی چوڑی موٹر خود اپنے جمال و جلال کی وجہ سے توجہ کا مرکز بن سکتی تھی اور جب اس میں مریم اور رضیہ اس وقت کی مریم اور رضیہ بیٹھی ہوں تو اندازہ لگایئے کہ اس میں کیسی اور کتنی گہما گہمی ہوگی۔ خوش قسمتی سے عین اسی وقت ہم بھی سڑک پر تھے۔ میں مخدوم، میر حسن اور اشفاق حسین۔ ہم لوگ نشرگاہ حیدرآباد سے نکل کر خیریت آباد کے ایک ہوٹل ''بلاتی'' میں چائے پینے جارہے تھے۔ ہم سب تو ان دونوں بہنوں کا حسن دیکھ کر بس حیران ہی ہوئے مگر ہمارا یار اشفاق اپنا دل پکڑ کر وہیں فٹ پاتھ کے پتھروں پر بیٹھ گیا۔ ''ہائے حوران خلد۔'' اور اتفاق ہے کہ تینوں مریم پاکستان سے باہر کی تھیں۔ ایک مریم بیروت کی، دوسری روس کی اور تیسری دہلی کی۔''

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

وقت ایسا تیز دھار ہتھیار ہے جو احساس کرائے بغیر توانائی کاٹتا رہتا ہے۔ فیض اب 74 سال کے ہوچکے تھے۔ جسمانی قوت گھٹتی جارہی تھی۔ ماسکو، لندن کے اسپتالوں کے علاوہ میو اسپتال میں بھی علاج ہوا مگر موت تھی کہ بڑھتی چلی آرہی تھی۔

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی اول شب
بے طلب پہلے پہل مرحمتِ بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے
جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرف وداع کی صورت
الحمدللہ بانجام دل دل زدگاں
کلمہ شکر بنام لب شیریں دہناں

لوگ جینے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے۔ فیض نے بھی ان دنوں میں شراب نوشی سے توبہ کرلی تھی سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا لیکن زندگی بھر دوسروں کے لیے لڑنے والا موت سے نہ لڑ سکا، چاروں خانے چت ہوگیا۔ 20 نومبر 1984ء کو وہ اس جہان فانی سے گزر گیا اور اسے ماڈل ٹاؤن لاہور میں سپردِ خاک سلا دیا گیا۔

اب کسی سمت اندھیرا نہ اجالا ہوگا
بجھ گئی دل کی طرح راہ وفا میرے بعد

++

TAGPK.COM

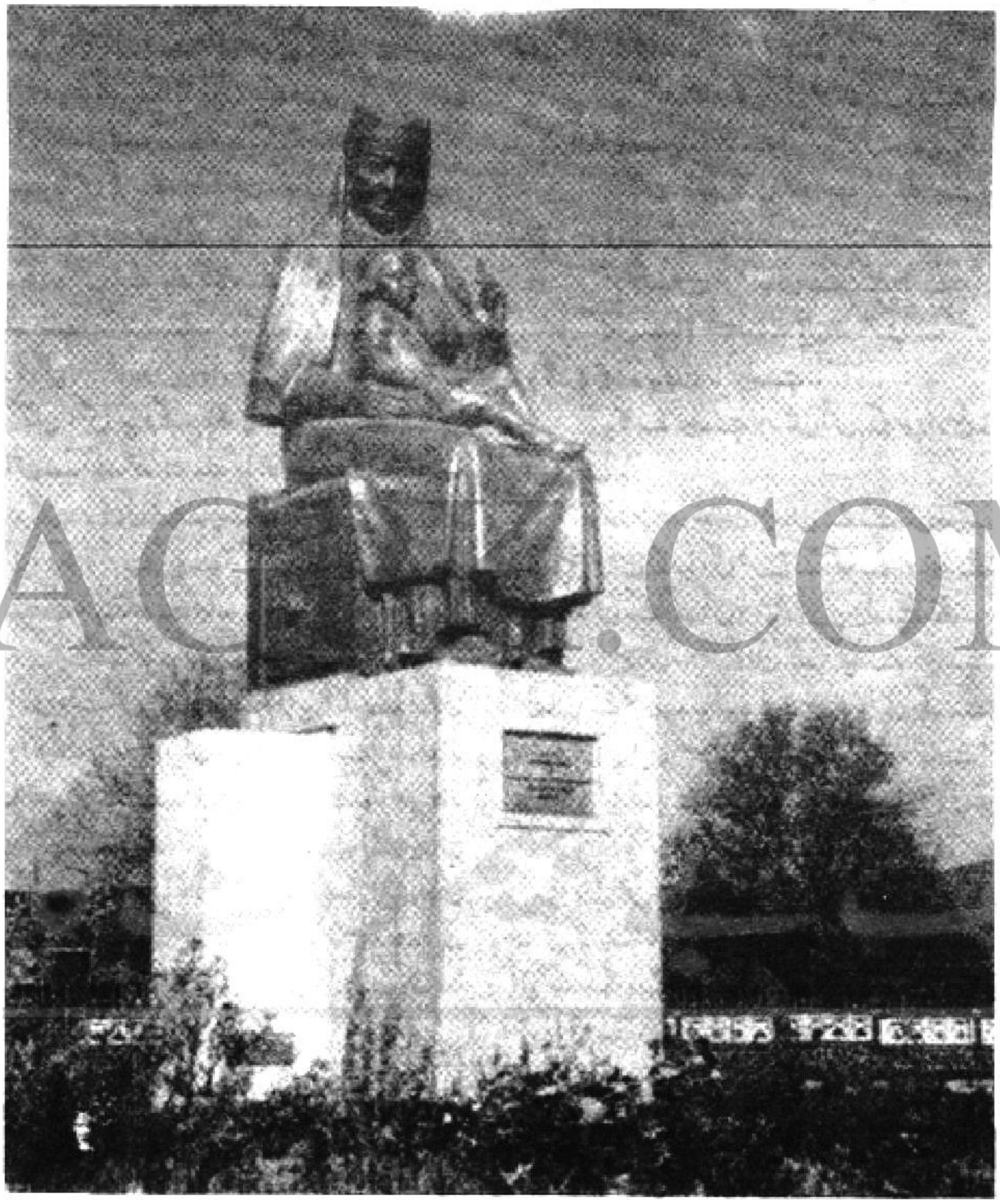
مادرِ مہربان

زرین قمر

سلطنت عثمانیہ جس کا پرچم آدھی دنیا پر لہرا رہا تھا۔
سلطنت عثمانیہ جس کے جاہ و حشم سے اہلِ یورپ پر لرزہ
طاری تھا اس سلطنت میں سب سے اہم شخصیت حاتمہ
باتون، مادر ارطغرل غازی کا تذکرہ اس خاتون نے ارطغرل
غازی کو پروان چڑھانے میں کس طرح خاموش کردار ادا کیا۔

ماضی کے جھروکے سے اہمیت کی حامل تحریر

1225ء کا زمانہ تھا صحرائے عرب کے لق و دق صحرا میں کائی قبیلے کا قافلہ پہاڑوں کے درمیان خیمہ زن تھا۔ کپڑے کے بنے خیموں کو بانسوں اور درختوں کے تنوں کی مدد سے مضبوط انداز میں لگایا گیا تھا۔ لق و دق صحرا میں خیمہ زن ہونے کی وجہ وہاں موجود گھاس اور سبزے کی چراگاہیں تھیں، وہاں پانی کا کچھ ذخیرہ بھی موجود تھا اور وہاں زندگی کو رواں دواں رکھنا قدرے آسان تھا۔ خیموں سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا بازار بھی تھا جہاں تنکوں، کھجور کے پتوں، درختوں کے تنوں اور مٹی گارے سے دکانیں بنی تھیں جو تقریباً چاروں طرف سے کھلی تھیں ان دکانوں میں زندگی کو



TAGPK.COM

آگے بڑھانے کے لیے ہر ضرورت کا کاروبار ہوتا تھا۔

اس علاقے سے گزرنے والے مسافر بھی یہاں آرام کے غرض سے ٹھہر جاتے تھے یا پھر کچھ تجارتی سامان کی خرید و فروخت والے رکتے تھے۔ اس علاقے میں علاؤالدین سلجوقی کی حکومت تھی اور کائے قبیلے کے سلطان سلیمان نے اس کی اجازت سے ہی وہاں خیمے لگائے تھے۔

''حق ہے اللہ۔'' ایک لوہار نے آگ کی طرح سلگتی تلوار پر اپنے وزنی ہتھوڑے کی ضرب لگائی۔

''سچ ہے اللہ۔'' اس کے ساتھی نے بھی تلوار پر ضرب لگا کر کہا۔ وہ دونوں ایک ہی انداز میں تلوار پر ضربیں لگا رہے تھے اور اپنی اپنی باری پر اپنا نعرہ مارتے جا رہے تھے۔ وہ قبیلے والوں کے لیے جنگی سامان تیار کیا کرتے تھے۔ وہ تلواروں، ڈھالوں نیزے، تیر کمان، خنجر سازی کے ماہر تھے۔

ایک طرف بڑے سے چھپر میں کچھ خواتین کپڑے دھو رہی تھیں اور کپڑوں پر رنگ بھی کر رہی تھیں۔ ان سب کی عمریں بہ مشکل 18 سے 25 سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ ان کی رہنمائی ایک ادھیڑ عمر بوڑھی عورت کر رہی تھی جو شکل ہی سے خاصی تجربہ کار اور ذہین دکھائی دے رہی تھی۔ یہ کائے قبیلے کے سردار کی بیوی حائمہ ہاتون تھی۔ وہ ذات کی ترک تھی۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ ارطغرل، دنداس بے، گندقدوبے، سبلتیگین بے۔ وہ بغور ہر عورت کے کام کو چیک کر رہی تھی اور مشورہ دیتی جا رہی تھی۔

''نہیں ابھی یہ رنگ ہلکا چڑھا ہے اسے اور گہرا کرو۔'' اس نے ایک عورت سے کہا جو ایک ریشمی کپڑا رنگ رہی تھی اور پھر دوسری کی طرف پلٹ گئی۔

''لاؤ دکھاؤ تم نے کیا ہے؟'' اس نے دوسری عورت کے ہاتھ سے کپڑا لیتے ہوئے کہا۔

''اس پر رنگ ٹھیک نہیں چڑھا ہے۔'' عورت نے جواب دیا اسی وقت طبل بجنے کی آواز آئی یہ اشارہ تھا کہ کوئی قافلہ یا گروہ قبیلے کے حدود میں آچکا ہے سارے لوگ آواز کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ تبھی ایک سمت سے کچھ گھڑ سوار بستی میں داخل ہوئے تھے انہیں دیکھنے کے لیے کھلے میدان میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ایک گھوڑے پر ایک ضعیف آدمی اوندھا پڑا تھا اور دوسرے گھوڑے پر ایک خوبصورت لڑکی سوار تھی جو زخمی تھی اور اس کا لباس بھی کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔

''ارے کیا ہوا ہے؟'' حائمہ ہاتون نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''ہم سب خیریت سے ہیں۔'' سب سے پیچھے آرہے اس کے بیٹے ارطغرل نے گھوڑے سے اترتے ہوئے جواب دیا اور زخمیوں کو اتارنے لگا۔

''ہم شکار پر گئے تھے جنگل میں حملے ہو رہے ہیں؟'' ارطغرل کے دوست نے کہا۔

''کون لوگ ہیں جو حملہ کر رہے ہیں؟'' حائمہ ہاتون نے پوچھا۔

''جلدی پتا لگ جائے گا۔'' ارطغرل نے جواب دیا اور زخمی بوڑھے کو اٹھا کر ایک خیمے میں لے گیا جہاں چھال کے بستر پر اسے لٹا دیا اور حکیم کو بلانے کے لیے ایک شخص کو دوڑا دیا۔ ضعیف شخص کی زخمی بیٹی اور بیٹا بھی اس کے ساتھ ہی خیمے میں آگے تھے۔

''شکریہ تمہارا، اللہ نے تمہیں رحمت بنا کر بھیج دیا۔'' زخمی لڑکی نے کہا۔

''ایسا مت کہو، میں کوئی فرشتہ نہیں، ویسے وہ لوگ تمہیں کہاں لے جا رہے تھے؟'' ارطغرل نے پوچھا۔

''پتا نہیں، شاید ہمیں فروخت کرنے لے جا رہے تھے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''تم لوگ کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''میرے بابا مشہور تاجر ہیں۔'' لڑکی نے مختصر جواب دیا پھر پوچھا ''یہ کون سا قبیلہ ہے۔''

''یہ کائے قبیلہ ہے اور میں اس کے سردار سلیمان شاہ کا بیٹا ہوں۔''

کچھ دیر بعد سلطان سلیمان کے خیمے میں حائمہ ہاتون نے دسترخوان لگا دیا، کئی طرح کے کھانے موجود تھے۔ اس کے خاندان کے لوگ بھی دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔

''سلیمان، دسترخوان لگ گیا ہے آجایئے۔'' وہ سلیمان کے قریب جا کر بولی۔ سلیمان اپنی جگہ سے اٹھ کر دسترخوان پر اپنی مخصوص جگہ آبیٹھا۔ خیمے کو نہایت مضبوطی سے لگایا گیا تھا اسے اوپر سے لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے بھی باندھ دیا گیا تھا جس کی وجہ سے پہاڑوں کی سمت سے آنے والی تیز ہوائیں اسے اڑا کے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی تھیں۔ اندر زمین پر بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے اور جگہ جگہ گاؤ تکیے بھی موجود تھے تاکہ لوگ ان سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ سکیں۔

TAGPK.COM

''دنداس بے آؤ آجاؤ۔'' حائمہ نے بیٹے کو پکارا۔
''دیکھو سکتیگین کے لیے بھی رکابی لے آؤ، میں چاہتی ہوں وہ جب بھی آئے اسے یہ احساس نہ ہو کہ ہم اسے بھول گئے ہیں۔'' حائمہ نے کہا۔ سکتیگین، ارطغرل کے بعد اس کا بڑا بیٹا تھا اور ایک محاذ پر گیا ہوا تھا اس کا وہ ہمیشہ خیال رکھتی تھی۔
''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔'' سلیمان دسترخوان پر بیٹھتے ہی بولا۔ ''بھئی ماشاء اللہ اس بار تو بڑا شکار کیا ہے تم نے۔'' وہ ارطغرل کو دیکھ کر بولا۔
''جی، لیکن یہ مشکل شکار تھا۔'' ارطغرل نے جواب دیا۔
''ہاں مشکل، ہر موقع پر ہر مشکل کا رخ تمہاری طرف ہو جاتا ہے۔'' اس کا تیسرا بھائی گندوقدوبے بولا جو اکثر اس سے اختلاف کرتا تھا۔
''یہ تاجر ہیں، صلیبیوں کی قید میں تھے میں نے آزاد کروایا ہے ان کی مدد نہ کرتا تو کیا کرتا؟''
''ہمیں سلجوق کو ان قیدیوں کے بارے میں بتانا چاہیے تھا۔''
''میرے پاس ان کی مدد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔''
''اچھا اب بس کرو، بحث کی ضرورت نہیں، کھانا کھاؤ۔ جو بھی ہوگا ہم نمٹ لیں گے۔'' سلیمان نے ناگواری سے کہا اور حائمہ ہاتون نے بیٹوں کو آنکھ کے اشارے سے چپ ہونے کو کہا۔
اسی رات ارطغرل زخمی ضعیف آدمی کے خیمے میں اس کی خیریت پتا کرنے گیا تھا۔ اس کی منگیتر آئی کس وہاں موجود تھی جو ضعیف کی دیکھ بھال کرنے آئی تھی۔ حائمہ نے اس کی ڈیوٹی وہاں لگائی ہوئی تھی، وہ نہیں چاہتی کہ زخمی مہمانوں کی تیمارداری میں کوئی کسر رہ جائے جو ارطغرل اور سلیمان کی ناراضگی کا سبب بنے۔
''تمہارا نام کیا ہے؟'' آئی کس زخمی لڑکی سے پوچھتی ہے۔
''مجھے حلیمہ کہتے ہیں..... میں نے ارطغرل کو دشمنوں سے لڑتے دیکھا وہ بہت بہادر ہیں۔''
''تم بہت خوبصورت ہو بالکل شہزادیوں جیسی۔'' آئی کس اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ حلیمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
''کیا میں نے کچھ غلط کہا؟''
''پتا نہیں؟'' حلیمہ نے جواب دیا۔
''لو..... یہ پہن لو۔'' آئی کس ایک ہار اسے دیتے ہوئے بولی۔ ''یہ میرے لیے ارطغرل لائے تھے۔''
''تمہاری شادی ہوگئی؟'' حلیمہ نے پوچھا۔
''ہو جائے گی، پہلے یہاں سے ہجرت ہو جائے اللہ اسے حفظ و امان میں رکھے۔'' آئی کس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں کوئی پسند ہے؟''
''والدہ کے بعد میرا بھائی میری ذمے داری ہے، میں اپنے بھائی اور باپ کی دیکھ بھال کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں مجھ سے کون شادی کرے گا؟''
''تم بہت اچھی ہو تمہیں تو ہر کوئی پسند کرے گا۔'' آئی کس مسکرا کر بولی۔
''دیکھو..... یہ دیکھو..... تم کتنی حسین ہو۔'' آئی کس نے شیشے جیسی پلیٹ میں نظر آتے اس کے عکس کو دکھا کر کہا تو حلیمہ مسکرا دی۔
بوڑھے کی تیمارداری کرتے کرتے ارطغرل کے دل میں حلیمہ کی محبت چٹکی لینے لگی تھی۔ حلیمہ کی نظروں میں بھی ارطغرل اپنی جگہ بنانے لگا تھا۔ مگر کسی نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ دونوں الگ الگ اپنی اپنی آگ میں جل رہے تھے کہ حلیمہ کے باپ نے قبیلے سے کوچ کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کی وجہ سے یہودیوں کا بادشاہ ٹاؤنس کائے قبیلے کا دشمن ہوگیا تھا اور قیدیوں کی واپسی چاہتا تھا۔ اسی عرصے میں شاہ سلیمان نے فیصلہ کیا کہ ارطغرل کو ''حلب'' بھیجا جائے تاکہ وہاں موجود مسلمان دستے کی مدد ہو سکے۔ روانگی کے وقت حلیمہ ارطغرل کو بتاتی ہے کہ ممکن ہے جب ارطغرل واپس آئے تو حلیمہ وہاں نہ ہو کیونکہ اس کے باپ نے وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ کائے قبیلے کی مشکلات میں اضافہ نہ ہو۔
''میں تمہیں پانے کی اُمید لے کر جا رہا ہوں حلیمہ۔'' ارطغرل روانگی کے وقت بولا۔
''خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔'' حلیمہ نے جواب دیا۔
ارطغرل کی روانگی کے بعد حلیمہ، آئی کس کے ساتھ خواتین کے کام کرنے والے حصے میں آئی ہے تو حائمہ ہاتون کی نظر اس پر پڑی۔ حائمہ سے حلیمہ اور ارطغرل کی دلچسپی چھپی نہیں تھی، وہ آواز دے کر آئی کس کو اپنے پاس بلاتی ہے۔ ارطغرل کے بھائی گندوقدوبے کی بیوی اس کے پاس آ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ قبیلے میں حلیمہ کی موجودگی کی وجہ

TAGPK.COM

سے ہونے والی تبدیلیوں کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھی اور انہیں پسند نہیں کرتی تھی۔

''سنو.....تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' گندوقدو کی بیوی سرجان نے حلیمہ سے پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''زیادہ ہوشیار مت بنو، تم جو کھیل کھیل رہی ہو وہ سب کو پتا ہے لیکن تمہارا یہ خواب کبھی بھی پورا نہیں ہوگا، بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' سرجان کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ حلیمہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ دور بیٹھی حائمہ کی نظریں بھی حلیمہ اور سرجان کا جائزہ لے رہی تھیں وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ دونوں کے درمیان کوئی ناپسندیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ حلیمہ سرجان سے بات ختم کر کے وہاں سے اٹھ گئی مگر سرجان کے واپس جانے سے پہلے ہی حائمہ سرجان کو آواز دے کر پاس بلاتی ہے۔

''تم نے اس سے کیا کہا ہے؟'' وہ سرجان سے پوچھتی ہے۔

''جو اس کے لیے ضروری تھا۔'' سرجان نے ناگواری سے جواب دیا۔

''جو اس کے لیے ضروری ہے یہ تم بتاؤ گی؟''

''میں قبیلے کی بہتری کے لیے سوچ رہی ہوں، اس کا یہاں رہنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔'' سرجان نے جواب دیا۔

''بہر حال، ایک سردار کی بیٹی ہو تم، اپنی روایات کا پاس تمہیں بالکل نہیں ہے، عقل استعمال کرو سرجان ورنہ یاد رکھو کہ پچھتاوا تمہاری تقدیر بن جائے گا۔'' حائمہ اسے سمجھاتی ہے۔

☆☆☆

ارطغرل چند فوجیوں اور بھائیوں کے ساتھ حلب پہنچا۔ وہ وہاں کے سربراہ العزیز سے ملنے آیا تھا۔ اسے کچھ زمین کے ٹکڑے کی ضرورت تھی تاکہ وہاں اپنے قبیلے کے لیے خیمے لگا سکے۔

''تمہیں حلب میں زمین دینے سے ہمارا کیا فائدہ ہے؟'' العزیز نے پوچھا۔

''میں اس کے بدلے تمہیں اپنے 200 فوجی جوان دوں گا جو بہت بہادر اور جری ہیں۔''

''میرے پاس تم سے زیادہ فوج ہے۔''

''یاد کرو بدر میں ہمارے صرف 313 بہادر سچے مسلمان تھے جنہوں نے ہزاروں کے لشکر کو شکست دے دی تھی۔'' ارطغرل فخر سے بولا۔

''لیکن مجھے تمہارے جوانوں کی بہادری پر شک ہے، اور اگر میں تمہیں حلب میں کچھ سبزہ زار کا ٹکڑا دے بھی دوں تو کچھ عرصے بعد وہاں سبزہ ختم ہو جائے گا پھر تم مزید زمین کا مطالبہ کرو گے۔''

''ہاں، ایسا تو ہوگا کیونکہ ہمیں بھی زندہ رہنے کے لیے خوراک چاہیے۔''

''میں اس بارے میں اپنے وزیروں سے مشورہ کروں گا۔ تم سفر سے آئے ہو، تھکے ہوئے ہو ابھی آرام کرو بعد میں بات کریں گے۔'' العزیز نے کہا۔

ارطغرل شہر پناہ کے قریب واقع ایک سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے دربار سے آئے ہوئے زیادہ وقت نہ ہوا تھا کہ کمرے میں تین چار لوگ گھس آئے۔ وہ تیر و تلوار سے لیس تھے۔ انہوں نے ارطغرل اور اس کے بھائیوں پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ ان بھائیوں کو ہلکا سمجھ رہے تھے۔ ارطغرل تو تلوار کا دھنی تھا ہی اس کے بھائی بھی غضب کے شمشیر زن تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے دو کی گردنیں اڑا دیں۔ تیسرا جان بچا کر بھاگا تھا کہ اسے العزیز کا وزیر ناصر پکڑ لیتا ہے، اس بھگوڑے کو قتل کرنا چاہتا ہی ہے کہ اسی وقت ارطغرل وہاں پہنچ گیا اور ناصر سے بولا کہ وہ مجرم کو نہ مارے کیونکہ وہ اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے لیکن تب تک ناصر کی تلوار چل چکی تھی، اس کا سر بھی کٹ گیا۔

''تم نے اسے کیوں مارا؟'' ارطغرل سخت لہجے میں ناصر سے پوچھتا ہے تبھی العزیز چند افراد کے ساتھ وہاں آجاتا ہے۔ ارطغرل کے چاروں بھائی بھی آجاتے ہیں۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' العزیز کڑک کر پوچھتا ہے۔

''ہم نے تمہارے شہر میں بہت سی باتیں سیکھی ہیں محترم۔'' ارطغرل، العزیز سے کہتا ہے۔ ''یہاں نہ ہمارے ہتھیار محفوظ ہیں اور نہ ہماری جانیں۔''

''یہ مجرم کون ہے؟'' العزیز اپنے وزیر ناصر سے پوچھتا ہے۔

''اس کا تعلق کلیسا سے ہے۔'' ناصر نے سر جھکا کر جواب دیا۔ اس کا اشارہ یہودی شاہ ٹاؤنس کی طرف تھا جو کلیسا کا پیروکار ہے۔

☆☆☆

TAGPK.COM

اگلے روز دربار میں العزیز، ارطغرل کو حلب کی ایک چوتھائی زمین دینے کا اعلان کرتا ہے لیکن وہ زمین دونوں اطراف سے دشمنوں کے نرغے میں تھی۔

''ہمیں دشمنوں میں رہ کر جینے کا فن آتا ہے تم اس کی پرواہ مت کرو۔'' ارطغرل نے حکم سنتے ہی کہا۔

ارطغرل حلب کی زمین حاصل کرنے کی خوشخبری خود سنانے اپنے قبیلے میں واپس پہنچتا ہے وہ خود یہ اہم خبر سلیمان کو دیتا ہے۔ اس رات کائی قبیلے میں ان کی روایات کے مطابق تلواروں کا رقص پیش کیا جاتا ہے۔ سب خیموں کے باہر میدان میں دائرے کی صورت جمع ہوتے ہیں درمیان میں آگ کا بڑا الاؤ روشن ہے۔ شاہ سلیمان اور اس کی بیوی حائمہ ہاتون مخصوص نشستوں پر براجمان تھے۔ جگہ جگہ شمعیں روشن تھیں۔ ارطغرل دائرے سے نکلتے ہوئے حلیمہ کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اس کے تعاقب میں چل پڑتا ہے اور تنہائی میں اسے روک لیا۔

''ٹھہرو، تم کہاں جارہی ہو؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے یہاں سے جانے کی کوشش کی تھی جب میں یہاں نہیں تھا؟''

''ہاں، تم نے ٹھیک سنا ہے۔''

''لیکن کیوں؟ میں تم سے کہہ کر گیا تھا کہ تم میری حفاظت میں ہو اور میری واپسی تک تمہیں یہیں رہنا ہے پھر بھی تم جارہی تھیں؟''

''ہاں، کیونکہ یہی ضروری تھا۔''

''آخر وہ تمہارا کون دشمن ہے جس سے تم خوفزدہ ہو اور اس کا نام بھی نہیں بتاتیں، بتاؤ وہ کون ہے؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ جو کوئی بھی ہے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ہم جہاں جائیں گے وہ بھی ہمارے پیچھے وہیں پہنچ جائے گا۔''

''آخر وہ کون ہے۔ مجھے اس کا نام بتاؤ۔'' ارطغرل نے غصے سے پوچھا لیکن اس سے پہلے کہ حلیمہ اسے کچھ بتاتی تقریب میں ایک شور اٹھا۔

''پکڑلو..... پکڑلو..... اسے جانے مت دو۔'' کچھ لوگ ایک سمت دوڑے اور پھر ایک نقاب پوش عورت کو پکڑ لائے۔

''کون ہے یہ؟'' سلیمان شاہ نے پوچھا۔

''یہ کوئی عورت ہے، یہ پکتے ہوئے کھانے کی دیگوں میں کچھ ملانے جارہی تھی کہ ہم نے دیکھ لیا، للکارا تو یہ بھاگ کھڑی ہوئی۔'' کسی نے جواب دیا۔

''بولو..... بولو تم کون ہو؟'' حائمہ ہاتون نے زور سے پوچھا۔

''بتاؤ تمہیں کس نے یہاں بھیجا تھا؟'' سلیمان شاہ نے کہا لیکن عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اس عورت کو زہر سمیت ابھی اور اسی وقت آگ میں جلا دیا جائے، میں سمجھ گیا ہوں یہ کلیسا کی بھیجی ہوئی عورت ہے جسے ہمیں مارنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

اسی وقت سلطان سلیمان کے حکم پر عمل کیا جاتا ہے پھر رات گئے سلمان نے ارطغرل کو اپنے خیمے میں بلایا وہ بہت فکرمند تھا۔

''تم جب سے ان زخمیوں کو لے کر یہاں آئے ہو ہم مشکل میں پھنس گئے ہیں، تاؤشس اور کاتیرا ہمارے دشمن ہوگئے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد قبیلے پر حملہ بھی کیا گیا تھا جنہیں ہم نے شکست دے کر بھگا دیا اور آج.....''

''لیکن بابا.....'' ارطغرل نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔'' سلیمان نے ارطغرل سے کہا۔ ''آج انہوں نے پھر ہمیں مارنے کی کوشش کی، اس کا مطلب ہے کہ نعمان حسن آفندی جو حلیمہ کا باپ ہے اور تاجر ہے ان کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے ورنہ صرف ایک تاجر کے لیے تو کوئی کسی کا یوں دشمن نہیں ہوتا۔''

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''تمہیں ان سے یہ راز اگلوانا ہوگا کہ یہودی ان کے اتنے دشمن کیوں ہورہے ہیں۔ وہ راز جو وہ ہم سے چھپا رہے ہیں، وہ ہمارے لیے کوئی بڑا خطرہ بھی بن سکتا ہے۔''

''بابا.....'' ارطغرل کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سلیمان اسے روک دیتا ہے۔

''میں جانتا ہوں کہ تم حلیمہ کو پسند کرتے ہو لیکن ایک اجنبی قیدی کی لڑکی کا رشتہ تمہارے لیے مناسب نہیں، میں نے سرجان کی بہن سے تمہارا رشتہ لے کر دیا ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں اب اس بارے میں صبح ناشتے پر بات کریں گے۔'' سلیمان نے کہا اور خیمے سے نکل گیا۔ اسی وقت حائمہ خیمے میں داخل ہوئی اور اس کی نظر ارطغرل کے اداس چہرے پر پڑی۔

''کیا ہوا ارطغرل، تم کیوں اتنے رنجیدہ ہو؟'' حائمہ نے پوچھا۔

''والدہ، بابا نے کہا ہے کہ گوپ چے سے میرا رشتہ

TAGPK.COM

طے ہوگیا ہے کیا یہ سچ ہے؟'' ارطغرل نے پوچھا تو حائمہ بستر پر بیٹھ گئی اور ارطغرل کو بھی اپنے پاس بٹھالیا۔

''ارطغرل، گوپ چے سردار کی بیٹی ہے اور ہمارے طور طریقے اچھی طرح سے جانتی ہے ہم بھی اس کے خاندان سے خوب واقف ہیں وہ تمہارے لیے بالکل مناسب رہے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر، میری مرضی بھی تو پوچھ لیتیں۔'' ارطغرل نے کہا، حائمہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

''حلیمہ کا کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے، میں نے اس کے خاندان کے بارے میں جاننا چاہا تھا لیکن اس نے مجھے کوئی خاص جواب نہیں دیا، وہ خود کو تاجر کہتے ہیں لیکن ان کے ماضی کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ اس کے مقابلے میں گوپ چے بہت بہتر ہے۔''

''والدہ، یہ سب کچھ پہلی بار ہوا ہے میری زندگی میں۔'' ارطغرل نے کہا۔ ''میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا اس کے بارے میں جتنا جانتا ہوں آپ کو بتادوں گا مگر یہ بھی بتادوں کہ مجھے اس کی آنکھوں میں سچائی نظر آتی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ مخلص ہے۔ ہم دونوں ایک ہی راستے کے مسافر ہیں۔ آپ میری ماں ہیں، آپ کو میرے دل کا حال معلوم ہونا چاہیے۔'' حائمہ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتی اور ارطغرل باہر نکل جاتا ہے۔

اس رات سونے سے پہلے حائمہ ہاتون کافی دیر تک جاگتی رہی تھی اس کے ذہن میں ارطغرل کی باتیں گونج رہی تھیں۔ سلیمان اس کی بے چینی محسوس کرلیتا ہے۔

''کیا بات ہے حائمہ، تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو؟''

''ہاں، ارطغرل سے آپ کی بات ہوئی؟''

''ہاں، ہوگئی۔'' اس کا زخمی مہمان ٹھیک ہوچکا ہے اسے اب چلے جانا چاہیے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں نے ارطغرل سے گوپ چے کی بات کی تھی مگر وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔''

''ایک جنگجو کا دل ہمیشہ اپنے قبیلے والوں کے لیے دھڑکتا ہے وہ جوان ہے بہادر ہے جذباتی ہے اس کے دل میں طوفان برپا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' حائمہ یہ بات سن کر اثبات میں سر ہلاتی ہے۔

''چلو تم بھی آرام کرلو۔''

''ہوں۔''

دوسری صبح سلیمان ناشتا کر ہی رہا تھا کہ ایک قاصد آگیا۔ اس نے سلیمان کو خبر دی کہ جو تجارتی قافلہ گندوقدو کی سربراہی میں جارہا تھا اس پر یہودی سردار کا تیراکوس نے حملہ کیا ہے، سارے ہی لوگ مارے گئے اور گندوقدو کو یرغمال بنالیا گیا ہے۔ اب کا تیراکوس کا مطالبہ ہے کہ آپ اپنے مہمان اس کے حوالے کریں تو وہ گندوقدو کو واپس کردے گا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' موقع پر موجود سرجان غصے سے کہتی ہے جو گندوقدو کی بیوی ہے۔ ''میں ہرگز یہ نہیں ہونے دوں گی۔''

''جاؤ..... تم لوگ دوسرے خیمے میں جاؤ۔'' سلیمان حائمہ، سرجان اور اس کی بہن گوپ چے سے کہتا ہے اور پھر ارطغرل کی موجودگی میں حلیمہ کے والد آفندی کو اپنے خیمے میں بلاتا ہے، ارطغرل اس کے قریب ہی کھڑا ہوتا ہے۔

''میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ ابھی ایک قاصد نے ہمیں خبر دی ہے کہ ہمارے تجارتی قافلے کو لوٹ لیا گیا ہے اور میرے بیٹے گندوقدو کو یرغمال بنالیا گیا ہے۔''

''میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں مجھے اس خبر سے دکھ ہوا ہے۔'' نعمان آفندی کہتا ہے۔

''میں نے تمہیں یہاں افسوس کرنے کے لیے نہیں بلایا بلکہ اس لیے بلایا ہے کہ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ میرے بیٹے کے بدلے تم لوگوں کو مانگ رہے ہیں، میں تمہاری حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔'' سلیمان نے تیز آواز میں کہا۔

''میں آپ کی بات کا جواب ضرور دوں گا لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ میری اس بات کا یقین کرلیں کہ کائے قبیلے کی میری نظر میں اتنی ہی عزت ہے جتنی میرے اپنے خاندان کے لوگوں کی۔'' نعمان حسن آفندی نے کہا۔ سلیمان غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''میں کون ہوں یہ جاننے کے بعد آپ کی مشکلات میں اضافہ ہوسکتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میں آپ کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنوں، لیکن میری زندگی آپ کی امانت ہے، اس لیے میں اپنی زندگی اور اپنے خاندان کی زندگی آپ پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے سیدھی طرح جواب دو۔''

''میں سلطنت سلجوقی خاندان مظفر علی داؤد علی محی

TAGPK.COM

الدین مظفر شاہ کا فرزند اور سلطان عزالدین کیخ پرسلان کا پوتا ہوں۔ سلجوق کا شہزادہ ہوں میں۔'' حسن علی آفندی کہتا ہے۔ ارطغرل اور سلیمان اسے دیکھتے رہ گئے۔

دوسرے خیمے میں سرجان غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

''میں ان لوگوں کو چھوڑوں گی نہیں، ان کی وجہ سے میرا گندوقد دشمنوں کے ہاتھ یرغمال ہے۔''

''تم کچھ نہیں کرو گی۔'' حائمہ ہاتون اسے ڈانٹتی ہے۔ ''جو بھی فیصلہ ہوگا وہ سلمان شاہ ہی کریں گے۔''

''میں حلیمہ کو نہیں چھوڑوں گی۔''

''خاموش ہو جاؤ سرجان۔'' حائمہ پھر ڈانٹتی ہے۔ ''اپنی کسی حماقت سے کوئی اور مصیبت مت کھڑی کر دینا۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' سرجان ایک بار پھر حلیمہ سے کہتی ہے اس کا چھوٹا بھائی بھی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

''گوپ چے جاؤ سرجان کو یہاں سے لے جاؤ۔'' حائمہ نے حکم دیا اور ان کے جانے کے بعد حلیمہ سے مخاطب ہوئی۔

''تم ہماری مہمان ہو میں تم سے سرجان کے رویے پر معافی مانگتی ہوں۔'' حلیمہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''میرا مشورہ ہے ابھی تم لوگ خیموں سے ہرگز نہ نکلنا، حالات بہت سنگین ہیں ابھی۔'' حائمہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

نعمان حسن آفندی نے سلیمان شاہ کے سوال پر اپنے رخ سے پردہ ہٹا دیا۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ ''میں بھاگ بھاگ کر تھک چکا ہوں، میری سلطنت کے اندر ہی دشمنوں کے جاسوس موجود تھے اور اسی لیے منگولوں نے یہودیوں اور صلیبیوں نے اتحاد کر کے ہماری سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا اور اس کی وجہ سے مجھے سب کچھ چھوڑ کر در بدر بھٹکنے کے لیے اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا، سردار اب میں بھی بھاگتے بھاگتے تنگ آ گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی حالات کے سپرد کر دوں۔''

''کا تیرا کورس کو آپ جانتے ہیں بابا، اگر ہم اس کی یہ شرط مان بھی لیتے ہیں تب بھی وہ ہمیں نقصان پہنچائے گا، اگر ہم شہزادے کو اس کے حوالے کر بھی دیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ بھائی گندوقد کو چھوڑ دے گا۔''

''تم بھی ٹھیک کہتے ہو ارطغرل، سب سے پہلے ہمیں گندوقد کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کرنا ہوگی۔''

''آپ نے ٹھیک کہا بابا۔''

''اور اگر بات چیت سے یہ معاملہ حل نہ ہوا تو پھر ہمیں تلوار کا سہارا لینا ہوگا۔'' سلیمان نے کہا۔

''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ارطغرل نے باپ کی تائید کی۔

''پادری چاہتے ہیں کہ کا تیرا کورس کو سلطان کے محل میں اعلیٰ مقام دلوایا جائے تاکہ وہ اسے استعمال کر سکیں۔'' حسن آفندی نے کہا۔

''کا تیرا کو ہر صورت میں شہزادہ حسن آفندی چاہیے بابا، یہ اس کی کمزوری ہے۔'' ارطغرل سمجھاتا ہے۔ ''اور ہم اسی بات کا فائدہ اٹھائیں گے۔''

''اور اگر ہمیں کامیابی نہ ہوئی تو؟'' سلیمان نے پوچھا۔

''پھر تو ایک ہی راستہ بچتا ہے، تلواروں کے سائے میں شہادت ہی ہماری منزل ہوگی۔'' ارطغرل نے جواب دیا۔

سلیمان شاہ اپنی پیٹھ پر موجود زخم کے باوجود اگلے روز کا تیرا کورس سے ملنے کے لیے روانہ ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ حائمہ اس کی تیاری میں مدد دے رہی تھی وہی اس کے زخم کی مرہم پٹی کرتی تھی اور سلیمان کی ہدایت کی وجہ سے اس نے اس زخم کے بارے میں کسی کو بتایا بھی نہیں تھا۔

''آپ جا تو رہے ہیں لیکن اپنا خیال رکھیے گا۔'' حائمہ نے سلیمان شاہ سے کہا۔ ''آپ کے زخم ابھی ٹھیک نہیں ہیں۔''

''میں ان کا عادی ہو گیا ہوں، خدا کا شکر ہے اس نے ہمیں بہت نوازا ہے۔'' سلیمان نے کہا۔

''ان شاء اللہ، ہم پر آنے والی یہ مشکل بھی آسان ہو جائے گی، آپ لوگوں کی بھلائی چاہتے ہیں، اللہ ہمارا ضرور ساتھ دے گا میں یہاں دعا کروں گی ان شاء اللہ آپ کامیاب ہوں گے۔''

''حائمہ، نعمان آفندی نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اس کی بچی کو اس کی امانت سمجھوں، یہودیوں کو صرف وہ اور اس کا بیٹا چاہیے، انہیں حلیمہ سے کوئی دلچسپی نہیں چنانچہ حلیمہ یہاں اس کی امانت ہے اور میری غیر موجودگی میں تم اس کی حفاظت کرو گی۔''

''آپ بے فکر رہیں، وہ میرے لیے میری بیٹی کی

TAGPK.COM

طرح ہے میں اس کا خیال رکھوں گی۔'' حائمہ نے وعدہ کیا۔

''خدا تم سب کا حامی و ناصر ہو۔'' سلیمان شاہ نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

سلطان سلیمان کے جانے کے دوسرے ہی دن سرجان کی سازشوں نے رنگ دکھایا اور قبیلے کے کچھ لوگوں نے حلیمہ کے خیمے پر حملہ کر دیا۔ وہ خیمے پر پتھر مار رہے تھے اور اسے وہاں سے نکالنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

''اسے یہاں سے نکالو..... یہ قائوں کی اولاد ہے..... اس کی وجہ سے ہمارے لوگ مارے گئے ہیں۔ ان کو دشمن مانگ رہے ہیں اسے انہیں دے دو..... ورنہ وہ اور لوگوں کو ماریں گے۔'' لوگ چیخ رہے تھے اور پتھر مار رہے تھے۔ دو سازشی ایک سمت کھڑے چپکے چپکے باتوں میں مصروف تھے اور خیمے کے اندر حلیمہ اکیلی خوفزدگی کے عالم میں پریشان کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ میں تلوار لے لی تھی تاکہ اگر کوئی خیمے کے اندر داخل ہو تو وہ اپنی حفاظت کر سکے۔

''ٹھہر جاؤ..... رکو..... پتھر بازی بند کرو۔'' اچانک حائمہ دوڑتی ہوئی وہاں آ گئی۔

''تم لوگوں کو کوئی ہوش بھی ہے تم کیا کر رہے ہو؟'' حائمہ نے مجمع کو ڈانٹا، وہ بڑی بہادری اور مردانگی سے سب کے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

''یہ لوگ ہمارے لیے مصیبت بنے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے ہم پر حملے ہو رہے ہیں۔ ہمارے بچے مارے جا رہے ہیں۔ اب سلیمان اپنے بیٹے گندوقدو کو بچانے گیا ہے ہمارے بچوں کے خون کا بدلا بھی ہمیں چاہیے۔'' مجمع میں سے ایک شخص نے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، کیا تمہارے بچے، میرے بچے نہیں ہیں؟ کیا سلیمان شاہ نے کبھی تمہارے اور اپنے بچوں میں کوئی فرق کیا ہے۔ سلیمان ایک ایماندار، بہادر اور نرم دل رکھنے والا سلطان ہے وہ بے شک گندوقدو کو لینے گیا ہے لیکن یہ کام تم سب کی حفاظت کے لیے بھی کیا جا رہا ہے تاکہ دشمن پھر کبھی ہم پر حملہ نہ کر سکے۔'' حائمہ نے سمجھایا۔

''ہمیں نہیں پتا اس عورت کو یہاں سے نکالو..... یہی ہماری مصیبتوں کی ذمے دار ہے۔'' ایک عورت نے آگے بڑھ کر کہا۔

''ہرگز نہیں، اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ سلیمان کے یہاں نہ ہونے سے میں کمزور پڑ جاؤں گی تو یہ تمہاری بھول ہے، خبردار ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا ورنہ تم مجھے سلطان سے کم نہیں پاؤ گے۔'' حائمہ نے غصے سے کہا۔

''اس عورت کو نکالو۔'' ایک اور آواز آئی۔

''ہرگز نہیں، سلطان سلیمان اس کی حفاظت کا وعدہ اس کے باپ سے کر چکا ہے، اب یہ ہمارے پاس امانت ہے اور امانت کی حفاظت کرنا میں خوب جانتی ہوں، خبردار کوئی میرے راستے میں نہ آئے۔'' حائمہ ہاتون نے کڑک کر کہا اور حلیمہ کے خیمے میں داخل ہو گئی اندر جا کر اس نے حلیمہ کے ہاتھ سے تلوار لے کر پھینک دی اور اسے سینے سے لگا لیا۔

''آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔'' حائمہ نے حلیمہ کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے ساتھ لے کر خیمے سے نکل گئی۔ انہیں دیکھ کر خیمے کے باہر جمع لوگ راستہ چھوڑ کر ہٹ گئے اور حائمہ اسے اپنے خیمے میں لے گئی۔

''یہاں بیٹھو میرے پاس اور فکر مت کرو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' اس نے حلیمہ سے کہا۔ ''تم بالکل بے فکر رہو تم میرے ساتھ محفوظ ہو جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہوا سلیمان شاہ ہرگز بھی اسے برداشت نہیں کریں گے۔''

حلیمہ خاموش نظروں سے اسے تکتی رہی۔

''جب تک ہمارے مرد لوٹ کر نہیں آ جاتے تم کچھ دن میرے ساتھ میرے خیمے ہی میں رہنا۔'' حائمہ نے پھر کہا۔

حلیمہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی وہ لوگوں کے رویے سے خوفزدہ ہو گئی تھی اس نے اب تک ان کی محبت اور مہمان نوازی ہی دیکھی تھی۔

''تمہارے یہاں رہنے سے اطمینان رہے گا مجھے۔'' حائمہ نے کہا تو حلیمہ ہلکے سے مسکرا دی پھر بولی۔ ''دعا ہے کہ ہماری مشکلیں حل ہو جائیں، مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایک بوجھ ہے میرے دل پر۔ بے بسی محسوس کر رہی ہوں اللہ سے دعا ہے کہ جلد ہی یہ آزمائشیں خیریت کے ساتھ ختم ہو جائیں یارب! ہمیں سکون دے۔''

''دشمن بہت دن سے ہمارے تعاقب میں ہیں۔ وہ میرے بابا اور میرے بھائی کو مار دینا چاہتے ہیں۔ کم عمری سے ہی میں نے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا ہے، قید بھی کاٹ چکے ہیں ہم کئی جگہ پر، وقت زندگی اور موت کی تلوار سر پر لٹکی رہتی تھی ارطغرل نے ہمیں اس مشکل سے نکالا ان کا احسان ہے ہماری زندگیوں پر، حائمہ، آپ کی موجودگی میں خود کو محفوظ محسوس کر رہی ہوں۔'' حلیمہ نے کہا تو حائمہ نے

TAGPK.COM

مسکرا کر اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

اسی وقت سرجان خیمے میں داخل ہوئی اور حائمہ کو مخاطب کر کے بولی ہے۔

''حائمہ ہاتون، آخر اس عورت کو تم نے اپنے خیمے میں کیوں بٹھایا ہوا ہے، ہم سب پر اسی کی وجہ سے مصیبت آئی ہے۔ سارا کیا دھرا اسی کا ہے، آپ جانتی ہیں۔ اسے تو دھکے مار کر قبیلے سے نکال دینا چاہیے تھا۔''

''سرجان، آخر تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ سے ایسے لہجے میں بات کرنے کی؟ چلی جاؤ فوراً، سنا نہیں تم نے؟'' حائمہ نے اسے ڈانٹا تو وہ طمطناتی ہوئی خیمے سے نکل گئی۔ اسی وقت باہر سے کچھ مردوں کی آواز آئی۔ ''چلو آؤ اندر چلو، اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی تین چار افراد اندر آ گئے، سرجان بھی جاتے جاتے رک گئی تھی۔ حائمہ ہاتون اندر کے خیمے میں حلیمہ کو چھوڑ کر باہر کے خیمے میں آئی تو ان لوگوں میں موجود سلطان سلیمان کے بھائی کردوغو پر اس کی نظر پڑی اور وہ معاملے کو بھانپ گئی۔

''تم سب کی اتنی جرأت بڑھ گئی ہے کہ تم بغیر اجازت سردار کے خیمے میں آ گئے؟''

''ان سب کو سردار سے بات کرنا ہے حائمہ خان۔'' کردوغو نے کہا اور سلیمان کی نشست کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''کیا میں انہیں منع کر دیتا۔'' کردوغو نے کہا اور حائمہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر وہ سلیمان کی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ حائمہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ روانگی کے وقت سلیمان نے خود کردوغو سے کہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں وہی سلطان کی ذمے داریاں نبھائے گا، پھر اس نے باقی لوگوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''تمہاری نیت جانتی ہوں، بہت برا انجام ہوگا تمہارا۔'' حائمہ نے کہا۔

''ہمیں سوچنا چاہیے کہ اگر سردار زندہ واپس نہ آیا تو کیا ہوگا؟''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم پر ایسا وقت بھی پڑے گا کہ ہم کائے قبیلے کی روایات کو بھول جائیں گے اور اپنے سردار کی زندگی میں اس کے مرنے کی دعائیں مانگیں گے۔'' حائمہ نے کہا۔ ''کیا یہی سیکھا ہے تم نے؟'' حائمہ کے مخاطب خیمے میں موجود وہ سارے مرد تھے جو کردوغو کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ اندرونی خیمے سے حلیمہ، گوپ چے اور سرجان بھی باہر کے خیمے میں آ گئی تھیں اور حائمہ کے ساتھ

جولائی 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ



مزید

ملک بھر کی محفل، محفل شعر و سخن اور ملک بھر کی حیات کی تھانے داری

کانچ محل

طاہر جاوید مغل کے قلم سے آخری صفحات پر دلوں کو گرماتی تحریر... ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں پر محو سفر... ایک بے باک مگر گھائل عشق اور حسن کی فتنہ سامانیوں کی طویل داستان

فخر آدمیت

تا قیامت انسانیت جس پر فخر کرے..... ایسے انسان بہت نایاب ہوتے ہیں زویا اعجاز کے قلم سے تاریخ کے ایک بہت خوب صورت پہلو پر روشنی

شہ زور

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال اسما قادری کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پر خطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان... عمر عبداللہ کے قلم کا شاہکار

سسپنس کلاسک

محی الدین نواب

کی خوب صورت تحریر کا انتخاب

اور کئی شمارے

نجمہ مودی، تنویر ریاض، ذاکر عبدالرب بھٹی، صبا مغل، منظر امام، اعتزاز سلیم وصلی، شاہ زین رضوان کی خوب صورت تحریریں

کھڑی تھیں۔

''تمہارے یہ بدلے روپ دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا ہے مجھے۔'' حائمہ بولی ''تم تو سلیمان کے منہ بولے بھائی ہو۔''

''مجھے افسوس ہے کہ ایسی صورت حال پیدا ہوگئی، میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔'' کردوغو نے کہا اور ساتھ آئے لوگوں کو حکم دیا کہ اسباب سرداری وہاں سے اٹھا کر دوسرے خیمے میں لے جایا جائے۔

حائمہ سمجھ رہی تھی کہ شاہ سلیمان کی غیر موجودگی میں ایک بڑی سازش تیار ہو رہی ہے۔ اس کا سدباب ضروری ہے ورنہ قبیلہ بکھر کر رہ جائے گا۔ اس نے کڑے تیور سے کردوغو کو دیکھتے ہوئے کہا: ''میں نے ابھی ابھی سلطان کے پاس قاصد بھیجا ہے۔ وہ کل صبح لوٹ آئیں گے اس لیے یاد رکھنا قبیلے کی بقا اتحاد میں ہے اور اتحاد کی ضامن زبان ہے۔ کوئی لفظ زبان سے ایسا نہ نکلے جو سلطان کو گراں گزرے۔''

حائمہ کے الفاظ ہتھوڑے کی طرح کردوغو کے ذہن پر پڑے اور اس نے جو سوچا تھا اسے بھلا دینے میں ہی اسے عافیت نظر آئی۔

سلطان سلیمان بہ خیریت واپس آگیا اور اس نے صورت حال کو سنبھال لیا ارطغرل نے حلب میں العزیز سے مل کر اپنے لیے زمین کا ایک خطہ منظور کروالیا تھا چنانچہ خشک سالی شروع ہونے سے پہلے وہاں ہجرت کا پروگرام بنالیا گیا اور پھر سلطان سلیمان، حائمہ، کردوغو نے قبیلے والوں کے ساتھ ہجرت کی اور حلب میں مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا جہاں انہیں کئی سمت سے مختلف دشمنوں کا سامنا تھا۔ العزیز کی فوج جو مختلف ہوگئی تھی، یہودیوں کا خطرہ، گویا خطرہ ہی خطرہ۔ اب سلطان سلیمان خود ہی اپنا جنگی پلان ترتیب دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حائمہ اپنی نگرانی میں عورتوں کی جنگجو فوج تیار کروا رہی تھی کیونکہ کئی سمتوں سے دشمن کا خطرہ اور کم تعداد ہونے کی وجہ سے انہیں عورتوں اور بچوں سے بھی مدد لینا تھی۔ عورتوں کو خاص طور سے نیزہ بازی، تلوار زنی اور تیراندازی سکھائی جا رہی تھی جبکہ ارطغرل، گندوقدو اور دنداس بے دوسرے محاذوں پر مصروف تھے اور سبتیکین کچھ عرصے پہلے جنگی محاذ پر جا چکا تھا۔

☆☆☆

حلب آنے کے کچھ ہی عرصے بعد سلطان سلیمان کا علالت کے دوران انتقال ہوگیا اور قبیلے کی سرداری حائمہ باتون نے سنبھال لی، تمام مسائل کے فیصلے نہایت سمجھداری اور دوراندیشی سے کرنے لگی۔ اس کے دونوں بیٹے ارطغرل اور گندوقدو اس کا دائیاں اور بائیاں بازو ثابت ہوئے پھر ایک موقع پر منگولوں کے ایک سپہ سالار نویان سے نمٹنے کے لیے حائمہ باتون کی موجودگی میں ایک اجلاس ہوا جس میں کائی قبیلے کے تمام اہم افراد اور دوسرے سردار جو کائی قبیلے کے ساتھ مل چکے تھے شریک ہوئے۔ حائمہ باتون کی موجودگی میں ارطغرل نے جنگی صورت حال اور محاذ جنگ کا نقشہ سمجھایا اور سب نے اس کی تائید کی۔ اب دنداس بے کی بھی شادی ہو چکی تھی اور وہ بھی ایک لشکر کا سپہ سالار تھا۔ چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے اس نے بھی ارطغرل کی حمایت کرنے کا اعلان کیا اور اس حملے میں ارطغرل نے منگولوں کو عبرت ناک شکست دی۔

مختلف محاذوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد ارطغرل کے بے شمار دشمن بھی پیدا ہو گئے تھے، اس پر کئی جان لیوا حملے ہوئے مگر وہ بچ گیا پھر ایک موقع پر اسے ایک خط کے ذریعے زہر دیا گیا وہ زہر بہت تیز تھا۔ خط چھوتے ہی زہر مسام کے ذریعے سرائیت کر گیا اور ارطغرل کی حالت بدل گئی اسے اپنے سینے میں شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور وہاں موجود لوگوں کے چہرے بھیانک لگنے لگے۔ آنکھوں سے خون باریک لکیروں کی صورت جاری ہوگیا، اس کی کیفیت بگڑی دماغ بے قابو ہوا اور وہ وہاں موجود لوگوں پر حملے کرنے لگا۔ سب نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا لیکن کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور وہ گر گیا تبھی حکیم کی خدمات حاصل کی گئیں جنہوں نے ارطغرل کے جسم سے زہر نکالنے کے لیے حجامہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ حلیمہ باتون اور حائمہ پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا لیکن حائمہ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا کچھ دیر بعد حکیم عارف خیمے سے باہر آئے ان کی آنکھیں متورم تھیں جیسے دیر تک روتے رہے ہوں سب لوگ تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

''سردار ارطغرل شہید ہوگئے ہیں۔'' انہوں نے اداسی سے کہا لوگوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہر طرف کہرام مچ گیا۔ قبیلے کے لوگ زور زور سے رونے لگے۔ حلیمہ سلطان چیخ مار کر خیمے میں داخل ہوگئی جہاں کچھ دیر پہلے ارطغرل کو

TAGPK.COM

زندہ چھوڑ کر باہر آئی تھی لیکن اب وہ مردہ حالت میں پڑا تھا۔

''آپ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

حائمہ ہاتون کوان کا بیٹا گند وقدوا س خیمے میں لے گیا جہاں ارطغرل پڑا تھا۔ حائمہ ایک بہادر سردار کی بیوی تھی اور بہادر بیٹوں کی ماں، غم کی گھڑی میں دوسروں کا سہارا بننا جانتی تھی اسے اب اپنے خاندان کا سربراہ ہونے کا حق ادا کرنا تھا اس نے ایک گہری سانس لی آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو سینے میں اتارا اور حکیم عارف سے مخاطب ہوئی۔ ''عارف یہ سب کیا ہے میں جاننا چاہتی ہوں؟''

''ہم بہت جلد حقائق کا پتا لگا کر آپ کو مطلع کریں گے، فی الحال آپ قبیلے والوں کو ارطغرل کی شہادت کی اطلاع دے دیں۔'' عارف نے کہا۔ ''آپ مضبوط رہیں گی تو لوگوں کو حوصلہ رہے گا اور وہ اس مشکل وقت میں خود کو سنبھال لیں گے۔ آپ بھی خود کو سنبھالیں آپ قبیلے کی سردار ہیں لوگ آپ کی تقلید کریں گے۔'' عارف کی بات پر حائمہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور عارف چار سپاہیوں کے ساتھ ارطغرل کو شفا والے کمرے میں لے گئے تھے تاکہ اگلے انتظامات کیے جا سکیں۔

کچھ دیر بعد عارف حلیمہ سلطان سے ملے اور انہیں ایک اور روح فرسا خبر دی تھی۔

''حلیمہ سلطان میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں لیکن آپ کو اس بات کو راز رکھنا ہوگا اور خود بھی پُرسکون رہنا ہوگا۔''

''کیا راز؟'' حلیمہ نے پوچھا۔

''ہمارے سردار ارطغرل زندہ ہیں۔ اللہ نے ان کی جان بخش دی ہے۔ ان کے جسم میں زہر پھیلنے سے پہلے ہی میں انہیں قے کروانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اب میں نے دوا دے کر انہیں گہری نیند سلا دیا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' حلیمہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ارطغرل زندہ ہیں۔''

''اوہ خدایا تیرا شکر ہے۔'' حلیمہ نے روتے ہوئے کہا۔

''ابھی آپ کو لوگوں سے بات کرنا ہے لیکن ان پر کچھ ظاہر نہیں کرنا، ایسے ظاہر کرنا ہے کہ جیسے وہ واقعی مر گئے

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

TAGPK.COM

ہیں۔''

خیمے کے باہر قبیلے کے لوگ کھڑے تھے جو جاننا چاہتے تھے کہ کیا ہوا ہے۔ حلیمہ اندر سے آئی اور حائمہ باتون کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ لوگ طرح طرح کے سوال کررہے تھے۔ اس نے لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

''کائی قبیلے کے بہادر خواتین وحضرات آپ سب کو ہمارے سردار کی فکر ہے؟ سب اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور اس کی طرف ہی لوٹنا ہے مگر میں بتانا چاہتی ہوں کہ ہمارے سردار سلیمان شاہ کے بیٹے ارطغرل شہید ہوگئے ہیں۔'' حلیمہ نے کہا اور لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

''آپ سب نے اپنے سردار کو کھودیا ہے جیسے کہ میں نے اپنا شوہر۔ ہم اپنے سردار کو سپرد خاک کریں گے اور اپنے غم بھی اپنے سینوں میں دفنا دیں گے اور اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ ہم ارطغرل کے بتائے ہوئے رستے سے ہرگز بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اپنے شہیدوں کی خاطر جنہوں نے اسلام کا جھنڈا اٹھایا اور ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے، ان کی عظمت کی سربلندی کے لیے ہم اپنی جانیں دیں گے اور ظلم کو مٹا کر حق کا علم بلند کریں گے۔''

اس کے بعد سب اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے تھے۔ ارطغرل کی میت کو دفنایا نہیں گیا تھا اور لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ زہر کی وجہ سے لاش اتنی خراب ہوگئی تھی کہ اسے دکھایا نہیں جاسکتا تھا اور یہی کہا گیا تھا کہ موت کی وجہ کوئی زہر ہے۔

ارطغرل کی خبر غم ہر جانب پھیل گئی تھی۔ دشمن شادیانے بجا رہے تھے۔ مطمئن ہوگئے تھے کہ ان کی راہ کا سب سے بڑا پہاڑ ہٹ گیا ہے۔ ارطغرل بھی یہی چاہتا تھا۔ سب کچھ اس کی منشا کے مطابق ہورہا تھا۔ اس نے خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے دشمنوں سے کئی مقابلے کیے۔ سیکڑوں صلیبی اس کے ہاتھوں مارے گئے اور اس نے کئی بڑی فتوحات حاصل کرنے تک خود کو روپوش رکھا یہاں تک کہ اس کی ملاقات براہِ راست سلطان علاؤالدین سے ہوگئی اور پھر سلطان علاؤالدین نے بھی بھیس بدل کر کئی معرکے لڑے اسی دوران اللہ تعالیٰ نے ارطغرل کو ایک چاند سا بیٹا بھی دیا اور حائمہ باتون قبیلے کی سرداری نبھاتی رہی اور اہم فیصلے کرتی رہی۔ اس نے عورتوں کی فوج کو ترتیب دیا اور کئی موقعوں پر قبیلے کی عزت و ناموس کی خاطر اس دستے نے معرکوں میں اپنے انداز سے حصہ لیا۔ خاص طور سے جب سلطان علاؤالدین کو زہر دیا گیا اور وہ سرائے میں نزع کے عالم میں تھا تو حائمہ ترک سرداران کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ اس کی شان ایک سپہ سالار والی تھی وہاں پر امیر سعد ایبک نے (جو غدار تھا) ارطغرل کو بھی قیدی بنا کر رکھا تھا اور علاؤالدین کو زہر دینے کا الزام اس پر لگایا تھا۔ حائمہ نے رکاوٹ کے باوجود امیر سعد ایبک سے ملاقات کی۔

''ترک سردار ان۔ یہاں پہنچ گئے ہیں۔ ارطغرل سردار ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔'' حائمہ نے سرائے کی راہداری سے گزرتے ہوئے نعرہ لگایا جسے ارطغرل نے سن لیا اور وہ جان گیا کہ اس کی والدہ وہاں پہنچ گئی ہیں۔ حائمہ کی سپہ سالار کی طرح تمام سرداروں سے آگے آگے چل رہی تھی اور اس کا دائیاں ہاتھ اپنی تلوار کی نیام پر تھا چہرے پر عزم و بہادری جھلک رہی تھی۔ اس وفد میں اور خواتین بھی تھیں۔ امیر سعد ایبک کے سامنے جا کر اس نے تعظیماً گردن نہیں جھکائی تھی بلکہ سیدھا آنے کا مقصد بیان کیا تھا۔

''جب بھی تم ہمارے قریب آتے ہو مشکلات کے سوا اور کچھ نہیں ملا ہمیں۔'' حائمہ نے اپنی بات شروع کی اس کے ساتھ اس کے وفد میں اس کے بہادر بیٹے بھی ترک سرداروں کے ساتھ شامل تھے جن کے ہاتھوں میں ان کے ہتھیار تھے۔

''ہم جانتے ہیں کہ ابوالمقصود ہی ہمارے سلطان ہیں۔'' حائمہ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بالکل اسی طرح جس طرح ہم جانتے ہیں کہ ارطغرل سردار بے قصور ہے یہاں موجود تمام ترک سرداران اس بات پر یقین رکھتے ہیں امیر سعد۔'' اسلاحان خاتون نے کہا جو وفد کے ساتھ تھی۔

''جی بالکل ہم سب جانتے ہیں بہتر یہی ہوگا کہ آپ ارطغرل کو فوراً رہا کردیں۔'' ایک ترک سردار نے باآواز بلند کہا۔ ''آپ غلط کررہے ہیں۔''

''تمہاری یہ جرأت۔'' امیر سعد نے ایک قدم آگے آکر طیش سے کہا۔ ''سلطنت کے امیر کو اس طرح سے حکم دینے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی آخر؟'' اس نے غصے سے کہا اور پھر اپنے سپاہیوں کی طرف مڑا۔

''سپاہیو... محافظو... ان سب کو باہر نکال دو... اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو بالکل رحم مت کرنا اس پر۔'' امیر سعد نے کہا اور وہاں سے جانے کے لیے مڑا۔ حائمہ

TAGPK.COM

ہاتون نے فوراً ہی اپنی تلوار نیام سے نکال لی تھی اور امیر سعد پر حملے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی اسے بھاگنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھیوں نے بھی تلواریں نکال لی تھیں۔ امیر سعد حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''حائمہ ہاتون! اصلحان؟'' کیا کرنا چاہتے ہو تم لوگ؟''

''ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں امیر سعد الدین۔'' اصلحان نے کہا۔

''لیکن شاید تم نہیں جانتے کہ اگر ہمارے سردار کو رہا نہیں کیا تو یاد رکھنا کہ بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی تمہیں۔'' حائمہ نے جواب دیا۔

''اگر خونریزی ہوئی تو ہم ارطغرل پر اپنی جانیں قربان کردیں گے۔'' ایک ترک سردار نے کہا۔ ''ارطغرل کو فوراً رہا کرو۔''

ترک سردار کی بات ختم ہوتے ہی ایک وجیہہ، بہادر اور نڈر شخص چند لوگوں کے درمیان چلتا ہوا باوقار انداز میں کمرے میں داخل ہوا اس کے سر پر پگڑی تھی جس میں نشان سلطانی لگا تھا۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔

''سلطان محترم.....آج پہلی بار دیکھا ہے ہم نے.....'' کئی آوازیں ابھریں۔ آنے والا غصیلے انداز میں امیر سعد کو گھور رہا تھا اور امیر سعد کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

''سلطان معظم!'' امیر سعد نے حیرت سے کہا تو وہ چلتا ہوا قریب آگیا۔

''ماشاء اللہ آپ صحت یاب ہوگئے؟ شکر ہے خدا کا۔'' امیر سعد نے کہا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''ارطغرل مجھے زہر دے سکتے ہیں سوچا بھی کیسے تم نے؟'' سلطان علاؤالدین نے پوچھا۔ ''وہ میرا سردار اعلیٰ ہے، ان سارے علاقوں کا انتظام سلطنت اس کو سونپا ہے میں نے اور تم نے اس پر الزام لگایا ہے اور اسے زندان میں ڈال دیا؟'' سلطان نے غصہ سے پوچھا۔

امیر سعد ایک خاموش کھڑا تھا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''اسے ابھی اور اسی وقت رہا کرو۔'' سلطان نے کہا۔ امیر سعد تب بھی خاموش کھڑا رہا۔

''تم نے سنا نہیں؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' سلطان نے غصے سے کہا۔ ''انہیں عزت سے میرے پاس لے کر آؤ۔''

''سپاہی ارطغرل کو رہا کرو اور انہیں فوراً لے کر آؤ۔'' امیر سعد نے اپنے سپاہی کو حکم دیا۔ تمام لوگوں نے اپنی تلواریں نیام میں رکھ لی تھیں اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ انہی لوگوں میں ایک سمت ابن العربی بھی کھڑے مسکرا رہے تھے جنہوں نے سلطان کا علاج اور اس کی زندگی کے لیے دعا کی تھی۔

سلطان چلتا ہوا تخت سلطان کے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ امیر سعد اس کے راستے سے ہٹ گیا تھا۔

''سرداران!'' سلطان نے وہاں موجود تمام افراد کو مخاطب کیا۔ ''بہادر ترک خواتین، تشریف رکھیے۔''

وہ خود بھی نشست پر بیٹھ گیا۔ دوسرے افراد نے بھی اپنی اپنی جگہ سنبھال لی کچھ ہی دیر میں ارطغرل بھی وہاں پہنچ گیا۔

''ایک بار پھر ارطغرل کا گرانقدر ہونے کا احساس ہو گیا ہے مجھے جس کے لیے میں آپ سب لوگوں کو مبارک باد دیتا ہوں اور آپ کا شکر گزار بھی ہوں، امیر سعد شاید حادثے کی وجہ سے میری حالت نازک ہوجانے پر حد سے تجاوز کر گئے تھے۔'' سلطان نے کہا تو امیر سعد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ارطغرل بے قصور ہیں میں جانتا ہوں۔'' سلطان نے کہا عین اسی وقت ارطغرل کمرے میں داخل ہوا۔

''سلطان محترم۔'' اس نے جھک کر تعظیم دی۔

''آیئے ارطغرل، تشریف رکھیے۔'' سلطان نے کہا۔ سب خوش ہو کر ارطغرل کو دیکھنے لگے۔ حائمہ کے چہرے پر بھی لازوال مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ ارطغرل اس کی بے شمار محنتوں کا ثمر تھا۔ ارطغرل، سلطان کے قریب خالی جگہ پر بیٹھ گیا تھا۔

''شکر ہے اللہ کا کہ میں آج آپ کو صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں۔'' ارطغرل نے کہا۔

دربار سج گیا تھا۔ صلیبیوں اور صیہونیوں سے محاذ آرائی کی منصوبہ بندی پر مشورے ہونے لگے۔

یہیں بیٹھ کر سب نے صیہونیوں پر اگلے حملوں کی منصوبہ بندی کی یہ سب وہاں موجود امیر سعد ایک بھی سن رہا تھا۔

TAGPK.COM

کچھ ہی عرصے میں ارطغرل نے سلجوقیوں کے ساتھ مل کر بازنطینی قلعے پر قبضہ کرلیا اور بازنطینی قلعے میں پہلی بار اذان کی آواز بلند ہوئی جس کے بعد ارطغرل نے پادریوں کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ اپنی صلیبیں اور دوسرا متبرک سامان گرجا گھروں سے لے جاسکتے ہیں۔ یوں کاراجا ئیسار کا قلعہ فتح ہوگیا تھا اور اس خوشی میں سلطان علاؤالدین نے ایک اعلانیہ خط جاری کروایا تھا جس میں قلعہ کاراجا ئیسار اور اس کے ساتھ سوغوت اور دومانج کا علاقہ ارطغرل کو اپنا وطن بنانے کے لیے دینے کا اعلان کیا تھا۔ یہ تحفہ ارطغرل اور اس کی اولادوں کے لیے تھا۔

جیسے جیسے کائے قبیلے اور ارطغرل کو کامیابیاں ملتی گئیں ویسے ویسے ان کے اتحادیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان اتحادیوں میں کچھ مخلص دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔ جو دشمن دوستوں کا روپ دھار کر ان سے ملے وہ ان کے خلاف سازشوں میں بھی ملوث رہتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب سلطان صلاح الدین ایوبی بھی صلیبی جنگوں میں معروف تھا اور یہود و نصاریٰ سے برسرپیکار تھا۔ اسی عرصے میں ارطغرل کے لشکر پر یہودیوں نے حملہ کیا اور ارطغرل شدید زخمی ہوا جس کو اس حالت میں اس کے دو سپاہی اٹھا کر لے گئے۔ لڑائی کے بعد لاشوں اور زخمیوں میں تلاش کرنے کے باوجود بھی ارطغرل کا کوئی نام و نشان نہیں ملا اور اسے مردہ تصور کرلیا گیا۔ اس موقع پر حائمہ ہاتون اور حلیمہ سلطان کی حالت تکلیف دہ تھی۔ وہ غم سے نڈھال تھیں لیکن اس کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور حائمہ ہاتون اپنی نگرانی میں اپنے جوان بیٹے ارطغرل کی لاش ڈھونڈتی رہی۔ آخرکار ایک جلی ہوئی لاش ملی جس کی انگلی میں ارطغرل کی انگوٹھی دیکھ کر حائمہ ہاتون نے اس کی شناخت ارطغرل کی لاش کی حیثیت سے کی۔ قبیلے میں کہرام مچ گیا۔ کئی دن سوگ منایا جاتا رہا۔ ارطغرل کی تدفین میں عیسائی کماندار ایلس بھی شریک ہوا۔ قبیلے والے بمشکل اپنے جذبات کو قابو کرتے رہے۔ اس موقع پر حائمہ ہاتون نے نہایت سمجھ داری کا ثبوت دیا۔ کوئی بدمزگی نہیں ہونے دی اور کماندار ایلس کو بخیر و عافیت رخصت کیا۔ امیر سعدالدین کی غداری آہستہ آہستہ کھل کر سامنے آرہی تھی لیکن اس نے اب تک اپنے آپ کو کسی مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچایا ہوا تھا۔ وہ ہر ہر بار کائے قبیلے میں رہتے ہوئے بھی اس کے خلاف سازش کرتا اور ہر بار بچ نکلتا تھا۔ حائمہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب اسے رنگے ہاتھوں پکڑ کر اس کے چہرے سے نقاب اتار سکے۔ اسی اثنا میں ارطغرل کی موت کے بعد اس کے چھوٹے بھائی دلدار کو قبیلے کا سردار بنا دیا گیا جو امیر سعد کے ہاتھوں میں کھلونا تھا۔ اس موقع پر حائمہ خاموش رہی کیونکہ یہ وقت کی مصلحت تھی اور حائمہ اس وقت اپنے مخالفین کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلی تھی لیکن اسے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ اصلا خاتون اس کا دایاں ہاتھ تھی جسے ارطغرل نے سپہ سالار بنایا تھا۔

☆☆☆

ارطغرل زخمی حالت میں ایک یہودی تاجر کے ہاتھ لگ گیا تھا جس کے پاس اور بھی غلام تھے جنہیں وہ کمانڈر ایلس کو بیچنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ارطغرل کو بھی انہی غلاموں میں شامل کرلیا لیکن ارطغرل کی طبیعت کسی کی غلامی میں رہنے کی نہ تھی اس نے جلد ہی غلاموں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور تاجر کے ساتھیوں سے لڑائی کی اور آزاد ہوگیا۔ ارطغرل کو اس موقع پر ایک اور وفادار آرسس مل گیا جو اللہ کی راہ میں شہادت حاصل کرنے کا شوقین تھا پھر دونوں نے مل کر کماندار ایلس کے خلاف لڑائیاں شروع کیں اور اب ہائلی بازار اور کاراجا ئیسا کا قلعہ جو ارطغرل حاصل کر چکا تھا وہ اسے دوبارہ حاصل کرنا تھا کیونکہ ایلس نے وہاں قبضہ کر رکھا تھا۔

اپنے زخمی ہونے کے دنوں میں ارطغرل نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک نومولود بچہ سفید کپڑے میں لپٹا ہوا ہے اس پر آسمان سے دودھیا روشنی پڑ رہی ہے اور کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ تمہارا تیسرا بیٹا عثمان ہے جو سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھے گا اور اسلام کی روشنی دور دور تک پھیلائے گا۔ اٹھو اور اپنی جدوجہد کا آغاز کرو اور مایوس مت ہونا۔''

یہی خواب تھا جس نے ارطغرل کے دل میں آزادی کے جذبے کو مزید بھڑکا دیا تھا اور اس نے پھر جہاد کا آغاز کر دیا تھا۔ اب وہ ہائلی بازار کو آزاد کروانا چاہتا تھا جبکہ دلدار اسے بیچنا چاہتا تھا کیونکہ وہ امیر سعد کی سازش کا شکار ہو چکا تھا پھر ایسا موقع آیا کہ کائے قبیلے میں بھائی بھائی کے درمیان مخالفت پیدا ہوگئی۔ کچھ لوگ دلدار کے ساتھ تھے اور کچھ درگت کے ساتھ تھے جو ارطغرل کا انتقام لیے بغیر کہیں جانے کو تیار نہیں تھے۔ یہ ساری صورتِ حال حائمہ خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ امیر سعد نے انہیں وہاں سے جانے کا حکم دے دیا تھا۔

ایک صبح جب وہ اپنے خیمے سے نکلی تو حلیمہ سلطان

ارطغرل کے گھوڑے کے پاس کھڑی تھی جس کا نام ''ارطر کے'' تھا وہ اس سے باتیں کررہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''تم نے دیکھا ارطر کے ہم نے کتنی وسیع وعریض زمین پار کی، دریاؤں اور صحراؤں سے گزرے جان اور مال کی قربانی دی ہم نے لیکن شیطان کے شر سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ ہم نے کتنے ہی غداروں کو، ظالموں کو دھول چٹا دی لیکن اپنے ہی بھائیوں کو قائل نہ کر سکے۔ تمہارا دل ہم انسانوں سے بہت بڑا ہے ارطر کے تم چلے جاؤ یہاں سے، جا کر اپنوں کے ساتھ رہو، پہاڑوں کو اپنا مسکن بناؤ، قبیلے سے دور چلے جاؤ۔''

حلیمہ بولتی جارہی تھی اور سسکیاں لیتی جارہی تھی۔ حائمہ قریب آئی اور گھوڑے کی لگام تھام کر کھڑی ہوگئی پھر وہ پیار سے گھوڑے کی گردن سہلانے لگی۔

''حلیمہ، یہ تمہارے شوہر کی نشانی ہے بیٹا تم اس کی ہر بات کو کیوں برباد کرنا چاہتی ہو حلیمہ؟''

''برباد ہونے والا ارطغرل کا قبیلہ اور مقصد ہے، ارطغرل نے جو درخت لگایا تھا اسے کوئی طوفان نہ ہلا سکا لیکن ان کے اپنے بھائی نے اس کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دیں۔ کیا آپ کو ذرا افسوس نہیں والدہ؟ بالکل بھی خیال نہیں آتا ارطغرل کا؟''

''درد اتنا شدید ہے بیٹی کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔'' حائمہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''کاش کہ میں تمہیں اپنا درد دکھا سکتی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا انتظار کرتی رہتی ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کبھی ہمارے پاس نہیں آئے گا۔ بعض اوقات اپنے دل کی آنکھوں سے زرہ پہنے اوطاق کے سامنے آتا ہوا دیکھتی ہوں میں اور وہ آکر کہتا ہے ''مت جائیں والدہ یہ زمین چھوڑ کر مت جائیں، رک جائیں، مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جائیں۔'' حائمہ رونے لگی۔

''تو آپ مت جائیں والدہ۔ رک جائیے یہاں، ہم ارطغرل سردار کی موت کا انتقام لیں گے، ان کی یہاں قبر ہے ہم انہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' حلیمہ روتے ہوئے بولی۔

''ہماری تقدیر اللہ کے حوالے ہے حلیمہ ہم صبر کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے میری بیٹی۔''

''تو اب ارطر کے یہاں نہیں رک سکتا، اسے جانا ہو گا۔ یہ اپنوں میں رہے گا تاکہ اسے یہاں رہ کر حالات کی بدنصیبی نہ دیکھنا پڑے۔'' حلیمہ بولتے ہوئے گھوڑے کی زین اور لگام اتار لیتی ہے۔ حائمہ بھی دور ہٹ جاتی ہے۔ حلیمہ گھوڑے کو چابک مار کر بھگا دیتی ہے۔ حائمہ چند قدم اس کے پیچھے چلتی ہے اور گھوڑا بھاگتا ہوا قبیلے کی حدود سے نکل جاتا ہے۔ تمام محافظین یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ارطر کے جنگل میں پہنچتا ہے کہ ارطغرل اسے دیکھ لیتا ہے اور اپنے گھوڑے سے اتر کر اس کے قریب آجاتا ہے۔

''ارطر کے..... ارطر کے..... تو تم راہ دیکھ رہے تھے میری واپسی کی؟'' وہ اسے پیار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''جدائی ختم ہوگئی ہے، ہمیں جدا کرنے والے کامیاب نہیں ہو سکے، اب ان ظالموں کو چیر دیں گے۔ گھوڑے کی پیشانی میں برکت ہوتی ہے۔ یہ ہمارے پیغمبرؐ کا فرمان ہے۔ میرے لیے یہ برکتیں میرے قبیلے میں موجود ہیں تو پھر فوراً قبیلے لے جا کر مجھے دنیا کی برکتوں سے ملا دو۔'' اس نے کہا اور پہلے والے گھوڑے سے زین اتار کر ارطر کے کو پہنا دی اور اس پر بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ ارطر کے جیسے خوشی میں ہوا سے باتیں کرنے لگا تھا اور اڑتا ہوا منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس وقت ارطغرل کا دوسرا بیٹا سوچک پیدا ہو چکا تھا۔

حلیمہ سلطان، حائمہ اتا اوطاق میں سرداری کی نشست کے قریب بیٹھی رو رہی تھیں کہ اصلحان وہاں آگئی۔

''حائمہ ہاتون، آپ کا کیا ارادہ ہے کیا ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں نے ترگت سے بات کی تھی اگر آپ یہاں سے جائیں گی تو قبیلے کی خاطر ترگت یہاں رکیں گے۔ آپ چاہیں تو آپ بھی ہمارے ساتھ یہاں رک سکتی ہیں ہم امیر سعد کا حکم نہیں مانیں گے۔'' اصلحان نے کہا۔ اسی وقت ارطغرل اپنے گھوڑے ارطر کے پر بیٹھا قبیلے کی حدود میں داخل ہوا۔ چوبداروں نے اسے دیکھتے ہی زور زور سے نقارہ بجانا شروع کر دیا جسے سن کر حائمہ ہاتون بھی چونک گئیں۔

''اتنا زبردست استقبال، یقیناً کوئی شاندار مہمان ہے۔'' انہوں نے کہا۔ لوگ دوڑ دوڑ کر خیموں سے باہر آنے لگے اور میدان میں جمع ہوگئے۔

''کون ہے.....؟ کون آرہا ہے.....؟'' ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

''یہ کس کا استقبال ہو رہا ہے..... یہ کون آرہا ہے.....؟'' ہر کوئی فکرمند تھا۔

حائمہ ہاتون خیمے سے باہر آگئیں، ان کے دائیں طرف حلیمہ سلطان اور بائیں طرف اصلاحان کھڑی تھیں اور وہ آنے والے کو دیکھ رہی تھیں۔

TAGPK.COM

''یہ تو ہمارے سردار ہیں..... سردار آگئے..... ہمارے سردار آگئے۔'' لوگ چیخنے لگے۔ ارطغرل نے گھوڑا روک دیا۔ گھوڑے نے دونوں پاؤں اٹھا کر سلامی دی۔ ارطغرل قبیلے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''والدہ.....'' حلیمہ نے حیرت و بے یقینی سے کہا۔ لوگ خوشی سے چیخ رہے تھے حائمہ مسکرا رہی تھی۔ ارطغرل فاتحانہ انداز میں گھوڑے کو لے کر قبیلے کی حدود میں داخل ہوا۔ درگت بنتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا ہر شخص خوشیاں منا رہا تھا حائمہ کو تو گویا دوبارہ زندگی مل گئی تھی۔

''والدہ..... والدہ.....'' حلیمہ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا وہ ایک ہی لفظ بولے جا رہی تھی۔

''ارطغرل۔'' آخر کار اس نے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے ارطغرل زندہ ہیں۔''

''شکر الحمدللہ، ارطغرل زندہ ہیں۔'' درگت نے کہا۔ ارطغرل کے چہرے پر فاتحانہ خوشی رقص کر رہی تھی۔

''خوش آمدید سردار..... خوش آمدید سردار.....'' لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

''ارطغرل سردار۔''

اب کائے قبیلے کو دوبارہ زندگی مل گئی اس کے بعد ہاتلی بازار کے بکنے کی سازش ناکام ہوگئی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میرے بعد کائے قبیلے کے معززین نے یہ جگہ چھوڑ کے جانے کا فیصلہ کیوں کیا؟'' ارطغرل نے پوچھا۔

''ہم معافی چاہتے ہیں سردار ہمیں آپ کے انتقال کی خبر نے ناامید کر دیا تھا۔'' ایک شخص نے کہا۔

''اگر میں مر بھی جاؤں تو میرا مقصد قائم رہے گا۔ یہ مقصد رضائے الٰہی ہے۔'' ارطغرل نے کہا اور حائمہ ہاتون نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جو ہزاروں سالوں سے ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ جب ہمارے پیغمبر دنیا سے پردہ فرما گئے تو اس وقت کے صحابہ کے سامنے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کی جو آیات پڑھی تھیں وہ یاد رکھنا۔ ''محمدؐ اللہ کے پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر تشریف لا چکے اب اگر وہ شہید ہو جائیں یا رحلت فرما جائیں تو کیا مقصد سے پیچھے ہٹ جاؤ گے؟ جو اپنے مقصد سے پیچھے ہٹا اس نے خود کو نقصان پہنچایا اللہ ان کے ساتھ ہے جو اس کا شکر ادا کرتے ہیں وہ جنہوں نے پوری دنیا میں نظام الٰہی کو قائم کرنا چاہا اور آپ نے کیا کیا؟ سب جان لیں میرا حکم ہے کہ سردار دلدار اور ان کے حمایتی اس جگہ سے بے دخل کیے جاتے ہیں۔'' ارطغرل نے کہا۔ تمام لوگ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

''ہمیں آپ کے حکم کے آگے کچھ بھی نہیں کہنا سردار ہمیں آپ کا ہر حکم منظور ہے۔'' ایک شخص نے کہا۔

''جو حکم سردار۔'' دلدار نے بھی کہا۔

''جو یہاں سے جانا چاہتے ہیں ان کے لیے راستہ کھلا ہے۔''

اس کے بعد ارطغرل نے سب سے پہلے قلعہ کاراجا ئیسار پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا، اسے ایلس کو شکست دے کر قلعے پر قبضہ کرنا تھا۔ اس منصوبے میں حائمہ ہاتون کا کردار اہم تھا۔ انہوں نے اس موقع پر قبیلے میں رہ کر درگت کا نکاح اصلحان خاتون سے کروایا تھا تاکہ ایلس کو یہی خبر رہے کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی شادی کے جشن میں مصروف ہیں لیکن اس جشن کے پیچھے اس پر حملہ ہونے جا رہا تھا۔ یہ اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے۔ شادی کی تقریب میں حائمہ ہاتون کی موجودگی میں تلواروں کا رقص کیا گیا تھا اور اسی رات درگت اور اس کی منکوحہ بیوی اصلحان کو زہر دے دیا گیا۔ اب پھر حائمہ انا پر بڑی ذمے داری آپڑی تھی۔ اس موقع پر بھی اس نے دانشمندی کا ساتھ نہ چھوڑا اس نے اپنے خیمے میں عورتوں کو بلایا اور انہیں بتایا کہ تمام مرد جہاد پر چلے گئے ہیں اور عورتوں پر بہت سی ذمے داریاں آپڑی ہیں انہیں چاہیے کہ اپنی اپنی دی گئی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے نبھائیں پھر وہ سب کو ان کی ذمے داریاں بتانے لگی۔ اب پھر انہیں کافی عرصے تک قبیلے کو مردوں کی غیر موجودگی میں چلانا تھا لیکن ان کے تجربے، بہادری، دور اندیشی کے لیے یہ کام نہایت آسان ثابت ہوا، وہ اس عرصے میں عورتوں کے فوجی گروہ کی تربیت کرتی انہیں تلوار زنی، نیزہ بازی اور تیر اندازی سکھاتی رہی۔

ایک بار پھر ارطغرل پر سلطان علاؤالدین کو زہر دینے کا الزام لگا اور انہیں کونیا بلوا کر قید کر لیا گیا۔ علاؤالدین کے بیٹا سلطان غیاث الدین نے ارطغرل پر الزام لگایا تھا اور اسی نے قید کیا تھا۔ ارطغرل کی قید کی خبر حائمہ ہاتون پر قہر بن کر گری تھی اور وہ ارطغرل کی بے گناہی ثابت کرنے اور اسے رہائی دلانے حلیمہ سلطان کے ساتھ کونیا پہنچ گئی۔

''میں جب جب بھی اس محل میں داخل ہوتی ہوں میرا دل گھبراتا ہے۔'' حلیمہ کونیا کے محل میں داخل ہوتے

TAGPK.COM

ہوئے حائمہ ہاتون سے بولی، وہ وہاں غیاث الدین کی والدہ ماہ پری سے ملنے آئی تھی تاکہ ارطغرل کی رہائی کی درخواست کر سکے۔

''اور اس بار میں زیادہ پریشان ہوں کیونکہ یہاں ارطغرل کو قید کیا گیا ہے۔'' حلیمہ نے کہا۔

''حلیمہ بیٹا، تم پریشان نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے ضرور آسانی فرمائے گا۔ ہر پریشانی کے بعد آسانی ہے۔'' حائمہ ہاتون نے اسے پیار سے سمجھایا۔ ''اللہ تعالیٰ ضرور ہمارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا تاکہ ہم اس صورتِ حال سے نکل جائیں۔''

ان کی ملاقات ماہ پری سے ہوئی لیکن وہ ان کی درخواست سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔ ''اگر تم لوگ ارطغرل کی وجہ سے آئے ہو اور یہ کہنے آئے ہو کہ وہ بے قصور ہے تو پھر تمہارا آنا بے کار ہے۔ تم لوگ جیسے آئے ہو ویسے ہی چلے جاؤ۔''

''ارطغرل کا کوئی جرم بھی ثابت نہیں ہوا، چنانچہ نہ تو وہ اور نہ ہی ہم اس سلوک کے مستحق ہیں۔'' حلیمہ نے جواب دیا۔

''ارطغرل نے اپنی جان قربان کرنے سے کبھی بھی دریغ نہیں کیا، جب بھی علاؤالدین سلطان کو کوئی مشکل پیش آئی وہ ہمیشہ ان کا ساتھ دیتے تھے، یہ الزام غلط ہے کہ انہوں نے علاؤالدین کو مارا ہے۔'' حائمہ ہاتون نے ماہ پری کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''ارطغرل کو ان کے لالچ اور ہوس نے دھوکا دیا ہے۔'' ماہ پری نے کہا۔ ''آپ لوگ کبھی ان کے غرور اور تکبر کو نہیں دیکھ پائے اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ہی سلطان علاؤالدین کو قتل کیا ہے۔''

''ارطغرل ہوس کی راہ پر نہیں چلتے یہ سب امیر سعدالدین کی سازش ہے۔'' حلیمہ نے جواب دیا۔

''تم اپنی حد سے گزر رہی ہو جاتی ہو تم کس سے بات کر رہی ہو؟'' ماہ پری غصے میں بولی۔ ''یہاں سے فوراً چلی جاؤ ورنہ ارطغرل کے ساتھ تم دونوں کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔''

''ہم یہاں آپ سے منتیں کرنے نہیں آئے بلکہ اپنے بیٹے ارطغرل کی بے گناہی کا اعلان کرنے آئے ہیں۔'' حائمہ ہاتون نے جواب دیا۔ ''مہربانی کر کے ہمیں زندان میں ارطغرل سے ملنے دیجیے۔''

''سلطان معظم کے قاتل سے کسی کو بھی ملنے کی اجازت نہیں ہے یہاں تک کہ اس کی والدہ سے بھی نہیں۔'' ماہ پری نے جواب دیا اور محافظوں کو بلا کر انہیں محل سے نکالنے کا حکم دیا۔ جیسے ہی محافظوں نے خواتین کو ہاتھ لگایا تھا کہ دونوں نے اپنے دفاع میں ان محافظوں کو چشم زدن میں زمین پر ڈھیر کر دیا۔

''خبردار، تمہاری جرأت کیسے ہوئی سرداروں کی خواتین کو ہاتھ لگانے کی؟ ہم خود چلے جائیں گے۔'' حائمہ ہاتون نے غصے سے کہا۔

اس موقع پر حائمہ ہاتون کا بڑا بیٹا سنگتیکن بھی ارطغرل کی گرفتاری کی خبر سن کر اپنے لشکر کے ساتھ وہاں پہنچ چکا تھا اور قلعے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے ساتھیوں کو تلوار اٹھانے سے منع کر دیا تھا تاوقتیکہ وہ خود تلوار اٹھانے کا اعلان نہ کرے۔

شہر میں سنگتیکن کی فوج تھی۔ محل میں حائمہ اور حلیمہ تھیں پھر ابن العربی جیسا دانشور ارطغرل کا حامی تھا۔ ایک عجیب قسم کا دباؤ تھا۔ بالآخر سازشوں کو جھکنا پڑا۔ ارطغرل کو رہا کرنا پڑا۔

رہا ہونے کے بعد ارطغرل نے دوبارہ مہمات کا آغاز کر دیا۔ وقت تیزی سے گزرا اور وہ وقت بھی آ گیا کہ اسے سلطان غیاث الدین اور اس کی والدہ ماہ پری کو اپنے قبیلے میں پناہ دینا پڑی۔ امیر سعدالدین کی سازشیں حد سے گزر چکی تھیں۔ اصلحان اسے قتل کرتے ہوئے خود شہید ہو جاتی ہے۔ اس غم سے بھی حائمہ ہاتون کو اس وقت گزرنا پڑتا ہے جب جنگجو مرد قبیلے میں نہیں ہوتے۔ وہ عورتوں کی مدد سے اصلحان کا جنازہ مرکزی خیمے میں رکھواتی ہے پھر ارطغرل اور درگت کے وہاں پہنچنے پر آخری رسومات ادا کراتی ہے۔ ارطغرل لشکر لے کر پھر جہاد پر روانہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے سلطان غیاث الدین اور ماہ پری کو اپنی ماں حائمہ ہاتون کی حفاظت میں دینے کے لیے کائے قبیلے بھیج دیتا ہے۔

''اب حالات ایسے ہیں کہ ہم جب تک امیر سعدالدین سے اپنی ریاست واپس نہیں لے لیتے تب تک آپ کے خیمے میں رہیں گے۔'' غیاث الدین بولا وہ اس وقت سردار حائمہ کی نشست پر بیٹھا تھا۔

''مہمان والی کون سی بات ہے، ہمارا قبیلہ اور ہمارا خیمہ آپ کا ہی ہے۔'' حائمہ کہتی ہے۔

''آپ انشاء اللہ ہمارے غریب قبیلے میں اپنے محل جیسا ہی آرام پائیں گے۔'' حکیم ارتغل کہتا ہے جو وہاں

TAGPK.COM

موجود ہوتا ہے۔

پھر چند روز بعد امیر سعد الدین کائے قبیلے میں اپنے جاسوس بھیجتا ہے تا کہ وہ غیاث الدین اور اس کی ماں کو مار دیں لیکن حائمہ اور ماہ پری خواتین کے ساتھ مقابلہ کرتی ہیں اس وقت کائے قبیلے کے کچھ بوڑھے سپاہی بھی جو جہاد پر نہیں گئے تھے وہ بھی تلوار زن ہو گئے۔ زبردست مقابلے کے بعد غیاث الدین کو بچا لیا گیا۔ عین اسی دن ارطغرل نے پوری قوت سے محل پر حملہ کر دیا۔ پہلے ہی حملے میں اس نے امیر سعد الدین کو قتل کر دیا اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

''میرے شہید جوانوں، تمہارے ساتھ ساتھ شہید اصلحان خاتون کے قتل کا بدلہ بھی لے لیا گیا ہے۔'' ارطغرل، امیر سعد کی بے سر لاش کے قریب بیٹھ کر کہتا ہے۔

ایک بار پھر اہم شخصیات حائمہ انا کے خیمے میں جمع ہوتی ہیں جہاں سلطان غیاث الدین بھی اپنی والدہ کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور اسے ارطغرل نے سعد الدین کی موت کی خبر بھیجی تھی۔ اس وقت وہ سب حالات پر غور کرنے جمع ہوئے تھے۔

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ سعد الدین اپنے انجام کو پہنچ گیا۔'' ارطغرل کا پیغام تھا۔

''آپ نے بہت سے بے گناہ مسلمانوں کے قتل کا انتقام لے لیا ہے جن میں اصلحان خاتون بھی شامل ہیں۔'' غیاث الدین نے کہا۔ ''آپ کے اور آپ کے بہادروں کے قصے رہتی دنیا تک موجود رہیں گے۔ آپ کو جو کچھ بھی سلطان علاؤالدین نے دیا تھا، آپ کو واپس مل جائے گا۔ آپ دوبارہ ان زمینوں کے سردار اعلیٰ بن جائیں گے اور جو زمینیں آپ کو دی گئی تھیں اب آپ ہی کی ملکیت ہوں گی۔''

سب لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ ارطغرل، سلطان کی اجازت سے اپنی والدہ کے قریب جاتا ہے اور ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے۔

''والدہ! آپ کو سلام ہے۔ آپ نے جیسا کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ میں نے خود کو سلیمان شاہ کا بیٹا ثابت کر دیا اور اپنی ماں کے دودھ کی لاج رکھی۔'' ارطغرل نے کہا تو حائمہ ہاتون نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا پھر سکاتیگن اور درگت بھی حائمہ ہاتون کا ہاتھ چومتے ہیں اور تعظیم پیش کرتے ہیں۔

اس موقع پر حائمہ ہاتون کی شان میں ایک نظم پیش کی جاتی ہے۔

''حائمہ خانم قبیلے کی عظمت کا نشان
سلیمان شاہ کے اوطاق کی رونق انہی سے ہے
قبیلے میں خوشیاں انہی کی دعاؤں کا اثر ہے
کائے قبیلے کی روشنی انہی کے دم سے ہے۔''

اسی دوران ارطغرل کے ہاں تیسرا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عثمان رکھا گیا جسے آگے چل کر سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھنا تھی۔

حائمہ ہاتون ایک عظیم ماں تھی جس نے ایک ایسے قبیلے کو جنم دیا جس کی تلواروں کی جھنکار آج چھ سو سال بعد بھی سنی جا سکتی ہے۔ اس کے بیٹے ارطغرل اور اس کے بھائیوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے جنگیں لڑیں۔ کفار کی صفوں کو چیرا، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کتنی ہی بار ان بیٹوں کی ماں نے اپنے بیٹوں کی شہادت کی خبریں سنیں، بہادری کا مظاہرہ کیا مگر چہرے پر شکن تک نہ لائی۔

حائمہ ہاتون جیسی ماں جب ہمت اور حوصلے کی چٹان بنتی ہے تو ایسی ماؤں کی کوکھ سے ارطغرل غازی جیسے جوان جنم لیتے ہیں جن کی نسل میں عثمان جیسے بہادر پیدا ہوتے ہیں۔ حائمہ ہاتون کائے قبیلے کی سب سے محترم اور مثالی خاتون تھیں۔ وہ بہادر، حوصلہ مند ایک ماہر جنگجو اور پورے قبیلے کی روایات کی ترجمان تھیں۔ وہ سردار کی غیر موجودگی میں کائے قبیلے کی سردار ہوتی ہے اور کائے قبیلے میں خواتین کے ہنروں کی ترجمانی کرتے ہوئے قبیلے کی عزت و آمدنی میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ اس نے قبیلے کی ہر خاتون کو سپاہی بنا دیا تھا۔

حائمہ ہاتون سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان غازی کی دادی، ارطغرل کی ماں اور سلیمان شاہ کی بیوی تھیں۔ حائمہ ہاتون ترک کائے قبیلے کے سردار کی بیٹی تھیں ان کے چار بیٹے اور دو سو قبیلے تھے جنہیں انہوں نے اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد انہیں کرمک کے علاقے میں ایک پہاڑی پر دفنایا گیا ان کی قبر پر 1892 میں سلطان حمید الدین ثانی نے ایک مزار تعمیر کروایا جہاں آج بھی لوگ حائمہ ہاتون کی آخری آرام گاہ پر حاضری دیتے ہیں۔ انہیں ریاست کی ماں "Mother of state" کہا جاتا ہے وہ اپنے بیٹوں سے کہتی تھی۔ ''بیٹے تم جاؤ میدان جنگ تمہارا منتظر ہے۔ مظلوموں کی تم اُمید ہو، ظالم کے لیے تم قہر ہو میں نے اپنے حقوق تمہیں معاف کیے اور تم بھی مجھے معاف کرنا جاؤ اللہ تمہارا مددگار ہوگا۔''

++

TAGPK.COM

عظیم فرار

سید احتشام

جیلوں سے فرار کی تاریخ نئی نہیں ہے۔ قیدی فرار ہوتے رہتے ہیں لیکن کچھ قیدیوں کے فرار کی داستان ناقابل یقین ہے۔ امریکا میں ایک ایسی جیل ہے جہاں سے فرار ناممکن تصور کیا جاتا ہے پھر بھی تین قیدی فرار کی کوشش میں لگے رہے۔ اس فرار پر لاتعداد تحریریں آچکی ہیں لیکن اب تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھ پایا ہے کہ فرار ہونے والے قیدی اب کہاں ہیں؟



فرار کی ایک ناقابل یقین داستان

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے خوبصورت ساحلی شہر سان فرانسسکو کی صاف و شفاف نیلگوں خلیج میں ساحل سے دو کلومیٹر (سوا میل) کے فاصلے پر لمبوتری شکل کا ایک ننھا سا جزیرہ ہے جو الکٹراز (Alcatraz) کہلاتا ہے۔ کل 22 ایکڑ کے رقبے پر محیط یہ جزیرہ 1,675 فٹ طویل، 590 فٹ عریض اور سطح سمندر سے 135 فٹ بلند ہے۔ اس کی زمین سخت پتھریلی اور ناہموار ہے۔ اسی وجہ سے یہ جزیرہ 'داراک' بھی کہلاتا ہے۔ اگرچہ سبزہ بہت کم ہے پھر بھی یہاں سیب اور انجیر کے جھومتے ہوئے اشجار نیز انواع و اقسام کے رنگ برنگ پھول اپنی بہار دکھاتے رہتے

ہیں۔ الکٹراز یا داراک کے بیشتر حصوں پر اجلی اجلی پُرشکوہ کثیرالمنزلہ عمارتوں کے الگ الگ بلاکس واقع ہیں جن میں ایک جہان آباد ہے۔ ان میں سے ایک عمارت سب سے وسیع وعریض ہے اور پورے جزیرے پر حکمرانی کرتی ہوئی لگتی ہے۔ یہ مرکزی عمارت ہے۔ رات کے وقت سان فرانسسکو کے ساحل پر سے گھپ اندھیرے میں ملفوف جزیرے کی چٹانوں سے سر پھوڑتی اور جھاگ اڑاتی ہوئی غضب ناک لہروں کا شور جہاں فضا پر چھائی ہوئی پُراسرار خاموشی کی ہولناکی میں اضافہ کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہاں پورا جزیرہ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے جب کہ اس کا قدیم سرخلک لائٹ ہاؤس ہر سو اپنی طاقتور روشنی بکھیرتا رہتا ہے۔ دن ہو یا رات اس جزیرے کے آن بان اور شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اپنے تاریخی پس منظر کے حوالے سے الکٹراز کا یہ جزیرہ دنیا کی خطرناک ترین جیل ہے۔

سان فرانسسکو کے جزائر پر قدم رکھنے والا پہلا یورپین ایک اسپینش کھوجی اور مہم جو نیول آفیسر مینوئل تھا جو 1775ء میں جزائر کا سروے کرنے آیا تھا۔ اس زمانے میں کیلی فورنیا پر اسپین کی حکومت تھی اور یہ جزیرہ ماہی خور آبی پرندے ''پیلی کین'' کا مسکن تھا۔ یہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں یہاں نظر آتے ہیں۔ جب مینوئل نے یہ خوبصورت منظر دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھا ''لا آئیلا ڈی لوس الکٹراز'' یعنی دی آئی لینڈ آف الکٹراز۔ اسپینی زبان میں پیلی کین کو الکٹراز کہتے ہیں۔ یہ نام اس قدر مقبول ہوا کہ آج بھی یہ اسی نام سے پکارا جاتا ہے لیکن اپنی سخت ناہموار اور پتھریلی زمین کی وجہ سے اسے داراک بھی کہتے ہیں۔ اسپینیوں نے اس جزیرے پر چھوٹی چھوٹی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ بعدازاں اس پر میکسیکو کا قبضہ ہوگیا تھا۔

1846ء میں ریاست ہائے متحدہ اور میکسیکو کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو 1848ء تک جاری رہی۔ اس دو سالہ جنگ میں میکسیکو کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور کیلی فورنیا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ریاست ہائے متحدہ نے کیلی فورنیا کو حاصل کرنے کے بعد اس جزیرے کی قلعہ بندی شروع کردی جس کا مقصد خلیج کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ بنانا تھا۔ اس کا آغاز 1853ء میں ہوا اور تکمیل 1858ء میں ہوئی۔ سال کے آخر تک یہاں دو سو فوجی تعینات کردیے گئے۔

1861ء میں امریکا میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں الکٹراز پر 85 توپیں نصب کردی گئیں جن کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ 1866ء تک یہاں 105 توپیں نصب کی جاچکی تھیں۔ چونکہ یہ جزیرہ بیرونی دنیا سے بالکل کٹا ہوا اور الگ تھلگ واقع تھا اور نہ صرف یہ کہ اس کا موسم بلکہ خلیج کا پانی بھی انتہائی سرد تھا اور لہریں بھی تلاطم خیز تھیں لہٰذا خانہ جنگی سے دو سال قبل 1859ء میں الکٹراز کو ملٹری جیل میں تبدیل کردیا گیا تھا اور مختلف نوعیت کے جرائم میں ملوث فوجیوں اور جنگی قیدیوں کو یہاں بھیجا جانے لگا تھا۔ 1861ء میں ملٹری ایسے شہریوں کو بھی یہاں بھیجنے لگی جو ملک سے غداری کے مرتکب ہوتے تھے۔

1909ء میں پرانی اور متروک عمارتوں کو زمین بوس کرکے مرکزی جیل کو نہایت وسیع وعریض کثیرالمنزلہ عمارت کی تعمیر کا آغاز کردیا گیا جو 1915ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ عظیم الشان عمارت آج بھی پورے جزیرے پر حکمرانی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی جدید طرز کی عمارتیں تعمیر کی گئیں مثلاً جیل کے حکام اور محافظوں کے اہلِ خانہ کے لیے رہائشی گاہیں، واچ ٹاور، اسپتال، لائبریری، وارڈن ہاؤس، سوشل ہال، سرد خانہ، ڈائننگ ہال، ورکشاپ اور تفریح گاہ وغیرہ۔

1933ء میں اسے وفاق کے سپرد کردیا گیا اور 1934ء میں حکومت نے اسے مکمل طور پر وفاقی جیل میں تبدیل کردیا۔ اسے خاص طور سے ایسے خطرناک اور بدنام زمانہ مجرموں کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا جو دیگر وفاقی جیلوں سے بار بار فرار ہوجاتے تھے اور حکومت کے لیے ایک مستقل دردسر بنے رہتے تھے۔ بیرونی دنیا سے بالکل الگ تھلگ خلیج میں واقع ایک ایسی جیل تھی جس کی سیکورٹی انتہائی سخت تھی اور جہاں سے کوئی بھی قیدی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر قدم پر موت کھڑی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ جیل کی عمارت سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ عمارت کی چھت پر پہنچنے کا کوئی بھی طریقہ کارگر نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ اس قدر مشکل، پیچیدہ اور خطرناک عمل تھا کہ اس کے بارے میں سوچ کر دلیر سے دلیر اور شاطر مجرم کے بھی حواس جواب دے جاتے تھے۔ بالفرض محال اگر کوئی شاطر مجرم محافظوں کی نگاہوں سے بچ کر اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو اس کے اگلا قدم کیا ہوتا۔ اگر وہ واچ ٹاور کی گردش کرتی ہوئی طاقتور روشنی میں کسی محافظ کی نگاہوں میں آنے سے بچ بھی جاتا تو گھپ

TAGPK.COM

اندھیرے میں اتنی بلندی سے چٹانوں پر چھلانگ کیسے لگاتا۔ اگر وہ چھلانگ لگا کر زندہ بچ بھی جاتا اور خودرو جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈ میں سے ہوتا ہوا، ساحل تک پہنچ جاتا تو دو کلومیٹر وسیع خلیج کو عبور کر کے ساحل تک کیسے پہنچتا۔ خلیج کا پانی برف کی مانند سرد تھا اور اتنے سرد پانی میں کوئی انسان صرف بیس منٹ تک زندہ رہ سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ پانی کا ریلا اتنا شدید تھا کہ اسے کسی تنکے کی مانند بہا کر لے جاتا اور ڈبو دیتا۔ اس کے زندہ بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

11 اگست 1934ء کو 137 خطرناک قیدیوں کی پہلی کھیپ سخت حفاظتی پہرے میں مختلف جیلوں سے بذریعہ ٹرین یہاں پہنچی اور یہ سلسلہ 1963ء تک اسی طرح چلتا رہا۔ اس جزیرے پر 450 قیدیوں کو رکھنے کی گنجائش تھی۔ ہر قیدی کے لیے ایک کوٹھری مخصوص تھی جو 9 فٹ لمبی، پانچ فٹ چوڑی اور سات فٹ بلند تھی۔ کوٹھریوں میں گدے دار پلنگ اور سنک کی سہولت تھی۔ سنک کے نیچے دیوار میں ایک چوکور خانہ تھا جس میں آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ یہ چوکور خانہ دراصل ہوادان تھا۔ اس ہوادان کی آہنی جالی کے پیچھے پانی کی موٹی موٹی پائپ لائنوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا جو عمارت کے عقبی حصے میں واقع سنسان راہداریوں سے ہوتی ہوئی چھت تک چلی گئی تھی۔

یہاں سزائے موت پانے والے اور لمبی سزا کاٹنے والے خطرناک قاتلوں، ڈکیتوں، منشیات فروشوں اور گینگسٹرز کو رکھا جاتا تھا۔ ان میں خطرناک گینگسٹرز اور مافیا چیف الکپون بھی شامل تھا جس نے پورے امریکا میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ بینجو بجانے کا شوقین تھا۔ چونکہ اس کا برتاؤ اچھا اور دوستانہ تھا لہٰذا اسے بینجو بجانے اور قیدیوں کا دل بہلانے کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن یہ ایک بھیانک غلطی تھی جس کا خمیازہ جیل کے حکام کو آگے چل کر بھگتنا پڑا۔

قیدیوں کو پڑھنے کے لیے عمدہ کتابیں اور رسالے فراہم کیے جاتے۔ اس کام کے لیے کسی قیدی کی ڈیوٹی لگا دی جاتی اور وہ تمام قیدیوں میں کتابیں اور رسالے بانٹتا پھرتا۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات پر مکمل پابندی عائد تھی۔ قیدیوں کے خونی رشتے دار ان سے ملنے آسکتے تھے۔ ہفتے میں ایک بار ان قیدیوں کو مرکزی جیل سے متصل ایک عمارت کے نہایت وسیع و عریض چھت پر بھیج دیا جاتا۔ یہ دراصل ایک تفریح گاہ تھی۔ یہاں وہ آپس میں مل بیٹھتے۔ انہیں گپ شپ کرنے، ہوا کھانے یا ورزش کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ نئے قیدیوں کا پسندیدہ موضوع ''فرار'' تھا۔ وہ پرانے قیدیوں سے تبادلہ خیال کرتے اور منصوبے بناتے۔

ان تمام دشواریوں، رکاوٹوں اور خطرات کے باوجود الکٹراز جیسی خطرناک جیل کی 29 سالہ تاریخ میں مجموعی طور پر 35 قیدیوں نے 14 مختلف موقعوں پر یہاں سے فرار ہونے کی ناکام کوشش کی۔ دو خطرناک قیدیوں نے ایک دفعہ کی ناکامی کے بعد دوسری مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی۔ 23 قیدی فرار ہونے کے دوران زندہ حالت میں پکڑے گئے۔ چھ قیدیوں کو گولی مار دی گئی۔ دو قیدی خلیج میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ پانچ ایسے قیدی ہیں جنہیں لاپتا اور غرقاب فرض کر لیا گیا ہے۔ یہ واقعات کیسے اور کب ہوئے اس کا ذکر بھی ہو جائے۔

پہلا پرتشدد واقعہ 27 اپریل 1936ء کو اس وقت پیش آیا جب ایک قیدی بھٹی میں کوڑا کرکٹ جلانے کی ڈیوٹی انجام دینے کے دوران فرار ہونے کے ارادے سے دیوار پر اور پھر اس پر لگے باڑ پر چڑھ گیا اور وہاں سے ہوتا ہوا، جزیرے کے آخری سرے پر پہنچ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس بلندی سے ساحل پر چھلانگ لگاتا، جیل کے ٹاور کے گارڈ کی نظر میں آ گیا۔ گارڈ نے اسے نیچے اترنے کا حکم دیا لیکن اس نے اس کی وارننگ کو نظر انداز کر دیا چنانچہ گارڈ نے اسے مار گرایا۔ وہ گولی کھا کر 100 فٹ کی بلندی سے نیچے ساحل پر آ گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

مورخہ 16 دسمبر 1937ء کو دو خطرناک قیدی 24 سالہ ٹیڈ اور 31 سالہ رالف نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ اگرچہ حکام فوراً اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ دونوں قیدی فرار ہونے کی کوشش میں خلیج میں ڈوب گئے لیکن نہ تو کبھی ان کی لاشیں دریافت ہوئیں اور نہ ہی اس امر کا سراغ لگایا جا سکا کہ آخر وہ کس انجام سے دوچار ہوئے۔ یہ ایک ایسا سربستہ راز ہے جو آج تک حل نہ ہو سکا تاہم الکٹراز جیسی خطرناک جیل سے فرار ہونے کا یہ پہلا غیری معمولی اور ناقابل یقین واقعہ تھا جس سے الکٹراز کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچا۔ اس پُراسرار واقعہ کی گونج آج بھی سنائی دے رہی ہے۔

یہ دونوں قیدی ٹیڈ اور رالف اوکلاہوما کے بینک ڈکیت تھے۔ رالف بینک ڈکیت ہونے کے ساتھ ہی اغوا کار بھی تھا اور اسی جرم میں الکٹراز بھیجا گیا تھا۔ یہ دونوں

TAGPK.COM

خطرناک مجرم اوکلاہوما کی وفاقی جیل سے فرار ہو چکے تھے۔ آخری مرتبہ پکڑے جانے کے بعد انہیں 1936ء میں الکٹراز بھیج دیا گیا تھا۔ ٹیڈ کو 'ٹلسا' کے ایک بوتل پلانٹ میں ڈکیتی کی واردات کرنے کی پاداش میں سزائے موت ہوئی تھی اور برقی کرسی اس کا مقدر تھی۔ الکٹراز میں انہیں دوسرے قیدیوں کے ساتھ جزیرے کے ایک دور افتادہ شمالی گوشے میں واقع ورکشاپ میں کام پر لگا دیا گیا تھا جہاں.. پرانی اور متروکہ گاڑیوں کے ٹرک کاٹ کر یوایس نیوی کے لیے میٹ بنائے جاتے تھے۔ جزیرے پر قیدیوں سے نائی، قسائی، بڑھئی، دھوبی، باورچی، لائبریرین غرض یہ کہ ہر طرح کا کام لیا جاتا تھا اور انہیں اس کا معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ سارے شعبے الگ الگ واقع تھے۔ بڑھئی کے ورکشاپ میں نیوی کے افسران کے لیے لکڑی کے اعلیٰ فرنیچر، کھڑکیاں اور دروازے بنائے جاتے تھے۔ درزی کے ورکشاپ میں قیدیوں نیز افسروں کے یونیفارم اور برساتی وغیرہ تیار کیے جاتے تھے۔

☆☆☆

دسمبر کا مہینا تھا۔ سردی اپنے شباب پر تھی۔ 16 دسمبر 1937ء کو خلیج گہری دھند کی لپیٹ میں تھی۔ درجہ حرارت منفی 50 ڈگری فارن ہائیٹ تھا۔ حد نگاہ صفر تھی۔ جزیرہ الکٹراز نگاہوں سے بالکل اوجھل تھا۔ ٹیڈ اور رالف ورکشاپ میں کام میں مصروف تھے۔ 12:50 پر معمول کی گنتی ہوئی۔ تمام قیدی حاضر تھے۔ 1:50 پر دوسری گنتی ہوئی۔ دونوں قیدی غائب تھے۔ ورکشاپ کی ایک کھڑکی کی دو آہنی سلاخیں آری سے کاٹی گئی تھیں اور شیشے کو بھاری رنچ کی ضرب سے توڑا گیا تھا۔ وہاں ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ دونوں قیدی اس سوراخ سے گزر کر دوسری طرف کود گئے تھے اور آہنی پھاٹک کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ گہری دھند کے باعث وہ کسی کو نظر نہیں آئے۔ آہنی پھاٹک مقفل تھا۔ انہوں نے ورکشاپ سے چرائی ہوئی رنچ کی شدید ضرب سے مقفل کو توڑ دیا۔ اب راستہ صاف تھا۔ وہ باہر نکل گئے اور ڈھلان پر بھاگتے ہوئے ساحل پر پہنچ کر یخ پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ان کا سراغ یہیں پر ختم ہو گیا۔

جزیرے کا چپہ چپہ چھان لیا گیا، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ساحل پر صرف متروکہ رنچ پڑا ہوا پایا گیا۔ بعد میں ہونے والی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ دونوں قیدیوں نے بہت پہلے سے تیاری شروع کر دی تھی۔ انہوں نے ورکشاپ میں ایک ایسی کھڑکی ڈھونڈ نکالی تھی جو محافظوں کی عقابی نظروں سے محفوظ تھی۔ انہوں نے ورکشاپ سے ایک ننھی سی آری چرائی تھی اور دیگر قیدیوں کی نظروں سے بچ کر رازداری سے روزانہ کی بنیاد پر کھڑکی کی سلاخوں کو کاٹتے رہے تھے۔ یہ ایک طویل اور صبر آزما کام تھا۔ کئی مہینے کی کوشش کے بعد وہ دو آہنی سلاخوں کو کاٹنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس دن ساحل پر پہنچ کر انہوں نے پانی میں تیرنے کے لیے پیٹرول کے خالی کین اور ٹائر استعمال کیے تھے لیکن ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ انہوں نے تیرنے کے لیے کوئی بیڑا بنایا تھا یا پانی میں اترا تھا۔

جیل کے حکام اس نتیجے پر پہنچے کہ ٹیڈ اور رالف فرار ہونے کے کچھ ہی دیر کے بعد خلیج میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ پانی کا بہاؤ اتنا شدید تھا کہ کوئی ماہر پیراک بھی اس کے آگے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ وہ ریلا اسے خلیج سے بہا کر بحرالکاہل میں پہنچا دیتا۔ دوسرے یہ کہ دھند اتنی گہری تھی کہ وہ کسی گزرتے ہوئے جہاز یا کشتی کے عملے کو نظر نہیں آ سکتے تھے جو انہیں بچا سکتے پھر یہ کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دے سکتا تھا کہ وہ ساحل کی طرف بڑھ رہے تھے یا کسی اور سمت تیر رہے تھے۔ قوی امکان یہی تھا کہ ان کی لاشیں ان چیزوں سمیت جن کے سہارے وہ تیر رہے ہوں گے، بہہ کر بحرالکاہل پہنچ گئی ہوں گی۔

اگرچہ ان کے زندہ بچ جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا اور حکام کو یقین تھا کہ وہ برف جیسے سرد پانی میں تیر کر خشکی پر نہیں پہنچ سکتے تھے پھر بھی پولیس اور ایف بی آئی کے حکام آس پاس کی کاؤنٹیز میں گشت کرنے والی ہر خبر اور افواہ کے پیچھے بھاگتے رہے۔ اگلے چند مہینوں اور برسوں میں ان کے دیکھے جانے کی کئی رپورٹس سامنے آئیں لیکن ان کی درستی نامعلوم رہی۔ لفٹ لے کر سفر کرنے والے دو مسافروں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے ان بھگوڑوں کو دیکھا تھا۔ انہوں نے ان کے فوٹو دیکھ کر انہیں شناخت بھی کر لیا۔ ایک مقامی روزنامہ کی رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ دونوں بھگوڑے جنوبی امریکا میں رہ رہے تھے۔ رالف کے آبائی شہر سینی نول، اوکلاہوما کے ایک ٹیکسی ڈرائیور نے پولیس کو بتایا کہ ان بھگوڑوں نے اس پر گولی چلائی تھی۔ خبروں کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک چلتا رہا لیکن یہ کبھی نہ سلجھ سکی کہ آیا وہ بھگوڑے واقعی زندہ بچ گئے تھے یا شہریوں سے لوٹ مار کرنے والے لٹیرے کوئی اور تھے۔

TAGPK.COM

☆☆☆

مورخہ 3 مئی 1938ء کو بڑھئی کے کارخانے کی عمارت 'ماڈل انڈسٹریز' میں جہاں لکڑی کے فرنیچر اور کھڑکی دروازے بنائے جاتے تھے، کام کے دوران تین خطرناک قیدیوں نے ایک غیر مسلح آفیسر کلائن پر ہتھوڑے سے حملہ کردیا۔ آفیسر سر پر پڑنے والے ہتھوڑے کی شدید ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ اب وہ تینوں بھاگتے ہوئے چھت پر پہنچ گئے اور چھت کے محافظ پر متعین آفیسر کو غیر مسلح کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران آفیسر ہیرولڈ نے دو قیدیوں کو گولی ماردی جن میں سے ایک قیدی موقع پر ہی ہلاک جبکہ دوسرا زخمی ہوگیا۔ زندہ بچ جانے والے ان دو قیدیوں کو آفیسر کلائن کو ہلاک کرنے کے جرم میں عمر قید کی سزا ہوگئی۔

مورخہ 13 جنوری 1939ء کو پانچ قیدی، قید تنہائی کے یونٹ میں سزا کاٹنے کے دوران کوٹھری کی سلاخوں کو آری سے کاٹ کر اور ایک کھڑکی کی سلاخوں کو موڑ کر یونٹ سے فرار ہوگئے اور پھر بھاگتے ہوئے پانی کے کنارے پہنچ گئے لیکن بدقسمتی سے جزیرے کے مغربی کنارے پر متعین آفیسروں کی نگاہ میں آگئے۔ آفیسروں سے آمنا سامنا ہونے پر تین قیدیوں نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کردیا جبکہ دو نے انکار کردیا۔ انکار کیے جانے پر ان دونوں کو گولی ماردی گئی جن میں سے ایک قیدی ہلاک اور دوسرا زخمی ہوگیا۔

مورخہ 21 مئی 1941ء کو چار قیدیوں نے کارخانے کے ایریا میں کام کرنے کے دوران الکٹراز کے کئی آفیسروں کو یرغمال بنالیا لیکن افسران انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ وہاں سے فرار نہیں ہوسکتے اور انہوں نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کردیا۔

مورخہ 15 ستمبر 1941ء کو ایک قیدی نے کوڑا کرکٹ اٹھانے کے دوران فرار ہونے کی کوشش کی لیکن خلیج کے یخ پانی میں داخل ہوتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ پکڑا گیا۔ بعدازاں عدالت میں پیش کیے جانے پر اس نے عدالت کے کمرے سے بھی فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

مورخہ 14 اپریل 1943ء کو چار قیدیوں نے کارخانے کے ایریا میں کام کرنے کے دوران دو افسروں کو یرغمال بنالیا۔ پھر یہ چاروں ایک کھڑکی پر چڑھ کر باہر کود گئے اور خلیج کے کنارے پہنچ گئے لیکن ایک یرغمالی آفیسر کو دوسرے افسروں کو الرٹ کرنے کا موقع مل گیا۔ افسران فرار ہونے والے تین قیدیوں پر گولیاں برسانے لگے جو خلیج میں تیرتے ہوئے جزیرے سے دور ہوتے جارہے تھے۔ دو قیدی پکڑے گئے۔ تیر کر فرار ہونے والے ایک قیدی کو گولی لگی اور اس سے پہلے کہ افسران اس تک پہنچتے، وہ پانی میں ڈوب گیا۔ اس کی لاش بھی دریافت نہ ہوسکی۔ تیر کر فرار ہونے والے دوسرے قیدی ہیمپٹن کو شروع میں غرقاب فرض کرلیا گیا تھا لیکن دو دن تک ساحل کے کنارے ایک چھوٹے سے غار میں چھپے رہنے کے بعد وہ کارخانے کے ایریا میں لوٹ آیا۔

مورخہ 7 اگست 1943ء کو جیل کی لانڈری میں سے ایک قیدی بھاگ گیا لیکن اس سے قبل کہ وہ خلیج کے پانی میں اترتا، ساحل پر پکڑا گیا۔

مورخہ 31 جولائی 1945ء کو ایک ہوشیار قیدی نے اپنے فرائض کی نوعیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ قیدی جان گالمس، الکٹراز کی گودی پر فوجی وردیاں لوڈ اور ان لوڈ کرکے دھلنے کے لیے جزیرے پر بھیجنے پر مامور تھا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری کے دوران اس نے ایک مکمل فوجی وردی چرالی اور وہ وردی پہن کر بڑے آرام اور اطمینان سے آرمی لانچ میں سوار ہوگیا جو اس کے خیال میں سان فرانسسکو روانہ ہورہی تھی اور اس کا مطلب تھا آزادی۔ اس خیال میں اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

حکام کو فوراً اس کی غیر موجودگی کا علم ہوگیا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ آرمی لانچ کی منزل سان فرانسسکو نہیں تھی جیسا کہ گالمس کو امید تھی بلکہ اس کی منزل الکٹراز سے دو میل کے فاصلے پر واقع اینجل آئی لینڈ تھی۔ اس نے جیسے ہی اینجل آئی لینڈ پر قدم رکھا، آفیسروں کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے اسے گرفتار کرکے واپس الکٹراز بھیج دیا۔

مورخہ 2 مئی تا 4 مئی 1946ء۔ الکٹراز کی تاریخ کا سب سے پرتشدد اور خونی واقعہ پیش آیا جو الکٹراز کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ قیدیوں اور آفیسروں کے درمیان ہونے والی یہ خونی جھڑپ دو دن تک جاری رہی۔ اس معرکے کا آغاز یوں ہوا کہ چھ خطرناک قیدیوں نے ایک آفیسر پر حملہ کرکے اس سے اس کا اسلحہ چھین لیا۔ اسے بری طرح زدوکوب کیا اور اس کا گلا گھونٹ کر اسے بے ہوش کردیا... پھر اس اسلحے کے زور پر دیگر کئی افسران کو غیر مسلح کرکے چابیاں چھین لیں اور کئی افسران کو ایک کوٹھڑی

میں بند کر کے انہیں یرغمال بنالیا۔

برنارڈ نامی بینک ڈکیت ان کا سرغنہ تھا جسے چھبیس سال کی سزا ہوئی تھی۔ اس نے اور اس کے پانچ ساتھیوں نے گن گیلری میں رکھا ہوا اسلحہ اور بارود چرا لیا تھا جو آہنی جالیوں والی ایک کوٹھری میں رکھا ہوا تھا اور پوری طرح مسلح ہو کر اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ برنارڈ نے جیل سے فرار ہونے کی کارروائی کا آغاز دن کے ڈیڑھ بجے کے بعد کیا تھا۔ دو بج کر سات منٹ پر جیل کا سائرن زور و شور سے چیخنے لگا۔ یہ کسی خطرناک صورتِ حال کی نشاندہی کرتا تھا۔ سان فرانسسکو کے شہریوں نے یہ آواز سنی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ساحل پر جمع ہو کر الکٹراز کا منظر دیکھنے لگے۔ وہاں سے وقفے وقفے سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور دھماکے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کھڑکیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔

جیل کے اندر مسلح قیدیوں نے نو غیر مسلح محافظوں کو یرغمال بنالیا تھا۔ دو جیل کے حکام سے مذاکرات کر کے ان پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے کہ انہیں رہا کر کے ایک کشتی کے ذریعے باحفاظت سان فرانسسکو کے ساحل پر پہنچا دیا جائے لیکن حکام نے ان کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ قیدی لاکھ مسلح سہی لیکن بیرونی پھاٹک کی چابی کے بغیر کسی طرح بھی فرار نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا قیدیوں اور محافظوں کے درمیان گولیوں اور دستی بموں کا تبادلہ ہونے لگا۔ یہ صورتِ حال دو دن تک برقرار رہی۔ اس دوران قیدیوں نے ایک آفیسر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دوسرا آفیسر ہیرولڈ، جیل کی کوٹھریوں پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش میں ہلاک ہو گیا۔ اٹھارہ افسران زخمی ہوئے۔ دو دن تک مسلسل گولیاں چلتی رہیں۔

تیسرے دن 4 مئی کو یو ایس میرین فورس طلب کر لی گئی۔ میرین فورس اندھا دھند گولیاں برساتی اور مارٹر گولے داغتی ہوئی جیل میں داخل ہو گئی۔ اس خونی جھڑپ میں سرغنہ برنارڈ سمیت تین قیدی مارے گئے۔ تین قیدی زندہ گرفتار کر لیے گئے۔ دو محافظ بھی ہلاک ہو گئے۔ زندہ پکڑے جانے والے تین میں سے دو قیدیوں کو موت کی سزا ہو گئی۔ ایک قیدی کو 99 سال کی سزا دی گئی جس نے ایک محافظ کو ہلاک کیا تھا۔ مورخہ 3 دسمبر 1948ء کو موت کی سزا پانے والے دونوں قیدیوں کو گیس چیمبر میں ایک ساتھ ڈال کر ہلاک کر دیا گیا۔

مورخہ 23 جولائی 1956ء کو فلائیڈ ولسن نامی قیدی گودی پر اپنے فرائض انجام دینے کے دوران غائب ہو گیا۔ وہ کئی گھنٹے تک ساحل کے کنارے بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان چھپا رہا۔ بالآخر اس کا پتا چلا لیا گیا اور اس نے اپنے آپ کو حکام کے حوالے کر دیا۔

مورخہ 29 ستمبر 1958ء کو آرون اور کلائیڈ نامی قیدیوں نے کوڑا کرکٹ اکٹھا کرنے کے دوران ایک آفیسر کو قابو میں کر لیا اور تیر کر جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ کلائیڈ کو پانی میں پکڑ لیا گیا لیکن آرون لاپتا ہو گیا۔ اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ دو ہفتے کے بعد اس کی لاش خلیج پر تیرتی ہوئی پائی گئی۔

اب آتے ہیں اس واقعہ کی طرف جس نے کئی ممالک میں ہلچل مچا دی تھی اور اسے عظیم فرار کا نام دیا گیا ہے۔

مورخہ 11 جون 1962ء کو الکٹراز جیسی خطرناک جیل سے تین قیدیوں کے فرار ہونے کا ایک ناقابل یقین اور تاریخی واقعہ پیش آیا جس نے امریکی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس حیرت انگیز واقعہ کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے جو الکٹراز کی اعلیٰ سیکیورٹی پر ایک بدنما داغ بن کر ابھرا اور اس کی ساکھ کو مجروح کرنے کا سبب بن گیا۔ اس عظیم فرار کی منصوبہ بندی میں چار انتہائی شاطر اور خطرناک قیدی فرینک لی مورس، دو سگے بھائی جان اینگلین اور کلیرنس اینگلن اور ایلن ویسٹ نامی قیدی شامل تھے۔

فرینک لی مورس یکم ستمبر 1926ء کو واشنگٹن ڈی سی میں پیدا ہوا تھا اور گیارہ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ زندگی کے ابتدائی ایام یتیم خانے میں گزارے۔ اس نے تیرہ سال کی عمر میں پہلے جرم کا ارتکاب کیا اور اسے سزا ہو گئی۔ بعد میں وہ منشیات رکھنے سے لے کر مسلح ڈکیتی جیسے جرائم میں گرفتار ہوا پھر بھی باز نہ آیا۔ کاروں کی چوری بالخصوص بینک ڈکیتی جیسے جرائم میں کئی بار جیل کی ہوا کھائی لیکن ہر بار جیل سے فرار ہوا۔ وہ بلا کا شاطر واقع ہوا تھا۔ لوزیانا میں بینک ڈکیتی کے جرم میں دس سال کی سزا کاٹنے کے دوران وہ ایک بار پھر جیل سے فرار ہو گیا۔ ایک سال کے بعد نقب زنی کی واردات کرنے پر پکڑا گیا اور 20 جنوری 1961ء کو الکٹراز بھیج دیا گیا۔

اینگلن برادران۔ جان اینگلن اور کلیرنس اینگلن تیرہ بھائی بہن تھے۔ دونوں بھائی کسان اور مزدور تھے۔

TAGPK.COM

انہوں نے 1950ء کے اوائل میں بینکوں میں ڈاکا ڈالنا شروع کیا لیکن کبھی کسی واردات میں اسلحہ استعمال کیا اور نہ ہی کسی کو زخمی کیا۔ 1958ء میں کولمبیا میں ایک بینک لوٹنے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور انہیں پندرہ تا بیس سال کی سزا ہوگئی۔ دونوں نے کئی بار جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی، لہٰذا انہیں بالترتیب 1960ء اور 1961ء میں الکٹراز بھیج دیا گیا۔

ایلن ویسٹ 1929ء میں نیویارک میں پیدا ہوا تھا۔ وہ کاریں چراتا تھا۔ اس نے زندگی میں بیس وارداتیں کیں اور کئی بار جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ اسے 1957ء میں الکٹراز بھیج دیا گیا۔

جب یہ چاروں سزا یافتہ چور اور ڈکیت دسمبر 1961ء میں الکٹراز میں یکجا ہوئے تو جیل سے فرار ہونے کا منصوبہ تشکیل دینے لگے۔ فرینک مورس ان کا چیف ماسٹر مائنڈ تھا۔ یہ چاروں جرائم پیشہ پہلے بھی اٹلانٹا کی جیل میں اکٹھے سزا بھگت چکے تھے، لہٰذا ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے۔

''شاید ہمیں یہاں سے نکلنے کا راستہ مل گیا ہے۔''

ایک دن فرینک مورس نے وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی منتخب میز پر کھانا کھانے کے دوران ماحول سازگار دیکھ کر بات چھیڑی۔

اس کے ساتھیوں نے چونک کر اپنے ہاتھ روک لیے اور اسے متجسس نظروں سے تکنے لگے۔ فرینک نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں دوبارہ گویا ہوا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ سیل بلاک بہت پرانا ہوگیا ہے۔ نمی کی وجہ سے دیواریں بہت کمزور ہوگئی ہیں اور کھارے پانی کی وجہ سے سلاخیں بھی۔ میں ایک نیل کٹر سے ہوادان کی جالی کے آس پاس کی دیواروں کو کھرچ رہا تھا۔ اگر ہم چوکور ہوادان کو تھوڑا بڑا کردیں تو اس کی آہنی جالی کو ہٹا کر اس سوراخ میں سے گزر کر سیدھے یوٹیلٹی کوریڈور یعنی پانی کی پائپ لائنوں کے کوریڈور میں پہنچ جائیں گے جو ہمیں سیدھے چھت تک لے جائے گا۔ ہوسکتا ہے ہم چھت پر ہی پہنچ جائیں۔''

''تو تم بغیر جالی والے اتنے بڑے سوراخ کو کیسے چھپاؤ گے؟'' کلیرنس پوچھ بیٹھا۔

''میگزین میں ایڈ والے صفحے ہیں۔ ہم انہیں پھاڑ کر کارڈ بورڈ بنالیں گے اور ان پر سلاخوں کے ڈیزائن بنا کر اس ہوادان میں رکھ دیں گے اور اسے تولیے یا کسی اور کپڑے سے ہلکا سا ڈھک دیں گے۔ میں نے ایک ایکورڈ بن بجانے کے لیے منگوایا ہے۔ میں وہ ایکورڈ بن اپنے اس ہوادان کے سامنے رکھ دوں گا۔''

''مانو ہم اس سیل سے نکل بھی گئے تو اگلی گنتی میں انہیں پتا چل ہی جائے گا۔'' جان نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہم رات میں نکلیں گے۔ انہیں صبح تک کچھ پتا نہیں چلے گا۔'' فرینک نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''وہ کیسے؟'' کلیرنس نے پوچھا۔

''ہمیں چار ڈمی سر بنانے ہوں گے۔'' فرینک نے کہا۔ ''پلاسٹر یا کارڈ بورڈ سے یا پھر کسی اور چیز سے اور پھر ہم انہیں تکیے پر رکھ دیں گے۔ گارڈز کو پتا نہیں چل سکے گا۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم بستر پر سو رہے ہیں۔''

وہ تینوں بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ فرینک، کلیرنس سے مخاطب ہوا۔ ''تم سیلون پر کام کرتے ہو نا؟ تم ڈمی کے سر کے لیے بال حاصل کرسکتے ہو۔ ہم بالوں کو ڈمی کے سر پر چپکا دیں گے۔ ہمیں ان پر پینٹ اور برش

ایسا پرفیوم جو پسینے کو خوشبو میں بدل دے

موسم گرما میں پسینا ایک وبال جان بن جاتا ہے اور انسان کو ہر وقت فکر لاحق رہتی ہے کہ کہیں اس کے پسینے سے بو نہ آرہی ہو، مارکیٹ میں ایسے بے شمار پرفیومز اور باڈی اسپرے دستیاب ہیں جن کے متعلق بہترین خوشبو کا دعویٰ تو کیا جاتا ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ تر پرفیومز دیر تک کام نہیں کرتے، ہالینڈ میں پسینے کی بو کو ختم کرنے کا ایک منفرد حل نکالا گیا ہے جہاں ایسا پرفیوم متعارف کرانے کی کوشش کی جارہی ہے جو انسانی پسینے کو خوشبو میں بدل دے گا، اس پرفیوم کو بنانے والوں کا کہنا ہے کہ اس انوکھی ایجاد کے بعد انسان کی بہت سے پروڈکٹس سے جان چھوٹ جائے گی اور پسینے کی وجہ سے جو ذہنی کوفت ہوتی ہے اس کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔

مرسلہ: زینب توحید، سیالکوٹ

TAGPK.COM

سے انسانی خدوخال بنانے ہوں گے۔''

''لیکن ہم کھائی تک کیسے پہنچیں گے؟'' جان نے پوچھا۔

''یہاں تم کام آؤ گے، جان۔'' وہ بولا۔ ''تم کپڑوں کی دکان پر کام کرتے ہو۔ وہاں سے کچھ برساتی چرا لینا اور تھوڑی سی سیمنٹ بھی۔ ہم ان سے لائف جیکٹس بنالیں گے اور انجل آئی لینڈ پہنچ جائیں گے۔''

''اور میں کیا کروں گا؟'' ایلن ویسٹ پوچھ بیٹھا۔

''میں کھدائی کروں گا تو تم پہرہ دو گے۔ تم کھدائی کرو گے تو میں پہرہ دوں گا۔'' فرینک نے جواب دیا۔ پھر دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں بھی یہی کرو گے۔ ایک کھدائی کرے گا تو دوسرا پہرہ دے گا۔''

''بھاگنے کے کتنے امکانات ہیں؟'' ایلن ویسٹ نے پوچھا۔

''بہت کم۔'' فرینک نے جواب دیا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' کلیرنس بولا۔

''میں بھی۔'' جان نے کہا۔

''اور میں تو ہوں ہی۔'' ایلن ویسٹ نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

☆☆☆

واپس سیل میں پہنچ کر فرینک مورس نے اپنے پڑوسی ایلن ویسٹ کو نیز سرگوشی میں آواز دی۔ ''چارلی۔''

ایلن ویسٹ تیزی سے اٹھ کر کوٹھڑی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ''میں کھدائی کرتا ہوں۔ تم گارڈ پر نظر رکھنا۔'' فرینک نے سرگوشی کی۔

ایلن ویسٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے کے پاس بیٹھ کر نگرانی کرنے لگا۔ فرینک موری، سنک کے نیچے واقع ہوا دان کی دیوار کو اپنے نیل کٹر سے کھرچنے لگا لیکن یہ بہت مشکل کام تھا۔ اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا، لہٰذا اسے اپنا کام روک دینا پڑا۔ اگلی مرتبہ کھانے کی میز پر وہ چاروں پھر اکٹھے ہوئے۔ ''اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ اس جگہ کا نام 'راک' کیوں رکھا گیا ہے۔'' فرینک مورس اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''اس نیل کٹر سے کام بن نہیں رہا ہے۔'' اس کے ساتھی ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگے۔ ''مجھے ایک بڑے اور نوکیلے اوزار کی ضرورت ہے جس سے ہوادان کے کناروں کو آسانی سے کھرچ کر مطلوبہ نتائج حاصل کر سکوں۔'' اس نے نوالہ لے کر کہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ڈائننگ ہال سے نکلتے وقت اس نے ایک کھانے کا چمچ چرا کر اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا اور اس سے ایک نوکیلا اوزار بنالیا۔ باقی ساتھیوں نے بھی اپنے اپنے طور پر مختلف چیزیں چرا کر اوزار بنا لیے اور چپکے چپکے ہوادان کے سوراخ کو کھرچ کھرچ کر بڑا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک قیدی دیوار کو کھرچتا تو دوسرا قیدی پہرے داروں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا۔ ایسے میں اگر کوئی پہرے دار گشت کرتا ہوا ان کی کوٹھڑی کی طرف آرہا ہوتا تو دوسرا قیدی سیٹی بجا کر یا کسی اوزار سے کوٹھڑی کی سلاخوں کو کھٹ کھٹا کر اسے خبردار کر دیتا۔ اس دوران دیواروں کو کھرچنے کی آواز دبانے کے لیے فرینک مورس اپنا اکورڈین زور و شور سے بجانے لگتا۔ اکورڈین کی تیز آواز دوسرے قیدیوں کو گراں ضرور گزرتی تھی لیکن کبھی کسی نے کوئی شکایت نہیں کی کیونکہ حقیقت سے سبھی واقف تھے۔ ایک دن ایلن ویسٹ کو احاطے میں پڑی ہوئی ایک پرانی دستی آری مل گئی جس سے آہنی سلاخوں کو کاٹا جا سکتا تھا۔ اسی دوران جیل کا ویکیوم کلینر ٹوٹ گیا۔ ایلن ویسٹ نے دعویٰ کیا کہ وہ اس کی مرمت کر کے اسے قابل استعمال بنا سکتا ہے، لہٰذا اسے ویکیوم کلینر کا معائنہ کر کے اس کی مرمت کی اجازت مل گئی۔ معائنہ کرنے کے دوران ایلن ویسٹ نے دیکھا کہ اس میں دو موٹریں لگی ہوئی تھیں اور ویکیوم کلینر ایک موٹر سے بھی چل سکتا تھا چنانچہ اس نے بہت احتیاط سے ایک موٹر نکال لی اور دوسری موٹر کو چالو کر دیا۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا اور اس کا کام بھی بن گیا۔ ان لوگوں نے وہ موٹر ایک ناکارہ ڈرل مشین میں فٹ کر دی اور ڈرل مشین چل پڑی جو ان کے بہت کام آئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے وہ تمام چیزیں حاصل کر لیں جو ان کے فرار میں مددگار ہو سکتی تھیں اور انہیں کسی نہ کسی طرح قابل استعمال بنا کر ہوادان نیز سیل بلاک کی چھت میں واقع بڑے سے روشن دان کی آہنی جالی کو کاٹنے لگے جس میں سے گزر کر وہ چھت پر پہنچ سکتے تھے۔ صابن، ٹشو پیپر، پلاسٹر آف پیرس، کاغذ اور گوند وغیرہ حاصل کر کے ان اشیاء کی مدد سے انسانی چہروں کی ڈمی بھی تیار کر لی گئی۔ سیلون سے چرائے گئے بال ان پر چپکا دیئے گئے اور پینٹ اور برش سے نقش و نگار بھی بنا دیئے گئے۔ وہ ان ڈمی کو تکیے پر رکھ کر بستر پر کمبل پھیلا دیتے اور اپنی اپنی کوٹھری کے ہوادان کے سوراخ میں سے گزر کر جسے وہ پہلے ہی بڑا

کر چکے تھے اور جس کی جالی وہ ہٹا چکے تھے یوٹیلیٹی کوریڈور میں پہنچ جاتے اور پائپ لائنوں کی مدد سے چھت میں واقع بڑے روشن دان کی آہنی سلاخوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ اس دوران اگر کوئی پہرے دار ان کی کوٹھری کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کے بستروں پر سرسری نظر ڈالتا تو ڈمی دیکھ کر انہیں سوتا ہوا سمجھتا اور آگے بڑھ جاتا۔

فرینک کی ہدایت کے مطابق انہوں نے پچاس پرساتیاں چرا کر بالائی منزل کے سنسان کوریڈور میں ایک جگہ ڈھیر کر دی تھیں اور اوزاروں کی مدد سے انہیں تراش خراش کر سیمنٹ اور گوند وغیرہ کے ذریعے جیکٹس اور بیڑا بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ سب کچھ اتنے خفیہ طریقے سے اور مہارت سے سرانجام دیا جا رہا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ انہیں علم تھا کہ یہ انتہائی خطرناک کام تھا اور ان کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

سوائے ایلن ویسٹ کے تینوں قیدیوں نے اپنی اپنی کوٹھری کے ہوادان کا سوراخ بڑا کر کے آہنی جالی نکال کر ایک طرف رکھ دی تھی اور اس کی جگہ کارڈ بورڈ پر آہنی جالی کا ڈیزائن بنا کر جالی کی جگہ رکھ دیا جاتا جسے بوقت ضرورت ہٹایا اور لگایا جا سکتا تھا۔ چار انسانی چہروں کی ڈمی بھی بوقت ضرورت اپنی عدم موجودگی کو چھپانے کے لیے تکیے پر رکھ دی جاتی اور پھر اٹھا کر بالائی کوریڈور میں برساتیوں کے ڈھیر میں چھپا دی جاتی لیکن ایلن ویسٹ کو اپنے کام کی انجام دہی میں بہت دشواری کا سامنا تھا۔ اس کی کوٹھری کی دیواریں بہت مضبوط تھیں لہٰذا وہ اپنے ہوادان کو اتنا بڑا نہیں کر سکا تھا کہ جالی کو ہٹا کر اس میں سے گزر سکتا اور یوٹیلیٹی کوریڈور میں پہنچ سکتا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے لائف جیکٹس اور لکڑی کے پیڈل بنانے کا کام سونپا گیا تھا اور وہ خفیہ طریقے سے اپنے کام میں اتنا مصروف رہتا کہ اسے دیوار کو کھرچنے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا کسی پہرے دار کے آنے کا دھڑکا بھی لگا رہتا تھا... پھر بھی اس کی کوشش جاری تھی۔

فرینک اور اس کے ساتھیوں نے مل کر ایک بیڑا بھی بنا لیا تھا جس کے سہارے انہیں خلیج کو عبور کرنا تھا۔ سب نے اپنا اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دیا تھا اور چھ ماہ بیت گئے تھے۔ اب وہ فرار ہونے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن مسئلہ صرف ایلن ویسٹ کا تھا جو اب تک اپنے ہوادان کو بڑا کر کے جالی نہیں ہٹا سکا تھا۔ ایلن ویسٹ کی ناکامی نے باقی تینوں قیدیوں کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ ان کے پورے منصوبے پر پانی پھرنے والا تھا۔

مورخہ 11 جون 1962ء کو رات کے ساڑھے نو بجے جیل کی تمام روشنیاں گل ہونے کے فوراً بعد منصوبے کا سربراہ اور ماسٹر مائنڈ فرینک مورس، بالائی منزل سے چاروں ڈمی لے کر نیچے آ گیا اور اس نے اعلان کر دیا کہ وہ آج ہی رات فرار ہوں گے۔ قیدی کلیرنس نے ایلن ویسٹ کی مدد کرنے کی کوشش کی اس نے یوٹیلیٹی کوریڈور میں سے لیٹی باہر کی طرف سے ایلن ویسٹ کے ہوادان کی جالی کو لاتیں مار مار کر توڑنے کی کوشش لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اب فرینک اور اینگلن برادران کے پاس ایلن ویسٹ کو چھوڑ کر فرار ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ورنہ وہ سب مارے جاتے۔

وہ تینوں قیدی لائف جیکٹس، لکڑی کے پیڈل اور بیڑا سمیت پانی کی پائپ لائنوں کی مدد سے تیس فٹ کی بلندی پر چڑھ کر چھت پر پہنچ گئے۔ لائٹ ہاؤس کی گردش کرتی ہوئی طاقتور روشنی ہر چند سیکنڈ پر وسیع و عریض چھت کو اجاگر کر دیتی۔ انہیں اس گردش کرتی ہوئی روشنی سے ہر صورت میں بچنا تھا ورنہ وہ قریب ہی واقع واچ ٹاور پر متعین مسلح گارڈ کی نظروں میں آ جاتے۔ وہ فوراً فرش پر لیٹ گئے اور جونہی انہیں موقع ملا انہوں نے سامان سمیت اٹھ کر بھاگتے ہوئے چھت کو عبور کر لیا اور پھر بہت احتیاط سے ایک دیوار کے بیرونی حصے پر نصب پچاس فٹ کی پائپ لائن کے ذریعے زمین پر اتر گئے۔ یہ شاور کی پائپ لائن تھی۔ اب وہ جیل کی عمارت کے باہر تھے اور آزاد تھے۔ وہ رات کی گہری تاریکی میں گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے بھاگتے ہوئے خلیج کے کنارے پہنچ گئے اور سامان سمیت یخ پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد وہ کسی کو بھی نظر نہیں آئے۔

آخری لمحات میں ایلن ویسٹ اپنے ہوادان کی جالی توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اس میں سے گزر کر چھت پر پہنچ گیا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کے تینوں ساتھی جا چکے تھے اور وسیع و عریض چھت اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس پر مایوسی کا شدید غلبہ ہوا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا خالی نظروں سے تاریکی کو گھورتا رہا اور پھر لوٹ کر اپنی کوٹھری میں آ گیا۔

اگلی صبح پہرے دار سارے قیدیوں کو جگاتے پھر رہے تھے۔ قیدیوں کی گنتی ہونے والی تھی۔ گنتی ہوئی تین قیدی غائب تھے۔ کئی محافظ آندھی اور طوفان کی مانند ان کی

کوٹھریوں میں داخل ہو گئے۔ وہ تینوں اپنے اپنے بستر پر خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ محافظ کو خوابیدہ قیدی پر شبہ ہوا۔ اس نے بڑھ کر اسے جگانا چاہا تو پورا سر ہی اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے منہ سے حیرت میں ڈوبی ہوئی ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ دوسرا سر اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گرا اور اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔

الکٹراز کا جزیرہ پُرشور سائرن سے گونجنے لگا۔ ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ محافظ دستوں نے پورے جزیرے کو گھیر لیا تھا اور چپے چپے کو دیکھ رہے تھے لیکن کہیں بھی ان قیدیوں کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ مسلح دستے موٹر بوٹس میں سوار خلیج کو چھان رہے تھے لیکن ان قیدیوں کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان بھگوڑوں کو خلیج نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ بیشتر حکام کو یقین تھا کہ وہ خلیج میں ڈوب گئے ہوں گے لیکن کہیں کوئی لاش بھی تیرتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دسمبر کی ایک سرد ترین رات تھی۔ خلیج کا پانی برف کی مانند سرد تھا۔ ایسے میں کسی کے لیے بھی خلیج کو تیر کر خشکی پر پہنچنا ممکن نہ تھا۔ حکام کی سرتوڑ کوشش کے باوجود ساحل پر ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ سارے قیدی حیران تھے کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔

جیل کے باہر پورے جزیرے میں کارروائیاں جاری تھیں اور جیل کے اندر حکام ان کی کوٹھریوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ سب کچھ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ تمام اوزار، ٹوٹا ہوا ہوادان، ٹوٹی ہوئی جالی اور بستروں پر موجود چہروں کے ڈمی۔ ایلن ویسٹ کی کوٹھری کا بھی یہی حال تھا چنانچہ انہوں نے فوراً اسے دبوچ لیا۔ ایلن ویسٹ ان کے شکنجے میں پھڑپھڑانے لگا۔ وہ بہت بری طرح پھنس گیا تھا۔ اب منہ کھولنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اس خیال سے سارا راز اگلنے پر آمادہ ہو گیا کہ حکام اس تعاون کے نتیجے میں اس کی سزا میں تخفیف کر دیں گے لہٰذا وہ شروع سے آخر تک سارا راز اگلتا چلا گیا۔

اس کے بیان کے مطابق، ان کی منزل سان فرانسسکو نہیں بلکہ اینجل آئی لینڈ تھی جو وہاں سے دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہاں سے انہیں سان فرانسسکو کا رخ کرنا تھا جہاں سے وہ کسی گارمنٹ کی دکان سے پہننے کے لیے کپڑے اور کار چراتے اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنی اپنی راہ لیتے۔ منصوبے سے متعلق ایلن ویسٹ کی تمام باتیں بالکل درست تھیں کہ فرینک مورس نے کیسے منصوبہ بنایا اور انہوں نے کیسے اس پر عمل کیا۔ سب کچھ یقیناً ویسے ہی پیش آیا ہو گا جیسا وہ بیان کر رہا تھا لیکن حکام کو اس کے بیان کے آخری حصے پر یقین کرنے میں تامل تھا کیونکہ مفرور قیدیوں کی تلاش کو اب بارہ دن ہو گئے تھے اور اس دوران آس پاس کے پورے علاقے سے کپڑے یا کار چرانے کی کوئی واردات رپورٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایلن ویسٹ غلط بیانی کر رہا تھا۔ وہ تینوں اینجل آئی لینڈ نہیں گئے ہوں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ کہیں اور کا رخ کیا ہو کیونکہ خشکی پر بھی ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ حکام کو یقین تھا کہ وہ خلیج میں ڈوب گئے تھے۔ خلیج کے یخ پانی میں کوئی بھی شخص بیس منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ لامحالہ ہائپوتھرمیا یعنی جسمانی حرارت میں غیر معمولی کمی کا شکار ہو کر مر جاتا۔

ملٹری اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مشترکہ طور پر بارہ دن تک وسیع پیمانے پر زمینی، فضائی اور آبی کارروائیوں کے باوجود کوئی لاش بازیافت نہ ہو سکی تاہم مورخہ 14 جون 1962ء کو اینجل آئی لینڈ سے کوئی دو سو گز دور اس کے جنوبی ساحل پر لکڑی کا ایک پیڈل آبی سطح پر تیرتا ہوا ملا۔ اسی دن ان ہی اطراف میں پلاسٹک میں ملفوف ایک پرس بھی تیرتا ہوا نظر آیا جس میں اینگلن برادران کے رشتے داروں اور دوستوں کے نام، پتے اور تصویریں تھیں۔ مورخہ 21 جون کو سان فرانسسکو کے گولڈ گیٹ برج سے کچھ ہی فاصلے پر واقع ایک ساحل پر ایک رین کوٹ کی باقیات پائی گئیں جن کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ یہ 'بیڑا' تھا جو کئی رین کوٹ کو آپس میں جوڑ کر بنایا گیا تھا اور خاصہ بڑا اور بہت وزنی تھا۔ اس کے اگلے دن الکٹراز جزیرے سے پچاس گز کے فاصلے پر رین کوٹ ہی کے میٹریل سے بنا ہوا ایک لائف جیکٹ پانی میں تیرتا ہوا ملا جسے ہوا بھر کر استعمال کیا گیا تھا لیکن اب اس میں سے ہوا نکلی ہوئی تھی۔ ان متعلقہ چیزوں کے ماسوا، ان مفرور قیدیوں کی کوئی بھی جسمانی شہادت کہیں نہیں پائی گئی جب کہ بعض ذرائع کے مطابق مفرور قیدیوں سے تعلق رکھنے والی یہ چیزیں اینجل آئی لینڈ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ مزید یہ کہ ان مفرور قیدیوں کے قدموں کے نشان اینجل آئی لینڈ کے ساحل پر پائے گئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے بیڑے سے اتر کر خشکی پر پہنچ گئے تھے لیکن حکام جان بوجھ کر اس سراغ پر پردہ ڈال رہے تھے کیونکہ اس سے الکٹراز کی

TAGPK.COM

ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

دوسری طرف ماہرین نے جب کمپیوٹر کی مدد سے اس رات خلیج میں پانی کے بہاؤ کا جائزہ لیا تو ان پر یہ واضح ہوا کہ وقوعہ کی رات پانی کے تیز بہاؤ کا رخ ادھر ہی تھا جدھر وہ تینوں گامزن ہوئے تھے یعنی انجل آئی لینڈ، لہٰذا بہاؤ نے ان کے لیے مشکلات کھڑی کرنے کے بجائے ان کی مدد کی ہوگی اور وہ اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے ہوں گے۔ تفتیش کے دوران سان فرانسسکو کے ایک پولیس آفیسر نے بتایا کہ 12 جون کی صبح ایک مشکوک بوٹ الکٹراز کے قریب نظر آئی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں رکی اور پھر گولڈن گیٹ برج کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس سے اس شبے کو تقویت ملتی تھی کہ قیدیوں نے فرار ہونے کے لیے بیرونی مدد حاصل کی تھی لیکن ایف بی آئی کے تحقیق کرنے پر اس بات میں کوئی صداقت نہیں نظر آئی اور اس بیان کو مسترد کردیا گیا۔ ذرائع کے مطابق ان قیدیوں کا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ان کے فرار ہونے کا کوئی دن مقرر نہیں تھا۔ کوئی بوٹ ہر رات وہاں کے چکر نہیں لگا سکتی تھی۔ اس میں ہزاروں ڈالر لگتے جس کے وہ متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔

ایف بی آئی کی رپورٹ کے مطابق فرار کے ایک ماہ بعد مورخہ 17 جولائی 1962ء کو ایک نارو تجین کار گوشپ کو گولڈن گیٹ برج سے سترہ میل دور پانی میں ایک لاش تیرتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے جسم پر شاید قیدیوں والا لباس تھا یعنی نیلی قمیص اور سرمئی پینٹ لیکن لاش اوندھی تیر رہی تھی، لہٰذا یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شپ کے عملے نے لاش کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مزید یہ کہ انہوں نے اکتوبر میں اس واقعہ کی رپورٹ کی جب چار ماہ گزر چکے تھے اور لاش کا کوئی پتا نہیں تھا۔ سان فرانسسکو کاؤنٹی کے کورونر نے شبے کا اظہار کرتے ہوئے، پرزور الفاظ میں کہا کہ وہ کسی مفرور قیدی کی لاش نہیں ہوسکتی کیونکہ کوئی لاش ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک سمندر کی سطح پر نظر نہیں آسکتی۔ وہ یقیناً اس چونتیس سالہ بے روزگار شخص کی لاش ہوگی جس نے پانچ دن پہلے کئی لوگوں کی موجودگی میں گولڈن گیٹ برج پر اپنی کار روک کر سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی تھی۔

تفتیش کا عمل جاری تھا کہ اسی دوران مورخہ 16 دسمبر 1962ء کو یعنی چھ ماہ کے بعد ہی اسکاٹ نامی ایک اور قیدی الکٹراز سے فرار ہوگیا اور خلیج میں تین میل تک تیر کر گولڈن گیٹ برج کے جنوبی کنارے فورٹ پوائنٹ پہنچ گیا۔ وہاں وہ کم سن لڑکے اور لڑکیوں کو ساحل پر بے ہوش پڑا ہوا ملا جو وہاں کھیل رہے تھے۔ اسے فی الفور اسپتال پہنچایا گیا جہاں اس کی جان بچائی گئی اور صحت یابی کے فوراً بعد اسے واپس الکٹراز بھیج دیا گیا۔ یہ واحد واقعہ تھا کہ کوئی قیدی خلیج کو تیر کر دوسرے ساحل پر پہنچ گیا تھا اور اس بات کا ثبوت تھا کہ خلیج کو عبور کرکے زندہ رہنا ممکن تھا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ وہ قیدی ہائپوتھرمیا یعنی جسمانی حرارت میں غیر معمولی کمی کا شکار ہوگیا تھا اور اگر اسے فوری طبی امداد نہ ملتی تو وہ یقیناً مرجاتا۔ تاہم اس واقع سے حکام کے اس مؤقف کو خاصی ٹھیس پہنچی کہ وہ تینوں قیدی ڈوب کر ہلاک ہوگئے تھے۔

یہ واقعہ پیش آنے کے تین ہی ماہ کے بعد مورخہ 21 مارچ 1963ء کو الکٹراز جیل کو ہمیشہ کے لیے بند کردیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ نمکین پانی اور سیلن کی وجہ سے عمارت اور پانی کی پائپ لائنوں کو شدید نقصان پہنچ رہا تھا۔ مزید یہ کہ اس کے اخراجات دوسری جیلوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھے۔ اٹلانٹا جیل میں فی قیدی یومیہ تین ڈالر جب کہ الکٹراز میں فی قیدی یومیہ دس ڈالر خرچ ہوتے تھے۔

مذکورہ تین قیدیوں کے فرار ہونے کے تقریباً سترہ سال کے بعد مورخہ 31 دسمبر 1979ء کو ایف بی آئی نے اس مفروضے کی بنیاد پر تفتیش کی فائل بند کردی کہ اگرچہ ان قیدیوں کی لاشیں بازیافت نہیں ہوئیں لیکن خشکی پر بھی ان کے پہنچنے کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی، لہٰذا قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ تینوں قیدی خلیج میں ڈوب گئے تھے۔ اس کہانی کا اختتام یہیں ہوجاتا لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے ایک دلچسپ اور سنسنی خیز موڑ لے لیا۔

☆☆☆

ایف بی آئی نے اپنے طور پر کیس کی فائل بند کردی تھی لیکن اس کی تفتیش یو ایس مارشلس سروس کے سپرد کردی تھی جن کے محکمے میں یہ فائل اب تک کھلی ہوئی تھی۔ اس کے ڈپٹی مارشل مائیکل ڈائک نے 2009ء میں میڈیا کو بتایا کہ ان مجرموں کا وارنٹ اب بھی فعال ہے۔ وہ مجرموں کی تلاش ترک نہیں کرتے جب تک وہ ننانوے یا سو سال کے نہیں ہوجاتے، لہٰذا یہ کیس 2026ء اور 2030ء تک چلتا رہے گا لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ گزشتہ تیس برسوں میں ان کی جانب سے اس کیس میں کتنی پیش رفت ہوئی تھی اور انہوں نے کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

TAGPK.COM

اس طویل عرصے کے دوران جو لوگ بھگ آدھی صدی پر محیط ہے، ایسے بہت سے ثبوت وشواہد سامنے آئے کہ اگر وہ چاہتے تو اس کیس میں پیش رفت ہو سکتی تھی اور وہ مجرموں تک پہنچ سکتے تھے لیکن مذکورہ دونوں محکمے جان بوجھ کر سارے مواقع ضائع کرتے رہے اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ وہ مختلف حیلے بہانے سے کیس کو طول دیتے رہے اور مجرموں کو گرفتار کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے بجائے تمام ثبوت وشواہد کو رد کرتے ہوئے، اپنی بے حسی، بے پروائی اور نااہلی کا ثبوت دیتے رہے۔

ان تین قیدیوں کے فرار ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد بہت سے لوگوں نے انہیں دیکھے جانے یا نظر آنے کی اطلاع دی نیز ان کا ٹھکانا بھی بتایا لیکن ان کی فراہم کردہ اطلاعات کو مذاق یا فراڈ سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی جان چھڑالی گئی اور کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

جنوری 1965ء میں یعنی فرار کے صرف ڈھائی سال بعد ایف بی آئی کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ کلیرنس اینگلن برازیل میں رہ رہا تھا۔ ایف بی آئی نے اسے افواہ سے تعبیر کیا لیکن ساتھ ہی اس افواہ کو اتنی اہمیت دی کہ اپنے ایجنٹوں کو اسے تلاش کرنے کے لیے فوراً جنوبی امریکا روانہ کر دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں کہ آیا اس کا سراغ لگ سکا یا نہیں۔

1967ء میں ایک مخبر نے بیورو کو فون کر کے یہ اطلاع فراہم کی کہ وہ اسکول میں فرینک مورس کے ساتھ پڑھتا تھا اور اسے تیس سال سے جانتا ہے اس کا دعویٰ تھا کہ ایک دن میری لینڈ میں فرینک مورس سے سرراہ اس کی ملاقات ہوگئی تھی۔ اس نے تھوڑی سی داڑھی بڑھالی تھی اور مونچھیں بھی رکھ لی تھیں لیکن اس مخبر نے مزید تفصیل بتانے سے انکار کر دیا۔

اینگلن برادران کی فیملی کو گاہے گاہے غیر دستخط شدہ پوسٹ کارڈ اور پیغام موصول ہوتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا جس پر 'جیری' لکھا ہوا تھا۔ پھر دوسرا پوسٹ کارڈ موصول ہوا جس پر 'جیری اور جوئے' کے دستخط تھے۔ اس فیملی نے ایک کرسمس کارڈ بھی پیش کیا جو 1962ء میں ان کے میل بکس میں قصداً ڈالا گیا تھا۔ اس پر تحریر تھا ''جان کی طرف سے ماں کو کرسمس مبارک۔'' اینگلن برادران کی ماں کو 1973ء میں اس کی موت واقع ہونے تک ہر سال 'یوم مادر' کے موقع پر پھول موصول ہوتے رہے جن پر ارسال کرنے والے کا نام درج نہیں ہوتا تھا۔ 1973ء میں ماں کی وفات پر دو طویل قامت عورتیں قبرستان میں نمودار ہوئیں۔ وہ بھاری میک اپ میں تھیں۔ انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک قبر کے پاس کھڑی روتی رہیں اور پھر کسی سے ملے بغیر وہاں سے چلی گئیں۔ وفاقی افسروں کا کہنا ہے کہ 1960ء کے اواخر اور 1970ء کی دہائی میں چھ یا سات لوگوں نے یہ اطلاع فراہم کی تھی کہ اینگلن برادران شمالی فلوریڈا یا جارجیا میں نظر آئے تھے۔ اینگلن برادران کے ایک بھائی رابرٹ کا بیان ہے کہ 1989ء میں ان کے باپ کے جنازے پر دو اجنبی نمودار ہوئے۔ ان کے چہرے پر داڑھی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق وہ دونوں تابوت کے سامنے خاموشی سے کھڑے میت کو دیکھ کر روتے رہے اور پھر وہاں سے چلے گئے۔

1989ء میں کیتھی نامی ایک عورت نے میڈیا کو اطلاع دی کہ وہ کلیرنس کو اس کی ایک تصویر سے پہچان گئی ہے۔ وہ شخص فلوریڈا کے قریب ''میریانا'' کے ایک فارم پر رہتا ہے۔ ایک اور عورت نے بھی دونوں بھائیوں کو پہچان لیا تھا۔ اس کا بھی کہنا تھا کہ وہ کلیرنس کو اس کی تصویر سے پہچان گئی تھی۔ وہ میریانا کے نزدیک رہتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کا رنگ، قد اور دیگر علامتیں ٹھیک ٹھیک بیان کر رہی تھی۔ ایک اور عورت نے فریک مورس کو اس کے خاکے سے پہچان لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خاکہ اس شخص سے بہت ملتا جلتا تھا جو اسے اس کے علاقے میں نظر آیا تھا۔

2000ء کے اوائل میں یو ایس مارشلس کو یہ اطلاع ملی کہ اینگلن برادران برازیل میں رہ رہے تھے۔ ڈپٹی مارشل ڈاگ بذات خود برازیل کا سفر اختیار کر کے وہاں پہنچ گیا۔ ایک مقامی بارٹینڈر نے اس بات کی تصدیق کی کہ ایک بھائی وہاں رہتا تھا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا کوئی نہیں جانتا۔

2015ء میں ہسٹری چینل نے اس کیس کے بارے میں ایک ڈاکومینٹری چلائی اور ایک ثبوت پیش کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں بھائی زندہ تھے۔ وہ ثبوت ایک کرسمس کارڈ تھا جس پر تہنیتی پیغام کے ذیل میں واضح طور پر جان اور کلیرنس کے دستخط تھے لیکن تاریخ اور ڈاک کی مہر نہیں تھی۔ اس لیے اس امر کا یقین نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کب اور کہاں سے ارسال کیا گیا تھا۔ تاہم ماہرین متفق تھے کہ وہ تحریر اینگلن برادران کی تحریروں سے مشابہ تھی۔

TAGPK.COM

1965ء میں سان فرانسسکو کے ایک مقامی روزنامے نے اینگلن برادران کی ایک رنگین تصویر شائع کی جس میں آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگائے ایک تودے کے پاس کھڑے تھے۔ یہ کسی فارم کی تصویر تھی۔ تصویر میں کلیرنس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ تصویر 1965ء میں کھینچی گئی تھی اور برازیل کی تھی۔ اس تصویر نے پریس اور محکمہ پولیس میں کھلبلی مچادی۔ ایف بی آئی نے اس کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا کہ داڑھی اور چشمے کی وجہ سے ان کی شناخت نہیں ہوسکتی تاہم بیشتر ماہرین اس بات پر متفق تھے کہ یہ دونوں اینگلن برادران ہی تھے۔ انہوں نے اس امر پر حیرانی کا بھی اظہار کیا کہ وہ اتنا طویل سفر طے کرکے برازیل پہنچ گئے اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی اور اب وہ دونوں سکون سے وہاں رہ رہے تھے اور محفوظ تھے۔

اینگلن برادران کے ایک بھائی رابرٹ نے بستر مرگ پر اس بات کا اقرار کیا کہ وہ 1963ء سے لے کر 1987ء تک اپنے دونوں بھائیوں سے رابطے میں تھا لیکن اس کے بعد ان دونوں سے اس کا رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ فیملی کے دیگر ممبران نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کو تلاش نہیں کریں گے کیونکہ انٹرپول والے اس کیس کی تفتیش کررہے تھے۔ اگر انہیں معلوم ہوجاتا تو وہ اس بات کا سراغ لگا لیتے اور انہیں گرفتار کرلیتے۔ اس کی سزا بھی بہت سخت تھی۔ پھر وہ ایسا کیوں چاہتے؟

2015ء ہی میں ہسٹری چینل نے ایک بار پھر ان بھائیوں کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر پیش کرکے زبردست کھلبلی مچادی۔ یہ تصویر بھی 1965ء میں برازیل ہی میں کھینچی گئی تھی۔ تصویر میں دونوں بھائی فٹ پاتھ پر چلے جارہے تھے۔ تصویر سامنے سے کھینچی گئی تھی۔ دونوں کے قدم اٹھے ہوئے تھے اور وہ کیمرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تصویر بالکل واضح تھی اور اس میں کسی شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس مرتبہ بھی ماہرین کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ بلاشبہ کلیرنس اور جان ہی تھے۔ تاہم ایف بی آئی نے اس کی کوئی چھان بین نہیں کی اور چپ سادھ لی۔

جنوری 2018ء میں لوگ اس وقت حیران رہ گئے جب ایف بی آئی نے یہ تہلکہ خیز انکشاف کیا کہ وہ چھپن سالہ پرانا کیس دوبارہ کھول رہے ہیں۔ اس اعلان سے پریس میں ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی اور اخبارات کی سرخیاں چیخنے لگیں۔ ایف بی آئی کے مطابق مشہور زمانہ عظیم فرار سے متعلق نئے شواہد سامنے آگئے تھے۔ اس ثبوت نے حکام کو چکرا دیا تھا۔ یہ ایک خط تھا جو 2013ء میں سان فرانسسکو کے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو موصول ہوا تھا۔ اس پر ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہوگیا کہ وہ خط پانچ سال تک منظر عام پر کیوں نہیں لایا گیا تھا۔ ایف بی آئی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ خط لکھنے والا جان اینگلن تھا۔

اس نے اپنے خط میں لکھا تھا..... ''میرا نام جان اینگلن ہے۔ میں جون 1962ء میں اپنے بھائی کلیرنس اور فرینک مورس کے ساتھ الکٹراز سے فرار ہوا تھا۔ اب میں تراسی سال کا ہوگیا ہوں اور میری حالت بہت بری ہے۔ مجھے کینسر لاحق ہوگیا ہے۔ ہم لوگ اس رات بڑی مشکل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے!''

خط کی تحریر شکستہ تھی کیونکہ جان اینگلن کوئی پڑھا لکھا شخص نہیں تھا۔ بعض جگہ الفاظ کو سمجھنے میں دشواری پیش آرہی تھی لیکن ماہرین پورا خط پڑھنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس نے آگے لکھا تھا۔ ''فرینک مورس اکتوبر 2008ء میں فوت ہوگیا تھا۔ اس کی قبر ارجنٹینا میں ہے لیکن فرضی نام سے۔ میرا بھائی کلیرنس 2011ء میں فوت ہوگیا تھا۔''

لیکن اب وہ کہاں تھا اور اسے خط لکھنے کی کیا سوجھی تھی؟ اس خط سے سب کچھ آشکار ہوگیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''یہ حقیقت ہے اور یہی سچائی ہے۔ میں آپ لوگوں کو یہ بتا سکتا ہوں کہ میں سات سال تک نارتھ ڈیکوٹا کے مقام مائنوٹ میں اور 2003ء تک نارتھ ڈیکوٹا کے مقام فارگو میں ایک سال رہا۔ فرار کے بعد میں زیادہ تر سیاٹل میں رہا۔''

آگے اس نے ایک حیرت انگیز اور ناقابل یقین انکشاف کیا ''اب میں جنوبی کیلی فورنیا میں رہتا ہوں۔''

یہ یقین کرنا بہت مشکل تھا کہ جو قیدی چھپن سال پہلے الکٹراز جیسی جیل سے فرار کے منصوبے میں شریک تھا اور قانون سے بھاگا ہوا تھا، سان فرانسسکو سے صرف چند گھنٹے کی دوری پر موجود تھا۔ وہ انتہائی بیمار تھا اور بے بسی کے عالم میں مدد کا طالب تھا۔ اس نے حکام کو مخاطب کرکے لکھا تھا۔ ''اگر آپ ٹی وی پر اعلان کردیں کہ میرا علاج کریں گے تو میں ایک سال کے لیے جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ اس اعلان کے بعد میں فوراً آپ کو بتادوں گا کہ میں ٹھیک کہاں رہ رہا ہوں۔ یہ مذاق نہیں ہے۔''

وہ حکام سے سودا کرنا چاہتا تھا لیکن اس سودے پر غور

کرنے سے پہلے حکام اس خط کی اصلیت جاننے کے لیے چھان بین کرنے کی ضرورت پر غور کرنے لگے چنانچہ مجرم کے ٹھکانے کا سراغ لگا کر اس تک پہنچنے کے بجائے مذکورہ خط کے راز پر سے پردہ اٹھانے اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے خط کے کاغذ کا ہر پہلو سے تجزیہ کیا گیا۔ پھر اس طرف سے فارغ ہو کر یو ایس مارشلس نے وہ خط ایف بی آئی کے حوالے کر دیا اور سکھ کی سانس لی۔ اب ایف بی آئی اس خط سے کھیلنے لگی۔ اس نے کاغذ کو جانچ کے مرحلے سے گزارا۔ پھر ڈی این اے کے شواہد کا سراغ لگایا، فنگر پرنٹس اور تحریر کا تجزیہ کرنے کے لیے اس کی تحریروں کے نمونے الکٹراز سے حاصل کیے گئے۔ تو کیا ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد انہیں کچھ ملا؟

سان فرانسسکو کے جس روزنامے نے وہ خط شائع کیا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں کی جانے والی تفتیش و تحقیق کی رپورٹ بھی شائع کر دی۔ روزنامے کے مطابق، ایف بی آئی اس نتیجے پر پہنچی کہ کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو جواب ملا۔ ''اس کا مطلب ہے ''ہاں'' اور اس کا مطلب ہے ''ناں'' دوسرے لفظوں میں، سب کچھ غیر مصدقہ ہے۔''

اس تمام عرصے میں یو ایس مارشلس کا یہ موقف تھا کہ ممکن ہے فرار ہونے والے قیدی فرینک اور اینگلن برادران زندہ بچ گئے ہوں۔ لیکن جنوری 2018ء میں اس خط کے منظر عام پر آنے کے بعد ان ہی کے ایک نمائندے نے خط کی اصلیت پر سوال اٹھا دیا۔ اسے یقین تھا اور اس کا یہ دعویٰ تھا کہ خط جعلی تھا۔ تاہم مارشلس سروس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی تفتیش اس وقت جاری رکھیں گے جب تک یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں یا جب تک وہ ننانوے سال کے نہیں ہو جاتے جبکہ ایف بی آئی اس کیس کو مختلف انداز سے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے 1979ء میں اس کیس کی تفتیش سے ہاتھ کھینچ لیا تھا تو ان کا کہنا تھا۔ ''ہم نے اس کیس پر سترہ سال محنت کی اور اس پر کام کیا لیکن اس پورے عرصے میں کوئی ایک بھی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ زندہ تھے۔ چاہے امریکا میں یا کہیں اور۔''

ان کا خیال تھا کہ جس شخص نے بھی جان اینگلن کی حیثیت سے وہ خط تحریر کیا تھا، ایک بہت ہی بیمار شخص تھا جو الکٹراز سے فرار کے مشہور واقع کا سہارا لے کر مدد کا طلب گار تھا اور اپنے کینسر کا علاج کروانا چاہتا تھا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ تینوں خلیج میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے تھے۔

فرینک مورس، جان اور کلیرنس کس انجام کو پہنچے، کسی کو بھی معلوم نہیں۔ آج بھی یہ ایک سربستہ راز ہے کہ آیا وہ فرار ہو کر زندہ بچنے میں کامیاب ہو گئے یا فرار ہونے کے دوران اس رات خلیج میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ قانون نافذ کرنے والوں نے اب تک اس خط کے بارے میں مزید ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ انہوں نے خط لکھنے والے شخص سے رابطہ کرنے کی کبھی کوئی کوشش بھی کی ہے یا نہیں۔ لیکن اگر وہ تینوں زندہ پائے گئے تو جان اینگلن 86 سال کا، کلیرنس 87 سال کا اور فرینک مورس 90 سال کا ہوگا۔ اپنی اس بڑھی ہوئی عمر کے باوجود وہ اب بھی اشتہاری مفرور ہیں اور 99 برس کے ہونے تک اپنے اعمال کے سزاوار ہوں گے۔

عوام کو صرف اور صرف سان فرانسسکو کے مقامی روزنامے میں اس خط کے شائع ہونے پر ہی اس واقعہ کا علم ہوا تھا۔ مذکورہ روزنامے نے کسی گمنام یا نامعلوم ذریعے سے اس خط کی ایک کاپی حاصل کر لی تھی۔ اس خط کی اشاعت پر جب ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تب یو ایس مارشلس نے یہ بیان جاری کیا۔ ''یہ یقین کرنے کی ہرگز کوئی وجہ نہیں ہے کہ فرار ہونے کے بعد کسی نے بھی اپنی طرز زندگی بدل دی ہوگی اور وہ مکمل طور پر قانون پسند شہری بن گئے ہوں گے۔''

یو ایس مارشلس والوں کی طرف سے ہنوز تفتیش جاری ہے، لہٰذا وہی بہتر جانتے ہوں گے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کب حقیقت سامنے آئے گی۔ آئے گی بھی یا نہیں لیکن دریں اثنا ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔

جنوری 2020ء میں ایک آرٹ ایجنسی کے ماہرین کی پوری ٹیم اس راز پر سے پردہ اٹھانے پر کمربستہ ہو گئی۔ ان ماہرین نے کمپیوٹر کی مدد سے جدید ترین ٹیکنالوجی CNX کا سہارا لے کر اینگلن برادران کی برازیل میں کھینچی گئی مبینہ تصویر کا ان کی پچھلی تصویروں سے موازنہ کرتے ہوئے ہر زاویے سے تجزیہ کیا حتیٰ کہ ان کے تاثرات کا بھی..... اور پھر پورے اعتماد کے ساتھ اس بات کی تصدیق کر دی کہ فوٹو میں نظر آنے والے دو آدمی بلاشبہ جان اور کلیرنس ہی ہیں۔

++

TAGPK.COM

سُروں کی ملکہ

انور فرہاد

ملکہ ترنم نور جہاں عرف اللہ وسائی نے کس طرح قدم بہ قدم ترقی کے زینے طے کیے۔ ان کی زندگی کے وہ گوشے جس کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے۔ کہی ان کہی وہ باتیں جو قارئین کا دل موہ لیں گی

بھی ہماری ملکہ دنیا اوج پر تھی

اگر اللہ توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
اس مصرعے کی آفاقی سچائی اس وقت خاص طور پر مجھے سمجھ میں آئی جب میرے چاہنے والوں نے مجھ سے شکوہ شکایت کرنا شروع کی۔

''کیا بات ہے، آپ اتنے دنوں سے لکھ رہے ہیں۔ جانے کس کس پر نہیں لکھا آپ نے۔ ایسے فنکاروں کے بارے میں بھی لکھا جن کو جانے کب کے لوگ بھول بھال گئے تھے۔ گڑے مردے اکھاڑ کر لے آئے مگر..... مگر نہیں لکھا تو سرسنگیت کی ملکہ کے بارے میں..... ملکۂ ترنم مادام نور جہاں کے بارے میں۔''



TAGPK.COM

میں نے اپنے طور پر تو جواب دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''ارے بھئی! میڈم پر تو اتنے لوگوں نے اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ میرے لکھنے کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہا۔''

مگر اپنے دل ہی دل میں کہا۔ واقعی شاعر نے سچ ہی کہا ہے۔ اللہ اگر توفیق نہ دے تو انسان کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے عظیم المرتبت سنگیت کی رانی کی جادو بھری کہانی لکھنے کی مجھے توفیق ہی نہیں دی تو میں ان پر کیا لکھتا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یہ سوچ کر دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ویسے تو میری اکثر تحریروں میں مادام کا ذکر خیر ہوتا رہا ہے اس لیے میں اس بات کا گناہ گار اور سزاوار نہیں ٹھہرتا کہ میں نے ملکۂ ترنم پر کچھ نہیں لکھا۔

لیکن اب جب اس بات کا تقاضا روز بروز بڑھتا ہی رہا کہ ..... محترم! کچھ تو لکھیں کہ آپ کی ذات پر یہ بہتان نہ لگے کہ انور فرہاد نے اس نابغۂ روزگار گلوکارہ کے بارے میں قلم کشائی نہیں کی۔

سب سے پہلے تو میں نے پیارے اللہ میاں سے دست بستہ دعا کی کہ مجھے بھی کچھ توفیق عطا کیجیے کہ میں چند سطریں ملکۂ ترنم پر لکھ کر انگلی کٹوا کر شہید ہونے والوں میں اپنا نام لکھوالوں۔ شاید مجھ گناہ گار کی دعا قبول ہوئی اور مجھے مادام پر لکھنے کا حوصلہ ملا۔

دوستو! یہ سچ ہے کہ مادام پر بہت لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ سرگزشت میں بھی خوب لکھا گیا۔ مگر میں کوشش کروں گا کہ وہ باتیں یا وہ حقائق جو یا تو لکھے ہی نہیں گئے ہیں یا لکھے گئے بھی ہیں تو عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں۔ لکھوں گا تاکہ میری تحریر میں کچھ نیا پن ہو۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ کسی کی ذات پر یا فن پر وہی کچھ لکھا جاتا ہے جو متعلقہ شخص سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ہر لکھنے والا ان ہی فیکٹ اور فیگر پر لکھتا ہے۔ بس ہر لکھنے والے کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔

زیادہ لکھنے والوں نے ملکۂ ترنم کے عروج کے دور کو فوکس کر کے ان کی فنی عظمت کے گن گائے ہیں اس لیے میں ان کے اس دور سے ان کی کہانی شروع کروں گا جب وہ فن موسیقی کی دنیا میں بالکل نوآموز تھیں اور بے بی نور جہاں کے نام سے گاتی تھیں۔ بے بی نور جہاں نے صرف سات سال کی عمر سے میلوں ٹھیلوں میں گانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی دو بڑی بہنیں وحیدن بائی اور حیدر باندی بھی بے بی کے ساتھ گاتی تھیں۔ ان کا ایک بھائی بھی تھا محمد شفیع، اسے بھی خاندانی روایت کے مطابق گانے بجانے کا شوق تھا۔ خاندان کا ذکر آیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بے بی کے بارے میں مزید کچھ بتانے سے پہلے اس کے خاندان کے متعلق بھی کچھ بتا دیا جائے۔

اس کے ماں باپ فتح بی بی اور مدد قلی کوٹ مروان خان ضلع قصور کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ اس گھر میں ان کی تیسری بیٹی 21 ستمبر 1926ء کو پیدا ہوئی۔ بچی کی پھوپی الٰہی جان نے پنجاب کی روایت کے مطابق چینی کی ایک چٹکی نومولود بچی کے منہ میں پہلی خوراک کے طور پر دی۔ اس موقع پر نومولود بچی کا نام اللہ وسائی رکھا گیا۔

کہتے ہیں کہ اس بچی کی پیدائش اس غریب گھرانے کے لیے بڑی بھاگوان ثابت ہوئی۔ بچی کے رونے کے انداز سے ہی استادوں نے کہہ دیا تھا۔

''یہ بچی سر کی دیوی بنے گی۔ اس کا رونا اتنا سر میں ہے تو جب گائے گی تو سر کی دنیا میں ہلچل مچا دے گی۔''

واضح رہے کہ یہ ایک گانے بجانے والا گھرانا تھا جہاں پھوپی الٰہی جان نے اس زمانے کی محفلوں میں گا کر بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اس بچی اللہ وسائی کی بڑی بہنیں وحیدن بائی اور حیدر باندی بھی گاتی تھیں۔ پانچ سال کی عمر ہی میں خاندانی استاد غلام محمد قصوری کے آگے اس بچی کو بٹھا دیا گیا۔ انہوں نے تان لگانا سکھایا۔ پہلی ہی تان نے قصور کے اس گھرانے میں ہلچل مچا دی۔

استاد غلام محمد قصوری کی تربیت نے اللہ وسائی کو اس قابل بنا دیا کہ سات سال کی عمر میں ہی اس نے اپنی بہنوں کے ساتھ میلوں میں گانا شروع کر دیا۔ ابتدائی دنوں میں یہ سات سالہ بچی اللہ وسائی اپنی بہنوں وحیدن بائی اور حیدر باندی کے ہمراہ قصور اور اس کے گردونواح کے قصبوں میں نغمہ سرائی کرتی رہی۔

1933ء یا 1934ء کا سال تھا جب استاد غلام محمد قصوری کے ہمراہ تینوں بہنیں قصور سے لاہور آئیں۔ موسیقار جے اے چشتی جوان دنوں چھوٹی چھوٹی محفلوں میں شوقیہ گاتے بھی تھے اور دھنیں بھی بناتے تھے، اپنی ہی ایک نعت شریف:

ہنستے ہیں ستارے یا شاہِ مدینہؐ

کی انہوں نے دل آویز دھن بنائی اور اللہ وسائی نے

اس نعت کو لاہور کے مہابیر تھیٹر میں اسی دھن کے ساتھ پیش کر کے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ اس کی مقبولیت کے بعد اللہ وسائی کو باقاعدہ پروگراموں میں شامل کیا جانے لگا۔ عیدن اور حیدر باندی بھی اس بچی کے ساتھ پرفارم کرتی تھیں۔۔۔ پھر جب اس بچی کی عمر 8 برس کی تھی، وہ اپنی دونوں بہنوں اور بھائی محمد شفیع کے ہمراہ کلکتہ پہنچی تو کلکتہ کے سب سے بڑے فلمساز کرنائی سیٹھ نے اللہ وسائی کا گانا سنا تو اس نے پیشگوئی کی۔

''یہ بچی سر کے آسمان پر چاند کی طرح جگمگائے گی۔''

اتنے بڑے فلم میکر کی یہ بات اس دور کی ہیروئن مختار بیگم نے سنی تو مختار بیگم نے بھی آٹھ سالہ اللہ وسائی کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''ننھی گلوکارہ! ہمیں بھی کچھ سناؤ۔''

تو کمسن گلوکارہ اللہ وسائی نے اس دور میں مختار بیگم ہی کے گائے ہوئے کچھ نغموں کو اپنی آواز میں اس انداز میں سنایا کہ مختار بیگم حیران رہ گئیں۔ بچی کو اپنے پاس بٹھا کر پیار کیا اور اس کی عمر کی درازی اور سرسنگیت میں دلنوازی کی دعا دی۔

یاد رہے کہ یہ وہ دور تھا جب کے دی مہرہ برصغیر کی پہلی پنجابی فلم پلان کر رہے تھے۔ کلکتہ کے اس فلمساز ادارے میں ان تینوں بہنوں کو مستقل آرٹسٹ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی اور جب پہلی پنجابی فلم ''شیلا عرف پنڈ دی کڑی'' بنائی تو تینوں بہنوں نے اس فلم میں باقاعدہ گلوکاری کی۔ اس فلم میں اللہ وسائی نے بے بی نور جہاں کے نام سے جو نغمہ گایا تھا اس کے بول تھے۔

لنک آجا پتن چناں دا او یار

فلم ''پنڈ دی کڑی'' میں یہ گیت اس بے بی نور جہاں پر فلمایا گیا تھا۔ یہ 1935ء کا سال تھا۔ بے بی نور جہاں کا گایا ہوا گیت سپرہٹ ہو گیا۔

دوستو! یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ برصغیر کی سب سے پہلی پنجابی فلم ''شیلا عرف پنڈ دی کڑی'' بنگال کے شہر کلکتہ میں بنائی گئی اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہی فلم ''شیلا عرف پنڈ دی کڑی'' سے ہی اللہ وسائی کو بے بی نور جہاں کا نام دیا گیا۔

متذکرہ فلم کے بعد بے بی نور جہاں کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1939ء تک جتنی بھی فلموں میں بے بی نور جہاں کے نام سے کام کیا، اس کا نام ہیروئن کے بعد دوسرے نمبر پر لکھا جاتا تھا ہیرو کا نام بعد میں آتا تھا۔

بے بی نور جہاں کی بڑی بہنیں بطور اداکارہ چل نہ سکیں حالانکہ ان کی فیملی عیدن کو ہیروئن بنانے کے لیے کلکتہ پہنچی تھی۔ فلم ''ہیر سیال'' میں عیدن نے مزاحیہ رول ادا کیا تھا۔ ''ہیر سیال'' میں بے بی نور جہاں نے فلم کی ہیر بالو (اقبال بیگم) کے بچپن کا کردار ادا کیا تھا اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ موسیقار دھومی خان کی موسیقی پر یہ کورس گایا تھا۔

سوہنا ویلیاں توں دیس پنجاب
جیویں پھلاں وچوں گلاب

یہ ایک مکمل لوک گیت تھا جو اس زمانے میں زبان زد عام ہوا۔ فلم ''ہیر سیال'' 1937ء میں بنی۔ اسی سال ''فخر اسلام'' میں بے بی نور جہاں نے شاعر جنید مرزا کے ترانے کو موسیقار مولی لال نائک کی موسیقی میں گایا۔

اٹھوائے مسلمو آیا وقت شہادت

1938ء میں بے بی نور جہاں نے ایک اور کامیاب پنجابی فلم ''سسی پنوں'' میں سسی کے بچپن کا کردار ادا کیا۔ ساتھ ہی اس کی آواز میں یہ گیت اس پر ہی فلم بند ہوا۔

''میرے بابل دا اکھڑا پیارا۔ میری اماں ہے روشن تارا۔'' یہ فلم بہت کامیاب رہی۔

1938ء ہی کا سال تھا جب یہ تینوں بہنیں لاہور واپس آ گئیں۔ یہاں دل سکھ پنچولی پنجابی فلم ''گل بکاؤلی'' بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ماسٹر غلام حیدر موسیقار اور نغمہ نگار، کہانی نویس اور مکالمہ نگار ولی صاحب منتخب کر لیے گئے تھے۔ تینوں بہنیں کسی کے توسط سے سیٹھ پنچولی تک پہنچیں۔ ماسٹر غلام حیدر نے بے بی نور جہاں کی آواز سنی تو انہیں بہت اچھی لگی۔ ان کی سفارش پر گل بکاؤلی کے ہدایت کار برکت مہرہ نے بے بی نور جہاں کو فلم میں کاسٹ کر لیا۔ بے بی نور جہاں کی آواز میں ''گل بکاؤلی'' کا یہ نغمہ ریکارڈ ہوا۔

شالا جوانیاں مانیں
آکھا نہ موڑیں، پی لے، جی لے
دکھ یار دوہارے جی لے پی لے
شالا جوانیاں مانیں

اس گیت نے دھوم مچا دی اور اصل شہرت بھی بے بی نور جہاں کو اس گیت سے ملی۔ 1939ء میں گل بکاؤلی ریلیز ہوئی تو اس فلم نے ریکارڈ بزنس کیا۔

فلم گل بکاؤلی سے قبل بے بی نور جہاں نے قیام کلکتہ

TAGPK.COM

کے دوران جن موسیقاروں کے ساتھ گایا تھا وہ ان کے گائے ہوئے گیت سنیما گھروں تک محدود رہے لیکن گل بکاؤلی کے گیت نگر نگر تک پہنچے۔ گل بکاؤلی کی کامیابی کے بعد دل سکھ پنچولی نے دو فلمیں ''خزانچی'' اور ''یملا جٹ'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ دونوں ہی فلمیں پنجابی تھیں۔ فلم یملا جٹ میں مشہور اداکار ایم اسماعیل نے بے بی نور جہاں کے باپ کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی، مکالمے اور نغمات ولی صاحب نے لکھے تھے۔ یہ بھارتی اداکار پران کی پہلی فلم تھی۔ یملا جٹ کے ہدایت کار موتی جی گڈوانی تھے۔

اس فلم کے گیت بہت مقبول ہوئے۔

''شالا جوانیاں مانے'' کے علاوہ'' پنجرے دے وچ'' بھی ہٹ ہوا۔ بے بی نور جہاں کی آواز میں ان دونوں سولو پنجابی گیتوں نے بے بی نور جہاں کو بہت شہرت دی۔ بے بی نور جہاں نے ماسٹر غلام حیدر کے ساتھ پنجابی فلم ''چودھری'' میں دو گانے گائے تھے۔ پہلے گانے کے بول تھے۔

''اک دنیا نویں وسا لیے..... آ آ گن''

اور یہ المیہ گیت ''سجناں تیرے بناں جی نو لگدا''

اس فلم کے تمام گانے نغمہ نگار الف ڈی شرف نے تحریر کیے تھے۔ ''چودھری'' کی نمائش 1941ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد بطور بے بی اسٹار نور جہاں کا معاہدہ پنچولی آرٹ پکچرز سے ختم ہوگیا تھا۔ اسی سال فلم ''خزانچی'' جو پنچولی آرٹ پروڈکشن کی فلم تھی، ریلیز ہوئی تھی۔ ماسٹر غلام حیدر نے فلم ''خزانچی'' کے لیے پلے بیک سنگر کے طور پر گانے ریکارڈ کیے۔ یہ پہلی فلم تھی جس میں نور جہاں نے پلے بیک کے طور پر کام کیا تھا لیکن اس فلم میں یہ گانے دوسری اداکارہ پر پکچرائز کیے گئے۔ اس وقت بے بی نور جہاں بچپن سے جوانی کی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

دوستو! ہماری سنگیت کی دنیا کی مہارانی ملکۂ ترنم نور جہاں کے ابتدائی دور کی کہانی آپ نے سنی۔ یہ سب کچھ آپ کو بتانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آپ کو معلوم ہو، پتا چلے کہ رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد۔ شہرت، مقبولیت، دولت اور عزت کسی کو بھی ایک دم نہیں مل جاتی ہے۔ بڑی محنت، ریاضت اور مسلسل جدوجہد کے بعد ملتی ہے۔ ہماری، آپ کی اور ایک عالم کی ملکۂ ترنم، یونہی اس مقام تک نہیں پہنچیں۔ اس بے چاری کو تو گڑیا کھیلنے کی عمر سے ہی منزل کی جستجو میں لگا دیا گیا تھا۔

آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے ان فلموں کے نام بھی درج کر رہا ہوں جن فلموں میں بے بی نور جہاں نے تقسیم ہند سے پہلے اداکاری اور گلوکاری کا مظاہرہ کیا۔

شیلا عرف پنڈ دی کڑی، مسٹر 420، سسی پنوں، ہیر سیال، نادری راج، فخر اسلام، گل بکاؤلی، یملا جٹ، چودھری، خزانچی، خاندان، مصر کا ستارہ، مسٹر اینڈ مسز بمبئی، نا ممکن، اپریل فول، نوکر، دہلی، ڈان، دوست، لال حویلی، بڑی ماں، گاؤں کی گوری، زینت، انمول گھڑی، دل اور مرزا صاحبان شامل ہیں۔

واضح رہے کہ فلم مصر کا ستارہ میں بے بی نور جہاں نے فلم کی ہیروئن کے بچپن کا کردار ادا کیا تھا۔ فلم مسٹر اینڈ مسز بمبئی میں بے بی نور جہاں نے موتی لال کا گیت ماسٹر امام بخش کی دھن پر گایا۔

''پرماتما کی یہ دنیا نرالی۔''

1942ء میں فلم ''خاندان'' میں بے بی نور جہاں نے پہلی بار ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ یوں بے بی نور جہاں کا دور ختم ہوا اور اداکارہ نور جہاں کا دور شروع ہوگیا جوان کی آخری فلم ''غالب'' میں جا کر اختتام پذیر ہوا جبکہ گلوکارہ کی حیثیت سے ان کا ریکارڈ ہونے والا آخری گیت ''تیرے بنا روگی ہوئے پیا سے نین۔'' غیر فلمی تھا۔ 1995ء میں میڈم نور جہاں نے استاد نصرت فتح علی خان کے ساتھ ایک ڈوئٹ کی صورت میں ریکارڈ کروایا تھا۔ یہ گیت مادام سے بیماری کی حالت میں وہیل چیئر پر قسطوں میں ریکارڈ کروایا گیا تھا۔ بیماری نے ان کے گلے سے سروں کا تمام رس نچوڑ لیا تھا اس لیے اس گیت میں ان کی آواز میں وہ بات نہ تھی جو ان کے گائے ہوئے گیتوں کی پہچان تھی۔

یہ قدرت کا نظام ہے کہ اکثر عروج کو زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وقت اور حالات نے اس عظیم سر سنگیت کی ملکہ کو بھی بیماری کے بہانے دنیا سے جانے پر مجبور کر دیا مگر ایسی شخصیتیں نظروں سے اوجھل ضرور ہو جاتی ہیں، ان کے کارنامے انہیں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھتے ہیں۔ ان کو ہم سے بچھڑے 21 برس بیت گئے ہیں اس کے باوجود ہم آپ کو ان کی کہی اور ان کہی کہانی سنا رہے ہیں اور ہم پر ہی کیا منحصر..... آنے والے وقتوں میں بھی ہم جیسے ان کی باتیں اور یادیں دہراتے رہیں گے۔

میں نے جیسا کہ آپ سے کہا تھا سروں کی اس ملکہ کی

TAGPK.COM

ایسی باتیں بتانے کو ترجیح دوں گا جو عام طور پر کم لوگوں کو معلوم ہیں۔

''پاکستان کی سو شاہکار فلمیں'' نامی ایک کتاب میں ملکۂ ترنم نور جہاں کی بطور ہیروئن اور گلوکارہ جو فلمیں بتائی گئی ہیں ان میں چن وے، دوپٹا، انتظار، نیند اور کوئل شامل ہیں۔ اس سے میڈم نور جہاں کے فنی مقام کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد مادام نور جہاں کی پہلی فلم ''چن وے'' ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس کی ہدایت کارہ بھی وہ خود ہی تھیں۔ اس طرح انہیں پاکستان کی اوّلین ہدایت کارہ کا اعزاز بھی ملا۔ ''چن وے'' کے فلمساز سید شوکت حسین رضوی تھے جو انڈیا میں نور جہاں کے ہمراہ ''جگنو'' اور ''زینت'' جیسی سپرہٹ فلمیں بنا چکے تھے۔ نامور موسیقار فیروز نظامی ''چن وے'' کے توسط سے پاکستان میں نور جہاں کے پہلے موسیقار تھے۔ چن وے میں موجود گیارہ نغمات تھے جو سب کے سب نور جہاں نے گائے۔ ان گیتوں کے شاعر ایف ڈی شرف (فیروز دین شرف) تھے۔ یہ غالباً کسی بھی پنجابی فلم میں نور جہاں کے گائے سب سے زیادہ نغمات کا ایک منفرد ریکارڈ ہے۔ ہاں یاد آیا۔ اس فلم میں ایک نغمہ استاد دامن کا بھی شامل ہے۔ یہ فلم 29 مارچ 1951ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ ''چن وے'' کے یوں تو تمام گیت ہی مقبول ہوئے مگر ''تیرے مکھڑے دا کالا کالا تل وے'' تو آج بھی اسی تر و تازگی کے ساتھ شوق سے سنا جاتا ہے۔

میڈم نور جہاں کی بطور ہیروئن پہلی اردو پاکستانی فلم ''دوپٹا'' ہے۔ اس کے ہدایت کار سبطین فضلی تھے جو تقسیم ہند سے پہلے بمبئی میں شمع، عصمت اور مہندی جیسی گھریلو فلمیں بنا چکے تھے۔ اس فلم ''دوپٹا'' کے موسیقار بھی فیروز نظامی تھے۔ اس فلم کے گیت بھی ''چن وے'' کی طرح بے حد مقبول ہوئے اور فلم نے بھی عوامی مقبولیت میں اس دور میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ پاکستان ہی میں نہیں بھارتی شہر کلکتہ کے 9 سینما گھروں میں ریلیز ہوئی اور بے حد پسند کی گئی۔ مادام نور جہاں کی یہ پہلی اردو فلم دوپٹا 3 مارچ 1952ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے گیتوں نے اس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس فلم میں نور جہاں کی آواز میں 8 گانے ریکارڈ کیے گئے جو سارے کے سارے انہی پر پکچرائز ہوئے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

☆ چاندنی راتیں سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں چاندنی راتیں
☆ تم زندگی کو غم کا فسانہ بنا گئے
آنکھوں میں انتظار کی دنیا بسا گئے
☆ میں بن پتنگ اڑ جاؤں رے
کسی کے ہاتھ نہ آؤں
☆ جگر کی آگ سے اس دل کو جلتا دیکھتے جاؤ
☆ میرے من کے راجا آ جا صورتیا دکھا جا

اس فلم میں ان کے مقابل اجے کمار اور سدھیر نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔

بطور اداکارہ اور گلوکارہ مادام نور جہاں کی ایک اہم فلم ''انتظار'' بھی تھی جس نے دونوں حیثیت سے انہیں لازوال شہرت سے ہمکنار کیا۔ خواجہ خورشید انور اس فلم کے فلمساز، موسیقار، کہانی نویس تھے۔ ہدایت کاری کے فرائض مسعود پرویز نے ادا کیے تھے۔ خواجہ خورشید انور تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں ہندی فلمیں کرمائی، اشارہ، پرکھ، آج اور کل، پگڈنڈی، پروانہ، سنگھار، نیلم پری، نشانہ اور یتیم نامی فلموں میں موسیقی ترتیب دی تھی مگر عجیب اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ان فلموں میں سے کسی میں بھی مادام نور جہاں کو نہیں گوایا لیکن جب وہ مستقل طور پر پاکستان آ گئے تو یہاں اپنی پہلی فلم ''انتظار'' میں نور جہاں سے غیر معمولی طور پر انہیں گوا کر ساری کسر پوری کر دی۔ ''انتظار'' اپنی موسیقی کی وجہ سے کلاسک فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس فلم میں مادام اپنی اداکاری ہی نہیں، گلوکاری کے لحاظ سے بھی فن کی بلندیوں پر تھیں۔ اس فلم میں ان کی آواز اور انداز کا سنگم نہایت حسین تھا۔ ان میں سے چند یہ بھی تھے۔

☆ چھن چھن ناچوں گی گن گن گاؤں گی
سیاں مورے آئیں گے ان کو رجھاؤں گی
☆ جس دن سے پیا دل لے گئے دکھ دے گئے
اس دن سے گھڑی پل ہائے چین نہیں آئے
☆ چاند ہنسے دنیا بسے روئے میرا پیار رے
درد بھرے دل کے میرے ٹوٹ گئے تار رے
☆ آ بھی جا آ بھی جا دیکھ آ کر ذرا
مجھ پہ گزری ہے کیا تیرے پیار میں
☆ میرا ساتھی میرے پاس نہیں میرے نیناں برسیں
چھم چھم چھم

سنتوش کمار اس فلم میں ان کے ہیرو تھے۔ ''انتظار''

میں بہترین اداکاری کرنے پر مادام نور جہاں کو پہلی بار سرکاری طور پر بہترین اداکارہ کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ 1956ء میں دیے جانے والے پہلے نیشنل ایوارڈ میں فلم ''انتظار'' کو مجموعی طور پر 6 ایوارڈز سے نوازا گیا تھا۔ انتظار 1956ء میں سلور اسکرین کی زینت بنی تھی۔

یاد رہے کہ ملکۂ ترنم نور جہاں 1942ء میں جب وہ انڈیا میں تھیں اور ان کی فلم ''جگنو'' ریلیز ہو کر سپر ڈپر کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی اور جس کے فلمساز و ہدایت کار سید شوکت حسین رضوی تھے اور ان کے مقابل دلیپ کمار ہیرو تھے۔ اس فلم کی فقید المثال کامیابی کے بعد سید شوکت حسین رضوی نے نور جہاں کو اپنی شریکِ حیات بنالیا تھا. سید صاحب سے شادی کے بعد ان کے تین صاحبزادے اکبر حسین رضوی، شہنشاہ حسین رضوی اور اصغر حسین رضوی کے علاوہ ایک صاحبزادی ظل ہما پیدا ہوئیں۔

اس موقع پر یہ بتانا بھی مناسب ہوگا کہ مادام نے 1961ء سید شوکت حسین رضوی سے طلاق لے کر اس وقت کے خوبرو اداکار اعجاز درانی سے شادی کرلی تھی۔ اعجاز کی رفاقت میں ان کی تین بیٹیاں شازیہ، حنا اور مینا پیدا ہوئیں۔

بات ہو رہی تھی میڈم کی شاہکار فلموں کی کہ ان کی شادیوں اور بچوں کا ذکر چھڑ گیا، خیر..... ان کی اگلی شاہکار فلم ''نیند'' تھی جس میں ان کی اداکاری اور گلوکاری نے فلم دیکھنے والوں پر سحر طاری کر دیا تھا۔ ''نیند'' کے ہدایت کار حسن طارق تھے۔ یہ بطور ہدایت کار ان کی پہلی فلم تھی۔ اس فلم کے مصنف ریاض شاہد اور موسیقار رشید عطرے تھے جن کی کمپوز کردہ مسحور کن موسیقی نے اس فلم کی خوبصورتی میں گرانقدر اضافہ کیا تھا مادام نے اس فلم میں ایک منفرد کردار پرفارم کیا تھا۔ ان کا کردار ایک کوئلہ چننے والی جوان لڑکی کا تھا جو ریلوے اسٹیشن پر پٹریوں پر گرنے والے کوئلے جمع کرتی ہے۔ اسے نیند بہت آتی ہے۔ اکثر کوئلہ چنتے چنتے پٹریوں کے آس پاس ہی سو جاتی ہے۔

اسلم پرویز اس فلم کے ہیرو تھے۔ دیگر ستاروں میں نیلو، محبت سلطانہ، علاؤ الدین اور جعفری بھی شامل تھے۔ نور جہاں نے اس فلم میں جہاں اپنی اداکاری کا اعلیٰ معیار پیش کیا تھا وہاں اس فلم کے گانے بھی بڑے چاؤ کے ساتھ گائے تھے۔ ان کے گائے ہوئے گیت جوان ہی پر پکچرائز ہوئے۔

☆ تیرے در پر صنم چلے آئے
تو نہ آیا تو ہم چلے آئے

☆ جیا دھڑکے سکھی ری جور سے
آئی مل کے بلم چت چور سے (نسیم بیگم کے ہمراہ)

☆ کیوں اداس ہو رہے ہو شام کی طرح

☆ آنی رات نہ آئے سانوریا

☆ اکیلی کہیں مت جانا جمانا ٹھگ ہے

''نیند'' کے نغمہ نگار تنویر نقوی تھے۔ یہ فلم جسے کلاسک کا درجہ حاصل ہوا 16 اکتوبر 1959ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔

مادام کی اداکاری اور گلوکاری سے سجی ایک شاہکار فلم ''کوئل'' بھی ہے۔ اس کلاسک فلم کے ہدایت کار مسعود پرویز، کہانی نویس شمس لکھنوی اور موسیقار خواجہ خورشید انور ہیں۔ اسلم پرویز کے ساتھ میڈم نے اس فلم میں لیڈنگ رول کیا تھا۔ نیلو، علاؤ الدین، نذر اور غلام محمد دیگر نمایاں ستارے تھے۔ اس فلم میں بھی ان کے گائے ہوئے گانے ان پر فلم بند ہوئے تھے۔

☆ رم جھم رم جھم پڑے پھوار
تیرا میرا نت کا پیار (ہمراہ منیر حسین)

☆ دل کا دیا جلایا میں نے تجھ کو کہیں نہ پایا میں نے

☆ ساگر روئے لہریں شور مچائیں
یاد پیا کی آئے نیناں بھر آئیں

☆ مہکی فضائیں گاتی ہوائیں
مہکے نظارے سارے کے سارے
تیرے لیے ہیں

☆ تیرے بنا سونی سونی لاگے رے
چاندنی رات چاندنی رات

☆ بے وفا میں نے تجھ سے
پیار کیوں کیا او بے وفا

خواجہ خورشید انور کی ترتیب دی ہوئی موسیقی اور مادام کی دل نشیں آواز نے ان گیتوں کو سدا بہار، مقبول زمانہ اور شاہکار کا درجہ عطا کیا۔

''کوئل'' بھی 1959ء میں ریلیز ہوئی اور میڈم نور جہاں کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگا گئی۔

مادام نور جہاں کے بارے میں کچھ کہی ان کہی مزید باتیں بھی گوش گزار تے چلیں۔ ان کے بارے میں جو باتیں لکھی گئی ہیں ان میں کہیں کہیں تضاد بھی ہے۔ جیسے لکھا

گیا ہے کہ مادام کا گایا ہوا آخری نغمہ فلم ''دلہن بنتی ہیں نصیبوں والیاں'' میں تھا جو 2006ء میں ریلیز ہوئی تھی اور یہ ریما پر پکچرائز ہوا تھا جس کے بول تھے۔

علی علی دم مست قلندر

جبکہ ایک جگہ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ 1997 میں جب انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ کراچی کے اسپتال میں زیر علاج تھیں اسی دوران انہوں نے لاہور جا کر ''سخی بادشاہ'' کے لیے گانے ریکارڈ کرائے جو ان کے آخری گیت ثابت ہوئے۔

ان کہی باتوں میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اپنے وقت کی عظیم گلوکارہ ملکۂ ترنم نے گانے کے علاوہ ایک فلم ہیر و (پنجابی) کے لیے ایک گیت بھی لکھا تھا۔ یہ 1977ء کی فلم تھی۔ اسے انہوں نے گایا بھی تھا۔

مادام کی فلم ''زینت'' وہ فلم ہے جس میں انہوں نے پہلی بار ڈبل رول پلے کیا تھا۔ وہ اس فلم میں ماں بھی بنی تھیں اور بیٹی بھی۔ یہ بمبئی کی فلم تھی اور اس کی نمائش 1945ء میں ہوئی تھی۔

پاکستان کا سب سے بڑا پیک فلم ایوارڈ ''نگار ایوارڈ'' مادام کو ایک دو نہیں پورے ایک درجن (12) ملے جبکہ انہیں الیاس رشیدی گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔ انہیں سرکاری طور پر صدارتی ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ 1956ء کی فلم ''انتظار'' کے لیے بہترین اداکارہ کا اور 1963ء میں فلم ''دامن'' کے لیے بہترین گلوکارہ کی حیثیت سے دو قومی ایوارڈ (صدارتی ایوارڈ) دیے گئے۔ جبکہ حکومت پاکستان کی طرف سے 1966ء اور تمغۂ حسن کارکردگی (پرائیڈ آف پرفارمنس) 1997ء میں ''نشان امتیاز'' عطا کیے گئے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مادام نور جہاں نے جب تک فلموں میں اداکاری کی اس وقت تک صرف ان ہی فلموں کے لیے گیت گائے جن میں وہ اداکاری کرتی تھیں اور ان کے گائے ہوئے گیت ان پر ہی پکچرائز ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ''جان بہار'' جو 1958ء میں ریلیز ہوئی۔ ایسی فلم ہے جس میں انہوں نے جو گائے وہ اس نیت سے گائے تھے کہ ان پر فلمائے جائیں گے مگر ان کی بجائے مسرت نذیر پر پکچرائز ہوئے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ''جان بہار'' میں پہلے وہی کام کر رہی تھیں۔ جب تمام نغمات ریکارڈ ہو چکے تو کچھ ایسی بات ہوگئی کہ مادام کو فلم سے الگ کر دیا گیا اور ان کی جگہ مسرت نذیر کو کاسٹ کر لیا گیا۔ اصل وجہ اس علیحدگی کی یہ تھی کہ سید شوکت حسین رضوی سے انہوں نے طلاق لے لی تھی اور سید صاحب نے انہیں کٹ کر کے مسرت نذیر کو کاسٹ کر لیا تھا۔ یوں اتفاقیہ طور پر نور جہاں کے گائے ہوئے گیت مسرت نذیر پر پکچرائز ہوئے۔

پھر جب مادام باقاعدہ طور پر فلموں کے لیے پلے بیک دینے لگیں تو سب سے پہلے فلم ''نتھ'' کے لیے اپنی آواز میں گیت ریکارڈ کروائے۔ اس فلم میں ان کا گایا ہوا یہ گیت بہت مقبول ہوا۔ ''زندگی ہے یا کسی کا انتظار'' یہ گانا اداکارہ بہار پر پکچرائز ہوا تھا۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مادام نور جہاں برصغیر کی بیسٹ اور پاکستان کی سب سے بڑی گلوکارہ تھیں۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ملکۂ ترنم نے ملی نغمات گا کر جو قومی خدمات انجام دی تھیں اس کے صلے میں اس وقت کے صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے انہیں ملکۂ ترنم کا خطاب دیا تھا۔

ایک وقت تھا جب سرنگیت کی ملکہ صرف اپنے لیے گاتی تھیں پھر جب اداکاری ترک کر دی تو دوسروں کے لیے گانا شروع کر دیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے گائے ہوئے گیت 60 مقبول اداکاراؤں پر پکچرائز ہوئے جن میں مشرقی پاکستان کے علاوہ سری لنکا اور نیپال کی اداکارائیں بھی شامل ہیں۔ ان پر پکچرائز ہونے والے کچھ مقبول نغمے یہ بھی ہیں۔

☆ گائے گی دنیا گیت میرے
سریلے رنگ میں نرالے رنگ سرے
(صبیحہ خانم پر پکچرائز ہوا۔ فلم موسیقار)

☆ چل ہٹ ری ہوا گھونگھٹ نہ اٹھا
میرا نکھڑا بالم دیکھے گا
(اداکارہ دیبا۔ فلم مادر وطن)

☆ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
(اداکارہ شمیم آرا۔ فلم قیدی)

☆ اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے
(اداکارہ رانی۔ فلم انجمن)

☆ عمر یا بیتی جائے کوئی رشتہ نہ آئے
(اداکارہ سنگیتا۔ فلم محبت اور مہنگائی)

TAGPK.COM

☆کس نام سے پکاروں کیا نام ہے تمہارا
(اداکارہ روزینہ۔فلم غرناطہ)
☆کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے
کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے
(اداکارہ نیلو۔فلم عذرا)
☆جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا
(اداکارہ نگہت سلطانہ۔فلم سسرال)
☆لاکھ نخرے دکھاؤ سر جھکانا پڑے گا
بن کے دلہن ہمارے گھر آنا پڑے گا
(اداکارہ صاعقہ۔فلم آس)
☆آج ہے محفل دید کے قابل شمع بھی ہے پروانہ بھی
(اداکارہ عالیہ۔فلم شمع اور پروانہ)
☆آئے ہو ابھی بیٹھو تو سہی
جانے کی باتیں جانے دو
(اداکارہ نجمہ۔فلم خاندان)
☆جھانجھر یا پہنا دو بندیا بھی چمکا دو
(اداکارہ انجمن۔فلم شیر خان)
☆کل تک جو کہتے تھے اپنا آج وہی بیگانے ہیں
(اداکارہ نشو۔فلم بہشت)
☆ان کا ہی تصور ہے محفل ہو کہ تنہائی
(اداکارہ عشرت چودھری۔فلم سہرے کے پھول)
☆اپنی سانسوں میں تجھ کو بسالوں گی
تجھ سے ہی تجھ کو چرالوں گی
(اداکارہ سبیتا۔فلم کبھی الوداع نہ کہنا)
☆آ بھی جاؤ ساجنا ارمانوں کے گلزاروں میں
ڈھونڈ رہی ہوں کب سے تم کو گلیوں میں بازاروں میں
(اداکارہ شبانہ۔فلم چاند سورج)
☆او جانے والے ہیں تیرے قربان خدا حافظ
(اداکارہ نمی۔فلم دلہن ایک رات کی)

میڈم نور جہاں کی شخصیت میں حقیقی ملکاؤں والی خاصیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کی شخصیت میں ایک وقار اور رعب و دبدبہ تھا جس کی وجہ سے لوگ ان سے مرعوب رہتے تھے۔ میڈم اپنی آن بان کی بنا پر ہر محفل میں مرکز نگاہ رہتی تھیں۔ ان کی شخصیت کو شاہانہ بنانے میں ان کے لباس کا بھی بڑا عمل دخل رہا۔ وہ بہت خوش لباس خاتون تھیں۔ خود ان کے ایک بیان کے مطابق ان کے وارڈ روب میں ساڑیوں کا اتنا کلیشن موجود تھا جو شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ وہ ہر تقریب میں ایک نئی ساڑی زیب تن کیے ہوتی تھیں۔ وہ اپنے بناؤ سنگھار پر بہت توجہ دیتی تھیں۔ ان کے ساڑی باندھنے کا انداز بے حد خوبصورت تھا۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ پاکستان کے بڑے بڑے سیاست دانوں، صدور اور وزراء سے تعلقات رہے۔ ہمارے حکمراں اس عظیم فنکارہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔

1974ء میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد کی۔ اس موقع پر ایک تقریب میں جس میں شاہ فیصل، رضا شاہ پہلوی، شاہ حسین، کرنل معمر قذافی، یاسر عرفات، انور سادات اور سوئیکارنو سمیت اسلامی دنیا کے دیگر حکمراں اور اہم شخصیات شریک تھیں، نور جہاں نے معروف مصری گلوکارہ ام کلثوم کے ساتھ ایک گیت گایا تھا جسے تقریب میں شریک عالمی راہنماؤں نے بہت سراہا۔

ملکۂ ترنم وہ واحد پاکستانی گلوکارہ ہیں جنہوں نے برطانیہ کے البرٹ ہال میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر انہوں نے متعدد عالمی شہرت یافتہ گلوکاروں کی موجودگی میں محفل لوٹ لی تھی۔

دوستو! وقت گزر جاتا ہے تو اس کی گرد آہستہ آہستہ جمنے لگتی ہے اور بہت سی باتیں یادوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ مادام کے سلسلے میں بھی بہت سی باتیں لوگوں کو یاد نہیں رہیں۔ ابھی میں نے میڈم کی ساڑیاں باندھنے کے انداز کی بات کی تھی۔ یہ بات بتانے کی ہے کہ انہوں نے یہ انداز مختار بیگم سے سیکھا تھا۔ اس دور کا تاریخ داں کہتا ہے کہ نامور ڈرامہ ایکٹر آغا حشر کاشمیری کی اداکارہ اور گلوکارہ بیگم مختار بیگم کے ساڑی باندھنے کا انداز بھی یہی تھا۔ میڈم جس زمانے میں مختار بیگم سے ملی تھیں اس دور میں وہ چائلڈ اسٹار تھیں مگر ذہین بچی ہونے کی وجہ سے انہیں ان کے ساڑی باندھنے کا اسٹائل یاد رہ گیا اور جب وہ ساڑی باندھنے کے قابل ہو گئیں تو وہی انداز اپنایا۔

بات کا رخ اگر ماضی کی طرف چلا گیا ہے تو اس زمانے کی کچھ اور باتیں بھی شیئر کرتا چلوں گا۔ یہ بات بھی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ میڈم نور جہاں نے بطور چائلڈ اسٹار خاموش فلموں میں کام کر کے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا تھا۔ ان کی پہلی خاموش فلم ''ہند کے تارے'' تھی جو 1930ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کے والد مدد علی اپنے

TAGPK.COM

خاندان کے ساتھ کلکتہ چلے گئے تھے۔ وہاں بھی انہوں نے کئی خاموش فلموں میں بہ حیثیت چائلڈ اسٹار کام کیا۔ یہ فلمیں 1931ء اور اس کے بعد ریلیز ہوئیں۔ انہوں نے بہت جلد خود کو کامیاب چائلڈ اسٹار منوالیا تھا۔

1930ء کے عشرے کی بات ہے کہ ان کی ملاقات مختار بیگم سے ہوئی تو انہوں نے ان کے اندر موجود خوبیوں کو بھانپ کر ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ انہیں کئی پروڈیوسرز سے ملوایا اور اداکاری اور گلوکاری کی بہت سی باریکیوں سے آگاہ کیا۔

مادام کو ''ملکۂ ترنم'' کا خطاب کب اور کیسے ملا؟ یہ بھی ایک سربستہ کہانی ہے۔ اس سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں کہ صدر پاکستان جنرل ایوب خان نے انہیں ''ملکۂ ترنم'' کے خطاب سے نوازا مگر اس واقعہ سے بہت پہلے 1945ء میں متحدہ ہندوستان کے زمانے میں انہیں اس خطاب سے نوازا جاچکا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ 1945ء میں نور جہاں کی ایک سپرہٹ فلم ''زینت'' ریلیز ہوئی جس کی موسیقی اور گیتوں نے تہلکہ مچادیا۔ اس فلم میں ایک قوالی نور جہاں، زہرہ بائی انبالہ والی اور امیر بائی کرناٹکی کی آوازوں میں ریکارڈ کی گئی جس نے فلمی صنعت میں ایک نیا رجحان متعارف کرایا۔ اس قوالی کے بول تھے۔

آہیں نہ بھریں، شکوے نہ کیے
کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے
ہاتھوں سے کلیجا تھام لیا

یہ پہلی قوالی تھی جو گلوکاروں کے بجائے گلوکاراؤں کی آواز میں ریکارڈ ہوئی۔ زہرہ بائی اور امیر بائی بھی بہت پختہ کلاسیکل سنگرز تھیں۔ نور جہاں کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر انہوں نے سماں باندھ دیا۔ اس فلم میں نور جہاں کا ایک گانا

آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا

بڑے درد بھرے انداز میں گایا گیا تھا۔ فلم ''زینت'' کے گانوں پر نور جہاں کو ''ملکۂ ترنم'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اللہ وسائی کو ''نور جہاں'' کا نام کس نے دیا؟ انہیں اللہ وسائی سے ''نور جہاں'' کا نام دینے والے آغا حشر کاشمیری تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ بچی تھیں اور آغا صاحب کی بیگم سے ملی تھیں اور ان کی سفارش پر آغا صاحب نے انہیں اپنے تھیٹر میں پرفارم کرنے کا موقع دیا تھا۔ اس وقت انہوں نے کہا۔ ''بھئی! یہ اللہ وسائی بھی کوئی نام ہے۔ تمہارے گلے میں تو نور ہے۔ اس لحاظ سے تمہارا نام تو میرے خیال میں نور جہاں ہونا چاہیے۔'' اور بس اس وقت سے وہ بے بی نور جہاں کے نام سے مشہور ہوگئیں۔

وقت گزرتا رہا اور بے بی نور جہاں فلموں میں اداکاری اور گلوکاری کرتی رہی۔ اس دوران ان کی عمر میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سیانی ہوچکی تھیں اور اب بطور چائلڈ اسٹار کاسٹ کرنا مناسب نہیں رہا تھا۔ وہ اس وقت تک بے بی نور جہاں کے نام سے اٹھ فلموں میں جلوہ گر ہوچکی تھیں کہ انہیں ہیروئن کے رول میں پیش کرنے سے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز ہچکچا رہے تھے مگر یہ خطرہ پنچولی آرٹ پروڈکشنز نے مول لیا اور نور جہاں کو فلم خاندان میں پران کے مقابل ہیروئن کے طور پر پیش کیا۔ یاد رہے کہ فلم ''خاندان'' بطور ہدایت کار سید شوکت حسین رضوی کی پہلی فلم تھی۔ اس سے پہلے وہ گل بکاؤلی، یملا جٹ اور چودھری کی ایڈیٹنگ کرچکے تھے۔

''خاندان'' میں بہترین اداکاری اور گلوکاری کا مظاہرہ کرکے وہ کانن دیوی، شانتا آپٹے اور خورشید بیگم کے بعد برصغیر کی چوتھی سنگر ہیروئن بن گئیں۔ اس فلم میں نور جہاں کا گانا ''میرے لیے جہان میں چین ہے نہ قرار ہے'' ناقابل فراموش گیت ثابت ہوا۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی جس کے بعد نور جہاں کی مانگ میں اضافہ ہوتا گیا۔ دوستو! یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ نور جہاں کی یہ فلم بطور ہیروئن اور سید شوکت حسین رضوی کی بہ حیثیت ہدایت کار پہلی فلم تھی اور اس پہلی فلم کے دوران ہی دونوں ایک دوسرے کی محبت میں ایسے مبتلا ہوگئے کہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

1942ء کی اس فلم کی تکمیل کے دوران ملکۂ ترنم کی عمر صرف 16 برس تھی۔ اس محبت کے چرچے ہر جگہ ہونے لگے۔ سید صاحب نور جہاں کو ساتھ لے کر لاہور سے ممبئی چلے گئے۔ اس شادی میں نور جہاں کے گھر والے شامل نہیں تھے کیونکہ وہ اس شادی کے خلاف تھے۔ یہ دونوں شادی کے بعد ایک طویل عرصے تک ساتھ رہے۔

یہ بات بھی قابلِ دید ہے کہ میڈم ابتدا ہی سے بڑی عاشقانہ مزاج کی واقع ہوئی تھیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ 1955ء میں پنجابی فلم ''پاٹے خان'' کی ریکارڈنگ کے دوران تقسیم کار ایم فہیم کے عشق میں گرفتار

ہوگئیں لیکن یہ افیئر زیادہ عرصہ نہیں چلا جبکہ کچھ عرصے بعد 19 اکتوبر 1959ء کو انہوں نے سید صاحب کو چھوڑ کر اداکار اعجاز سے شادی کر لی۔ اعجاز اس وقت 25 برس کے نوجوان تھے جبکہ میڈم پختہ عمر کی خاتون تھیں۔ دونوں شریک حیات کے طور پر دس برس تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ ان کا ساتھ اس وقت ختم ہوگیا جب اعجاز نے اداکارہ فردوس سے شادی کر لی۔ یہ آپ کو پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ اعجاز سے علیحدگی کے باوجود آخری دم تک وہ اس بے وفا سے محبت کرتی رہیں۔

یاد رہے کہ میڈم نور جہاں نے بھارتی فلموں میں 127 گانے گائے۔ ان کی 55 فلمیں ممبئی میں بنیں، 8 کلکتہ میں، 5 لاہور میں اور ایک رنگون (برما) میں بنائی گئی۔ متحدہ ہندوستان میں ان کی ریلیز ہونے والی آخری فلم ''مرزا صاحباں'' تھی جس میں ہیرو کا رول پرتھوی راج کپور کے بھائی ترلوک کپور نے کیا تھا۔ انہوں نے برصغیر میں بننے والی 14 فلموں میں بطور ہیروئن پرفارم کیا۔ 6 فلموں میں بطور چائلڈ اسٹار یا سائیڈ ہیروئن بھی کام کیا۔

واضح رہے کہ فلم ''خاندان'' کی کامیابی کے بعد نور جہاں ممبئی شفٹ ہوگئی تھیں۔ ''خاندان'' 1942ء کی فلم تھی۔ ممبئی میں ان کی فلمیں نوکر (1943ء)، نادان (1943ء)، دوست (1944ء) اس دور کی مشہور فلمیں تھیں۔ ''دوست'' میں ان کے ہیرو موتی لال تھے۔ سید شوکت حسین رضوی نے ان کے بھائی کا کردار ادا کیا تھا۔ اگرچہ اس وقت وہ میاں بیوی بن چکے تھے۔ فلم ''لال حویلی'' میں مینا کماری نے نور جہاں کے بچپن کا رول کیا تھا۔ 1945ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''بڑی ماں'' میں جو ماسٹر وی ناٹک کی فلم تھی، مادام نے ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ اس فلم میں بے بی لتا منگیشکر اور بے بی آشا منگیشکر نے ٹائٹل کردار کیے تھے۔ ''بڑی ماں'' کے گیتوں کی موسیقی کے دتا نے مرتب کی تھی۔ گیت ضیا سرحدی نے لکھے تھے جن کے بول تھے۔

☆ دیا جلا کر آپ بجھایا تیرے کام نرالے
☆ آ انتظار ہے تیرا دل بے قرار ہے میرا
☆ تم ہم کو بھلا بیٹھے ہم تم کو بھلائیں کیسے
☆ کسی طرح بھی چین پا نہ سکے گی
وہ آگ سینے میں جو لگی ہے۔

1945ء میں تیسری فلم نور جہاں کی ''گاؤں کی گوری'' تھی جس میں انہوں نے نذیر کے مقابل ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار امر ناتھ تھے جبکہ شیام سندر موسیقار تھے۔ ولی صاحب کے لکھے گیت نور جہاں نے گائے جن کے بول تھے۔

☆ کون ہنسا کس نے ستاروں کو ہنسایا چپکے سے
☆ جن پردیسی بلم پردیسی من کو ستائے
☆ کس طرح بھولے گا دل ان کا خیال آیا ہوا
☆ بیٹھی ہوں تیری یاد کا لے کر میں سہارا
آجاؤ کہ چمکے میری قسمت کا ستارا
☆ رت ہوئی سہانی، ہے کلیوں کی کہانی
☆ میں کھیتوں کی چڑیا میری پنکھ نرالی
ساون کی مدھ ماتی رت میں

1945ء میں نور جہاں کی بطور ہیروئن اگلی فلم ''زینت'' تھی جسے شوکت حسین رضوی نے ایسٹرن پکچرز کے لیے بنایا تھا۔ اس فلم میں کرن دیوان نور جہاں کے ہیرو تھے۔ موسیقی رفیق غزنوی، حفیظ خان اور میر صاحب نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے گیتوں نے بہت مقبولیت حاصل کی۔

☆ بلبلو مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع
☆ آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کر رہ گیا
☆ ناچو ستارو تا چو اب چاند نکلنے والا ہے
☆ آ جا رے نندیا تو آ کے نہ جا
☆ آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیا کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
☆ سکھی آیا ساون آیا

یہ سارے گیت نغمہ نگار شیون رضوی نے تحریر کیے تھے۔

اگلے برس 1946ء میں نور جہاں کی بطور ہیروئن تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ پہلی فلم محبوب پروڈکشن کی ''انمول گھڑی'' تھی۔ ہدایت کار محبوب خان تھے۔ موسیقی موسیقار اعظم نوشاد نے ترتیب دی تھی۔ ''انمول گھڑی'' کے ہیرو سریندر تھے۔ اس فلم کے گیت نور جہاں نے بڑی خوبصورتی سے گائے تھے جن کے بول تھے۔

☆ جواں ہے محبت حسیں ہے زمانہ
لٹایا ہے دل نے خوشی کا خزانہ
☆ میرے بچپن کے ساتھی مجھے بھول نہ جانا
دیکھو دیکھو ہنسے نہ زمانہ

TAGPK.COM

☆ کیا مل گیا بھگوان تمہیں دل کو دکھا کے
☆ آ جا میری برباد محبت کے سہارے
☆ آواز دے کہاں ہے دنیا میری جواں ہے
یہ تمام گیت تنویر نقوی نے لکھے تھے۔ یہ سب کے سب سپر ہٹ ثابت ہوئے۔

اس سال کی دوسری فلم "دل" تھی جس کے ہیرو ایک نئے اداکار عبداللطیف تھے۔ اس فلم کو فضلی برادرز کے لیے فضل حسین فضلی نے بطور ہدایت کار بنایا۔ اس کی موسیقی ظفر خورشید نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں نور جہاں کے گائے ہوئے گیتوں کے بول تھے۔

☆ آئی آئی گھڑی یہ سہانی
☆ بھنورے شور نہ کرنا
☆ چلی گاڑی دھواں اڑاتی چلی
لہراتی اور بل کھاتی چلی
☆ دے کے مجھے وہ درد جگر بھول گئے کیا

اس فلم کے گیت شمس لکھنوی، عرش حیدری اور رضی الدین بنارسی نے لکھے تھے۔

اس سال کی نور جہاں کی تیسری فلم "ہم جولی" تھی۔ یہ فلم عبداللہ پروڈکشن کے بینر تلے 1946ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کو لقمان اور اسماعیل میمن نے مشترکہ طور پر ڈائریکٹ کیا تھا۔ اس فلم میں نور جہاں کے مقابل جے رام ہیرو تھے۔ حفیظ خان کی موسیقی میں انہوں نے یہ گیت گائے تھے۔

☆ راز کھلتا نظر نہیں آتا
کون ہوں کیا ہوں.....
☆ درد سے جگ میں کوئی آزاد نہیں
☆ پھولوں میں نظر یہ کون آیا
☆ بھگوان کب تک تیری دنیا میں یہ اندھیرا رہے گا

اگلے برس 1947ء میں نور جہاں کی بطور ہیروئن دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ پہلی فلم "جگنو" تھی دوسری فلم "مرزا صاحباں"۔ جگنو کے ہدایت کار ان کے شریک حیات سید شوکت حسین رضوی تھے۔ یہ فلم شوکت آرٹ پروڈکشن کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں نور جہاں کے مقابل دلیپ کمار ہیرو تھے۔ موسیقی فیروز نظامی نے کمپوز کی تھی۔ اس فلم کے یہ گیت بے حد مقبول ہوئے۔

☆ ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی
☆ امنگیں دل کی مچلیں مسکرائی زندگی اپنی
☆ آج کی رات ساز دل پر درد نہ چھیڑ
☆ تم بھی بھلا دو میں بھی بھلا دوں
☆ یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے

دوسری فلم "مرزا صاحباں" تھی جو غیر منقسم ہندوستان میں نور جہاں کی آخری فلم تھی۔ اس فلم کو مدھوکر پکچرز کے لیے امر ناتھ نے بنایا تھا۔ ترلوک کپور ہیرو تھے۔ موسیقی پنڈت امر ناتھ اور حسن لال بھگت رام نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں نور جہاں نے یہ گیت گائے تھے۔

☆ تم آنکھوں سے دور ہو
☆ کیا یہی تیرا پیار تھا
☆ ہائے رے اڑ اڑ جائے مورا ریشمی دوپٹا
☆ آ جا تجھے افسانہ جدائی کا سنائیں
☆ رت رنگیلی آئی چاندنی چھائی
چاند میرے آ جا
☆ ہاتھ سینے پر جو رکھ دو تو قرار آ جائے

یاد رہے کہ اس فلم کے گیت قمر جلال آبادی اور عزیز کشمیری نے تحریر کیے تھے۔

مادام کی نجی زندگی کی کچھ باتیں بڑی دلچسپ ہیں جنہیں جان کر آپ بھی محظوظ ہوں گے مثلاً مرغن غذائیں، ٹھنڈا پانی اور کھٹی ترش چیزیں گلے کے لیے زہر سمجھی جاتی ہیں لیکن میڈم جب گانے کی ریکارڈنگ کے لیے جاتیں تو پہلے تھوڑا سا اچار کھاتیں اور پھر ٹھنڈا پانی پی کر گانا شروع کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا۔

"میرا گلا خدا کی دین ہے اور وہی اس کی حفاظت کرتا ہے۔"

ان کی کچھ عادتیں بھی منفرد تھیں۔ میڈم غیر ضروری طور پر گھر سے باہر جانا سخت ناپسند کرتی تھیں۔ انہیں تقریبات یا ہوٹلوں میں جانا پسند نہیں تھا نہ ہی انہوں نے کبھی نجی تقریبات میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

ان کی شخصیت کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ میڈم نور جہاں بھرپور شخصیت کی مالک تھیں۔ بالوں کو بیچ سے مانگ نکال کر جوڑے کی شکل میں باندھنا اور بھاری بھرکم زیورات پہننا انہیں پسند تھا۔ بھاری میک اپ اور رنگارنگ ساڑیاں ان کا گویا ٹریڈ مارک بن چکی تھیں۔ وہ ایک بار استعمال کیا ہوا زیور اور ایک بار پہنی ہوئی ساڑی بہ مشکل دوسری بار پہنتی تھیں۔

پاکستان آنے کے بعد میڈم نور جہاں نے لاہور میں

TAGPK.COM

شاہ نور اسٹوڈیو کی بنیاد رکھی۔ یہ مملکت پاکستان کو نور جہاں کی طرف سے پہلا تحفہ تھا۔ اس وقت پاکستان میں فلم انڈسٹری ابتدائی مراحل میں تھی اور فلمسازی ایک دشوار ترین کام تھا۔ نور جہاں نے شاہ نور اسٹوڈیو بنا کر پاکستانی فلمی صنعت کے لیے اُمید کی کرن پیدا کر دی تھی۔

پاکستان آکر بھی انہوں نے اپنی اداکاری اور گلوکاری کا سلسلہ جاری رکھا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کوئی فنکار چند برسوں تک عوام کی نگاہوں سے اوجھل رہے تو دوبارہ واپس آنے پر اسے پہلی سی پذیرائی نہیں ملتی مگر مادام کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ چار سال تک سلور اسکرین سے دور رہنے کے بعد جب دوبارہ طلوع ہوئیں تو ان کی ساکھ پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔ بھارت میں ان کی آخری فلم ''جگنو'' تھی جبکہ چار سال کے وقفے کے بعد انہوں نے پاکستان میں ''چن وے'' سے اپنی واپسی کا ثبوت دیا مگر ان کی شہرت اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

قیام پاکستان کے بعد میڈم نور جہاں نے بطور اداکارہ 13 فلموں میں اداکاری کے ساتھ گلوکاری کی۔ اس کے بعد انہوں نے اداکاری سے ناتا توڑ لیا۔ 1960ء سے انہوں نے اپنی گلوکاری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ پلے بیک سنگر کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم ''جان بہار'' تھی جس میں ان کے گائے ہوئے گانے مسرت نذیر پر پکچرائز ہوئے۔ یہ سید شوکت حسین رضوی کی ذاتی فلم تھی جس میں پہلے وہی ہیروئن تھیں اور انہوں نے اپنے ہی لیے سارے گیت ریکارڈ کرائے تھے مگر اس دوران سید صاحب سے طلاق کے سبب انہیں اس فلم کی کاسٹ سے الگ کر دیا گیا اور ان کی جگہ مسرت نذیر کو کاسٹ کر لیا گیا۔ اس کے بعد میڈم نے پھر اداکاری سے توبہ کر لی اور بطور گلوکارہ گاتی رہیں۔ انہوں نے صبیحہ خانم سے لے کر ریما تک کے لیے پلے بیک سنگنگ کی۔ انہوں نے 1996ء میں فلم ''سخی بادشاہ'' کے لیے اپنا آخری گانا ''کی دم دا بھروسا یار'' ریکارڈ کرایا تھا۔ اپنی گرتی ہوئی صحت کے باعث وہ چار سال تک شوبز کی دنیا سے دور رہیں۔ ان کے آخری ایام خاصے تکلیف دہ تھے مگر انہوں نے بڑی ہمت سے اپنی بیماری کا سامنا کیا۔

دوستو! اب ذرا دل تھام کر بیٹھو کہ اس کروفر اور شاہانہ زندگی گزارنے والی تابغۂ روزگار سرِ سنگیت کی ملکہ کو ایسی غم کی آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کی زندگی کا باغ ہی اجڑ کر رہ گیا۔ 1987ء میں میڈم نور جہاں کو شکاگو میں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہیں ان کی کامیاب سرجری کر دی گئی۔ چند برسوں تک دل کا معاملہ درست رہا مگر 1997ء میں دوبارہ دل کا دورہ پڑا تو وہ کراچی کے ایک نجی اسپتال میں زیر علاج رہیں۔ اسی دوران انہوں نے لاہور جا کر فلم ''سخی بادشاہ'' کے لیے گانے ریکارڈ کرائے جو ان کے آخری فلمی گیت ثابت ہوئے۔ دل کی بیماری کے ساتھ میڈم کو گردوں کی بیماری بھی لاحق ہو گئی جس کی وجہ سے انہیں امریکا کے ''کولینڈ'' اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس دوران ایک بار پھر ان کی ہارٹ سرجری ہوئی جو کامیاب رہی لیکن گردوں کی حالت خراب ہو گئی جس کا علاج کڈنی سینٹر میں ہوتا رہا پھر علاج کے لیے انہیں لندن جانا پڑا۔ واپسی کے بعد کراچی میں ایک بار پھر دل کا دورہ پڑا اور جگر سے خون رسنے لگا جس کی وجہ سے انہیں آغا خان اسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں رکھا گیا مگر ان کی حالت سنبھل نہ سکی اور وہ تقریباً ایک سال تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد 27 رمضان 1421ھ بہ مطابق 23 دسمبر 2000ء بروز ہفتہ دوپہر ساڑھے بارہ بجے کراچی میں اپنے داماد حسن سردار کے گھر میں انتقال کر گئیں۔ انہیں ڈیفنس کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

انہیں اپنے چاہنے والوں سے بچھڑے 21 برس بیت گئے ہیں مگر آج بھی دنیا ان کے گیت گاتی ہے اور ان کو اپنے درمیان پاتی ہے۔ وہ بلا مبالغہ سرِ سنگیت کی ملکہ تھیں۔ 1960ء سے 1990ء تک وہ بطور پلے بیک سنگر پاکستانی فلم انڈسٹری پر راج کرتی رہیں۔ انہوں نے کچھ البمز بھی تیار کیے تھے۔ ان کی مقبولیت کا چاند کبھی نہیں گہنایا۔ انہیں بے شمار ایوارڈز اور اعزازات دیے گئے۔ تقریباً 65 برس تک فن کی خدمت کرنے کے صلے میں اور اس کے اعتراف کے سلسلے میں سرکاری اور نجی سطح پر اعزازات سے انہیں نوازا جاتا رہا۔ انہوں نے فلم ''انتظار'' اور فلم ''دامن'' کے گیت گا کر دو قومی صدارتی اعزاز تمغۂ حسن کارکردگی اور نشانِ امتیاز حاصل کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انارکلی، کوئل، آگ کا دریا، لاکھوں میں ایک، سالگرہ، دوستی، آج اور کل، چراغ بالی اور ماجھو کے لیے بہترین گلوکارہ کے نگار ایوارڈز حاصل کیے۔ ان کے علاوہ 1981ء میں تیس سالہ بہترین کارکردگی پر ''الیاس رشیدی گولڈ میڈل'' اور 1990ء میں

TAGPK.COM

چالیس سالہ کارکردگی پر خصوصی نگار ایوارڈ حاصل کیے۔ علاوہ ازیں انہیں دیگر عوامی ایوارڈز سے بھی نوازا جاتا رہا۔

مادام نور جہاں اپنے بچوں سے بے پناہ پیار کرتی تھیں بلکہ بچوں کے بچوں کو بھی دیوانہ وار چاہتی تھیں۔ ان کی پوتی سونیا جہاں نے بھارتی فلم ''تاج محل'' میں ممتاز محل کا کردار ادا کیا تھا۔ ان سے مشابہت رکھنے والی سونیا جہاں کے حسن رکھ رکھاؤ اور چال ڈھال میں شاہانہ انداز اور ایک شان بے نیازی جھلکتی ہے۔ ان کی اولادوں میں ظل ہما نے ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے گلوکاری سے رشتہ استوار کیا تھا مگر وہ ماں کی طرح شہرت حاصل نہ کر سکیں۔

ملکۂ ترنم نے ایک عورت، ایک بیوی، ایک ماں، ایک نانی اور ایک دادی کی حیثیت سے اپنا کردار بڑے اچھے انداز میں ادا کیا۔ وہ برصغیر کی وہ عظیم گلوکارہ ہیں جن کے بارے میں ماضی میں ایک بھارتی اداکار نے کہا تھا۔

''ہم سے کشمیر لے لو اور نور جہاں ہمیں دے دو۔''

اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنی بڑی گلوکارہ تھیں۔ ایک نور جہاں وہ تھیں جو ہندوستان کی ملکہ بنیں اور ایک نور جہاں یہ تھیں جو برصغیر کی نامور گلوکارہ بنیں۔ ان کی آواز برصغیر سے اٹھی اور پوری دنیا میں چھا گئی۔ ان کے آگے بڑی بڑی گلوکاراؤں کے چراغ گل ہو جاتے تھے۔ انہوں نے ایسا نام پیدا کیا کہ عرصہ دراز تک ان کے فن کے سامنے کسی کا جادو نہ چل سکا۔ لتا منگیشکر، ملکۂ ترنم کا اس طرح احترام کرتی تھیں جیسے ایک شاگرد اپنے استاد کا اور ایک پجارن اپنے دیوتا کا احترام کرتی ہے۔ لتا نے نور جہاں کو آواز کی دیوی کا خطاب بھی دے رکھا تھا۔ لتا بلاشبہ ایک مہان گلوکارہ ہیں۔ اپنی گلوکاری کے علاوہ اپنی نجی شخصیت اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے بھی وہ اعلیٰ اقدار کی مالک ہیں۔ ان کا ایک واقعہ جو اس وقت میں بتاؤں گا اس سے بھی ان کی اعلیٰ ظرفی کا اندازہ ہوگا۔

1978ء میں EMI جو HMV کا ذیلی ادارہ تھا، نے میڈم نور جہاں کی غزلوں کا ایک LP لونگ پلے ریلیز کیا تھا جسے انڈیا میں بھی بہت پسند کیا گیا تھا۔ جب اس LP ریکارڈ کو انڈیا کی لیجنڈ اور مشہور گلوکارہ آشا بھوسلے نے سنا تو وہ نور جہاں کی موجودہ آواز، شاعری اور غزلوں کی طرزوں سے بے حد متاثر ہوئیں۔ انہوں نے کچھ دنوں کے بعد ان تمام غزلوں کو اپنی آواز میں ریکارڈ کروا کر نور جہاں کو خراج تحسین پیش کیا اور اس لونگ پلے کو کشش کے نام سے انڈیا میں ریلیز کر دیا۔

موسیقار ماسٹر عبداللہ، نذر حسین اور محسن رضا جنہوں نے مادام کے لونگ پلے کے لیے موسیقی کمپوز کی تھی، وہی موسیقی آشا نے بھی اپنے LP کشش میں استعمال کیا حالانکہ اس وقت تک ان میں سے کوئی بھی موسیقار انڈیا نہیں گیا تھا۔

آشا بھوسلے ان غیر فلمی غزلوں کا LP لے کر اپنی دیدی لتا منگیشکر کو سرپرائز دینے گئیں مگر لتا نے اسے سن کر

ضمیر جعفری

سید ضمیر جعفری نے ابتدائی تعلیم جہلم سے حاصل کی اور پھر لاہور کا رخ کیا اور اسلامیہ کالج لاہور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان کا اصل نام سید فخر حسن ہے۔ وہ چک عبدالخالق (جہلم) کے ایک معزز سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مبشر حسین شاہ ہے۔ ضمیر جعفری کے قلمی نام سے انہوں نے شاعری کا سفر شروع کیا۔ انہوں نے دونوں انداز (سنجیدہ اور مزاح) میں شاعری کی مگر مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل کی جب کہ ان کی سنجیدہ شاعری بھی اہم ہے مگر مزاحیہ شاعری میں کمال حاصل کیا۔ انہوں نے معاشرتی ناہمواریوں، طبقاتی، تضاد اور سماجی مسائل کو مزاح کے رنگ میں پیش کیا۔ ضمیر نے مشکل الفاظ کا سہارا نہیں لیا بلکہ آسان سادہ اور عام فہم زبان میں شاعری کی ایسی شاعری جو قاری کو متاثر کرتی ہے اور ان کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں ایک اچھے نثر نگار بھی تھے مگر ان کی اصل فیلڈ طنز و مزاح ہی تھا اور مزاحیہ شاعر ہی کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر فوج میں ملازم ہو گئے اور مختلف تعلقات عامہ سے وابستہ رہے۔ میجر کے عہدے پر فائز رہے۔ فوج کے رسالہ ''الہلال'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اپنے طویل عرصہ ملازمت کے دوران انہیں کئی ایک محاذوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ بیرون ملک کا سفر بھی کیا۔ عمر کے آخری دور میں انہیں ان کے بیٹے نے امریکا بلایا۔ وہ گئے اور قسمت میں نہ تھا کہ واپس آتے، دل کا دورہ پڑا، انتقال ہو گیا اور میت پاکستان لائی گئی۔

TAGPK.COM

خوش ہونے کے بجائے خاصی ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا۔
''آشا! تم ایک بڑی گلوکارہ ہو اور بڑی گلوکارہ کو کسی دوسری مہان گلوکارہ کی ہو بہو کاپی کرنا زیب نہیں دیتا۔ تم نے بہت غلط کیا ہے۔ اب تمہارا یہ ریکارڈ سن کر لوگ تمہاری آواز کا موازنہ نور جہاں سے کریں گے۔ فلموں کی حد تک تو چل جاتا ہے مگر غیر فلمی نغمات میں ایسا کرنا مناسب نہیں۔''
یہ تھا اس بڑی گلوکارہ کا بڑا پن کہ اس نے اپنی بہن کی غلط حرکت پر اسے بخشا نہیں۔ ٹھیک ٹھاک طریقے پر ان کی کلاس لی۔

اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ آشا بھوسلے نے بڑے چاؤ اور دل کی گہرائیوں سے اس لونگ پلے کی غزلیں گائی تھیں مگر ان کا یہ LP وہ شہرت حاصل نہ کر سکا جو مادام کے لونگ پلے کو حاصل ہوئی تھی۔

ایک بھولی بسری بات یاد آ گئی۔ 40-1939ء کی بات ہے۔ اس وقت کی انڈیا گورنمنٹ نے دیہاتی زندگی کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا پروگرام بنایا۔ دیہاتی زندگی چونکہ موسیقی سے جڑی ہوتی تھی جہاں ہر خوشی اور ہر غم کا اظہار گیتوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ ویسے بھی موسیقی انسانی زندگی میں تبدیلی لانے کا آسان ذریعہ رہا ہے لہٰذا دیہات کے لوگوں کی ذہنی اور معاشی ترقی کے لیے اس پروگرام کا نام ''دیہات سدھار'' رکھا گیا جس میں گیتوں کی شاعری کے ذریعے صحت، صفائی، تعلیم، بچت اور جانوروں پر ظلم نہ کرنے کا پیغام دیا جاتا۔ اس پروگرام میں ہر چھوٹے بڑے گلوکار نے اپنا حصہ ڈالا۔ جس میں بے بی نور جہاں بھی شامل تھیں جس کی آواز میں انڈین گورنمنٹ نے ''دیہات سدھار'' کے نام سے دو گیت دو مختلف ریکارڈز میں جاری کیے۔
اوّل ریکارڈ میں یہ گیت تھا۔
کر ہوش رتی دھوے بال کڑے دپھرے
گندہ تہرا بال کڑے ..... پیا پھردا بھیڑے حال
کڑے نیں تینوں اوسد خیال کڑے
دوئم ریکارڈ میں یہ گیت تھا۔
''ڈھور ڈنگراں تے ظلم نہ کر''
ان ''دیہات سدھار'' گیتوں کی پبلسٹی کے لیے گورنمنٹ کا اپنا ایک ادارہ تھا جو لوگوں کو بغیر قیمت کے ریکارڈ دیتا تھا اور مختلف طریقوں سے سنایا بھی جاتا تھا۔ ان گیتوں کو ان مشہور طرزوں پر بنایا جاتا تھا جو اس زمانے میں مقبول ہوتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ متذکرہ ان دو گیتوں کے ریکارڈز پر اللہ وسائی کا نام درج کیا گیا تھا۔ اگرچہ 1935ء سے ہی انہیں بے بی نور جہاں کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ 1942ء تک جتنے بھی ان کی آواز میں ریکارڈز جاری ہوئے ہیں ان پر بے بی نور جہاں ہی لکھا گیا ہے۔

بے بی نور جہاں کی گلوکاری کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو اس ضمن میں کچھ اور قابل ذکر باتیں بتا دوں۔ بے بی نے اپنی چھوٹی عمر سے گانا شروع کر دیا تھا اور بہت مقبول بھی ہوئی تھیں مگر اس عمر میں یعنی اتنی چھوٹی عمر کے سنگرز کے ریکارڈ بنانے کا رواج نہیں تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ پابندی تھی اس لیے اس بچی کی رس بھری آواز میں گائے ہوئے مقبول نغمات کو اس دور کی چند سینئر گلوکاراؤں کی آواز میں صدا بند کروا کر ریکارڈز تیار کیے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ریگل گراموفون کمپنی نے 1939ء میں
☆ ہنستے ہیں ستارے اے شاہ مدینہ
☆ سن اے شتر سوار
جب پہنچے تو کالی کملی والے کے دربار
پہلی نعت کو مس بیو اور دوسری نعت کو مس ذکریا بیگم آف دہلی کے نام سے پیش کیا گیا۔ بیو نے اپنی آواز میں اور مس ذکریا بیگم نے اپنی آواز میں ریکارڈ کروایا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں نعتیں موسیقار جے اے چشتی نے خود لکھ کر 1934ء میں بے بی نور جہاں سے پڑھوائی تھیں جو اس وقت اللہ وسائی کے نام سے گاتی تھی۔

جب بے بی نور جہاں کی عمر میں ایک دو سال کا اضافہ ہو گیا اور وہ پابندی سے آزاد ہو گئی تو ٹوئن گراموفون کمپنی نے ان کے دو غیر فلمی پنجابی فلموں کا ریکارڈ جاری کیا۔ اس ریکارڈ کے گیتوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ خاص کر یہ گیت ''سوہنے دیساں اندر دیس پنجاب'' جسے ایف ڈی شرف نے لکھا تھا جسے بعد میں اس گیت کی مقبولیت کے پیش نظر فلم ''ہیر سیال'' (1938ء) میں شامل کیا گیا۔ یہ گیت اپنے وقت کا مقبول ترین گیت تھا۔ بعد میں اس گیت کو شمشاد بیگم نے بلقیس بیگم کے نام سے بھی گایا۔ نشاط کمپنی کا یہ ریکارڈ بھی ہاتھوں ہاتھ بکا۔ ذکریا بیگم آف دہلی نے بھی یہ گیت گایا مگر آوازوں کی بھیڑ میں ان کی آواز دب کر رہ گئی، کامیاب نہ ہو سکی۔ پاکستان بننے کے بعد بھی اس گیت کو کئی بار دہرایا گیا۔ خاص کر نسیم بیگم نے فلم ''دیس پنجاب دا'' میں اسی طرز اور شاعری کو بڑے بھرپور انداز میں

TAGPK.COM

دلچسپ اور متاثر کن تحریروں کا مرقع جون 2021ء کا شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے



ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

افشاں آفریدی اور **نایاب جیلانی** کے قسط وار ناول انوکھے موڑ پر

فرح بھٹو کے دلنشیں بیان کا مظہر ناولٹ **چاہ کی راہ میں**

ایلیا علی غفار کی خوب صورت تحریر **بچھڑے ہم سفر**

شبینہ گل کے ماہرانہ قلم سے شاہکار مکمل ناول **تو تاج محبت کا**

پاکیزہ کے مہمان میں پڑھیے

انعم فیاض اور **اسد انور** سے

شائستہ زریں کے دلچسپ سوالات

عورت..... تخلیق الٰہی اختر شجاعت کا پُراثر مضمون

اور

خولہ سعید جاوید، رعنا کوثر، عذرا فردوس، فصیحہ آصف خان،

عروج لبنیٰ قدیر و دیگر لکھاریوں کے لاجواب افسانے

پُرتنوع سلسلوں سے سجا، خوب صورت تراشوں پر مبنی، شعر و شاعری سے مرصع اور حُسن و صحت کے متعلق متن سے آراستہ ماہنامہ پاکیزہ صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے.....

TAGPK.COM

گایا۔ قصہ مختصر یہ کہ ایک طویل عرصے تک یہ گیت مختلف آوازوں میں دنیائے موسیقی میں متحرک رہا مگر جو لوچ، جو سر، جو رس نور جہاں کی آواز میں تھا وہ ان گلوکاراؤں کی آواز میں نہ تھا۔

میڈم نور جہاں جو ملکۂ ترنم کے نام سے مشہور تھیں ان میں ملکاؤں والی بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔ سر سنگیت کی ملکہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دریا دلی بھی ملکاؤں جیسی تھیں۔ یوں تو انہوں نے اپنی اس خوبی کا مظاہرہ متعدد مواقع پر کیا مگر اس سلسلے میں چند واقعات پر ہی روشنی ڈالوں گا۔

گلوکار اخلاق احمد کو خون کا سرطان تھا۔ اس بارے میں تو بہت سے لوگوں کو بہت کچھ معلوم ہے۔ اس سلسلے میں اس کا علاج لندن کے مشہور اسپتال میں بھی ہوا۔ یہ بھی اس کے بہت سے چاہنے والوں کو معلوم ہوگا مگر ایک گلوکار ہونے کے ناتے اس کے پاس اتنی رقم کہاں تھی کہ اس کا علاج لندن کے اسپتال میں ہوتا۔

اخلاق احمد کی حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جارہی تھی مگر وہ اس ڈر سے ڈاکٹروں کے پاس نہیں جاتا تھا کہ اس کے پاس علاج کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس کے دوست اسے مجبور کرنے لگے کہ تمہارا علاج کرانا بہت ضروری ہے اور اس کے لیے تمہیں لندن جا کر علاج کرانا پڑے تو بھی علاج کراؤ۔ وہ بڑی بے بسی سے کہتا۔ ''میری بیوی پی آئی اے میں ملازم ہے۔ لندن آنے جانے کا ٹکٹ تو وہ افورڈ کرلے گی مگر..... مگر علاج کے لیے ہم فارن کرنسی کہاں سے لائیں گے؟ کیسے لائیں گے؟''

نامور نغمہ نگار مسرور انور نے میڈم نور جہاں کو اخلاق احمد کی بیماری اور علاج کے سلسلے میں اس کی مجبوری کے بارے میں بتایا۔

''وہ مجبور ہے۔ ہم لوگ تو مجبور نہیں۔ ہم اس کے علاج کا بندوبست کریں گے۔'' میڈم نور جہاں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا اور پھر یوں ہوا کہ میڈم نے لاہور کے تمام فلمی نگار خانوں۔ آؤٹ ڈور پر گئے ہوئے فلم یونٹوں میں وہ تمام لوگ جن کو دیکھنے فلم بین سنیما گھروں میں آتے ہیں ان کو تین دن کے نوٹس پر لاہور کے ایک ہال میں آنے کا کہہ دیا۔ ان میں اداکار، اداکارائیں، ڈانسر، کامیڈین سب ہی شامل تھے۔ یہ بھی منادی کرادی کہ جو نہیں آئے گا وہ اپنے آپ کو فلموں سے باہر سمجھ لے۔

یہ اخلاق احمد کے لیے ایک بینیفٹ شو تھا۔ اس کے ٹکٹوں پر مادام کے حکم پر کوئی ایکسائز ٹیکس نہیں لگایا گیا تھا۔ راتوں رات جتنی رقم جمع ہوئی سب کو اسٹیٹ بینک کے افسران کو آفس ٹائم کے بعد بلوا کر قانون کے تقاضے پورے کرائے گئے اور چوتھے دن اخلاق احمد کو لندن روانہ کردیا گیا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس شو کے انعقاد کے سلسلے میں جتنے بھی اخراجات ہوئے میڈم نے خود ادا کیے اور اس فنڈ میں اپنی جانب سے بھی رقم ملائی۔

میڈم کی سخاوت کا ایک اور واقعہ جس کے راوی موسیقار اختر اللہ دتہ ہیں جو ریڈیو پاکستان کے مشہور طبلہ نواز استاد اللہ دتہ کے صاحبزادے ہیں۔ اختر اللہ دتہ بتاتے ہیں۔

''ایک بار میڈم کے ساتھ طبلہ بجانے والے علیل ہوکر میو اسپتال لاہور میں داخل ہوگئے۔ میرے والد ان طبلہ نواز کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً میڈم نور جہاں اپنی بیٹی ظل ہما کے ساتھ وارڈ میں داخل ہوئیں۔ اپنے ماسٹر صاحب اور میرے والد کی خیریت معلوم کی اور اپنے پرس سے ایک موٹا تگڑا لفافہ نکال کر طبلہ نواز کو دیا۔ وہ اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھنے لگے تو میڈم بولیں۔ ''اسے کھولیں اور گنیں۔ ''اس غریب نے کیا گننا تھا۔ وہ اتنی بھاری رقم تھی کہ اس بے چارے نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ گھبرا کر اس نے میڈم سے سوال کیا۔ ''کیا یہ سب میرے لیے ہے؟''

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا جس پر ظل ہما جو اس وقت تقریباً 13 برس کی ہوں گی چپ نہ رہ سکیں اور اپنی والدہ سے کہا۔ ''ان ماسٹر صاحب کو اتنے زیادہ پیسے!''

جواب میں میڈم نے اپنی بیٹی کو با آواز بلند ڈانٹتے ہوئے کہا جو وہاں موجود سب نے سنا۔ ''تجھے کیا علم۔ ارے میں جو کچھ ہوں انہی ہاتھوں کی وجہ سے ہوں۔ چل اٹھ۔'' اور غصے کی حالت میں بغیر سلام دعا کے وہاں سے چل دیں۔

اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ دیکھا آپ نے۔ وہ ملکہ تھیں۔ ملکۂ ترنم تھیں۔ ان کی ٹکر کا کوئی اور نہیں تھا مگر ان کا دل کتنا غریب پرور تھا۔ نہ صرف خود چل کر ایک غریب طبلہ نواز کی عیادت کو گئیں بلکہ اسے خطیر رقم بھی پیش کی۔

ان کی ملکاؤں جیسی ایک اور خوبی کی روداد بھی سنتے چلیے جس کے راوی آپ کے جانے پہچانے علی سفیان آفاقی ہیں۔

کسی تقریب کے سلسلے میں میڈم نور جہاں، ان کے شوہر اعجاز، اداکارہ نیلو، اداکار رتن کمار اور میں (آفاقی) ایک بار لاہور سے ڈھاکا پہنچے۔ وہاں ایک اچھے ہوٹل میں ہمارا قیام

وطعام کا انتظام تھا۔ ایک روز میڈم نے کھانے کی بڑی تعریف کی اور کہا۔ ''یہ کھانا جس باورچی نے پکایا ہے اسے بلاؤ۔''

باورچی آیا تو میڈم نے اسے پرس سے کچھ رقم نکال کر دی۔ مادام کو مہربان دیکھ کر اس نے کہا۔ ''میرا اور ہوٹل کے تمام چھوٹے بڑے اسٹاف کا دل چاہتا ہے کہ وہ آپ کو گاتا گاتے ہوئے دیکھیں۔''

میڈم بھی موڈ میں تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''میں کل رات صرف آپ لوگوں کے لیے اور آپ لوگوں کی فیملی کے لیے گاتا گاؤں گی۔''

اگلے روز صبح گورنر ہاؤس سے پیغام آیا کہ رات کو گورنر صاحب نے آپ کو اور اعجاز صاحب کو ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ میڈم تک یہ پیغام پہنچا تو انہوں نے دوٹوک کہہ دیا۔ ''میں تو رات کو ہوٹل کے ملازمین اور ان کے خاندان والوں کے لیے گا رہی ہوں۔'' اور گورنر ہاؤس جانے سے معذرت کر لی۔

یہ اطلاع گورنر تک پہنچی تو گورنر نے خود ٹیلی فون پر میڈم کو ڈنر پر آنے کی درخواست کی لیکن میڈم اپنے فیصلے پر اٹل رہیں اور گورنر صاحب سے صاف صاف کہہ دیا۔ ''گورنر صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میں نے ہوٹل کے ملازمین سے وعدہ کر لیا ہے اس لیے آپ کی دعوت میں نہ آسکوں گی۔''

گورنر صاحب پر جانے کیا گزری ہوگی میڈم کے انکار پر کہ میڈم نے ان پر ہوٹل کے ملازمین کو ترجیح دی۔ بہرحال رات کا پروگرام شروع ہوا۔ میڈم خوب مزے لے لے کر گانے لگیں۔ حاضرین میں سے لوگ پرانے گانوں کی فرمائشیں کر رہے تھے۔ میڈم سنائے جا رہی تھیں۔ اس دوران ان باورچی بابا نے میڈم سے اس گانے کی فرمائش کر دی۔

کس طرح بھولے گا دل ان کا خیال آیا ہوا
جا نہیں سکتا کبھی شیشے میں بال آیا ہوا

بس اس فرمائش کے دوران بابا جی نے یہ جملہ کہہ کر رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔

''اس وقت میں چھوٹا تھا جب یہ گانا سنا تھا۔''

میڈم یہ بات کبھی برداشت نہیں کرتی تھیں کہ کوئی ان کو عمر رسیدہ کہے۔ ان کے تیور ایک دم بدل گئے مگر وہ حیرت انگیز طور پر جلد ہی پُرسکون ہوگئیں اور اس صورتِ حال پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

''ہاں..... اس وقت میں بھی بہت چھوٹی تھی۔''

میڈم میں جمال کے ساتھ ساتھ جلال بھی تھا۔ یہی ان کی شخصیت کی نیرنگی بھی تھی مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ تمام وقت غصہ ناک پر دھرے گھومتی رہتی تھیں۔ ان میں پیار، محبت اور غصہ برابر برابر موجود تھے۔ کسی کے لیے وہ مدد کو آتیں تو تمام اصول اور قاعدے اور مروجہ طریقے ایک طرف رکھ کر کام کروا لیتیں۔ کسی کا حقہ پانی بند کرنا ہوتا تو اللہ کی پناہ..... اس سلسلے میں کئی واقعات آگے بیان کر چکا ہوں۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اعجاز نے ان کی بے پناہ محبت کے باوجود جب انہیں چھوڑ کر فردوس سے ناتا جوڑ لیا تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ انہیں کتنا غصہ آیا ہوگا۔ مگر اپنی جلالی طبیعت کے پیشِ نظر اعجاز کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ ''ہیر رانجھا'' کے لیے فردوس پر پکچرائز ہونے والے گیت ریکارڈ کرائے پھر اعجاز کی فلم ''دوستی'' کے لیے بھی اپنی آواز کا نذرانہ پیش کیا۔ سب سے اہم بات یہ کہ جب اعجاز کو منشیات کے کیس میں لندن میں قید کر لیا گیا تو لندن جا جا کر اعجاز کے لیے جو کچھ بہتری کا سامان کر سکتی تھیں، کرتی رہیں۔

دوستو! اگر اس وقت میں ''ہیر رانجھا'' میں مادام کے کردار کے بارے میں ذرا تفصیل سے حالات کا جائزہ لوں تو یقیناً آپ کو اور دوسرے پڑھنے والوں کو اندر کی بہت سی باتیں جاننے کا موقع ملے گا۔

1970ء میں جب اعجاز نے فلمساز کی حیثیت سے فردوس کو ہیروئن لے کر فلم ''ہیر رانجھا'' بنانے کا اعلان کیا تو میڈم نور جہاں نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا۔ ''میں اس فلم کے لیے گانے نہیں گاؤں گی۔''

میڈم کو اس بات کا بھی علم تھا کہ اس فلم کے ہدایت کار مسعود پرویز اور موسیقار خواجہ خورشید انور ہیں۔ یہ دونوں ہی دبنگ افراد تھے۔ میڈم کو اپنے ذرائع سے مکمل معلومات مل رہی تھیں کہ اعجاز اور فردوس کے علاوہ اس فلم میں منور ظریف، زمرد وغیرہ بھی کام کریں گے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ اعجاز کے ساتھ مسعود پرویز بھی شریک فلمساز ہیں۔ فلم کے گیتوں کے بارے میں بھی انہیں علم تھا کہ تمام گیت اور فلم کے مکالمے احمد راہی لکھ رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خواجہ صاحب نے گیتوں کی اچھی خاصی رسیلی دھنیں بنائی ہیں۔ ان کو یہ اطلاع بھی پہنچ گئی تھی کہ اس فلم کے ڈانس ڈائریکٹر حمید چودھری ہیں اور فلم مکمل ہونے کے بعد ضمیر قمر سے ایڈٹ کروائی جائے گی۔ میڈم کے ذرائع نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ گانوں کی صدا بندی سی منڈو ڈی اور واجد علی شاہ کریں گے ان کو ان کے ذرائع نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ خواجہ خورشید انور ان کے انکار کے بعد وہ سارے گیت جو فردوس پر فلمبند ہوں گے، مالا سے

گوائیں گے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے فردوس پر فلمائے جانے والے سارے گیت خصوصی طور پر میڈم کے لیے ہی کمپوز کیے تھے۔ ان کے ذہن میں اندر کہیں یہ بات محفوظ تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے یہ گانے نور جہاں ہی گائیں گی۔

بہر حال ان گانوں کی ریہرسل کے لیے مالا کو بلوایا گیا مگر مالا، خواجہ صاحب کے پاس جانے سے پہلے خود چل کر نور جہاں کے پاس پہنچیں اور کہا۔ ''میڈم! یہ گانے بنے تو آپ کے لیے تھے لیکن مجھے انہیں گانے کو کہا جا رہا ہے۔ اب آپ کے پاس آئی ہوں۔ بتایئے کیا کروں؟''

میڈم نے مالا کو گانے کی اجازت دے دی۔۔ دوستو! اب ذرا ریکارڈنگ کے وقت کی سنسنی خیز وقوع کی بات سنیے۔

ریکارڈنگ والے روز جب میوزیشن اپنے ساز درست کر رہے تھے اور مالا ریکارڈنگ کے لیے تیار ہو رہی تھیں تو اچانک میڈم آندھی اور طوفان کی طرح جلالی کیفیت میں ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں۔ وہاں موجود تمام لوگ انہیں دیکھ کر دم بخود ہو گئے۔ مالا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ سب سے پہلے میڈم نے مالا سے کہا۔ ''تم یہاں سے جاؤ۔''

وہ بے چاری جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو پڑھتے ہوئے سر پر پیر رکھ کر بھاگی۔

اب میڈم سیدھے خواجہ صاحب کے پاس پہنچیں اور کہا۔ ''خواجہ صاحب! گانا بتائیں، کون سا گانا ہے؟''

خواجہ صاحب نے کسی قسم کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ گویا وہ جانتے تھے کہ ایسا ہی ہونے والا ہے۔ بہر حال انہوں نے میڈم کو گانا بتایا اور میڈم صدا بندی کے لیے تیار ہو گئیں۔

یوں میڈم نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی آن اور انا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے لیکن اس بات سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ فردوس اعجاز کو جس قدر چاہتی تھی اس سے کئی گنا زیادہ میڈم اعجاز کو چاہتی تھیں۔ اعجاز کی خاطر میڈم نے گویا آگے بڑھ کر خوش دلی سے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ اعجاز سے علیحدگی کے بعد بھی ان کے دل میں اعجاز کے لیے جگہ تھی۔ اپنی بیماری کے دوران اور انتقال تک ان کے لبوں پر اعجاز ہی کا نام تھا اعجاز نے بھی میڈم کی بیماری کے زمانے میں ان کی خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اعجاز سے میڈم کی لازوال محبت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ کوئی میڈم نور جہاں کی مخالفت کرے اور اس کے بعد بھی فلموں میں قائم و دائم نظر آئے۔ یہ میڈم کا ہی ظرف تھا کہ انہوں نے فردوس کو اپنی رقابت کے باوجود انڈسٹری میں رہنے دیا۔ یہ انہونی بات ہے کہ اس تمام عرصے فردوس فلموں میں چھائی رہی ورنہ بڑے بڑے طرم خان میڈم کے تیور دیکھ کر ہی کانپ جاتے تھے۔ کہتے ہیں چھوٹے بڑے لوگ میڈم کی وجہ سے فلمی دنیا سے باہر کر دیے گئے۔

دوستو! جی تو نہیں چاہتا کہ اس حسن و جمال کی ملکہ کے جلال کے بارے میں کوئی پوشیدہ کہانی سناؤں مگر یہ داستان ادھوری رہ جائے گی۔ میڈم کی زندگی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ وہ کبھی کبھی ایسی چراغ پا ہو جاتی تھیں کہ اگلے کے لیے اپنے آپ کو بچانا دشوار ہو جاتا تھا۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے۔ ''اک ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے۔'' تو ایسی ہی ایک ذرا سی بات پر میڈم نے پاکستان کے لیجنڈ موسیقار کو لاہور بدر کروا دیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس اجمال کی تفصیل بیان کیے بغیر اس کا جواب نہیں ملے گا۔ یہ روداد جناب نثار بزمی صاحب ہی کی زبان سے سنیے۔

''ریڈیو پاکستان لاہور سے میرا ایک انٹرویو نشر ہوا۔ یہ سیدھا سادا انٹرویو تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے متنازعہ بنا دیا گیا۔ اگرچہ اس میں تنازعے کی کوئی بات نہیں تھی۔ انٹرویو نشر ہونے کے اگلے روز ہدایت کار حسن طارق میرے پاس آئے اور کہا۔ ''آپ نے اپنے انٹرویو میں ایسا کیا کہہ دیا کہ میڈم نور جہاں اس قدر غصے میں ہیں؟''

''میڈم کے بارے میں تو میں نے اس انٹرویو میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ آخر کس بات پر غصے میں آ گئیں؟''

اس پر حسن طارق بے ساختہ بولے۔ ''یہی تو بات ہے کہ آپ نے ان کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی۔''

''کیا آپ نے وہ انٹرویو سنا ہے؟'' میں نے حسن طارق سے پوچھا۔

''جی..... میں نے تو نہیں سنا۔''

وہ یہ باتیں کر کے ابھی گئے ہی تھے کہ پرویز ملک کا فون آ گیا۔ کم و بیش یہی باتیں انہوں نے بھی پوچھیں۔

اور پھر خود میڈم کا خصوصی پیغام بھی آ گیا کہ میں ان کے بارے میں کہی ہوئی بات واپس لوں اور یہ کہ پریس کلب میں پریس کانفرنس بلائی جائے جس کے تمام اخراجات میڈم برداشت کریں گی۔ اس میں، میں یہ کہوں کہ ریڈیو پاکستان نے میرا انٹرویو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور میڈم کے بارے میں جو کہا گیا اس کی نفی کی جائے۔

TAGPK.COM

میں نے پیغام لانے والے سے پوچھا۔ ''کیا میڈم نے وہ انٹرویو سنا تھا؟''

''مجھے اس کا علم نہیں۔''

کچھ دیر بعد ایک اور معروف فلمی شخصیت آئی اور اب ایک نئی بات کہی گئی کہ میں میڈم سے معافی مانگوں۔

اب عجیب صورتِ حال ہوتی جا رہی تھی۔ کئی لوگ ایک کے بعد ایک آ چکے تھے۔ پہلے صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو میڈم کی ناراضگی کا باعث بن گیا۔ اب میڈم سے معافی مانگنے کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ مسرور انور بھی آئے اور کم و بیش وہی ساری باتیں دہرائیں۔ اس بار ایک اور بات کا اضافہ ہو گیا، چونکہ میں نے ابھی تک میڈم سے معافی نہیں مانگی ہے لہٰذا نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہوں۔

اب تو مجھے بھی تشویش ہوئی کہ اس سب معاملے کے پیچھے ہے کیا؟ میڈم تک میں نے اپنا پیغام پہنچایا کہ پتا تو معلوم ہو کہ آخر میں معافی کس بات کی مانگوں؟

معلوم ہوا کہ میڈم نے تو وہ انٹرویو سنا ہی نہیں تھا۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ میں نے میڈم کی تضحیک کی ہے۔ قاصد آ رہے تھے، جا رہے تھے۔ عجیب صورتِ حال ہوتی جا رہی تھی۔ مزید یہ معلوم ہوا کہ جب مجھ سے ریڈیو انٹرویو میں یہ سوال پوچھا گیا۔ ''آپ تو بھارت میں بھی فلموں کی موسیقی ترتیب دیتے رہے ہیں تو پاکستان آ کر آپ کو کس سنگر نے متاثر کیا؟''

میں نے مہدی حسن اور رونا لیلیٰ کا نام لیا۔ میڈم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ پوچھا گیا نہ میں نے کچھ کہا۔ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں۔ وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مذکورہ سوال کے جواب میں نور جہاں کیوں نہیں کہا گیا؟

لیجیے قصہ ہی تمام ہوا۔ میں نے قاصدوں کے علاوہ مسرور انور کو بھی کہا کہ وہ جا کر میڈم سے کہیں کہ آپ کا اس کل کی بچی سے کیا مقابلہ۔ میں نے تو آج کی آوازوں کو سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا تھا مگر ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے آخری مرتبہ کچھ لوگوں کو بیچ میں ڈال کر میڈم سے پوچھا کہ مجھے یہ تو بتایئے کہ معافی کس بات کی مانگوں؟ اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب میڈم کے بقول میں شریف آدمی ہوں لہٰذا میری کم سے کم سزا یہ ہوگی کہ میری موسیقی میں میڈم اب کوئی بھی فلمی گیت نہیں گائیں گی۔ یہی نہیں بلکہ حسن طارق اور پرویز ملک اور دوسرے ہدایت کاروں کو بھی مجھے اپنی فلموں میں کام دینے کی ممانعت ہو گئی۔ یہ سب لوگ میرے پاس آئے کہ میں کوئی بیچ کا راستہ نکالوں۔ میں نے الٹا ان ہی سے کہا۔ ''آپ لوگ ہی کوئی بیچ کا راستہ بتا دیجیے۔ ایک ایسا کام جو میں نے کیا ہی نہیں، میں اس کی معافی کیوں مانگوں؟''

آخری بار کچھ کرم فرما آئے اور انہوں نے حالات کی سنگینی کا اشارہ دیا۔ میں نے ان سے کہا۔ ''آپ لوگ میڈم سے کہہ دیجیے معافی تو میں ہرگز نہیں مانگوں گا۔'' میرے اس انکار پر میڈم نور جہاں نے مجھے پیغام بھجوایا۔

''چونکہ تم شریف آدمی ہو اس لیے میں نے تمہاری یہ سزا تجویز کی ہے کہ تم فوراً لاہور بدر ہو جاؤ۔ لاہور سے چلے جاؤ۔ یہی فلمیں اور کہاں کی موسیقی، سب کچھ بھول کر باقی زندگی اللہ اللہ کرو۔''

یہ بھی ایک رخ تھا اس جلالی ملکہ کا کہ محض اس بات پر کہ ایک موسیقار نے اپنے انٹرویو میں ان کا نام کیوں نہیں لیا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اس ملکۂ معظمہ کا ایک روپ یہ بھی ہے جو اب میں آپ کو دکھاؤں گا۔ یہ اکتوبر 1991ء کا زمانہ تھا جب نثار بزمی صاحب اپنے کسی کام سے لاہور گئے تھے۔ اس زمانے میں نگار پبلک فلم ایوارڈ برائے سال 1990ء کی تقریب ہونے والی تھی جس میں ملکۂ ترنم نور جہاں کو 40 سالہ خدمات کے صلے میں خصوصی ایوارڈ دیا جانا تھا۔ الیاس رشیدی صاحب ایوارڈ ہی کے سلسلے میں لاہور آئے ہوئے تھے اور ان کا قیام لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں تھا۔ ہمارا ایک صحافی بھائی بھی ان ہی دنوں اپنے کسی کام کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا۔ اسے خبر ملی کہ بزمی صاحب لاہور میں موجود ہیں تو وہ صحافی بزمی صاحب سے ان کے ہوٹل میں ملا۔ بزمی صاحب نے صحافی سے کہا۔ ''چلو کچھ فلمی شخصیات سے تمہاری ملاقات کرواتے ہیں۔'' اور وہ اسے اپنے ساتھ فلیٹیز ہوٹل لے آئے۔ یہاں گلوکارہ ناہید اختر بھی ایک کمرے میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ بزمی صاحب ناہید اختر کے کمرے میں گئے۔ ناہید اختر بزمی صاحب کو اتنے دنوں بعد دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ بات چیت کا سلسلہ جاری تھا کہ ہوٹل انتظامیہ سے کوئی شخص آیا اور کہا۔ ''بزمی صاحب سے میڈم نور جہاں بات کرنا چاہتی ہیں۔ وہ ہوٹل انتظامیہ کے آفس میں موجود ہیں۔''

ذرا دیر بعد بزمی صاحب نے ناہید اختر کو اللہ حافظ کہا اور ہوٹل کے آفس کی طرف چل دیے۔ صحافی بھی ان کے ساتھ تھا۔ میڈم بہت تپاک سے ملیں اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھنے کے بجائے بول پڑیں۔ ''بزمی صاحب! میں آپ کو

TAGPK.COM

اپنے خرچ پر حج بیت اللہ کے لیے بھیجنا چاہتی ہوں۔''

''شکریہ میڈم!'' انہوں نے ترنت جواب دیا۔ ''میں حج کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔''

''میں آپ کو دوسرا حج کروا دیتی ہوں۔'' میڈم نے بزمی صاحب کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''میڈم! میں دوسرا حج بھی کر چکا ہوں۔ میں نے دوسرا حج اپنے والد کو کاندھے پر بٹھا کر کیا تھا۔''

میڈم اپنی اس پیشکش کے سلسلے میں ناکام ہو گئیں تو حکمت عملی بدلتے ہوئے بولیں۔ ''بزمی صاحب! یہ کیسٹوں کا زمانہ ہے۔ ابھی تک میں نے کسی کے لیے بھی کیسٹ ریکارڈ نہیں کرایا۔ آپ کوئی سے بھی سات آٹھ گانے تیار کریں۔ میں آپ کے لیے یہ کام کروں گی۔''

اس پر بزمی صاحب بولے۔ ''میڈم! میں تو دس بارہ سال سے فلمی دنیا سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔''

ان سب باتوں کے دوران میڈم بزمی صاحب کے لیے اپنے ہاتھ سے پھل کاٹتی رہی تھیں۔ اس کے بعد چائے دانی سے بزمی صاحب کے لیے پیالی میں چائے بنائی اور پیالی اٹھائے خراماں خراماں چلتے ہوئے ان کے پاس آئیں۔ چائے پیش کرتے ہوئے پتا نہیں ارادتاً یا اتفاقاً کچھ چائے بزمی صاحب کی کولا پوری چپل پر گر گئی۔ میڈم ان کی چپل کی جانب لپکیں اور اپنی قیمتی ساڑھی کے پلو سے ان کی چپل صاف کرنے لگیں۔ بزمی صاحب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا۔

''میڈم! آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟''

میڈم نے ان کی چپل اٹھائی اور اپنے سر پر رکھ لی اور موٹے موٹے آنسوؤں کے ساتھ رونے لگیں۔ اس دوران کبھی کبھی یہ جملہ بھی کہہ جاتیں۔ ''آپ مجھے کچھ تو خدمت کرنے دیں۔''

بزمی صاحب نے برملا کہا۔ ''آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ چھوڑیں، جو ہوا سو ہوا۔''

لگتا تھا میڈم بس یہی جملہ سننا چاہتی تھیں۔ بزمی صاحب کے اس جملے نے اکسیر کا کام کیا اور ایک دم میڈم پہلے والے خوشگوار موڈ میں آ گئیں پھر اچانک انہوں نے صحافی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

یہ سوال انہوں نے بزمی صاحب سے کیا تھا۔ اصولاً اس کا جواب بزمی صاحب کو ہی دینا تھا مگر ان سے پہلے صحافی بول پڑا۔ ''میں ایک چھوٹا سا صحافی ہوں اور آج کا دن میرے لیے خوشیوں بھرا دن ہے۔ مجھے تین شخصیات سے ملنے کا ارمان تھا، وہ آج پورا ہوا۔''

میڈم کو ایک دم طیش آ گیا کہ میرے ساتھ اس ناہنجار نے کسی اور سے ملنے کا ارمان کیوں کیا غصے میں ان کا ہاتھ اس انداز میں اٹھا تھا جیسے وہ اس گستاخ کو زناٹے دار تھپڑ رسید کرنا چاہتی ہوں مگر اس وقت بزمی صاحب کی آواز سنائی دی۔

''میڈم! ہمیں اجازت دیجیے۔''

اور میڈم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بزمی صاحب نے صحافی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''چلو'' اور وہاں سے غصے میں بھرے باہر نکل آئے۔ میڈم نے بڑی بے بسی کے عالم میں اپنا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا لیا۔

میرے پیارے پڑھنے والو! ان واقعات اور ایسے حالات کی عکاسی کرنے کا ہرگز یہ مطلب یا مقصد نہیں کہ ملکۂ ترنم مادام نور جہاں کے فنی قد کاٹھ کو خدانخواستہ کچھ کم کیا جائے۔ وہ ایک عظیم فنکارہ کے ساتھ ایک انسان بھی تھیں اور انسان سے لغزشیں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ فن موسیقی اور سرسنگیت کے حوالے سے بلاشبہ ان کا ثانی برصغیر میں کوئی نہیں۔ اس ضمن میں ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو پیدائشی گلوکارہ تھیں۔ پیدا ہونے کے بعد جب ان کی آواز رونے کی صورت میں سنائی دی تو اس کی پھوپی نے جو خود بھی ایک اچھی گلوکارہ تھیں اپنے بھائی مدد علی سے کہا۔ ''کڑی تے روندی وی سروچ اے۔''

یعنی لڑکی تو روتی بھی سر میں ہے۔ اس وقت یہ کس کو معلوم تھا کہ غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی یہ بچی آگے جا کر فن کی دنیا میں چاند سورج بن کر چمکے گی۔ اسے اس کی ملکوتی آواز کی وجہ سے نور جہاں کا نام ملے گا۔ ملکۂ ترنم کا خطاب دیا جائے گا اسے۔

مختلف دور میں، مختلف اہم شخصیات نے انہیں عزت افزائی کے لیے خطابات سے نوازا۔ آپ اسی تحریر میں پڑھ چکے ہیں کہ سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان نے انہیں ملکۂ ترنم کا خطاب عطا کیا جبکہ ان سے پہلے بھی انہیں ملکۂ ترنم کا تاج پہنایا جا چکا تھا۔ اسی طرح اللہ وسائی کو نور جہاں کا نام دینے والوں میں آغا حشر کاشمیری کا نام بھی آیا ہے جبکہ ایک مستند تحقیق نے یہ بتایا ہے کہ سب سے پہلے اللہ وسائی کو نور جہاں کا نام سیٹھ دل سکھ کرنانی نے دیا تھا۔ سیٹھ دل سکھ کرنانی کلکتہ کے اس وقت کے کروڑ پتی سیٹھ تھے جو بحری جہازوں کے بھی مالک تھے۔ یہ دولت مند سیٹھ عام کاروباری شخصیات کے برعکس فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے

TAGPK.COM

ایک بڑی تھیٹریکل کمپنی قائم کی تھی جس میں ہندوستان بھر کے فنکار شامل ہوتے تھے۔ اس کمپنی کے کارندے مختلف علاقوں میں جا کر فنکار تلاش کرتے تھے۔ سیٹھ دل سکھ کرنانی کے کارندے جب لاہور پہنچے تو یہاں سے انہوں نے اپنی کمپنی کے لیے عیدن بائی اور اس کی آٹھ سالہ بہن اللہ وسائی کا انتخاب کیا۔ بعد ازاں جب ان بہنوں کو کلکتہ میں فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے پیش کیا گیا تو سیٹھ دل سکھ کرنانی نے کمسن اللہ وسائی کی آواز سن کر پیش گوئی کی کہ اس بچی کی شہرت ساتویں آسمان تک پہنچے گی۔ نیز سیٹھ دل سکھ کرنانی نے ہی اس لڑکی کا نام ''نور جہاں'' رکھ دیا۔

یہ ساری بات اس محقق نے لکھی ہے۔ اب کون کہاں تک سچا ہے اور کس کی بات قابل قبول ہے اس بارے میں، میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ دراصل مادام کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے ان پر بے تحاشا لکھا گیا اس لیے ان پر لکھی ہوئی بہت سی باتوں میں تضاد ہے۔

ملکۂ ترنم نور جہاں نے گلوکاری بھی کی اور اداکاری بھی مگر ان کی گلوکاری شروع ہی سے ان کی اداکاری پر بھاری رہی اس لیے انہوں نے ایک خاص وقت پر اداکاری سے ناتا توڑ لیا۔ بطور اداکارہ ان کی آخری فلم ''غالب'' تھی جو 24 نومبر 1961ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں ان کے ہیرو سدھیر تھے اور فلمساز و ہدایت کار عطا اللہ شاہ ہاشمی تھے اور پھر وہ صرف گلوکاری ہی کرتی رہیں۔ فلمی گانوں کے علاوہ بھی مختلف نوعیت کے گیت گاتی رہیں۔ غزلیں، نظمیں، ملی ترانے اور پاک بھارت جنگ کے دوران تو انہوں نے جنگی ترانے گا کر حب الوطنی کا جو ثبوت دیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ 6 ستمبر 1965ء میں میڈم نور جہاں نے خاصی تعداد میں قومی، ملی اور جنگی نغمے ریکارڈ کروائے۔ جنگ کے دنوں میں انہوں نے جذبات سے بھرپور اور دل کی گہرائیوں سے ملی اور جنگی نغمات گا کر فوجی بھائیوں کے دل گرمائے، اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں انہوں نے محاذ جنگ میں جا کر بھی فوجی جوانوں کے جوش و جذبے کو بڑھایا اور اپنی آواز کا جادو جگا کر ان کو وطن کی حفاظت کرنے اور مر مٹنے کا درس دیا۔ آج بھی ان کے گائے ہوئے نغموں کی گونج زندہ و تابندہ ہے۔

☆ اے وطن کے سجیلے جوانوں
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں
☆ میرا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں راکھاں
☆ رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
☆ ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وک دے
توں لبدی پھریں بازار کڑے
☆ اے وطن تیرے پیغام پر
ہم لٹا دیں گے جانیں تیرے نام پر
☆ میرا ماہی چھیل چھبیلا ہائے نی
کرنیل نی جرنیل نی
☆ میدان تمہارے ہاتھ میں ہے
☆ ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

ان نغموں کے علاوہ بھی فوجی جوانوں کے لیے لہو گرمانے والے نغمے مادام نے گائے ہیں جبکہ ان کے بہت سے غیر فلمی گیت اور غزلیں بھی بہت مقبول ہوئیں جن کو گا کر مادام نے ان کے شاعروں کو بھی شہرت دی۔

☆ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
☆ ہم نہ نکہت ہیں نہ گل ہیں جو مہکتے جائیں
☆ دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
☆ کبھی کتابوں میں پھولوں کو رکھنا
کبھی درختوں پر نام لکھنا
☆ تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
☆ میں ترے سنگ کیسے چلوں بجنا
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا
☆ آندھی چلی تو نقش کف پا نہیں ملا
☆ رات پھیلی ہے ترے سرمئی آنچل کی طرح
☆ سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
☆ تیرے پیار میں رسوا ہو کر
جائیں کہاں دیوانے لوگ
☆ اک ذرا سی بات تھی برسوں کے یارانے گئے
☆ سرسنگیت کی جوگن بن کے
گیت میں گاؤں گلی گلی

ایسے متعدد گانے اور گیت ہیں جنہیں میڈم کی طلسمی آواز نے امر بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شاید دنیا میں بھیجا ہی اسی لیے تھا کہ وہ اپنی نورانی آواز سے پوری دنیا کو پُرنور کر دیں۔

دوستو! ملکۂ ترنم نور جہاں کے 1935ء سے 2000ء تک 65 سالہ فلمی کیریئر میں بہت سارے موسیقاروں نے ان کی آواز سے استفادہ کیا۔ موسیقار ان کو ''سروں کی رانی'' کہتے تھے۔ ان کی پہلی فلم ''شیلا عرف پنڈ دی کڑی'' کی موسیقی دھوی خان رامپوری نے مرتب کی تھی جبکہ

TAGPK.COM

بطور ہیروئن ان کی پہلی فلم ''خاندان'' کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے۔ پاکستان میں نامور موسیقاروں میں روبن گھوش ہی ایسے موسیقار ہیں جو میڈم نور جہاں کی آواز کو برائے کار نہ لا سکے۔

اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ یوں تو مادام نور جہاں کے ساتھ پاکستان کی تقریباً ساری ہی گلوکاراؤں کو گانے کا شرف حاصل ہوا ہے سوائے رونا لیلیٰ اور نیرہ نور کے۔

رونا لیلیٰ کے بارے میں شاید آپ میں سے کچھ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کی (نور جہاں کی) موجودگی میں بھی رونا لیلیٰ کی بہت ڈیمانڈ تھی اس لیے وہ ''کل کی اس بچی'' کو بھی اپنا مدمقابل سمجھتی تھیں مگر نیرہ نور کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ کسی موسیقار نے نیرہ نور کو مادام کے ساتھ گانے کا موقع کیوں نہیں دیا۔

دوستو! یہ تو آپ کو علم ہوگا کہ ملکۂ ترنم کی صاحبزادی ظل ہما کو بھی گانے کا شوق تھا مگر شاید یہ نہ معلوم ہو کہ ظل ہما کو پہلی بار موسیقار نثار بزمی نے فلم ''ویری گڈ دنیا ویری بیڈ لوگ'' میں گوایا تھا۔ اس کے بعد ظل ہما ایک دو فلموں میں پلے بیک کے طور پر گاتی رہیں پھر 2014ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ شاید بہت سے دوستوں کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ماڈل اور اداکار احمد علی بٹ ظل ہما کے صاحبزادے ہیں جبکہ ظل ہما کے ایک اور بیٹے حمزہ نے فلم ''گھر کب آؤ گے'' میں اداکاری کی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ملکۂ ترنم کے صاحبزادے اکبر حسین رضوی نے اپنی بیگم فلورنس کے ہمراہ ایک غیر ملکی فلم YESTER LOVE میں کام کیا تھا۔ یاد رہے کہ فلورنس نے اختر یوسف کی فلم ''ساون آیا تم نہیں آئے'' میں بھی اداکاری کی تھی۔ اکبر حسین رضوی نے فلمساز و ہدایت کار کے طور پر فلم ''ماں بہو بیٹا'' تخلیق کی تھی جبکہ ان کی صاحبزادی سونیا جہاں بھارتی فلم ''تاج محل'' میں بطور ہیروئن اداکاری کر چکی ہیں۔ یہ بات بھی بتانے کی ہے کہ میڈم نور جہاں کا ایک اور پوتا سکندر رضوی بھی فلموں میں انٹری دے چکا ہے مگر اس فیملی کے افراد کو تمام تر سہولیات کے باوجود سید شوکت حسین رضوی اور مادام نور جہاں جیسی شہرت اور مقبولیت نہیں ملی۔ ملکۂ ترنم کو تو شاید اللہ تبارک تعالیٰ نے پیدا ہی سر سنگیت کی پرورش اور پروان چڑھانے کے لیے کیا تھا۔ بے شک انسان ہونے کے ناتے ان میں کچھ کوتاہیاں اور خامیاں بھی تھیں مگر وہ بنیادی طور پر ایک اچھی خاتون بھی تھیں۔ وہ سینے میں ایک ہمدرد دل رکھتی تھیں اور ضرورت مندوں کے دکھ درد میں کام بھی آتی تھیں۔ یہ تو آپ کو بتایا ہی جا چکا ہے کہ گلوکار اخلاق احمد کے علاج کے لیے انہوں نے کس طرح بینیفٹ شو کا بندوبست کیا اور اس مقصد کے لیے معقول فنڈ جمع کیا۔ اس موقع پر انہوں نے خود بھی ایک لاکھ روپیا عطیہ کیا۔ وہ سنگرز ایسوسی ایشن کی سرپرست بھی تھیں۔ اس حوالے سے بھی وہ سنگرز کی مدد کیا کرتی تھیں۔

مادام نور جہاں ملکۂ ترنم نے جہاں اردو، پنجابی اور سرائیکی فلموں کے لیے گیت گائے وہاں چند سندھی فلموں کے لیے بھی گلوکاری کی۔

دوستو! یقین کرو جتنے گیتوں کا اس وقت ذکر کیا ہے اس سے کئی گنا زیادہ مادام نور جہاں کے مقبول نغمے ہیں۔ ان کا تو گایا ہوا ہر گانا سن کر دل دیوانہ ہو جاتا تھا۔ وہ تو سروں کی رانی تھیں۔ ملکۂ ترنم تھیں۔ ان کے گلے میں جو نور تھا اس نے دنیا جہان کو پُرنور کیا۔ بے شمار لوگوں نے اگر ان کے بارے میں لکھا ہے تو اس لیے لکھا ہے کہ ان پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ میرے سمیت بہت سے لوگوں نے ان کو منظوم نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیے۔ اس موقع پر صرف حبیب جالب جیسے نامور شاعر کی خراجِ عقیدت کا نمونہ پیش کروں گا۔

بن گئی ہے دلوں کی دھڑکن تو
گونجتی ہے تری صدا ہر سو
تیری آواز میں ہے وہ جادو
جو بھی سنتا ہے جھوم جاتا ہے
تیری غم پہ مسکراتا ہے
تو نے جس شوق کا ایک اظہار
بس یہی تھا فریضۂ فنکار
ایک تاریخ ہے تیرا کردار
تیرا ہر گیت غیر فانی ہے
حوصلہ، ولولہ، جوانی ہے
شور ہے تیرا مہ لقاؤں میں
نام ہے تیرا باوفاؤں میں
ہر طرف دیس کی فضاؤں میں
تیری آواز نور افشاں ہے
ریڈیو ان دنوں رگِ جاں ہے

یاد رہے کہ یہ نظم 31 اکتوبر 1965ء کے ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی اور ستمبر کی پاک بھارت جنگ کے دوران مادام کی صوتی جنگ کے چرچے جاری و ساری تھے۔

++



قوتِ ارادی

اے آر راجپوت

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر یا دوا مرض سے بچاتا ہے نہیں، مرض کو موت ارادی شکست دیتی ہے۔ دوا تو صرف سہارا ہے۔ برطانیہ کی معروف اداکارہ کے شب و روز کا تذکرہ اس نے موت کو شکست دی تھی۔

یہ ایک برطانوی اداکارہ پیٹریشیا نیل کی کہانی ہے۔ جس نے عزم و حوصلہ سے موت کو شکست دی۔ یہ کہانی اس اداکارہ کے خاوند رواڈل ڈھل کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جو ایک شہرۂ آفاق ادیب ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

یہ کوئی خیالی کہانی نہیں، بلکہ میری رفیقۂ حیات پیٹریشیا نیل کی داستانِ زیست کا المناک باب ہے جس کے زندہ رہنے کے عزم نے موت کو پچھاڑ دیا اور اپنے حوصلہ، ہمت اور جرأت سے وادیٔ اجل سے بخیر و عافیت نکل آئی۔

پیٹریشیا اداکارہ ہونے کے باعث جہاں بھی فلم بندی کے سلسلہ میں جاتی تھی پورہ کنبہ اس کے ہم رکاب ہوتے تھے۔ سال میں ایک آدھ بار لازماً ہمیں فلم بندی کے سلسلہ میں کہیں نہ کہیں جانا پڑتا تھا۔ یہ سفر کس قدر تکلیف دہ ہوا کرتے تھے، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں اچانک کام کے سلسلے میں اپنا تمام ساز و سامان سنبھال کر سفر پر جانا پڑے اور پیچھے گھر میں قفل پڑا ہو۔

گزشتہ سال ہمیں ایک فلم میں کام کرنے کے سلسلے

میں ہونولولو کے سفر کی زحمت اُٹھانا پڑی اور اس سال ''سات خواتین'' کی فلم بندی کے سلسلہ میں ہمیں کیلے فورنیا کے لیے رختِ سفر باندھنا پڑا۔

اس فلم کو عالمی شہرت یافتہ ہدایت کار جان فورڈ ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ فروری اور مارچ میں فلم بندی کا پروگرام تھا۔ جب ہمیں اس پروگرام کا علم ہوا تو ہمیں بے حد خوشی ہوئی، کیونکہ انگلستان کے یخ بستہ مہینوں سے پیچھا چھڑانے کا یہ ایک نادر موقع تھا۔ چنانچہ ہم نے سامانِ سفر باندھا اور کیلے فورنیا پہنچ گئے۔ وہاں ہمیں ہدایت کار مارٹن رٹ کا مکان خالی کر کے دیا گیا جس نے ہڈ، نامی فلم کو ڈائریکٹ کیا تھا، یہی وہ فلم تھی جس میں پیڑیشیا کو اداکاری کے جوہر دکھانے پر عالمی اعزاز، آسکر ملا تھا۔

اس سفر میں پیڑیشیا کے ساتھ ہماری آٹھ سالہ بچی ٹیسا، ساڑھے چار سالہ تھیو، نو ماہ کی اوفلیا، بہنیں، شینا اور انجیلا تھی۔

سفر کی تکان اُتارنے کے بعد پیڑیشیا نے نگار خانے کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔

14 فروری تک فلم بندی کا کام شروع ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس سے پیڑیشیا کو بھی سخت پریشانی تھی اور اس کی پریشانی کی ایک معقول وجہ بھی تھی۔ پیڑیشیا اُمید سے تھی۔ چنانچہ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ ''آپ کو علم ہے کہ میں اُمید سے ہوں۔ جب اس فلم کا آخری منظر فلمایا جا رہا ہوگا اس وقت بچے کی پیدائش میں کُل چار مہینے رہ جائیں گے۔''

میں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ''اس حالت میں تو تم کامل یکسوئی سے فلم میں کام نہ کر سکو گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اس فلم سے دست کش ہو جاؤ۔''

اس میں پیڑیشیا کا بھی کوئی قصور نہ تھا کیونکہ جب اس فلم کا معاہدہ ہوا تھا اس وقت ہمیں بتایا گیا تھا کہ فلم بندی کا کام جنوری میں شروع ہو کر فروری کے آخر تک ختم ہو جائے گا لیکن اب فروری کا تیسرا ہفتہ گزر چکا تھا اور ابھی تک کام شروع ہونے کے آثار نہ تھے۔

تاہم اس نے انتہائی غور و فکر کے بعد فیصلہ کن انداز ... میں جواب دیا۔ ''اگر دو دن کے اندر اندر کام شروع نہ ہوا تو میں اس معاہدے سے دست کش ہو جاؤ گی۔''

اسی شام کو ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ اگلے دن صبح کام شروع ہو رہا ہے۔ صبح چھ بجے پیڑیشیا تیار ہو کر گھر سے روانہ ہوئی اور شام پانچ بجے واپس آئی۔ وہ جس وقت گھر پہنچی تو بے حد خوش تھی، کیونکہ کافی عرصہ بعد اسے پھر اپنے دیرینہ رفقاء کار ڈائریکٹر جان فورڈ اور ایڈی البرٹ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ دوسرے دن بھی شوٹنگ ہوئی۔

17 فروری کو شوٹنگ کا تیسرا دن تھا۔ پانچ بجے شام پیڑیشیا معمول کے مطابق اسٹوڈیو سے گھر آئی۔ وہ بے حد خوش و خرم اور ہشاش تھی۔ اس دن اس نے گدھے پر سوار ہو کر فلم میں کام کیا، اس نے مزے لے لے کر سارے دن کی روداد سنائی اور باتوں میں ایسی مشغول ہوئی کہ بیٹھے بیٹھے ہمیں ساری کہانی سنا دی۔

اس وقت اس کی آنکھوں میں خوشیاں تیر رہی تھیں۔

چھ بجے ٹیسا نے بڑی محبت سے کہا۔ ''پیاری ممی! آج مجھے نہلاؤ۔''

پیڑیشیا کی آنکھوں میں خوشی سے سرسوں پھول اُٹھی۔ اس نے ٹیسا کو محبت سے سینے سے لگا لیا اور پھر اسے نہلانے کے لیے اپنے غسل خانے میں لے گئی، جو اُوپر کی منزل پر واقع تھا۔

میں تھوڑی دیر کے بعد اُوپر پہنچا کہ دیکھوں کیا ہو رہا ہے کہ پیڑیشیا غسل خانے سے برآمد ہوئی۔ اس نے اپنی داہنی ہتھیلی سے کنپٹی کو پکڑ رکھا تھا اور چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں تھیں۔ میرے پوچھنے پر پیڑیشیا نے بتایا۔ ''میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔''

میں فوراً اس کی طرف لپکا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی اور درد و کرب سے تلملاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے عجیب شکلیں نظر آ رہی ہیں۔''

''کیسی ہیں وہ شکلیں؟'' میں نے فوراً سوال کیا۔

''میں نہیں بتا سکتی، مجھے کچھ یاد نہیں۔'' اس کی آواز حلق ہی میں ڈوب گئی۔

میں بھی پلنگ پر اس کے قریب بیٹھ گیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کا سر پیچھے کی طرف جھکا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پیڑیشیا کی دماغی شریان پھٹ گئی ہے۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنی داہنی کنپٹی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''درد سے یہ جگہ پھٹ رہی ہے۔''

میں نے اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ ساتھ ہی اسے ہدایت کی کہ وہ بالکل نہ ہلے جلے، میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔

اسے لنا کر میں اپنے مطالعے کے کمرے کی طرف دوڑا کیونکہ دیوار پر کاغذ کے ایک پرزے پر ان ڈاکٹروں کے نام، پتے اور ٹیلی فون نمبر درج تھے جو دماغی امراض کے ماہر تھے۔

میرے پاس یہ پتے کہاں سے آئے؟ یہ بھی ایک دردناک کہانی ہے۔

چار سال کی بات ہے۔ تھیو کی عمر اس وقت بہ مشکل چھ ماہ تھی کہ نرس اسے پرام میں ڈالے سیر کرانے لیے جا رہی تھی کہ اچانک ایک تیز رفتار موٹر کار اس سے ٹکرائی اور بچے کو شدید زخمی کرتے ہوئے نکل گئی۔

ان چار سالوں میں بچے پر کیا بیتی، ہم نے اس کی جان بچانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے، کہاں کہاں ہم اسے اُٹھائے اُٹھائے پھرے، کن یکتائے زمانہ ماہرین امراضِ دماغ سے علاج کرایا، یہ ایک ایسی المناک داستان ہے جس کے تصور سے آج بھی ہماری روح کانپ اُٹھتی ہے۔

تھیو کو اس حادثہ میں ایک شدید نوعیت کا عارضہ ہو گیا۔ اس کے دماغ میں پانی جمع ہو جاتا تھا۔ اس پانی کے اخراج کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ دماغی شریان کو کاٹ کر ربڑ کی ایک نلکی لگا دی جائے اور پھر پانی کو جسم کے ایسے حصے میں پہنچا دیا جائے جہاں پانی خود بخود جذب ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک نہایت خطرناک آپریشن کیا جاتا ہے۔ ربڑ کی نلکی شریان کے ساتھ پیوست کر کے دل کے اذنِ اوّل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جس جگہ سے یہ نلکی گزرتی تھی وہاں اس میں ایک پمپ نما ویلو لگا ہوتا تھا، تاکہ پانی دل میں اُترے اور اوپر واپس نہ جائے۔ اس طرح پانی خون میں جذب ہو کر ختم ہوتا رہتا تھا۔

یہ طریقہ مستند طریقہ علاج نہیں بلکہ جان بچانے کی ایک سر توڑ کوشش ہے۔ کیونکہ ربڑ کی نلکی اکثر بند ہو جاتی ہے اس لیے اسے صاف کرنے کے لیے پھر پہلے کی طرح آپریشن کیا جاتا ہے۔

تھیو کے اس قسم کے آٹھ آپریشن ہو چکے ہیں۔ کچھ نیویارک میں اور کچھ لندن میں۔ ہر بار تھیو، موت کی آغوش میں جا کر بھی پلٹ آیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ربڑ کی نلکی بند ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی بچے کی آنکھیں سوج جاتیں۔ ہم اسے اُٹھا کر اسپتال پہنچتے، جہاں کئی گھنٹے یہ بچہ آپریشن ٹیبل پر موت سے کشتی لڑتا رہتا۔ خدا خدا کر کے آپریشن ختم ہوتا۔ کئی گھنٹوں کے شدید انتظار کے بعد، آپریشن تھیٹر کا دروازہ



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

جولائی 2021ء

کے گلشن شمارے کی ایک جھلک

اولین صفحات

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات

روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

اناگیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے نوجوان کی بے تابیوں کا اختتام

امجد جاوید کے سلسلے کی آخری قسط

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل

زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

- پہلا رنگ -

حقیقت کے تعاقب میں منزل سے دور ہو جانے والوں کا فسانہ

- دوسرا رنگ -

وطن کی محبت میں جان لینے اور جان دینے والوں کا ماجرا

چٹنی نکتہ چٹنی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

کھلتا اور ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی نرس برآمد ہوتی۔ اسٹریچر پر پٹیوں کے پگھوتلے تھیو کا ننھا منا زرد چہرہ نظر آتا جس میں نیلگوں دو آنکھیں چمک رہی ہوتی تھیں اور پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی تھیں۔

''تم نے انہیں کیوں آپریشن کرنے دیا؟'' اور ہم اس کا کوئی جواب نہ دے سکتے۔

پیٹریشیا ہمیشہ اپنے لختِ جگر کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیتی۔ وہ بیروں اپنے بیٹے کے سرہانے بیٹھ کر اپنے نورِ نظر کی صحت کے لیے دعائیں مانگتی۔ اس بے چاری نے..... بیسیوں راتیں اپنے بچے کے سرہانے تکیہ پر اُمید و بیم کے عالم میں ویران کیں۔

جب تھیو کا آٹھواں آپریشن ہوا، اس وقت ہمیں سخت تکلیف ہوئی۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کوئی مستقل علاج تلاش کیا جائے۔ آخر کار میں نے اپنے ایک دوست سے اس بات کا ذکر کیا۔ وہ ویلو بنانے کے کام میں ماہر تھا۔ اس نے بڑے غور و فکر کے بعد ایک طریقہ نکالا جس سے ربڑ کی نلکی بند نہ ہو۔

پچھلے تین سال سے اس طریقہ پر عمل ہو رہا ہے۔ سر دست یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ یہ طریقہ کامیاب ہے یا نہیں۔

تھیو کی اس بیماری سے ہم پچھلے چار سالوں سے نبرد آزما تھے اور ہمیں ہر وقت خطرے کا سامنا کرنے کے لیے ماہرین امراضِ دماغ کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرے پاس ان ماہرین کے پتے اور ٹیلی فون نمبر ہوتے تھے... چنانچہ میں نے جھپٹ کر دیوار سے اس کاغذ کے پُرزے کو اُتارا اور شب خوابی کے کمرے کی طرف دوڑا۔

پیٹریشیا بستر پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ میں نے ٹیلی فون کا نمبر ملایا۔ ڈاکٹر صاحب خود ہی ٹیلی فون پر بول اُٹھے اور مجھ سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔

''کیا..... تھیو.....؟''

''جی نہیں، ڈاکٹر! پیٹریشیا کی دماغی شریان پھٹ گئی ہے۔''

ڈاکٹر نے کئی سوال کیے جن کا میں نے جواب دیا۔ اتنے میں، میں نے پیٹریشیا کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا جبڑا نیچے کی جانب ڈھلک رہا تھا۔

''ڈاکٹر! پیٹریشیا بے ہوش ہو رہی ہے۔'' میں چلّایا۔

''گھبراؤ نہیں میں ایمبولینس کار بھیج رہا ہوں۔ تم پیٹریشیا کو لے کر اسپتال پہنچو، میں دروازے پر منتظر رہوں گا۔''

میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھا اور پیٹریشیا کی طرف متوجہ ہوا۔ پیٹریشیا بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے جلدی سے اسے کروٹ کے بل کر دیا تاکہ چت لیٹے رہنے سے اس کی زبان دانتوں میں آ کر کٹ نہ جائے۔

جب ایمبولینس کار والے اسٹریچر لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔ پیٹریشیا ہوش میں آ چکی تھی لیکن اس کا حافظہ جواب دے چکا تھا۔ وہ بار بار پوچھتی تھی ''یہ کس کا مکان ہے تم کون ہو؟ یہاں کون رہتا ہے؟''

جب ایمبولینس کار اسپتال میں داخل ہوئی تو دروازہ پر سفید کوٹوں میں ملبوس کئی ڈاکٹر منتظر کھڑے تھے۔ ان میں وہ ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ انہوں نے ہاتھوں ہاتھ پیٹریشیا کو آپریشن تھیٹر میں پہنچایا۔ ابتدائی معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا دماغ کا ایکسرے ضروری ہے۔

''ڈاکٹر! پیٹریشیا اُمید سے ہے، ایکسرے لیتے وقت بچے کا خیال رکھیے گا۔ اسے اچھی طرح ڈھانپ دیجیے گا۔'' میں نے کہا۔

''گھبراؤ نہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

دس بجے مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ کمرے کی دیوار پر پیٹریشیا کے سر کی فلم لٹکی تھی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ پیٹریشیا کے دماغ کی شریان تین جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ میں نے جب دیوار پر ایکس رے فلم کی طرف دیکھا تو شریان پر تین جگہ سفید داغ نظر آئے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں شریان پھٹنے سے خون جمع ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر نے ایک سفید دھبے پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''اس جگہ سے تیسری مرتبہ شریان پھٹی ہے۔ غالباً جب ہم ایکسرے لے رہے تھے اس وقت تیسری شریان پر حملہ ہوا تھا۔'' ڈاکٹر نے جس مرض کا ذکر کیا تھا یہ عموماً بڑھاپے میں یا فشارِ خون یا ہائی بلڈ پریشر کے باعث رونما ہوتا ہے۔

شریان کسی جگہ سے غبارے کی طرح پھولنے کے بعد پھٹ جاتی ہے۔ خون اس جگہ سے نکل کر جسم میں داخل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر خون حرام مغز میں گرنا شروع ہو جائے تو جان بچنا مشکل ہے۔

ایک ڈاکٹر شیشے کی ایک نالی لیے باہر نکلا۔ پیٹریشیا کی ریڑھ کی ہڈی میں سوراخ کر کے پچکاری سے پانی نکالا گیا

TAGPK.COM

تھا۔ نلکی میں سرخی دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

''ڈاکٹر! اب کیا ہوگا؟''

''اس کا صرف ایک علاج ہے، آپریشن لیکن یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ پیٹریشیا آپریشن کی تکلیف برداشت کر سکے گی یا نہیں۔''

''اگر آپریشن نہ کیا گیا تو کیا ہوگا۔'' میرے حلق سے غم میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔

''اگر آپریشن نہ کیا گیا تو موت یقینی ہے۔'' ڈاکٹر کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے ڈاکٹر کسی کنوئیں میں سے بول رہا ہے۔

''مج.....خ.....خدا کے لیے آپریشن کیجئے۔''

''بہتر، میں آپریشن کرتا ہوں، لیکن آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہیے گا۔''

☆☆☆

ساڑھے دس بجے آپریشن ہوا۔ پیٹریشیا کے خوب صورت سنہرے بال مونڈ دیئے گئے۔ ڈاکٹر نے جلد کاٹ کر کھوپڑی سے الگ کر دی۔ پھر کھوپڑی میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کیے گئے اور آری سے سر کی ہڈی کاٹی گئی۔ شریان کو ننگا کیا گیا اور جس جگہ سے پھٹی تھی اسے سیا گیا۔

میں آپریشن تھیٹر سے باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ نرسیں آ رہی تھیں، جا رہی تھیں۔ جن کی ڈیوٹی ختم ہوئی وہ شب بخیر کہہ کر ڈیوٹی پر آنے والی نرسوں سے الوداع ہو گئیں۔

ابھی تک آپریشن جاری تھا۔ جب عروسِ سحر آنکھوں میں نیند کا خمار لیے ہوئے بیدار ہوئی تو آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ نرس ایک ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی باہر نکلی۔

اسٹریچر پر پیٹریشیا بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نکلنے شروع ہوئے ان کے چہروں پر تھکان کے آثار تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ کس قدر خوف ناک تھا یہ آپریشن۔

ڈاکٹر نے مجھے پریشان دیکھ کر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پیٹریشیا سخت جان نکلی۔ اس نے آپریشن کی تمام تکالیف کو برداشت کر لیا۔ یہ ناممکن بات قوت ارادی کی مضبوطی نے ممکن بنائی ہے مریض آپریشن یا دوا سے صحیح نہیں ہوتا قوت ارادی اسے صحت مند بناتی ہے۔''

اگلے چند روز پیٹریشیا نیم جان پڑی رہی۔ اس کی داہنی ٹانگ اور بازو بالکل مفلوج ہو چکے تھے۔ کئی دن رگوں کے ذریعہ خوراک جسم میں پہنچائی گئی۔ پھر ناک میں نلکی لگا کر خوراک معدے میں پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔

چار ہفتوں بعد پیٹریشیا کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ باتیں بھی کرنے لگی لیکن اس کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حافظہ بالکل ساتھ چھوڑ چکا ہے کیونکہ اسے چیزوں کے نام بھول گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ذہن پر زور دے کر وہ اپنا مقصد بیان کرتی تھی۔ اس کے لیے وہ عجیب و غریب الفاظ استعمال کرتی تھی۔ اس کی داہنی آنکھ میں بینائی تو واپس آ گئی لیکن اسے ایک جگہ دو شکلیں نظر آتی تھیں۔

چنانچہ اس کی آنکھ پر پٹی باندھ دی گئی۔ اسپتال سے رخصت ہونے کے دو ماہ بعد ہم کیلیفورنیا میں رہے اور سترہ مئی کو لندن واپس پہنچے۔

جب ہم اپنے گھر میں داخل ہوئے تو دوستوں کی طرف سے پھولوں کے سینکڑوں گل دستے کمروں سے مہک رہے تھے۔ ایک دوست نے شیمپین کی بوتل بھی بھیجی تھی۔ میں نے شیمپین کی بوتل کھولی اور ایک گلاس بھر کر پیٹریشیا کو دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خوشی سے چلائی۔

''میری آنکھ ٹھیک ہو گئی ہے۔ اب مجھے دو دو شکلیں نظر نہیں آتیں۔'' یہ سن کر سب کی آنکھوں میں خوشی کے ننھے ننھے چراغ جل اُٹھے۔

آج کل پیٹریشیا روبصحت ہے۔ وہ جنگلے کو پکڑ کر ہولے ہولے سیڑھیاں بھی اُتر لیتی ہے۔ باورچی خانے میں کھانا بھی تیار کرتی ہے۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر خود اپنے ہاتھ سے کھانا بھی کھاتی ہے لیکن ابھی اس کے مفلوج اعضا اس قابل نہیں ہوئے کہ وہ پہلے کی طرح کلیلیں بھرتی نظر آئے لیکن ہمیں خوشی ہے کہ اس بہادر عورت نے دلیری اور جرات کے ساتھ موت کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دی۔ جس حیران کن تیزی کے ساتھ وہ صحت کی کھوئی ہوئی دولت دوبارہ حاصل کر رہی ہے۔ اس کے پیشِ نظر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جلد ہی اس کی جوانی کا مہتاب اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ ہمارے گھر میں جلوہ آرا ہوگا۔ اس نے قوت ارادی سے موت کو شکست دی ہے۔

++

TAGPK.COM

TAGPK.COM

بے گناہ قاتلہ

عبدالعرب

وہ پیرس کی سب سے مشہور جسم فروش تھی۔ لوگ اس کے دیوانے تھے۔ اس کی حویلی میں ہمہ وقت ازدحام لگا رہتا تھا۔ اس کے محبوب نے بھی اسے پلکوں پر بٹھا رکھا تھا پھر بھی وہ اس کی قاتل ٹھہری۔

ایک الو کے بھدے کا تذکرہ

آج بھی پیرس کے کلب گھروں اور عشرت کدوں میں اگر کوئی کشوری کا نام لے لیتا ہے تو سننے والے ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتے ہیں۔

1940ء میں کشوری کا حُسن چاند بن کر پیرس کے مطلع پر چمکا اور دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ تک اس کی جوانی اس کے قدموں پر نوٹوں کا ڈھیر لگاتی رہی۔ اس کے حسن کی جھلکیاں بربادی کا نشان بنتیں۔ اس کی قربتیں تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتیں، لیکن وہ پیرس کی راتوں کی ملکہ بنی رہی۔

ایک ایسی ملکہ جس کے حضور میں سر جھکانے کے لیے ایک نہیں سینکڑوں اور ہزاروں بے تاب رہتے۔

کشوری کو آج تک کوئی ایسا شخص بھلا نہیں پایا ہے جس سے کشوری کا کسی بھی صورت میں کوئی واسطہ یا رابطہ قائم رہا ہو۔ آج تک وہ وکیل اس کو یاد کرتے ہیں جنہوں نے اسے عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں دیکھا تھا۔ آج تک اسے وہ گواہ یاد کرتے ہیں جنہوں نے اس کی مخالفت یا موافقت میں گواہی دی تھی۔ آج تک وہ جج یاد کرتا ہے جس نے اسے پانچ



سال کے لیے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کرنے کی سزا سنائی گئی۔

1949ء میں کشوری نے قانون کی تاریخ میں ایک بالکل نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ایک ہی جرم کے تحت اس پر تین مرتبہ مقدمہ چلایا گیا۔اس سے قبل دنیا کے کسی مجرم پر ایک ہی جرم کا فیصلہ سنانے کے لیے تین مرتبہ نئے سرے سے مقدمہ نہیں چلایا گیا تھا۔

کشوری پیرس کی راتوں کی ملکہ تھی۔کشوری پیرس کے امراء اور سرمایہ داروں کے دلوں کی دھڑکن تھی۔کشوری پیرس کے نائٹ کلبوں کی جان تھی لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کشوری حقیقتاً کہاں کی رہنے والی ہے اور اس کا اصلی نام کیا ہے؟ وہ خود کو انڈیا کی بتاتی تھی اور کہتی تھی کہ اس کے باپ کا نام انگلش تھا۔وہ خود کو ایکٹریس کہتی تھی لیکن اس نے کبھی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ایک مرتبہ اس پر ناجائز شراب کا ذخیرہ رکھنے کے الزام میں مقدمہ چلا،اس مقدمہ میں اس نے اپنا نام کشوری بتایا اور یہ کہا کہ وہ جنوبی کنارا کی رہنے والی ہے۔

کشوری کی اصل حقیقت کے بارے میں اس وقت بھی کوئی کچھ نہیں جانتا تھا جب اس کا ستارہ عروج پر تھا اور آج بھی کوئی نہیں جانتا جب کہ وہ پانچ سال کی سزا کاٹنے کے بعد جیل سے باہر آچکی ہے۔

پیرس کی اس قلوپطرہ کے بارے میں آج بھی کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟ اور کس حال میں اپنی زندگی کے دن گزار رہی ہے؟

کشوری پر اس الزام میں مقدمہ چلایا گیا تھا کہ اس نے ایک نوجوان تاجر کرنی کے قتل کی سازش میں حصہ لیا ہے لیکن اس کو سزا ہونے کے بعد بھی کسی نے اس بات پر یقین نہیں کیا کہ یہ خوب صورت حسینہ جس کے لبوں پر ہر وقت ایک زندگی سے بھرپور مسکراہٹ رقص کرتی رہتی ہے، کسی کے قتل کی سازش بھی کر سکتی ہے۔

کشوری کے ساتھ عالیشان مکان میں ہر وقت خوب صورت اور نوجوان عورتیں، انواع واقسام کی شراب موجود رہتیں۔

رات کی سیاہی پھیلتے ہی اس کے مکان کا ہر کمرا عیش محل بن جاتا۔عریاں رقص ہوتے،شراب کے فوارے سے اُچھلتے اور نقرئی قہقہے رات کی تاریکیوں کا مذاق اُڑا اُڑا کر صبح کی طرف اس طرح بڑھتے رہتے کہ کمرے میں موجود دولت مند بوڑھوں اور جوانوں کو اس کی خبر بھی نہ ہونے پاتی کہ رات کب شروع ہوئی تھی اور کب ختم ہوگئی۔

☆☆☆

سی فیس میں آج بھی کشوری کا یہ عالیشان مکان جس کو بھی کشوری ویلا کہا جاتا تھا اور جو اس کی ذاتی ملکیت تھا، آج بھی گزرنے والوں کو ماضی کی یاد تازہ کراتا رہتا تھا۔

اس مکان کے نچلے حصے میں کسی تیل کمپنی کا افسر کرائے پر رہتا تھا، جس کا نام روبرٹ مین تھا۔وہ نیا نیا برطانیہ سے پیرس آیا تھا۔بالائی منزل کے تمام کمرے کشوری کے استعمال میں تھے۔ ہر کمرے کی دیواروں اور چھتوں کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔خود اس کی خواب گاہ کی دیواروں کا رنگ سبز تھا جس میں ہر وقت عطر کی خوشبو مہکتی رہتی تھی۔

کشوری کو عطر سے دیوانہ وار رغبت تھی۔مقدمہ کے دوران ایک مرتبہ اس کی خواب گاہ کی تلاشی لی گئی تو ایک پوری الماری عطر کی شیشیوں سے بھری پائی گئی تھی۔

کشوری ویلا کے کمروں میں زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔آرام دہ فرنیچر، ملائم بستر، فضا میں عطر کی خوشبو، جوان جسم، مچلتا حسن، شراب کے اُبلتے چھلکتے پیمانے، موسیقی کی لہریں اور اس کے بعد وہ مترنم تنہائی جو بوڑھوں کو بھی جوان بنا دے۔

کشوری کے اس عشرت کدہ میں ملازموں کی ایک فوج ہی موجود رہتی تھی، یہ اور بات ہے کہ وہ تنخواہ صرف چند کو دیتی تھی، باقی ملازم صرف اس کے دیداروں اور اس کے قرب کی خاطر اس کی خدمت کرتے رہتے تھے۔

جارج اور راک، اس کے معتمد ملازم تھے اور ہر وقت اس کے آس پاس ہی موجود رہتے تھے۔ جان اس کا شوفر تھا۔اس کے انچارج بٹلر کا نام رابرٹ تھا۔دوسرے دو بٹلر کا نام فرانسس تھا۔ایک باورچی اٹل نام کا بھی تھا۔

اسی طرح باورچی خانے میں جیمس نام کا ایک لڑکا بھی ملازم تھا۔کشوری ویلا کے باغیچہ کی دیکھ بھال لانا نام کے ایک مالی کے سپرد تھی جو اپنے لڑکے ''چنایا'' کے ساتھ ملازموں کے کوارٹروں میں رہتا تھا۔

'کشوری ویلا' کو باہر سے دیکھ کر کوئی شخص بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے ہر کمرے میں شراب وشباب کی ایک دنیا آباد ہوگی لیکن پولیس ایک عرصے سے ان کمروں کی تاک میں تھی۔ پولیس کو شک تھا کہ کشوری ناجائز شراب اور افیون کا کاروبار وسیع پیمانے پر کر رہی ہے۔پولیس کا شک اس لیے بھی مضبوط ہوگیا تھا کہ جو بھی وہاں دس منٹ رکتا واپسی

TAGPK.COM

کے وقت اس کے قدم لڑکھڑاتے تھے۔

کشوری کو نوجوان شرابیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف ان دولت مندوں میں دلچسپی لیتی تھی جو بوڑھے ہوں اور جن کی دولت کی کوئی حد نہ ہو۔

کشوری کا ایک بیٹا بھی تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس بچے کا باپ کون ہے؟ جو مر چکا تھا۔

1948ء تک کشوری پیرس میں دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹتی رہی اور اپنے ساتھ دوسری عورتوں کا شباب لوٹاتی رہی۔ پھر ایک دن اسے احساس ہوا کہ وہ دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ اس احساس کے بیدار ہوتے ہی اس نے ایک خوب صورت، جوان اور تعلیم یافتہ نوجوان کو اپنی زلفوں کا اسیر بنالیا۔

یہ نوجوان خود عورت کی آغوش کا بھوکا تھا۔ کشوری کی آغوش ملی تو وہ اپنا سب کچھ بھول گیا۔ اس نوجوان کا نام نادکرنی تھا۔

نادکرنی کچھ عرصے تک پولیس میں انسپکٹر بھی رہ چکا تھا لیکن جب اس کے صحت مند جسم پر کشوری کی نگاہیں پڑیں تو وہ ایک غیر ملکی جہازراں کمپنی سے وابستہ تھا اور تقریباً تین ہزار ڈالر ماہوار تنخواہ لے رہا تھا۔

پانچ فٹ سات انچ کے جوان میں غضب کی جامہ زیبی تھی۔ اس کے حسن مردانہ اور جنسی کشش کا اندازہ صرف اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود کشوری اس کی طرف دیوانہ وار بڑھتی چلی گئی تھی۔

ابتدا کشوری نے ہی کی تھی لیکن چند دنوں کے بعد خود نادکرنی، کشوری کا دیوانہ بن چکا تھا۔ وہ بڑے فخر سے اپنی انگلی کی انگوٹھی دکھا کر یہ کہتا تھا کہ اس کی اور کشوری کی منگنی ہوچکی ہے۔ اُسے اس کی کوئی پروا نہیں رہی تھی کہ دوسرے کشوری کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ وہ کشوری سے واقعی سچی محبت کرنے لگا تھا۔ کشوری کے بغیر اسے چین ہی نہ ملتا تھا۔ کشوری کے پیار کو اس نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بنالیا تھا۔

نادکرنی کا معمول تھا کہ وہ شام ہوتے ہی، کشوری ویلا پہنچ جاتا۔ کشوری سے ملتا لیکن جیسے ہی اس کا کوئی گاہک آتا کشوری اسے چھوڑ کر چلی جاتی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ نادکرنی تمام رات کشوری کی واپسی کا انتظار کرتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا۔ اسے خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ کشوری کا پیشہ کیا ہے لیکن وہ کشوری کی محبت میں اندھا ہوچکا تھا۔

چند دنوں بعد ہی نادکرنی نے کشوری ویلا میں باقاعدہ رہائش اختیار کرلی۔ کشوری نے اس کے لیے ایک سجا سجایا کمرا خالی کرادیا تھا لیکن کشوری کے لاکھ کہنے کے باوجود نادکرنی نے اپنی ملازمت نہیں چھوڑی۔ اس نے اپنی مالی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کشوری کا غلام ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ اب بھی کشوری پر رقم پانی کی طرح خرچ کرتا تھا۔ یہ اس کی خودداری اور عزت نفس کے تقاضے ہی تھے جن کی وجہ سے چھ ماہ میں وہ اپنی باہوار تنخواہ کے علاوہ جمع پونجی اٹھارہ ہزار ڈالر بھی خرچ کرچکا تھا۔

8 فروری 1949ء..... کو نادکرنی معمول کے برعکس رات گئے کشوری ویلا میں داخل ہوا۔ بالائی منزل کے بڑے ہال میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ کشوری ایک دولت مند بوڑھے کے سامنے اپنی اداؤں کے ساتھ ایک بے ہنگم سا رقص کررہی تھی اور کچھ دوسری عورتیں بھی اپنے ناز و ادا دکھا رہی تھیں۔ شراب کے جام بھرے جارہے ہیں اور خالی کیے جارہے تھے۔ ایک عورت سازندوں کی مدد سے ماحول کو مترنم بنائے ہوئے تھی۔ دیر تک وہ یہ منظر دیکھتا رہا اور اس کے جذبات میں ایک آگ سی لگتی رہی۔

وہ کشوری کو ذہنی طور پر اپنی بیوی سمجھتا تھا اور اس وقت اس کی نظروں کے سامنے بے حیائی کا ایک شرمناک مظاہرہ کررہی تھی، اور وہ مجبور تھا کہ یہ منظر دیکھتا رہے۔

چند لمحوں بعد وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوگیا اور اپنے جذبات پر قابو پالینے کے لیے اس نے شراب کا سہارا لے لیا۔ شراب کے دو ہی پیگ اس کے حلق کے نیچے اُترے تھے کہ اس میں ایک بے باکی سی آگئی وہ دوبارہ بڑے ہال میں داخل ہوا اور اس نے پارٹی درہم برہم کردی۔ اس کی بلوہ آرائی دیکھ کر مال دار خریدار نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ فوراً کشوری ویلا سے باہر چلا جائے۔

کشوری خاموشی سے یہ منظر دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے نادکرنی کے ساتھ کھانا کھایا اور جب کھانے سے فراغت ہوگئی تو اس نے نادکرنی سے کہا کہ پارٹی اس نے درہم برہم کی ہے اس لیے جو عورتیں سیٹھ جی کی تفریح کے لیے باہر سے بلائی گئی تھیں، ان کی فیس نادکرنی اپنی جیب سے ادا کرے۔

نادکرنی نے اسی وقت پرس سے رقم نکال کر کشوری کی طرف پھینک دی۔

عورتیں چلی گئیں، کشوری کی بہن بھی چلی گئی جو آج کی

TAGPK.COM

تقریب میں خاص طور سے بلائی گئی تھی۔

آدھی رات کے بعد نادکرنی اور کشوری میں ایک محبت بھرا جھگڑا ہوا لیکن محبت کے اس جھگڑے نے نادکرنی کو قبرستان پہنچا دیا اور کشوری کو جیل۔

جھگڑا کیوں ہوا، اس کی بنیاد کیا تھی؟ آج تک اس کا حال کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔

دوسرے دن 9 فروری کی صبح نادکرنی زخمی حالت میں کشوری ویلا کے عقبی سڑک کے فٹ پاتھ پر پڑا پایا گیا۔ وہ مرا نہیں تھا، لیکن موت اس پر اپنا سایہ ڈالنے کی تمام تیاریاں کر چکی تھی۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور منہ سے بھی۔

نادکرنی کو اس حالت میں سب سے پہلے شوری کے شوفر جان نے دیکھا اور چیخ چیخ کر تمام نوکروں کو طلب کر لیا۔ اس کے بعد وہ پانی کا گلاس لینے دوڑا تاکہ نادکرنی کے حلق میں پانی ٹپکا دے۔

ٹھیک اسی لمحے کشوری بالکونی میں نمودار ہوئی اور اس نے جان کو حکم دیا کہ وہ بے ہوش نادکرنی کو پانی نہ پلائے بلکہ اسے اُوپر لے آئے۔ حکم پاتے ہی تمام نوکر نادکرنی کو اُوپر لے آئے اور انہوں نے ملاقاتی کمرے کے صوفے پر بے ہوش نادکرنی کو لٹا دیا۔

نہ معلوم کیوں کشوری ڈاکٹر بلانے سے ڈر رہی تھی لیکن بارہ بجے کے قریب اس نے ڈاکٹر پاٹی کو طلب کر ہی لیا جو اس کا طبیب عائلی تھا اور جس پر وہ بھرپور اعتماد کرتی تھی۔

ڈاکٹر پاٹی سے کشوری نے کہا۔ ''تمام رات نادکرنی شراب پیتا رہا تھا صبح سے قبل وہ دیوانوں کی طرح کمرے سے باہر نکلا سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر اس کے پیر پھسلے اور وہ نیچے سڑک پر آ رہا۔''

تمام نوکروں نے بھی کشوری کے بیان کی توثیق کر دی۔

ڈاکٹر پاٹی نے نادکرنی کا طبی معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ اس کی حالت نازک ہے اس لیے اسے فوراً اسپتال میں داخل کر دیا جائے۔

دن کے دو بجے جارج اور راک اس کو لے کر سینٹ جارج اسپتال پہنچے جہاں انچارج ڈاکٹر سے وہی کہانی سنائی گئی جو کشوری نے ڈاکٹر پاٹی کو سنائی تھی۔

جارج نے اپنی طرف سے صرف اتنا اضافہ کیا کہ یہ حادثہ دوپہر سے کچھ پہلے ہوا تھا۔

کشوری کے ملازم نے نادکرنی کے بھائی الم کرنی کو بھی خود جا کر اطلاع دی کہ نادکرنی حادثے کا شکار ہو گیا ہے اور وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

بھائی فوراً اسپتال پہنچا لیکن نادکرنی کی حالت دیکھنے کے بعد اس نے جارج کی بیان کردہ کہانی پر یقین نہیں کیا۔

جارج کی اُنگلی میں نادکرنی کی انگوٹھی دیکھ کر اس کا شک اور بڑھ گیا۔ اب اسے یہ شک ہو چکا تھا کہ جارج کی بیان کردہ کہانی جھوٹ پر مبنی ہے۔ اس نے اسپتال سے باہر آ کر پولیس میں رپورٹ درج کرائی اور اپنا شک بھی ظاہر کر دیا۔

پولیس کشوری کا بیان لینے کے لیے سب سے پہلے کشوری ویلا پہنچی لیکن کشوری وہاں نہیں تھی۔ پانچ دن تک کشوری کا کوئی پتا نہ چلا۔ پانچ دنوں بعد وہ خود ہی بالکل اچانک پولیس آفیسر کے سامنے حاضر ہو گئی لیکن اس کا بیان وہی تھا جو وہ ڈاکٹر پاٹی کو دے چکی تھی۔

ادھر 9 فروری سے 13 فروری تک نادکرنی اسپتال میں مسلسل بے ہوش رہا۔ 13 فروری کی رات کو اسے کچھ ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ چنگ کے قریب اپنے بھائی الم کرنی کو دیکھ کر اس نے کہا۔

''مجھے کشوری، جارج اور راک نے مارا ہے۔''

15 فروری کو نادکرنی کو پیرس کے مشہور سرجن ڈاکٹر بالیگا کے ذاتی کلینک میں داخل کیا گیا۔ داخلہ کے وقت وہ بالکل ہوش میں تھا۔ اس نے یہاں اپنے بھائی سے ایک نئی بات کہی۔ اس نے کہا۔ ''کشوری کا نوکر رابرٹ بدمعاش ہے اور افیون بیچتا ہے۔''

17 فروری کو ڈاکٹر بالیگا نے اس کے سر کا ایک خطرناک آپریشن کیا۔ آپریشن بالکل کامیاب رہا لیکن 19 فروری کو دن کے دو بجے نادکرنی نے آخری ہچکی لی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے... اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆☆☆

اب تک جن جن ڈاکٹروں نے نادکرنی کا معائنہ کیا تھا ان کی متفقہ رائے تھی کہ اس کو نہ صرف مارا گیا ہے بلکہ کم از کم بیس فٹ کی بلندی سے پھینکا گیا ہے۔ اس کے بدن کا نچلا حصہ چوٹ کی وجہ سے تقریباً مفلوج ہو چکا تھا۔

نادکرنی کی موت کے بعد پولیس بھی زیادہ تیزی سے حرکت میں آئی اور تفتیش کے پہلے دور میں کشوری ویلا کے مالی، لانا اور اس کے لڑکے نے یہ بیان دے دیا کہ انہوں نے

TAGPK.COM

خود اپنی آنکھوں سے راک اور جارج کو دیکھا کہ وہ نادکرنی کو اُوپر کی بالکونی سے نیچے پھینک رہے ہیں۔

کشوری کا پانچ دن مفرور رہنا اسے مشکوک بنا چکا تھا۔ اس کا بٹلر رابرٹ بھاگ چکا تھا اور حالات پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ کشوری بے گناہ ہے نہ اس کے ملازمین۔

ایک ہفتہ کے اندر رابرٹ بھی گرفتار کرلیا گیا۔ کشوری، جان، راک اور رابرٹ سبھی حراست میں تھے۔ ان کو مجسٹریٹ مسٹر ریلے کی عدالت میں پیش کیا گیا۔

رابرٹ سرکاری گواہ بننے کے لیے تیار ہوگیا اور عدالت نے اس کو یقین دلا دیا کہ اگر وہ بالکل سچا بیان دے گا تو اس پر رحم ضرور کیا جائے گا۔

مقدمہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلی گواہی رابرٹ کو دینا تھی۔ رابرٹ گواہوں کے کٹہرے میں آیا۔ کشوری نے مسکرا کر اپنے غدار ملازم کی طرف دیکھا، اس کی مسکراہٹ میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ رابرٹ نے اسی لمحے سرکاری گواہ بننے سے انکار کر دیا۔ پولیس سارا ڈھانچا جو اس نے کشوری اور دیگر ملزمان کے خلاف تیار کیا تھا، عدالت میں ہی ڈھیر ہوگیا۔

پولیس کی طرف سے جان جو کشوری کا ڈرائیور تھا، جیمس جو کچن میں ملازم تھا، لاتا جو مالی تھا۔ بطور گواہ پیش ہوئے۔ ڈاکٹروں نے بھی پولیس کی طرف سے گواہی دی۔

ڈرائیور جان نے اپنی گواہی میں کہا۔ ''میں کشوری کی بہن کو مالونگا چھوڑ کر واپس آیا اور میں نے سونے کے لیے گیرج کے سامنے اپنا بستر بچھا لیا لیکن ابھی میں سونے نہیں پایا تھا کہ میں نے ایک ایسی آواز سنی جیسے کپڑوں کی کوئی گٹھری بالکونی سے نیچے پھینکی گئی ہے۔ اس کے بعد میں نے سنا کہ نادکرنی میرا نام لے کر مجھے پکار رہا ہے۔ میں گیا تو اس نے اُوپر سے نیچے آتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں کپڑوں کا یہ بنڈل اس کی جیپ میں رکھ دوں۔ ٹھیک اسی لمحہ کشوری اور رابرٹ بالکونی پر نمودار ہوئے۔ کشوری نے نادکرنی سے کہا کہ وہ اُوپر آئے، نادکرنی اُوپر چلا گیا۔

پھر ایک گھنٹا بعد نادکرنی دوبارہ نیچے آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں گیرج کھول دوں کیونکہ وہ موٹر کی سیٹ پر رات بسر کرنا چاہتا ہے۔ میں نے گیرج کھول دیا۔ اب نادکرنی نے موٹر کی پچھلی سیٹ پر لیٹنے کے بعد مجھ کو بلا کر اپنی انگوٹھی دی اور کہا کہ میں یہ انگوٹھی کشوری کو دے آؤں۔ میں ہچکچایا تو نادکرنی نے مجھے ڈانٹا۔ مجبوراً میں انگوٹھی لے کر اُوپر گیا۔

میں نے کشوری کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور باہر سے ہی کہا کہ وہ انگوٹھی دینے آیا ہے، لیکن کشوری نے دروازہ نہیں کھولا اور کہا کہ اسے پریشان نہ کروں۔ واپسی کے لیے میں سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا کہ دیکھا، راک بھی میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ راک سیدھا گیراج میں گیا اور اس نے نادکرنی سے کہا کہ وہ دو محبت کرنے والوں کا جھگڑا ہے اور اس میں نرمی گرمی ہوتی ہی رہتی ہے اس لیے وہ گیرج کے بجائے اُوپر جا کر سوئے۔

میں نے اسی دوران نادکرنی کی انگوٹھی بھی راک کو دے دی تاکہ وہ اسے نادکرنی کو دے دے۔ راک کے سمجھانے پر نادکرنی دوبارہ اُوپر چلا گیا لیکن چند منٹ بعد کشوری کے

نعت کے غیر مسلم شاعر

اختر، ہری چند ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، ابتدا میں اپنا تخلص شرمار کھا بعد میں بدل کر اختر رکھ لیا لیکن مزاحیہ شاعری میں دوزخی کے تخلص سے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ یکم جنوری ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔ آپ کی شان میں فرماتے ہیں:

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
شوکت مغرور کا کس شخص نے توڑا طلسم
منہدم کس نے الٰہی قصرِ کسریٰ کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا در یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

اقتباس: بہرزماں۔ نوراحمد میرٹھی
مرسلہ: حبیب الرحمن

ادب سیتاپوری، کنور سورج نرائن سہنا ۱۹۰۹ء میں سیتاپور (اودھ) کے محلہ ترین پور کے گھرانے کے ایک فرد کنور سروپ نرائن کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا پتم رائے کاوش، بریلی کے باشندے تھے جو ۱۸۵۷ میں ترک سکونت کر کے سیتاپور آگئے تھے۔ آپ کی شان میں اس طرح مداح سرا ہوتے ہیں:

نمازِ محبت ادا کر رہا ہوں
خیالِ حرم سامنے آ نہ جانا
جبینِ ادب خود جھکی جا رہی ہے
قریب آرہا ہے ترا آستانا

اقتباس: بہرزماں۔ نوراحمد میرٹھی
مرسلہ: حبیب الرحمن

TAGPK.COM

کمرے سے دوبارہ جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔"

کچن کے ملازم لڑکے جیمس نے اپنے بیان میں کہا۔"میں نے اپنی آنکھوں سے کشوری کے کمرے میں نادکرنی کو مار کھاتے ہوئے دیکھا تھا، جارج اسے گھونسے مار رہا تھا، راک لاتیں مار رہا تھا اور کشوری اس پر اپنی چپل برسا رہی تھی۔ نادکرنی اس کے بعد بے ہوش ہوگیا۔ رابرٹ نے اسے صوفے پر لٹادیا۔"

مالی 'لاما' نے اپنے بیان میں کہا۔"9 فروری کو سورج نکلنے سے قبل میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جارج اور راک بے ہوش نادکرنی کو بالکونی سے پچھلی سڑک پر پھینک رہے ہیں، اس کے ہاتھ پیر بالکل اکڑے ہوئے تھے۔ لاما نے مزید کہا۔ جارج نے مجھے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں نے پولیس کو اپنا آنکھوں دیکھا حال بتایا تو مجھے قتل کردے گا۔ کشوری نے مجھ سے کہا کہ میں پرتگالی علاقے میں بھاگ جاؤں۔ وہ مجھے اس فرار کے لیے ایک بڑی رقم بھی دینے کے لیے تیار تھی۔

لاما کے لڑکے نے "چنایا" نے بھی بالکل ایسا ہی بیان دیا جو اس کے باپ نے دیا تھا۔

ڈاکٹروں نے اپنی گواہی میں اس کی تصدیق کی کہ نادکرنی کم از کم بیس فٹ کی بلندی سے ضرور گرا ہے اور گرنے سے قبل اس کو بُری طرح پیٹا گیا تھا۔

نادکرنی کے بھائی الم کرنی نے کہا۔"نادکرنی نے ہوش میں آنے پر خود مجھ سے کہا تھا کہ اس کو کشوری، راک اور رابرٹ نے پیٹا ہے۔"

☆☆☆

ان تمام گواہیوں کی بنیاد پر مجسٹریٹ نے کشوری، جارج، راک اور رابرٹ پر قتل کا جرم عائد کرتے ہوئے تمام ملزمان کو سیشن کے سپرد کردیا۔

مقدمہ مسٹر ہنوور اور نو افراد کی جیوری کے سامنے پیش ہوا۔ جیوری نے تین کے مقابلہ پر چھ رائے سے یہ فیصلہ دیا کہ ملزم رابرٹ بے گناہ ہے اور کشوری، راک و جارج ضربِ شدید لگانے کے مجرم ہیں۔ جیوری کی اکثریت نے ملزمان کو قتل کا مجرم نہیں مانا۔ عدالت نے تینوں کو سات سال قیدِ بامشقت کی سزا دے دی۔

کشوری نے فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل کی۔ اس کے وکیل مسٹر اے کے بروک نے اس کی طرف سے عدالت میں بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کردیا کہ جیوری نے اپنے حقوق کا غلط استعمال کیا ہے۔ جسٹس ماؤڈیکر نے فیصلہ دیا کہ مقدمے کی دوبارہ سماعت ہو۔

مقدمہ کی دوسری سماعت سیشن جج اور سات ممبران جیوری کے سامنے شروع ہوئی۔ مسٹر بروک نے کشوری کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کی۔ اس مرتبہ جیوری نے تین کے مقابلہ میں چار کی رائے سے کشوری کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ سیشن جج نے جیوری کی رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ جیوری کا فیصلہ چوں کہ قانون کے تقاضوں کو پورا نہیں کررہا ہے اس لیے مقدمہ کی دوبارہ سماعت ہو بشرطیکہ حکومت اس سماعت کو منظور کرے۔ حکومت نے سیشن جج کے فیصلہ کی توثیق کردی۔

مقدمہ کی تیسری سماعت سیشن جج مسٹر جے ایم کیل کے سامنے شروع ہوئی، ایک اسپیشل جیوری کا تقرر کیا گیا۔ اب نئے سرے سے گواہیاں گزریں۔ سرکاری وکیل نے اپنی بحث میں کہا۔

"جارج اور راک کشوری کے پرانے اور وفادار ملازم ہیں۔ انہوں نے یقیناً اپنی مالکہ کے حکم پر نادکرنی کو مارا پیٹا اور پھر اس کو بالکونی سے نیچے پھینکا ہے۔ وہ کشوری کی ہدایت کے بغیر یہ جرم نہیں کرسکتے تھے، کیوں کہ ان کی نادکرنی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

جیوری نے متفقہ طور پر تینوں کو مجرم قرار دے دیا، عدالت سے تینوں کو پانچ پانچ سال قیدِ سخت کی سزا سنادی گئی۔ کشوری نے سیشن جج کے فیصلہ کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی لیکن یہ اپیل خارج کردی گئی۔

☆☆☆

پیرس کی اس قلوپطرہ جو کبھی راتوں کی چاندنی بنی رہتی تھی۔ اپنی سزا اس جیل میں کاٹی جہاں بڑے بڑے لیڈر اپنی سزائیں کاٹا کرتے تھے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد کشوری بالکل گمنام ہوکر رہ گئی۔ کسی کو نہ معلوم ہوسکا کہ وہ کہاں رہتی تھی؟ کیا کرتی تھی؟ اور اس کے دن کس طرح گزر رہے ہیں؟

صرف ایک افواہ مشہور ہوئی تھی کہ وہ اپنا زیور بیچتی رہتی ہے اور اس کے سابقہ سیٹھ ساہوکار دوست کبھی کبھی اس کی کچھ مدد کردیا کرتے ہیں لیکن ایک امر بالکل مسلمہ ہے، کشوری اب وہ کشوری نہیں رہی ہے جس کی صرف ایک ہی جھلک نوجوانوں اور بوڑھوں تک کو دیوانہ بنادیا کرتی تھی۔

++

TAGPK.COM

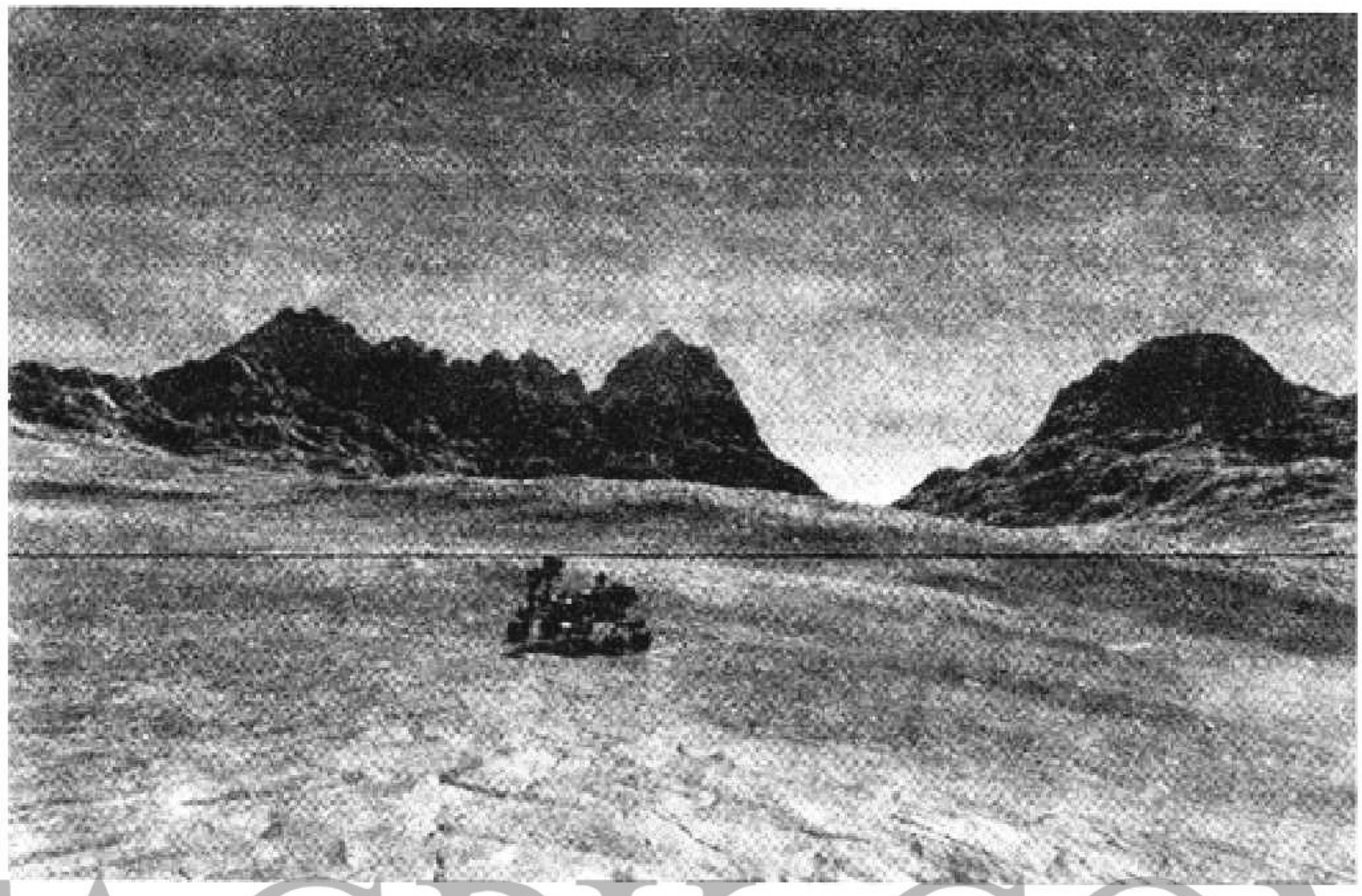
نگراں

فرزانہ نگہت

انسان کے قدم جب چاند پر پہنچے تو خلا نوردوں نے وہاں ایک عجیب و غریب چیز دیکھی۔ وہ بلند و بالا عمودی چٹانوں کو پیلا رنگتے ہوئے اس چیز کی طرف بڑھے لیکن جب نزدیک پہنچے تو حیران رہ گئے

TAGPK.COM

ذائقہ بدلنے کے لیے چھوٹی سی سائنس فکشن



اگر آپ چاند پر جنوبی سمت سے نظریں دوڑائیں تو اس کے دائیں کنارے پر اس کے خم کے ساتھ ساتھ آپ کو اوپر کی طرف ایک وسیع و عریض سیاہ دھبوں کی میدان دکھائی دے گا جو چاند کی سب سے خوبصورت اور عمدہ جگہ ہے۔ اسے ''میئر کریسیئم'' یا ''بحیرِ معمات'' کہتے ہیں۔ دو ہزار سات میل قطر کے اس پر شکوہ پہاڑوں کے گھیرے میں واقع اس جگہ کو ہماری وہاں 1996ء میں آمد سے پہلے کبھی نہ کھوجا گیا ہے۔

مجھے بحیثیت ماہر ارضیات ''میئر کریسیئم'' کے جنوبی خطے کی کھوج کا کام سونپا گیا تھا۔ ہم نے اس میں ایک ہفتے میں سو میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ ایک نضائی دباؤ کو برداشت رکھنے والے

آلے سے مزین ٹریکٹر میں پہاڑوں کے کناروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہمارا سفر چاند کی سست رفتاری سے طلوع ہونے والی صبح کے ساتھ شروع ہوا تھا اور زمینی وقت کے مطابق ہمیں وہاں شام ہوتے ہوتے ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ ان عجیب و غریب پہاڑوں میں کسی کو کبھی تھکن کا احساس نہیں ہوتا جو زمین کے پہاڑوں کے مقابلے میں کٹے پھٹے اور عجیب سا کھردرا پن لیے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کے دامنوں میں گھومتے پھرتے اور بلند و بالا چٹانوں پر چڑھتے اترتے ہم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہمیں وہاں کیسے کیسے عجائبات دیکھنے کو ملیں گے۔

ہم ایک دن میں درجنوں بار خلائی لباسوں میں ملبوس اپنی گاڑی سے نکل کر چاند کی دھاتوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل جایا کرتے تھے۔ ہم زمینی وقت کے مطابق وہاں وقت گزار رہے تھے۔ دن کے اختتام سے پہلے بائیس سو گھنٹوں میں ہمارا ریڈیائی پیغام پانچ سو میل کی دوری پر بیس (Base) پر پہنچتا تھا۔ ہمارے کیبن کے باہر چٹانیں سورج کی عمودی کرنوں میں دہک رہی تھیں لیکن ہمارے لیے یہ رات کا وقت تھا جسے ہم نے آٹھ گھنٹے سو کر گزارا۔

اس دن کیبن کے ایک کونے میں بنے ہوئے باورچی خانے میں ناشتا تیار کرنے کی باری میری تھی۔ یہ کوتا گیلری کا کام بھی دیتا تھا۔ گوشت کے پارچوں کو فرائی پین میں ڈالتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ ان تمام سالوں میں زمین سے شارٹ ویو ریڈیو نے میرا ایک پسندیدہ گیت ''ڈیوڈ آف دی وائٹ راک'' نشر کیا تھا۔ کیبن کے باہر ہمارا ڈرائیور اپنے خلائی سوٹ میں ملبوس ٹریکٹر کے نچلے پرزوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ میرا اسسٹنٹ لوئیس گارنٹ بھی اس کے ساتھ مصروف تھا۔

گوشت گل جانے کے انتظار میں فرائی پین کے پاس کھڑے کھڑے میں نے یونہی دس ہزار فٹ بلند پہاڑی دیواروں کے اوپر نظریں دوڑانی شروع کیں۔ جنہوں نے سامنے تمام جنوبی افق کو ڈھانپ رکھا تھا۔ قریب ترین دیوار کے مرکزی حصے بھی میدان کی خمدار عمودی سطح نے نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا کیونکہ چاند ایک بے حد چھوٹی سی دنیا ہے اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے افق تقریباً دو میل کی دوری پر تھا۔ سورج کی دھوپ بڑی خیرہ کن چمک کے ساتھ ان چٹانی دیواروں پر پڑ رہی تھی اور آنکھوں کو چندھیائے دے رہی تھی لیکن ان کے اوپر تارے وسط سرما کی آدھی رات کے زمینی آسمان سے بھی زیادہ سیاہ آسمان پر چمک رہے تھے۔

میری آنکھوں نے اسی وقت ایک بڑی چٹانی دیوار کے کنارے کے اوپر چوٹی پر ایک عجیب سی شے چمکتی دیکھی۔ اسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس چوٹی نے آسمان سے کوئی تارا نوچ لیا ہو۔ یہ روشنی کا کوئی پہلودار گولا سا تھا۔ میں از راہ تجسس یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ آخر کیا چیز ہو سکتی تھی آہستہ رو یری کی برجی پر چڑھا اور چار انچ ٹیلی اسکوپ کا رخ اس طرف موڑ دیا۔

میں نے جو کچھ دیکھا وہ مجھے شدید حیرت اور الجھن میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا۔ تیز دھوپ میں جو چیز چمک رہی تھی وہ اتنی چھوٹی سی تھی کہ اس کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنا مشکل تھا لیکن اس کی بناوٹ کا تناسب اور نفاست حیران کن تھی اور جس چوٹی پر وہ ٹھہری ہوئی تھی اس کی زمینی سطح بالکل ہموار تھی۔ میں بڑی دیر تک اس عجیب شے کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ میرے نتھنوں میں جلتے ہوئے گوشت کی بو آنے لگی جس نے مجھے بتا دیا کہ ہمارے ناشتے کے گوشت کے پارچوں نے سوا لاکھ میل کا سفر بے کار ہی طے کیا تھا۔

اس تمام صبح ہم اس شے کے بارے میں بحث میں الجھے رہے۔ یہ یقین تھا، میرے رفقاء نے کہا تھا کہ چاند پر کسی قسم کی ذہین زندگی موجود نہیں تھی۔ میں بھی یہ بخوبی جانتا تھا لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سائنس دان اپنے بے وقوف کہلانے کا خوف اپنے دل سے نکال پھینکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''میں وہاں جا رہا ہوں۔ اگر یہ میری ذہنی تشفی کے لیے بہتر ثابت ہوتا ہے تو.....''

''اگر تم نے اپنی گردن نہ تڑوالی تو یہاں سے زمین واپسی پر سب تم پر ہنس رہے ہوں گے۔'' گارنٹ بولا۔

راس کے اندر ڈیڑھ میل ٹریکٹر میں چکر لگانے کے بعد ہم جلد ہی سونے لیٹ گئے۔

اگلی صبح گارنٹ بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ ہمارا ڈرائیور ٹریکٹر کے ساتھ پیچھے چھوڑے جانے پر بے حد خوش ہوا تھا۔

پہلی نظر میں ہمیں وہ چوٹیاں مکمل ناقابل پیمائش معلوم ہوئی تھیں لیکن بلندیوں کا تجربہ رکھنے والوں کے لیے ایسی دنیا کی چڑھائیاں چڑھنا آسان ہوتا ہے جہاں زمین کے مقابلے میں وہ چھ گنا کم بلند ہوتی ہیں۔ ہم نے اپنا پہلا پڑاؤ میدان سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک چوڑے چھجے پر ڈالا۔ وہاں سے ہمیں بہت دور نیچے اپنا ٹریکٹر ایک ننھے سے دھاتی کیڑے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

ہمیں اپنے خلائی لباسوں کے اندر خوشگوار سی ٹھنڈک

محسوس ہورہی تھی کیونکہ ان کے ریفریجریشن یونٹ ہمارے جسموں کی گرمی کو خارج کرنے کے لیے سورج سے زبردست جنگ کررہے تھے۔ گیرٹ غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مہم سراسر احمقانہ اور بے سود قسم کی تھی میں بھی اس سے کافی حد تک متفق تھا لیکن پہاڑیوں پر چڑھنے کا جوش اور یہ احساس کہ اب تک کسی انسان نے وہاں قدم نہ رکھا تھا مجھے مسرور کیے ہوئے تھا۔

بالآخر ہم ایک چٹانی دیوار تک آن پہنچے۔ یہ ہمارے سروں سے پچاس فٹ بلند تھی اور اس کے اوپر ہموار سطح زمین پر وہ چیز کھڑی تھی جس کی کشش مجھے ان لق ودق ویرانوں میں کھینچ لائی تھی۔ وہ یقینی طور پر زمانوں پہلے کا کسی شہابیے کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہوسکتا تھا۔ اس کی درزیں یا شگاف اس گمبھیر اور نا قابل تبدیل سکوت میں ابھی تک نئے اور روشن دکھائی دے رہے تھے۔

اس چٹانی دیوار پر چڑھنے کے لیے اس میں ہاتھ پاؤں جمانے کے لیے کوئی سوراخ وغیرہ نہیں تھے اس لیے ہمیں رسی اور آنکڑے سے مدد لینی پڑی۔ میں نے آنکڑے کو گھما کر اوپر پھینکا تیسری کوشش میں یہ اوپر کی ہموار سطح کے کنارے میں اٹک گیا۔ میں رسی کے سہارے اوپر چڑھنے لگا۔ گارنٹ میرے پیچھے پیچھے ہولیا۔

بھاری خلائی لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود یہاں میرا وزن چالیس پاؤنڈ سے زائد نہ تھا اس لیے میں تیزی سے ہاتھ چلاتا ہوا اوپر چڑھتا گیا۔ اوپر چٹانی کنارے تک پہنچ کر میں نے اپنے ساتھی کی طرف ہاتھ ہلایا اور اوپر ہموار سطح پر چڑھ کر سیدھا کھڑا ہوگیا اور سامنے دیکھنے لگا۔

آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ اس لمحے تک مجھے مکمل یقین تھا کہ وہاں میرے پانے کے لیے کوئی نئی انوکھی چیز نہ ہوگی۔ یہ محض شک وشبہ ہی تھا جو مجھے اس جگہ کھینچ لایا تھا لیکن یہ شک و شبہ ہی نہیں کوئی غیر معمولی احساس بھی تھا۔

اب میں اس سو فٹ لمبی چوڑی سطح مرتفع پر کھڑا تھا۔ میرے سامنے وہ چیز کھڑی چمک رہی تھی۔ ہرم نما..... ایک آدمی کے قد سے دوگنی لمبائی کی..... یہ چٹان پر ایک بہت بڑے کئی پہلوؤں والے ہیرے کی طرح جمع کھڑی تھی۔

مجھے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شاید وہاں چاند کی کوئی تہذیب ہوتی ہوگی جسے دریافت کرنے والا میں پہلا انسان ہوں گا۔

میرے ذہن نے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ کیا یہ کوئی عمارت ہے؟ کوئی مقبرہ؟ یا کوئی ایسی چیز جسے ہماری زبان میں کوئی نام نہ دیا جاسکتا تھا؟ اگر یہ کوئی عمارت تھی تو یہ اس انتہائی ناقابل رسائی جگہ پر کیوں کھڑی تھی؟ میں اسے زیادہ قریب سے دیکھنے کے لیے اس کی طرف بڑھ گیا لیکن کسی محتاط حس نے مجھے اس کے زیادہ قریب جانے سے روک دیا۔

پھر میں نے اس کی چوٹی سے کوئی چیز رینگتے ہوئے نیچے جاتے دیکھی۔ یہ خلائی مٹی تھی جس نے نیچے جاکر اس ہرم نما شے کو ایک بڑے سے دائرے کی صورت میں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ گویا اس کے گرد ایک حفاظتی دیوار کھڑی کردی۔ میں نے ایک پتھر اٹھایا اور اس چمکتی شے کی طرف اچھال دیا وہ اس کی نیم گولائی والی سطح سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔

مجھے خیال گزرا کہ وہ کوئی غیر معمولی چیز تھی۔ ہماری زمین پر پائی جانے والی چیزوں سے یکسر مختلف..... وہ کوئی عمارت نہیں بلکہ ایک مشین تھی جو ابدیت اور چیلنج کرنے والی قوتوں سے اپنی حفاظت کررہی تھی۔ میں گیرٹ کی طرف مڑا جو میرے قریب ہی بے حس وحرکت سا کھڑا تھا۔ وہ مجھ سے

ایک تقریب میں امیر الامرا کا یہ شعر میرے سامنے پڑھا گیا۔

بگذر مسیح از سیر ما کشتگان عشق
یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

چونکہ میری طبیعت موزوں ہے۔ کبھی آورد سے اور کبھی بے ساختہ مصرع رباعی یا شعر موزوں کرلیتا ہوں۔ اس وقت بے اختیار یہ شعر زبان پر آگیا:

از من متاب رخ کہ نہ یم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

جب یہ شعر دربار میں پڑھا گیا تو حاضرین میں سے بعضوں نے جن کی طبیعت موزوں تھی اسی زمین میں شعر کہہ کر پیش کیے۔ ملا علی احمد مہرکن نے بھی اسی زمین میں یہ شعر کہا اور اچھا کہا

اے محتسب! ز بہر چہ پیر مغان مترس
یک خم شکستن تو بصد خون برابر است

اقتباس: تزک جہانگیری
مرسلہ: شاہد جہانگیر شاہد۔ پشاور

بے خبر دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اسے نہ چھیڑا اور کچھ بہتر طور سوچ وفکر کرنے کے لیے چٹان کے سرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس دریافت پر میں نے اپنے پہلے جوش وخروش میں یہ خیال کیا تھا کہ شاید یہ چمکتا دمکتا مجوبہ چاند کے دور دراز کے ماضی کی کسی نسل سے تعلق رکھتا تھا پھر ایک دم ہی یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا کہ شاید یہ میری ہی طرح چاند پر پہنچنے والا کوئی اجنبی ہے۔ چاند کی کوئی تہذیب خواہ کیسے ہی انجام سے دوچار ہوئی ہو اپنے وجود کی کوئی نشانی نہ چھوڑ سکی تھی۔

ہمیں ایٹمی قوت سے اس شے کی نادیدہ ڈھال توڑنے اور ان کرسٹل کی دیواروں سے گزر کر اس مشین میں داخل ہونے میں بیس سال لگے۔ اس میں ہمیں جو میکنزم ملے اور اس میں جو ٹیکنالوجی استعمال ہوئی تھی وہ ماورائے انسانی قوتوں کی ایجاد ہی ہو سکتی تھی۔

زمین پر پڑی خلائی مٹی کی موٹی سی تہہ کے مطالعے سے ہمیں اس اہرام نما مشین کی عمر معلوم کرنے میں آسانی ہوگئی۔ اسے ہماری زمین پر زندگی کے ظہور سے پہلے وہاں نصب کیا گیا تھا۔ جب ہماری دنیا اس کے موجودہ زمانے سے نصف عمر کی تھی تو ستاروں کی دنیا سے کوئی چیز باہر نکلی تھی اور چاند کے نظام (سولر سسٹم) سے گزرتی ہوئی اپنے راستے میں اپنی یہ نشانی چھوڑتے ہوئے آگے چلی گئی تھی۔ ہمارے ہاتھوں تباہ ہونے تک وہ نشانی یعنی وہ ہرم نما مشین برابر اپنا کام کیے جا رہی تھی اور اپنے بنانے والوں کا مقصد پورا کیے جا رہی تھی۔ یہ مقصد کیا تھا؟ اس بارے میں میرا اندازہ تھا کہ بہت پہلے..... کہکشاں کے دائرے میں حرکت کرتے ہوئے کروڑوں اربوں ستاروں کے درمیان دوسرے سورجوں کی دنیاؤں کے لوگ سائنسی ترقی کی ان منازل پر پہنچ چکے تھے جن پر ہم اب پہنچے تھے۔ تخلیق کی ڈوبتی ہوئی روشنی میں ان تہذیبوں کا سوچنے جو چند ہی دنیاؤں میں موجود تھیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے تنہا تھے۔ ان کی تنہائیوں، ان کے عقائد اور ان کی سوچوں میں اس وسیع وعریض کائنات میں کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ ہماری طرح انہوں نے بھی دوسری زندگیوں کی تلاش میں ستاروں کے جھرمٹوں کو کھوجا ہوگا اور ہر جگہ خالی دنیائیں ہی دیکھی ہوں گی یا ایسی دنیائیں جن میں بے معنی قسم کی رینگنے والی مخلوقات تھیں۔ ایسی ہی ہماری زمین بھی اس وقت تھی۔ اس کی فضائیں اس وقت آتش فشاں پہاڑوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھیں جب پلوٹو کے عقب کی بھول بھلیوں سے ابتدائی لوگوں کا پہلا جہاز نمودار ہوا تھا۔ یہ بیرونی منجمد دنیاؤں کے قریب سے گزرا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ زندگی ان کی تقدیر میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی وہ راستے میں آنے والے مختلف سیاروں پر آرام کرنے کے لیے اور سورج کی دھوپ میں گرم ہونے کے لیے اترتے گئے۔

ان آوارہ گردوں نے زمین کو بھی ضرور دیکھا ہوگا، برف اور آگ کے درمیان تنگ علاقے میں محتاط چکر لگایا ہوگا اور اندازہ لگایا ہوگا کہ یہ سورج کے بچوں کے لیے بے حد پسندیدہ جگہ تھی۔ یہاں دور دراز کے مستقبل میں ذہانت جنم لے سکتی تھی۔ وہ یہاں آباد ہو سکتے تھے لیکن ان کے آگے ابھی بہت سی دنیائیں تھیں اس لیے وہ پھر بھی اس طرف نہ آئے لیکن انہوں نے یہ کہا کہ کائنات میں بکھری لاکھوں کروڑوں دنیاؤں کی نگرانی کے لیے چاند پر اپنا ایک سنتری یا پاسبان چھوڑ دیا۔ یہ روشنی کا ایک مینار تھا (Beacon) جو ان تمام زمانوں میں انہیں بڑے تواتر کے ساتھ یہ سگنل بھیجتا چلا آ رہا تھا کہ اسے ابھی تک کسی نے دریافت نہ کیا تھا۔

شاید اب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں کہ کرسٹل کا وہ اہرام زمین کی بجائے چاند پر ہی کیوں نصب کیا گیا تھا۔ اس کے بنانے والوں کو ان نسلوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا جو آپس میں لڑ جھگڑ رہی تھیں۔ انہیں ہماری تہذیب سے اس وقت دلچسپی ہوتی اگر ہم اپنی بقا کے لیے سوز دنیت ثابت کرتے۔ تمام ذہین نسلیں اکٹھی ہو جاتیں اور ان کے جھولے (Cradle) سے بھاگ نکلنے کے لیے خلا کو پار کرنے کا چیلنج قبول کرتیں۔

اس امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اس ہرم کی دریافت اور اس کے بزور کھولنے سے پہلے ایک ہی وقت کی بات تھی۔

اب اس کے سگنل بند ہو چکے ہیں اور اس کی ڈیوٹی پر مامور لوگوں کے ذہن زمین کی طرف مڑ چکے ہیں۔ شاید وہ ہماری نوزائیدہ تہذیب کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر وہ اب بہت..... بہت بوڑھے ہو چکے ہوں گے اور بوڑھے لوگ احمقانہ طور پر جوانوں سے حسد کرتے ہیں۔

میں اب کہکشاؤں کی طرف کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس پر حیران ہوئے بغیر کہ ستاروں کے جھنڈوں کے بادلوں میں کس طرف سے وہ بھیدی آ رہے ہیں۔ ہم نے فائر الارم لگا دیا ہے اور اب بجز انتظار کچھ نہیں کر رہے۔ میں یہ نہیں سوچتا کہ ہمیں کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔

++

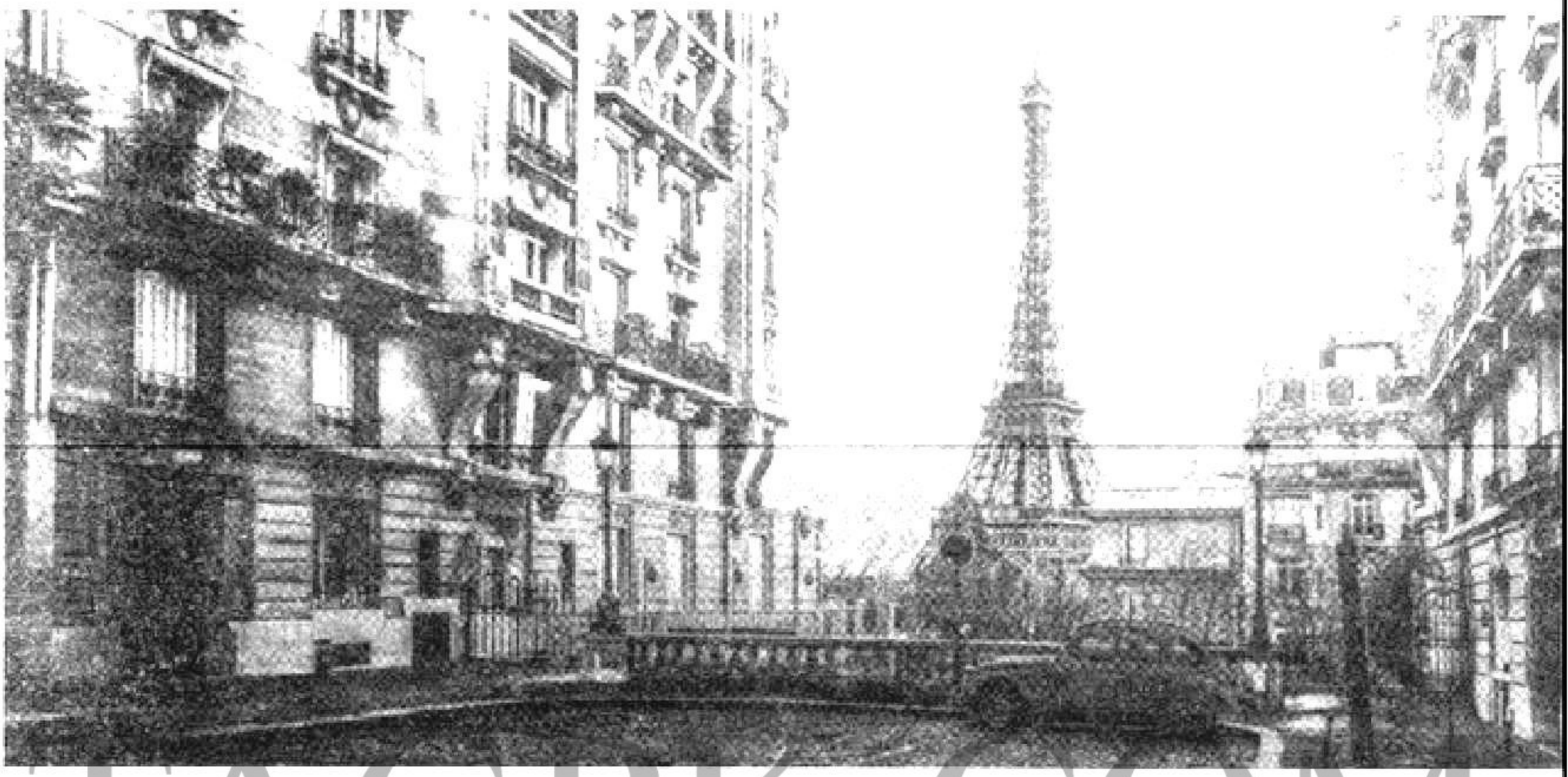
TAGPK.COM

پیرس کی یادیں

کمال عالم خان

سفر وسیلہ ظفر تو ہوتا ہی ہے معلومات کا خزانہ بھی بناتا ہے اچھی تحریر پڑھنے کے شوقین ہیں تو یہ سفرنامہ آپ ہی کے لیے ہے امید قوی ہے کہ آپ کو دیگر سفرناموں کی طرح یہ بھی پسند آئے گا۔

سفر وسیلہ ظفر ہے جن کی مناجات



فرانس کے مختلف شہروں کی سیر کرنے کا موقع مجھے اب تک کی زندگی میں تین دفعہ ملا۔ ہر دفعہ کچھ نئے مشاہدات ہوئے ہیں اور ہر دفعہ مختلف مقامات دیکھنے کا موقع ملا اسی لیے کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر ہے۔ سفر کیسے کیسے تجربات کی کسوٹی پر پرکھتی ہے ذرا آپ بھی سنیں۔

یہ 1979ء کی شروع کی بات ہے۔ میں ان دنوں واپڈا میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ڈیزائن کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور واپڈا ہاؤس لاہور میں میرا آفس تھا۔ انہی دنوں انٹرنیشنل ڈیویلپمنٹ ایجنسی (IDA) نے پاکستان کے بجلی کے نظام کو ٹھیک کرنے اور نئے ہائی ٹینشن لائن اور بجلی

کے گرڈ اسٹیشن بنانے کے لیے 23 ملین ڈالر کی ایڈ دی تھی۔ نئے گرڈ اسٹیشن اور بجلی کی ترسیل کے ڈیزائن اور کنسٹرکشن کا کام میرے ڈیپارٹمنٹ کو دیا گیا جس کا میں انچارج تھا۔ پروجیکٹ پر موٹر کولمبس کنسلٹنگ انجینئر مقرر ہوئے جو اس پروجیکٹ پر میرے ڈویژن کے ساتھ مل کر 32 عدد ہائی ٹینشن گرڈ اسٹیشن اور کئی سو کلومیٹر ہائی ٹینشن ٹرانسمیشن بجلی کی لائن بنوائیں گے۔ موٹر کولمبس انجینئرز سوئٹزرلینڈ کی کمپنی تھی۔ یہ 32 عدد ہائی ٹینشن گرڈ اسٹیشن جو پورے پاکستان کے مختلف علاقوں میں بنوائے گئے مثلاً جمرود اور ٹل جو خیبر پختونخواہ میں ہیں سے لے کر پورے پنجاب اور سندھ میں پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے ان تمام جگہوں پر جانے اور گرڈ اسٹیشن کی جگہ کا تعین اور اپروول کے لیے اس جگہ کو دیکھنے کا موقع ملا لہٰذا پاکستان کے تقریباً ہر علاقے میں اور ہر شہر میں میرا جانے کا اور وہاں کا علاقہ دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی دوران پاکستان واپڈا نے ان کارخانوں میں جہاں سے ہم اس پروجیکٹ کے لیے پلانٹ اور مشینری خرید رہے تھے، موٹر کولمبس کنسلٹنگ انجینئر کی سفارش پر اپنے انجینئرز کو اعلیٰ ٹریننگ کا پروگرام بنایا جو بجلی کی ہائی وولٹیج ترسیل پر تھی، فرانس کی کمپنی مرلن جرائن جو آج کل شنائڈر کہلاتی ہے، واپڈا کو گرڈ اسٹیشن سے متعلق سامان اور ایکیوپمنٹ سپلائی کر رہی تھی۔ واپڈا کی طرف سے مجھے فرانس میں ٹریننگ کے لیے اس کمپنی میں بھیجا گیا جہاں پر جدید قسم کی بجلی سے متعلق ہائی پاور ٹرانسمیشن کی مشینری اور ایکیوپمنٹ کے ڈیزائن اور استعمال کو سمجھا جا سکے تاکہ جب پاکستان میں اس کو لگا کر استعمال میں لایا جائے اور اگر کوئی نقص پیدا ہو تو فوراً ٹھیک کیا جا سکے۔ فرانس میں لیون شہر کے قریب ایک قصبہ گرونوبل ہے جہاں پر شنائڈر کمپنی کے مینوفیکچرنگ پلانٹ، ٹریننگ سینٹر ہے اور گرونوبل ٹیکنیکل یونیورسٹی بھی ہے جہاں پر پاور انجینئرنگ سے متعلق خاص طور سے ہائی وولٹیج پاور کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہاں ہائی وولٹیج کی ایک بہت اچھی لیبارٹری بھی ہے جہاں پر اس سلسلے میں نئی ریسرچ اور ٹیسٹ وغیرہ ہوتے ہیں۔

گرونوبل کی حیثیت اس وجہ سے بھی مشہور ہے کہ یہاں سائنس کی ریسرچ کی بہت سی لیبارٹریز ہیں اور مختلف ملکوں کے ریسرچ اسکالر یہاں کام کرتے ہیں۔ اس زمانے میں ہمارے ملک میں سب سے زیادہ وولٹیج جس پر واپڈا کی بجلی کی ترسیل کا دارومدار تھا اور اب بھی ہے 500,000 وولٹ یا 500 کے وی ہے۔ اس زمانے میں یعنی 1997ء میں اس لیبارٹری میں 1000 کے وی پر ٹیسٹ ہو رہے تھے اور اب دنیا میں بہت سی جگہ 1000 کے وی پر بجلی کی ترسیل ہو رہی ہے۔ بہرحال، ہماری رہائش، ٹریننگ، تعلیم سے متعلق خرچا مرلن جرائن کمپنی کے ذمے تھا۔ عام طور سے ٹریننگ کمپنی کے ورکشاپ فیکٹری یا کمپنی کی ٹیسٹ لیبارٹری میں ہی تھی مگر کچھ دن معلومات کے لیے گرونوبل ٹیکنیکل یونیورسٹی میں بھی جانا پڑا جہاں پر ہمارے ٹرینر یا پروفیسر ڈاکٹرز کے تھے۔ یہ نہایت تجربہ کار اور پڑھے لکھے انسان تھے جو انگریزی زبان بہت اچھی طرح سے بولتے تھے اور یہ ہمارے لیے بہت اچھے تھے کیونکہ ہمیں فرانسیسی بالکل نہیں آتی تھی۔ یہاں فرانس میں لوگ انگریزی بولنا پسند نہیں کرتے حالانکہ انہیں انگریزی آتی بھی ہو تو بھی انگریزی بولنے سے معذرت کر لیں گے۔

ہماری رہائش کا انتظام ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کیا گیا تھا جو شنائڈر کمپنی کے کارخانوں اور گرونوبل یونیورسٹی کے درمیان تھا۔ ہماری تعلیم کے لیے ڈاکٹرز کے ذمے داری تھی۔ زیادہ تر ہماری ٹریننگ سے متعلق کلاس شنائڈر کمپنی کی فیکٹری میں ہی ہوئیں لیکن تجربات کے لیے گرونوبل ٹیکنیکل یونیورسٹی میں بھی کلاس ہوتی اور تجربہ گاہ کا بھی دورہ ہوتا۔

گرونوبل میں شنائڈر کمپنی کی کئی جگہ فیکٹریاں ہیں۔ عملی تجربے کے لیے وہاں بھی جاتے اور مختلف ٹیکنیکل نوعیت کی معلومات اکٹھی کرتے اور بہت سے معاملات پر وہاں موجود انجینئرز سے گفتگو بھی ہوتی جس سے علم میں کافی اضافہ ہوتا۔

گرونوبل میں شنائڈر کمپنی کی تقریباً تمام فیکٹریوں میں جانے کا موقع ملا۔ یہاں لوگ، عورتیں اور مرد، بچے سب انگریزی سمجھتے ضرور ہیں مگر بولتے نہیں ہیں۔ انگریزی کو بولنا اچھا نہیں سمجھتے۔ یہاں تمام فیکٹریوں میں پہلی دفعہ پہلوان قسم کی عورتوں کو مردوں والے کام کرتے دیکھا۔ مثلاً بھاری بھاری وزن ایسے اٹھا رہی تھیں جس کو دیکھتے ہی ہماری جان نکل جائے۔

یہاں کی فیکٹریوں میں ایک اور خاص بات دیکھی۔ اکثر ورکرز کی ورکنگ ٹیبل کے سامنے دیوار پر پسند کے مطابق کسی فلمی یا غیر فلمی حسینہ کا نیم برہنہ فوٹو ضرور ہوتا اگر آپ نے دیکھ کر تعریف کر دی تو جن صاحب کی پسند ہے وہ

بہت خوش ہوں گے اور اس حسینہ کے جسم کے اجزائے ترکیبی کی تعریف بھی کریں گے کیونکہ حسن اور خوبصورتی صرف چہرے کی نہیں ہوتی۔ یہاں مجھے اپنی بے ثباتی کا خیال آیا کہ ہم لوگ بھی کس قدر بھولے ہیں یا پھر مجبور ہیں کہ اگر کسی خاتون حسینہ کی اندرونی اور بیرونی خدوخال دیکھے بغیر ہی تعریف کردی تو ہمارے اوپر بے غیرتی کی ساری دفعات لاگو ہوجاتی ہیں اور مفت میں مختلف گالیاں اور لعنتیں ملتی ہیں۔ کبھی کبھی تو اپنے اردگرد اسلام خطرے میں محسوس ہونے لگتا ہے اور آپ پورے کے پورے کفار کی صف میں دکھائی دیتے ہیں۔

فیکٹری کے ملازمین خاص طور سے خواتین اور مرد جو غیر شادی شدہ ہیں، اپنا فارغ وقت جم یا اسپورٹس میں گزارتے ہیں۔ یہاں فٹ بال ایک ہردلعزیز کھیل ہے۔ لوگ اس کے دیوانے ہیں۔ شام سے رات تک اکثر فٹ بال اسٹیڈیم آباد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری چیز جو آباد ہوتی ہے وہ یہاں کے شراب خانے یا پب ہیں۔

ایک دن ازراہ تفریح اور یہ سوچ کر کہ کچھ تو مقامی لوگوں سے راہ رسم ہو، اک خوش شکل خاتون جو فیکٹری میں کلرک یا سیکریٹری تھیں اور انگریزی بول سکتی تھیں، میں نے پوچھ لیا کہ ''آپ شام کو اپنا وقت کیسے گزارتی ہیں؟ کیا آپ شام کو کسی اسپورٹ میں حصہ لیتی ہیں۔'' تو وہ خوش ہوئیں کہ چلو کسی نے تو ان سے ان کی ذاتی مصروفیت کے متعلق بات کی اور نہایت اپنایت سے گفتگو کی۔ فوراً بولیں۔ ''وی، وی۔'' یعنی جی ہاں۔ جی ہاں۔ میں روز تیراکی کرتی ہوں۔'' میری زبان سے نکل گیا۔ ''ویری اسمارٹ۔ میں بھی تیراکی کرتا ہوں۔'' حالانکہ مجھے تیراکی بالکل نہیں آتی اور نہ کبھی تیراکی (خراب ہی سہی) کی ہے۔ بھڑک مارنے میں کیا حرج تھا کیونکہ دوستی بھی بڑھانا تھی۔ بہرحال، بات بڑھانے کے لیے کہ جس ہوٹل میں، میں رکا ہوا ہوں وہاں سوئمنگ پول نہیں ہے۔ فوراً ازراہ ہمدردی اور ازراہ محبت بولیں۔ ''آج شام میں آپ کو ہوٹل سے لے لوں گی۔ میں روز شام کو ایک کلب جس کی میں ممبر ہوں، سوئمنگ کرتی ہوں۔'' اسی دوران ایک صاحب ہماری گفتگو سن کر قریب آئے اور ازراہ مہربانی اور ازراہ محبت بولے۔ ''ریٹا! تم کمال صاحب کو شام اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تمہاری کمپنی بھی اچھی رہے گی اور کمال صاحب تمہاری کمپنی میں انجوائے کریں گے۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

''ریٹا ایک اچھی تیراک ہے۔ ہمارے علاقے کی گولڈ میڈلسٹ ہے۔ آپ اس کے ساتھ سوئمنگ کرتے ہوئے بہت انجوائے کریں گے۔''

نام تو خاتون کا پتا چل گیا تھا کہ محترمہ ''ریٹا'' کہلاتی ہیں۔ اب ہم ان کو کیا بتاتے کہ ہم نے تو کبھی گہرے پانی میں اتر کر بھی نہیں دیکھا، تیرنا تو دور کی بات ہے۔ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میں نے تو صرف بات کرنے کے لیے ہی مخاطب کیا تھا کہ رعب مارنے میں کیا حرج ہے ادھر ریٹا بضد تھی کہ شام کو وہ اپنی گاڑی میں مجھے لینے آئے گی۔ ساتھ تیراکی کرے گی اور پھر میرے ساتھ ڈنر کرے گی جو اس کی طرف سے ہوگا۔ بہت خوشی خوشی مجھے آفر دے ڈالی۔ میں بہت مشکل میں پھنس چکا تھا۔ تیرنا مجھے اچھا نہیں آتا تھا۔ میرا پول کھل جانا تھا۔ ڈنر کی خیر ہے۔ ریٹا کی کمپنی میں یا اس کے ساتھ میں ڈنر ضرور کرنا چاہتا تھا۔ کچھ گپ شپ ہوتی اس خوبصورت عورت کے ساتھ مگر تیراکی سے میرا پول کھل جانا تھا لہٰذا معذرت کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا لہٰذا یہ کہہ کر موقع ضائع کردیا کہ ابھی نہیں، پھر کبھی اور اپنے دل کے ساتھ ساتھ اس حسینہ کا دل بھی توڑ ڈالا۔ صرف اپنی عزت بچانے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بولا حالانکہ ریٹا بضد تھی کہ آج نہیں تو کل سہی اس کے ساتھ سوئمنگ کروں۔ میں نے وعدہ کیا کہ ضرور مگر ان دو تین دنوں میں نہیں۔

کہنے لگی۔ ''وعدہ کرو، دو ایک دن میں جب بھی فارغ ہوگے ساتھ سوئمنگ کریں گے اور ڈنر کریں گے۔''

میرے منہ سے نکل گیا۔ ''میں وعدہ نہیں کرتا کیونکہ ایک دفعہ وعدہ کرکے پھنس چکا ہوں۔''

کہنے لگی۔ ''کیسے؟ کیا ہوا تھا؟''

جواب دیا۔ ''وعدہ کیا تھا پھر شادی ہوگئی۔''

زور سے ہنسی اور بولی۔ ''پھر؟''

کہا۔ ''پھر کیا ہونا تھا۔ اب تین بچے ہیں۔''

ریٹا کھلکھلا کر ہنستی رہی تھی۔ بہرحال تھوڑی دیر گپ شپ رہی۔ اس مختصر گپ میں ہماری شناسائی کچھ بڑھ گئی مگر میں اس کے دفتر کے سامنے سے جب بھی گزرتا، دیکھ کر گزرتا تھا کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ تین دن مزید ہم اس فیکٹری میں ٹریننگ کے سلسلے میں رہے۔ میرا ریٹا سے سامنا نہیں ہوا۔ میں بھی بچتا رہا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ میرے خیال میں وہ بھی موقع کی نزاکت کو سمجھ چکی تھی اس لیے اس نے بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔

TAGPK.COM

گرونوبل میں ہم جس چھوٹے سے ہوٹل میں رکے ہوئے تھے وہاں ہر طرح کا آرام تھا مگر ہم پاکستانیوں کی سب سے بڑی مشکل دوسرے ملک میں جا کر کھانا کھانے سے متعلق ہوتی ہے۔ حرام اور حلال کا تصور عام طور سے یہاں نہیں ہوتا جو ہمارے لیے ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس لیے دوسرے غیر مسلم ممالک میں ہمارا زیادہ تر کھانا مچھلی، انڈے، سبزی ہوتی ہے۔ آلو کا سوپ، دال کا سوپ یہاں آ کر پیا بھر ڈبل روٹی۔ بہت اچھا لگا۔ مچھلی کا استعمال بھی اکثر ہوتا تھا۔ شروع شروع میں ایک دفعہ فرائی فش کا آرڈر دیا جو ریسٹورنٹ مینو پر کافی تحقیق اور ویٹرس سے کافی سریلی گفتگو سن کر اور ان کی محبت بھری رائے شامل کر کے دیا گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک کلو کی سالم فرائی مچھلی، بھاپ نکلتی ہوئی ہماری ٹیبل پر نہایت اہتمام کے ساتھ حاضر کی گئی۔ دیکھنے میں بہت اچھی اور ہمارے یہاں کی روہو مچھلی کی نسل سے لگتی تھی۔ ہمیں بہت بھوک لگ رہی تھی مگر ویٹرس صاحبہ مچھلی ٹیبل پر رکھ کر بولیں۔ ''ذرا انتظار کریں۔ میں اس کے لیے کچھ لاتی ہوں۔''

ہم سمجھے شاید کوئی سلاد یا ساس وغیرہ ہوگا لہٰذا ہاتھ روک لیا۔ پلک جھپکتے ہی ہماری ویٹرس صاحبہ ہاتھ میں ایک بوتل لیے حاضر ہوئیں۔ ہماری نااہلی کہ ہم سمجھے اس میں کوئی خاص سوس ہوگا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے شیمپئن کی بوتل مچھلی پر انڈیل دی اور اس سے پہلے کہ ہماری کچھ سمجھ میں آتا ماچس جلا کر اس کی تیلی سے پلیٹ میں شعلہ بھڑکا دیا۔ ابھی ہم کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بولیں۔ ''پون اینی نائٹ۔'' یعنی بسم اللہ کریں اور بھوک کو خوش اسلوبی سے مٹائیں۔ چلا کہ شیمپئن کا تڑکا ایک خاص اعزاز ہوتا ہے جو ہمیں دیا گیا لیکن انہیں کیا معلوم کیونکہ یہ پوری مچھلی ہمارے لیے حرام ہوگئی۔ ویٹرس کو جب معلوم ہوا کہ ہم اس کو نہیں کھا سکتے تو بہت افسردہ ہوئیں۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ ہم ان کو کافی ٹپ دیں گے کیونکہ یہ تڑکا اسپیشل ہے مگر حالات پلٹ گئے۔ ہمارے کھانے کے انکار پر ہوٹل منیجر صاحب آئے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم مسلمان ہیں، اس مچھلی کو نہیں کھا سکتے کیونکہ اس میں شیمپئن کا تڑکا لگ چکا ہے تو وہ بھی بہت معذرت کرنے لگے۔ ڈش کو واپس لے جایا گیا اور دوسری مچھلی کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہی ویٹرس بہت افسردہ اور معذرت خواہ انداز میں لائیں اور نامعلوم فرانسیسی زبان میں کیا کیا بول رہی تھیں جو ہماری سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ وہ بہت شرمندہ ہیں۔ بہرحال، پھر بھی ہم نے کچھ ٹپ انہیں دے ہی دی جو وہ لینا نہیں چاہ رہی تھیں اور بار بار اپنی شرمندگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ اصل میں غلطی ہماری تھی اور یہ سب لاعلمی کی وجہ سے ہوا۔ ہمیں پہلے بتانا چاہیے تھا کہ ہم مسلم ہیں، حلال فوڈ کھاتے ہیں اس لیے اس مینو میں بہت اچھے اچھے کھانے ہونے کے باوجود مچھلی پر زور دیا ہے۔ دوسری طرف ہوٹل کی طرف سے ہمیں ایک خاص مہمان کے طور پر سمجھا گیا اور شیمپئن کا تڑکا فری میں لگایا گیا حالانکہ اس کی بھی قیمت ہوتی ہے۔ ہمارے پاس آ کر ہوٹل کے منیجر اور اس ویٹرس نے بہت دفعہ معذرت کی۔

اس حادثے کے بعد ہم کئی دفعہ اس ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے گئے۔ آلو کا سوپ اور مچھلی وغیرہ کھائی۔ ہوٹل کے منیجر صاحب ہمیشہ ہمارے پاس آ کر ویلکم کرتے رہے۔ وہ ویٹرس بھی سلام دعا کرتی رہی۔

ٹریننگ کے دوران شنائڈر کی فیکٹری میں ایک فورمین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ ایک پہلوان قسم کی چیز تھے۔ ایک دن لنچ کے ٹائم پر وہ بھی فیکٹری کی کینٹین میں لائن میں میرے آگے کھانا لینے کے لیے کھڑے تھے۔ قارئین کو بتاتا چلوں کہ یورپ میں اکثر فیکٹریوں میں کینٹین ہوتی ہے جہاں پر کمپنی کی طرف سے ڈسکاؤنٹ ریٹ پر کھانا ملتا ہے۔ اکثر لوگ لنچ ٹائم میں لنچ یہاں ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے چند مچھلی کے سکلس اٹھائے، بیئر کی بوتل لی اور آلو کے چپس اپنی ٹرے میں رکھے اور مجھے آگے آنے کے لیے اشارہ دیا۔ میں نے ہیلو کہا اور بات بڑھانے کے لیے پوچھ لیا۔ ''لگتا ہے آپ کو سی فوڈ بہت پسند ہے اسی لیے مچھلی کے علاوہ اور کچھ نہیں کھا رہے۔'' فوراً بولے۔ ''اور آپ تو مسلمان ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ پاکستان سے آئے ہیں۔ آپ بھی یہاں کا گوشت نہیں کھاتے کیونکہ حلال نہیں ہوتا۔'' حلال کا لفظ انہوں نے استعمال نہیں کیا مگر کچھ اور لفظ تھا جس کا یہ مطلب تھا کہ مجھے یاد نہیں۔ بولے میں بھی پاکستان کے لوگوں کی طرح کا گوشت کھاتا ہوں یعنی حلال۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صاحب یہودی ہیں اور اس معاملے میں بالکل مسلمانوں کی طرح ہیں۔ اس مختصر سی گفتگو نے ہماری جان پہچان بڑھا دی۔ دوسرے دن پھر فیکٹری کی کینٹین میں ملاقات ہوئی اور وہ میرے ساتھ میری ٹیبل پر ہی اپنے کھانے کی ٹرے لے کر

بیٹھ گئے۔ سلام دعا کے بعد میں نے ہی بات بڑھائی کہ مجھے یہاں حلال کھانا کھانے کی پرابلم ہے۔ میرے لیے بہت بڑا مسئلہ ہے۔ کہنے لگے۔ ''آپ ٹیونیشین یا ٹرکش ریسٹورنٹ پر کھانا کھائیں۔ یہ لوگ حلال فوڈ بیچتے ہیں۔ میں بھی اکثر وہیں کھاتا ہوں کیونکہ میری فیملی اسرائیل کے شہر حائفہ میں رہتی ہے۔ یہاں اکثر مجھے کھانا خود بنانا پڑتا ہے۔''

شنائڈر کمپنی کے اس پلانٹ پر جہاں میری ٹریننگ ہو رہی تھی ہم چار دن رہے۔ اس کے بعد ان صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔

میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں ہمارے کمرے کی صفائی کے لیے ایک خوبصورت سی مسلمان لڑکی جس کا تعلق ٹیونیشیا سے تھا، آئی تھی۔ پہلی دفعہ دیکھا تو خاصی خوبصورت نظر آئی۔ بلاشبہ ٹیونیشیا کی خواتین کے حسن کے متعلق سنا تھا جو یہاں نظر آ گیا۔ کپڑے تو فرانس کی خواتین کی طرح تھے مگر اپنے سر کو اسکارف سے ڈھکا ہوا تھا جس سے یہ طے تھا کہ خاتون مسلمان ہیں۔ میں پچھلے کئی دن سے اسی کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا مگر کیونکہ میں صبح صبح فیکٹری میں ٹریننگ کے لیے چلا جاتا تھا اس لیے ان خاتون کو نہیں دیکھا حالانکہ یہی خاتون میرے کمرے کی صفائی کی ذمے دار تھیں اور روز یہی یہاں کام کرتی تھیں۔ آج کیونکہ چھٹی تھی اور فیکٹری نہیں جانا تھا اس لیے کمرے میں تھا۔ ان کو دیکھ کر میں نے پوچھا: ''آپ فرانسیسی تو نہیں لگتیں کس ملک سے تعلق ہے؟''

بولیں۔ ''ٹیونیشیا سے۔''

پوچھا۔ ''یہ اسکارف تو مسلمان عورتیں باندھتی ہیں۔''

بولیں۔ ''میں مسلمان ہوں۔'' یہ سن کر میں نے کہا۔ ''السلام علیکم! فوراً وعلیکم السلام کی آواز کے ساتھ ہی اپنایت کا تصور دماغ میں آ گیا۔ میں نے کچھ اور گفتگو کرنے کی ناکام کوشش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر ''نو انگلش'' میری ساری اپنایت پر پانی پھیر دیا۔ بہرحال وہ اپنا کام ختم کر کے السلام علیکم کر کے چلی گئی۔ مجھ سے غلطی ہوئی اس لڑکی سے پوچھ لیتا کہ ٹیونیشین ریسٹورنٹ کہاں ہے، جو نہ پوچھ سکا۔

دو تین دن کے بعد میں تھوڑا لیٹ ہو گیا، فیکٹری میں بھی کوئی خاص کام نہیں تھا اس لیے کمرے میں ہی رک گیا۔ مجھے ایک صاحب کا انتظار تھا جن کے ساتھ مجھے گرونوبل یونیورسٹی جانا تھا کیونکہ وہاں پر ایکسٹرا ہائی وولٹیج کے کچھ تجربات ہو رہے تھے جن کو اٹینڈ کرنا تھا۔ میں ان کا انتظار کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی ..... میں سمجھا کہ وہ صاحب آئے ہیں اس لیے بلند آواز میں کہا ''یس کم ان''

دروازہ کھلا اور ٹیونیشین خاتون داخل ہوئیں۔ وہ کمرے کی صفائی کے لیے آئی تھیں۔ آتے ہی اور مجھے دیکھتے ہی فرانسیسی زبان میں ''سلوایلیو موسیو'' کہا جس کا مطلب معاف کیجیے یا سوری کہنا ہے اور پھر تھوڑا رک کر السلام علیکم کہہ دیا۔

میں نے بھی خوش دلی سے وعلیکم السلام کہا۔ مسکرائی اور فرانسیسی زبان میں اجازت مانگی کہ کیا کمرا صاف کر دوں؟

میں نے اجازت دے دی اور ساتھ میں ڈیوڈ صاحب کا انتظار کرنے لگا جن کے ساتھ یونیورسٹی لیب جانا تھا۔ اسی دوران ڈیوڈ صاحب آ گئے میں نے ان سے انگریزی میں کہا کہ اس لڑکی سے پوچھو کہ یہاں قریب میں ٹیونیشیا کے کھانوں کا ریسٹورنٹ کہاں ہے؟

ڈیوڈ نے فرانسیسی زبان میں اس لڑکی کو مخاطب کر کے ٹیونیشین ریسٹورنٹ کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہوٹل کے عقب میں ہی ایک چھوٹی سی دکان میں ریسٹورنٹ ہے۔ پیلے رنگ کا بڑا بورڈ دکان پر لگا ہے جس پر فرانسیسی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ یہ معلوم کر کے میں ڈیوڈ کے ساتھ یونیورسٹی کے لیے نکل گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ لڑکی جو شاید 18 یا 20 سال کی ہو گی اور اسکارف باندھے ہوئے اچھی لگ رہی تھی۔ قارئین کو بتاتا چلوں کہ جس طرح انگریزوں نے ہمارے علاقے میں ایک عرصہ دراز تک حکومت کی ہے اور ہم انگریزی بولتے ہیں اسی طرح فرانسیسیوں نے ٹیونیشیا پر ایک لمبے عرصے تک حکومت کی ہے اس لیے وہاں پر مقامی زبان کے علاوہ جو عربی سے ملتی جلتی ہے، سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ جس طرح ہمارے علاقے کے بہت سے لوگ برطانیہ جا کر کام کرتے ہیں اسی طرح ٹیونیشیا کے لوگ فرانس آ کر کام کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہاں مستقل رہائش پذیر ہیں اور ہیں مسلمان۔ ڈیوڈ کے ساتھ میں یونیورسٹی دو روز سے جا رہا تھا اور وہاں کی تجربہ گاہ میں جو تجربات ہو رہے تھے، ان کو دیکھتا رہا پھر وہاں ایکسٹرا ہائی وولٹیج کے سرکٹ بریکر نمیٹ ہوئے ان کو بھی دیکھا۔ اس مشغولیت میں دو تین یوم صرف ہوٹل اور فیکٹری یا یونیورسٹی تک کا ہی سفر رہا۔ نہ کسی بازار گئے نہ کوئی تفریحی مقامات دیکھے۔

TAGPK.COM

ہمیں گرونوبل آئے ہوئے چھ دن ہو چکے تھے، وقت تیزی سے گزرا تھا اور ہفتے کا دن آ گیا۔ ویک اینڈ کا دن تھا۔ گھڑی دن کے دس بجا رہی تھی۔ ابھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ سوچا کہ ڈائریکٹ کھانا ہی کھائیں گے۔ میں لابی میں آیا تو وہی خاتون جو میرے کمرے کو صاف کرتی تھیں ریسیپشن پر کھڑی تھیں۔ میں نے السلام علیکم کہا۔ جواب میں مسکراہٹ کے ساتھ وعلیکم السلام کا جواب آیا۔ میں نے خیریت پوچھنے کے انداز میں کہا۔ ''آپ کیسی ہیں؟''

ظاہر ہے انہوں نے فرانسیسی زبان میں کہا۔ ''ٹھیک ہوں۔'' میں نے اپنی خواہش کا اظہار انگریز میں کیا کہ میں کھانا کھانے ٹیونیشین ریسٹورنٹ جا رہا ہوں۔ ایک تو مجھے راستہ صحیح پتا نہیں ہے دوسرے میں کسی کی کمپنی میں وہاں جا کر لنچ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میرے ساتھ لنچ کریں تو مجھے خوشی ہوگی کیونکہ مجھے فرانسیسی نہیں آتی اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مینیو میں کیا کیا ہے اور مجھے کون کون سی چیز کھانا چاہیے؟

مجھے کچھ ایسا لگا کہ میری یہ برجستہ پیشکش ان کو بری لگی پھر سے میرے ساتھ ہوٹل سے باہر جا کر ایک پتلی سی سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت روکھے انداز میں بولیں۔ ''ادھر جا کر الٹے ہاتھ پر پوچھ لینا۔''

ایسی صورتِ حال میں سوائے اپنی ناتجربے کاری پر افسوس ہی کر سکتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا وہ بھی جب ہم ہوٹل چھوڑ رہے تھے کہ محترمہ شادی شدہ ہیں اور دو چھوٹے بچے بھی ہیں۔ بہرحال مسلمان ہونے کے ناتے جب بھی آمنا سامنا ہوا، پہلے وہ سلام داغ دیتی تھیں۔ گفتگو مزید کر نہیں سکتی تھیں کیونکہ اپنی مادری زبان کے علاوہ فرانسیسی بولتی تھیں جو مجھے نہیں آتی تھی اس لیے رابطہ صرف سلام دعا تک ہی محدود رہا۔

جس دن ان محترمہ نے مجھے حلال ریسٹورنٹ کا راستہ بتایا تھا اسی شام میں ٹہلتا ہوا اندازے سے اس ریسٹورنٹ پر پہنچ گیا۔ ریسٹورنٹ کا مرکزی دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ اندر جا کر دیکھا تو کرسیاں اور میزیں بھی تھیں اور کچھ لوگ بیٹھے کھانا بھی کھا رہے تھے۔ میں ایک خالی ٹیبل دیکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ ویٹر آیا اور فرانسیسی زبان میں سلام دعا کی پھر مینیو سامنے رکھ دیا۔ وہ بھی فرانسیسی زبان میں تھا۔ ظاہر ہے مجھے بالکل سمجھ نہیں آیا کہ کیا کھاؤں۔ میرے سے مجھے کہنا پڑا۔ ''نو فرنچ اونلی انگلش۔''

پھر میں نے کہا میں پاکستانی ہوں، مسلمان ہوں لہٰذا حلال فوڈ کے چکر میں آپ کے ریسٹورنٹ آیا ہوں۔ ویٹر کی سمجھ میں نہ جانے کیا آیا ''وی، وی'' یعنی جی ہاں، جی ہاں کرتا ہوا کاؤنٹر پر جا کر اپنے منیجر سے کچھ بات کی اور فوراً وہ صاحب میرے پاس حاضر ہوئے۔ انگریزی میں جو بہت خستہ تھی، بولے۔ ''آپ پاکستان سے آئے ہیں؟''

جواب ہاں میں تھا انہوں نے فوراً السلام علیکم کہا۔ واضح ہو گیا کہ یہ بھی مسلمان ہیں۔ میری گزارش پر انہوں نے کھانے کے مینیو کارڈ پر انگلی رکھ کر ایک کھانے کی تفصیل انگلش میں بتائی کہ یہ بکرے کے گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں اور دلیا بمع شوربے کے اور مرچ مسالوں کے ساتھ ہے یعنی بہت ''ہوٹ'' ہے۔ مچھلی کا سوپ بھی ہے پھر نہ معلوم کس قسم کی سبزی بمع پنیر کے ٹکڑوں کے اور لوبیا کو بالکل گھوٹ کر دال بنا کر اس کا سالن نہ معلوم اسے کیا کہتے تھے۔ بہرحال یہ چند ڈشیں یاد ہیں جو مجھے بتائی گئیں۔ میں نے جب ''کس کس'' کی تفصیل سنی تو اس کا آرڈر بمع لوبیا کی سبزی کا آرڈر دیا۔ لوبیا کی سبزی اچھی تھی ہماری طرح کا مزہ تھا، بس لوبیا کو پیس دیا گیا تھا اور پھر ''کس کس'' بس یوں سمجھیں کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیوں میں دلیا ڈال کر مرچ، نمک، ہلدی، پیاز پکا کر جو مرکب تیار ہوگا وہ ''کس کس'' ہے، کچھ کچھ ہمارے یہاں کے شوربے والے گوشت کی طرح تھا۔ یہاں روٹی ہمارے یہاں کے ''بن'' کی طرح کی ہوتی ہے۔ ذرا بڑے سائز میں یا پھر تندوری روٹی کی طرح کی لمبائی میں آدھا میٹر اور چوڑائی میں آٹھ انچ ہوتی ہے۔ یہاں ایک اور طرح کی روٹی بھی بہت استعمال ہوتی ہے جو اب ہمارے یہاں بھی ملنے لگی ہے جس کو فرنچ بریڈ کہتے ہیں۔ 3 انچ ڈائی میٹر کی دو فٹ لمبی ڈیل روٹی کی طرح سخت روٹی۔

بہت دنوں کے بعد مرچ، نمک اور مسالے والا کھانا کھایا حالانکہ ہمارے کھانوں والا مزہ نہیں تھا مگر کچھ تو ملتا جلتا تھا۔ بہت اچھا لگا۔ ''پولے'' مرغی کو کہتے ہیں۔ اس کی بھی کئی ڈشز تھیں۔ میں نے ایک دفعہ اس ڈش کو بھی منگوایا مگر اس میں پکی مرغی کی خوشبو موجود تھی جیسے پوری پکی نہیں ہے۔ یہاں لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔ اکثر ہوٹلوں میں گوشت کے پارچے ذرا موٹے سائز میں کوئلے پر پکے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کو اسکلوب کہتے ہیں۔ گوشت آدھا کچا ہوتا ہے جبکہ اس میں خون بھی نظر آتا ہے۔ لوگ اس کو بڑے

شوق سے کھاتے ہیں۔ میرے خیال میں ہم لوگ اسے نہیں کھا سکتے۔ آپ کے آرڈر کے بعد بیرا آپ سے یہ ضرور پوچھے گا کہ گوشت کیسا پکا ہوا ہو؟ ہاف ڈن یا فل ڈن یعنی آدھا کچا ہو یا پورا پکا ہوا۔ ہم لوگ شاید ہاف ڈن نہیں کھا سکتے کیونکہ اس میں کچے گوشت کی بو آتی ہے اور فل ڈن میں بھی کچے گوشت کی بو ہوتی ہے مگر کم ہوتی ہے۔ ہم پاکستانیوں کا کھانا پکانے اور کھانے کا مزہ یورپ کے کھانوں سے مختلف ہے۔

اسی دوران جمعہ کا دن آ گیا۔ سوچا کہ جمعہ کی نماز کہیں پڑھی جائے مگر اسی دن لنچ کے بعد ایک لیکچر ایک پروفیسر صاحب نے جو ہماری ٹریننگ کا ایک حصہ تھا، دینا تھا۔ اس میں کچھ نہایت ایڈوانس ٹیکنالوجی جو بجلی کی ہائی وولٹیج پر ترسیل میں استعمال ہوتی ہے بتانا تھا۔ وہ بھی ٹھیک ڈیڑھ بجے دن یعنی لنچ کے فوراً بعد۔ اس لیے جمعہ کی نماز تو بعد کی بات ہے، ظہر بھی نہیں پڑھ سکے۔ بہرحال پروفیسر صاحب جن کا نام میں بھول رہا ہوں، گرونوبل ٹیکنیکل یونیورسٹی میں ایڈوانس ٹیکنالوجی جو الیکٹریکل ٹرانسمیشن سے متعلق ہیں، پڑھاتے ہیں۔ تین گھنٹے کے لیکچر میں صرف پندرہ منٹ کے ٹی بریک میں کافی بریک کے نام پر پھر ریسٹ ملا۔

سچی بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کی بہت سی باتیں اور ٹیکنالوجی سے متعلق فارمولے ہماری بالکل سمجھ میں نہیں آ رہے تھے کیونکہ ہماری ابتدائی معلومات ہی بہت کمزور تھیں اور پھر کالج میں ہم نے انجینئرنگ ضرور پڑھی لیکن وہ بھی بہت پرانے زمانے کی۔ اب اس وقت ہم اپنی علمی قابلیت کے اعتبار سے بہت پیچھے تھے۔ بہرحال کچھ سمجھ آیا کچھ نہیں۔ یہ لیکچر جو ساڑھے تین بجے شروع ہوا تھا چھ بجے کے قریب ختم ہوا۔ اس پورے لیکچر میں بہت ساری باتیں ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئیں مگر پروفیسر صاحب سے سوال نہ کر سکے کیونکہ ہماری تعلیم اور علمی ادراک کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

لیکچر کے ختم ہونے پر ہوٹل واپس آئے کیونکہ دوسرے دن چھٹی تھی اس لیے پروگرام بنایا کہ یہاں پر شہر کی سیر کی جائے اور باہر ہی کھانا کھایا جائے۔ فیکٹری میں ایک فرانسیسی انجینئر، دیستان صاحب سے اچھی خاصی شناسائی ہوگئی تھی۔ ان سے گزارش کی تھی کہ میرے ساتھ ڈنر کریں۔ وہ مان گئے اور پروگرام کے مطابق تقریباً 7 بجے شام وہ میرے پاس آ موجود ہوئے۔ باہر اچھی خاصی سردی شروع ہوگئی تھی۔ سڑکوں پر چہل پہل بہت کم تھی۔ سمندر کے

طاہر جاوید مغل کے سحر انگیز قلم کا جادو

کانچ محل

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

حساس معاشرتی پہلوؤں پر ایک جراح کی نشتر کاری.....

رنگین و سنگین احساسات و جذبات کی جنگ اور

عبرت اثر انجام پر مشتمل ایک خوبصورت داستان

جولائی 2021ء سسپنس کے صفحات کی زینت

ریسٹورنٹ میں جو دیستان صاحب نے ہی پسند کیا تھا چلے گئے۔ معلوم ہوا یہ کسی ٹرکش کا ریسٹورنٹ ہے اور یہاں بھی حلال کھانا ملتا ہے۔ یہاں لوبیا کا سوپ اور فرائی مرغی کا سالن بہت اچھا لگا۔ ایک اور ٹرکش ڈش "پلاؤ" کے نام سے بھی منگوائی گئی۔ یہ چاول مرغی کے ساتھ پکائے گئے تھے مگر ہمارے یہاں کے پلاؤ کی خوشبو اور مزہ نہیں تھا۔ نہ معلوم کس قسم کی خوشبو تھی۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں آئی۔ سنا یہ گیا کہ یہاں فرانس میں لوگ اس چاول کی ڈش کو بہت پسند کرتے ہیں۔

قارئین! گرونوبل شہر فرانس کے الپس کے پہاڑی ایریا میں واقع ہے یعنی پہاڑی سلسلہ جہاں برف جمی رہتی ہے اس کے قریب ہی ہے۔ بہرحال کھانے کے دوران یہ فیصلہ ہوا کہ کل کیونکہ اتوار ہے لہٰذا سیر کے لیے گرونوبل، بسٹائل کیبل کار میں سیر کی جائے۔ فیصلہ ہوا کہ دیستان صاحب صبح 9 بجے کے قریب مجھے ہوٹل سے لیں گے اور پھر ہم کیبل کار پر بریسٹائل جائیں گے۔ قارئین! بریسٹائل ایک ضلع کی طرح کی جگہ ہے جو ایک پہاڑی پر ہے۔ شہر کے لیول سے اس پہاڑی کی اونچائی تقریباً 270 میٹر ہے اور کیبل کار کا اسٹیشن جہاں سے وہ اسٹارٹ ہوتی ہے اور اس کی اونچائی پر جہاں کیبل کار رکتی ہے کا فاصلہ تقریباً 700 میٹر ہے۔ پہاڑی سے نیچے دریا ہے اور چاروں طرف آبادی۔ بہت خوب صورت منظر ہوتا ہے جب کیبل کار پہاڑی کی طرف جاتی ہے جہاں سے پورا شہر نظر آتا ہے۔ پہاڑی پر پہنچ کر آپ اِدھر اُدھر ٹہل سکتے ہیں۔ یہاں ایک ریسٹورنٹ بھی ہے اور چائے، کافی، کولڈ ڈرنک کے اسٹال بھی۔ یہاں ٹورسٹ مختلف جگہوں سے آتے ہیں۔

پہاڑ پر کافی سردی تھی جو مجھے لگ رہی تھی مگر کچھ جوان ایسے بھی تھے جو صرف ایک موٹی قمیص یا جرسی چڑھائے ہوئے گھوم رہے تھے۔ یہ ایک پکنک اسپاٹ بھی ہے جہاں پر لوگ مختلف شہروں سے اور مختلف ملکوں سے بھی آتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں، مرد اور خواتین چھٹیوں کے موڈ میں نظر آتے ہیں۔ پہاڑی کے کسی کنارے پر کسی لڑکے اور لڑکی کے محبت کے مناظر بھی نظر آجاتے ہیں۔ اتنی اونچائی پر پیار کرنا کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ یہ پیار کرنے والوں کو دیکھتے ہوئے وہاں سے گزرنے والے ازراہ احترام اپنی نظر دوسری طرف کر لیتے ہیں جیسے کوئی بات نہیں، عیش کرو، میں نے کچھ نہیں دیکھا وغیرہ۔ باقی قارئین خود سمجھ دار ہیں کہ یہاں محبت کیسے کی جاتی ہے۔

یہاں ہم لوگ تقریباً دو گھنٹے کے قریب رکے اور کافی (کاپا چینو) پی۔ پہاڑی چاروں طرف گھوم کر اردگرد کا نظارہ کیا جو بہت دلفریب تھا۔ دنومل شہر تقریباً پورا ہی نظر آیا۔ شہر کے درمیان سے دریا کا گزرنا اس پہاڑی سے دیکھنے میں بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں قارئین کو بتاتا چلوں کہ اگر آپ پانی پینا چاہیں تو وہ مہنگا ہے بہ نسبت ایک ٹن بیئر کے۔ یعنی پانی کی بوتل دس فرانک کی اور بیئر کا ٹن پانچ فرانک کا۔ یعنی بیئر نہ پینے والے پر دس فرانک کا جرمانہ۔ ہم پاکستانی یا مسلمان یہ جرمانہ ادا کرنا بہت پسند کرتے ہیں اور بخوشی یہ زیادتی برداشت کرتے ہیں۔ اس پہاڑی کی سیر کر کے ہم دوپہر کے بعد ہوٹل واپس آگئے۔ دیستان صاحب اجازت لے کر گھر چلے گئے۔

اگلا ہفتہ بہت مصروفیت میں گزرا۔ شنائڈر کی فیکٹری کی لیبارٹری میں ایکسٹرا ہائی ووٹیج سرکٹ بریکر پر ٹیسٹ ہونے تھے جو مجھے دیکھنا تھا۔ یعنی 500 کے وی کا تمام ایکیوپمنٹ (مشینری) موجود تھے۔ جس پر تجربات ہونے تھے۔ نیز ایک کنٹرول پینل کی ٹیسٹنگ بھی دیکھنا تھی اور اس کے ڈیزائن کے متعلق تین کلاسیں ہونی تھیں جس میں ڈاکٹر ذکے کا لیکچر تھا جو یہاں چیف ڈیزائن انجینئر تھے۔ سرکٹ بریکر کے متعلق تمام معلومات اور اس کے ڈیزائن سے متعلق خاص ترجیحات پر معلومات دینا تھیں نیز اس کے ٹیسٹنگ کے طریقہ کار کو بھی بتانا تھا۔ پھر پریکٹیکل کر کے بھی فیکٹری میں تیار شدہ نئے بریکر کو دیکھنا تھا اور اس کے رزلٹ نوٹ کرنا تھے۔ ٹیسٹنگ ایکیوپمنٹ کا استعمال بھی سیکھنا تھا۔ یہ تمام کام اس ہفتہ کے شیڈول میں تھے لہٰذا پورا ہفتہ بہت مصروفیت میں گزرا اور جب شام کو فیکٹری سے واپس آتے تو اپنے نوٹ تیار کرنے بیٹھ جاتے جو رات تک مکمل ہوتے یعنی کہیں آنے جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے شام کو یا رات کو باہر نکل کر کچھ کھا پی لیا اور بس۔ فیکٹری میں ایک انجینئر مسٹر دیستان تھے جن سے کافی شناسائی ہوگئی تھی۔ اصل میں وہ لبنانی تھے مگر فرانس میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد صاحب نے فرانس میں ہجرت کی تھی۔ ان سے بات ہوتی رہتی تھی۔ گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ اکثر ویک اینڈ پر پہاڑ پر اسکیئنگ کرنے جاتے ہیں یعنی الپس کی پہاڑیوں پر۔ الپس کا پہاڑ گرونوبل سے بھی ملتا ہے۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا کہ اب جب جائیں تو مجھے بھی

لے لیں۔ میں بھی ''اسکی'' کروں گا۔ جمعہ کا دن تھا۔ میں فیکٹری میں ایک الیکٹریکل پینل کی میٹنگ میں مشغول تھا۔ دیستان صاحب آئے اور کہنے لگے۔ ''کل ویک اینڈ ہے اور میرا پروگرام ایلپس پہاڑ پر ''اسکی'' کرنے کا ہے۔ اگر آپ چلنا چاہیں تو ساتھ چلیں۔'' میں نے فوراً ہامی بھر لی مگر میں نے کہا کہ اسکی کٹ تو میرے پاس نہیں ہے جس میں بوٹ جو خاص قسم کے بنے ہوتے ہیں، سنو بورڈ (برف پر پھسلنے کا بورڈ)، ہیلمٹ اور اسکی پول وغیرہ اور خاص طور سے آنکھوں کے لیے خاص چشمہ جسے اسکی گلاسز کہتے ہیں یعنی میرے پاس اسکی کے لیے کوئی سامان نہیں تھا۔ دیستان صاحب نے میری مشکل آسان کردی۔ پوری کٹ گھر سے لے آئے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ ان کے بوٹ (جو تے جو اسکی میں پہنے جاتے ہیں) بالکل میرے سائز کے تھے۔ بہرحال دوسرے دن دیستان صاحب ٹھیک 9 بجے ہوٹل کی لابی میں موجود تھے۔ میں بھی تقریباً تیار تھا لہٰذا فوراً لابی میں ملاقات ہوئی اور ہم لوگ ایلپس کی طرف روانہ ہوئے۔ آج سردی بھی کچھ زیادہ تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے اوورکوٹ میں بھی سردی لگ رہی تھی حالانکہ پوری آستین کا موٹا سوئیٹر بھی پہنا ہوا تھا۔

شہر سے باہر نکل کو ایلپس کی پہاڑیوں کی طرف جانے والی سڑک پر ہم جا رہے تھے۔ پوری سڑک صرف چڑھائی تھی مگر صاف ستھری تھی اور کافی بل کھاتی ہوئی پہاڑ پر جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دور چل کر برف نظر آنے لگی اور برف میں ڈھکی سڑک سے گزرتے ہوئے ہم اونچائی پر یعنی پہاڑ پر پہنچے۔ پہاڑ پر چاروں طرف برف ہی برف جمی ہوئی تھی۔ ایک وسیع ایریا بالکل میدان کی طرح تھا جہاں کوئی کھائی یا گڑھا نہیں تھا۔ ہاں راستے میں سڑک پر برف کی صفائی کرنے والے کئی جگہ موجود تھے اور مشینوں کے ذریعے سڑک سے برف ہٹا رہے تھے تاکہ سڑک اوپر جانے والوں کے لیے صاف رہے۔ بتایا گیا کہ یہاں چھٹی والے دن کافی رش رہتا ہے اور گرونوبل کے اکثر جوان، مرد اور عورتیں اسکی کرنے آتے ہیں۔ اسکی گرونوبل کے لوگوں کا ایک اسپورٹ ہے اور یہاں اکثر اسکی کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ مجھے یہاں کافی سردی لگ رہی تھی حالانکہ گاڑی میں ہیٹنگ چل رہی تھی اور میں نے سردی سے بچاؤ کے لیے چشمہ اور گرم ٹوپی بھی پہنی ہوئی تھی۔

پہاڑ پر ایک بہت بڑا علاقہ لیول کرکے بنایا گیا تھا جہاں پر کئی میٹ روم، ایک ڈسپنسری اور ایمرجنسی ہیلتھ کیئر یونٹ اور ایک چھوٹا سا بازار نما علاقہ جہاں کئی ریسٹورنٹ اور دکانیں تھیں۔ دیستان صاحب نے اپنی کار ایک طرف پارکنگ میں کھڑی کی۔ اسکی کٹ اٹھائی اور ایک کٹ (جو بڑے بیگ کی شکل میں تھی) مجھے میری کٹ تھمائی اور جہاں ریسٹ روم کی پیرک نما بلڈنگ تھی اس کے برآمدے میں پڑی بینچ پر براجمان ہو گئے اور اسکی کٹ نکال کر پہننا شروع کردی۔ میں بھی ان کی دیکھا دیکھی پہننے لگا۔ انہوں نے اسکی کی چھڑی جسے پول کہتے ہیں، پکڑی۔ جوتوں کے ساتھ اسکی بورڈ باندھا اور برف پر پھسلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں بھی دیستان صاحب کی ہدایت کے بموجب اسکی کے لیے تیار ہو گیا۔ بالکل اسی انداز میں جیسے جیسے دیستان صاحب تیار ہوئے تھے یعنی میں نے ان کی بالکل نقل کی۔ انہوں نے اسکی کا چشمہ پہنا، سر پر ہیٹ پہنا اور ایک جست لگا کر برف پر جا کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے میرے پیچھے پیچھے آجائیں۔ یہ کہتے ہی وہ برف پر پھسل رہے تھے۔ میں پہلے ہی جھٹکے میں گرتے گرتے بچا۔ وہ تو بھلا ہو اسکی اسٹک کا کہ اس پر بوجھ ڈال دیا تو بچت ہو گئی۔ دیستان صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر برف پر پھسلتے ہوئے کہا کہ میرے ساتھ آئیں۔ تھوڑی دور یعنی مشکل سے آٹھ یا دس فٹ کے فاصلے پر دیستان صاحب نے جیسے ہی میرا ہاتھ چھوڑا اور وہ تیزی سے آگے نکلے یہ سوچ کر کہ اب میں خود چلوں گا، میں زمین پر دھڑام سے گر گیا اور مجھے پیر میں درد ہونے لگا۔ میں تھوڑی دیر اسی طرح برف پر بیٹھا رہا۔ دو لڑکیاں اسکی کرتے ہوئے میرے پاس آئیں اور فرانسیسی زبان میں ہمدردی کے موڈ میں شاید کہہ رہی تھیں کہ کوئی مدد کی ضرورت ہے اور کیا ہوا ہے جو آپ گر گئے؟ میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کہا کوئی بات نہیں، میرے پیر میں تکلیف تھی پھر بھی میں یہاں آ گیا۔

ان دونوں نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں دوبارہ اسکی کرتا ہوا جاؤں مگر مجھے تو آتا ہی نہیں تھا لہٰذا دونوں پیروں سے سنو بورڈ نکالا اور لنگڑاتے ہوئے کافی شاپ تک پہنچ گیا۔ ادھر دیستان صاحب سمجھے کہ میں اسکی کر رہا ہوں آرام آرام سے لہٰذا وہ اس پہاڑی کی وادی میں کہیں نیچے اسکی کرتے ہوئے چلے گئے، نظر نہیں آئے۔ میں بڑی مشکل سے لنگڑاتے ہوئے کافی شاپ تک پہنچا تھا اور ایک خالی ٹیبل پر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی ٹیبل پر

TAGPK.COM

ایک خاتون، وہ بھی ادھیڑ عمر کی بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میری ٹیبل کے قریب آئیں اور فرنچ میں بولیں کہ ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

یوں بھی میں چہرے مہرے سے یہاں کے باشندوں میں ... کسی صورت میں نہیں تھا، وہ بولیں۔ ''آپ انڈین لگتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نو انڈین، بٹ پاکستان'' اور پھر نہ جانے فرنچ یا سوئس زبان میں کیا کہا۔ مجھے لگا کہ وہ... میرے گرنے اور لنگڑا کر چلنے پر کچھ تبصرہ کر رہی ہیں اور ڈسپنسری کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ میں نے فرانسیسی زبان میں شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔ اس کے علاوہ مزید گفتگو نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فرانسیسی صرف اتنی ہی آتی تھی۔ دیستان صاحب بھی تھوڑی دیر میں آموجود ہوئے۔ کہنے لگے۔ ''آپ نے بہت تھوڑی اسکی کی اور جلدی آکر بیٹھ گئے۔''

انہیں بالکل نہیں پتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے کیونکہ وہ اسکی کرتے ہوئے کھائی میں کافی دور نکل گئے تھے۔ حقیقت بتائی تو بہت پریشان ہوئے۔

میں نے کایا چینو (کافی کی ایک قسم) کا ایک کپ کینٹین کے کاؤنٹر سے خریدا اور ٹیبل پر بیٹھ کر جیسے ہی ایک گھونٹ لیا تو ہوش اڑ گئے۔ خدا کی پناہ، اس قدر کڑوی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جتنی کڑوی ہوگی اتنی ہی اچھی اور قیمتی ہوگی۔ کڑواہٹ کا یہ عالم تھا کہ ہونٹوں سے لگا کر پھینکنے کو دل چاہ رہا تھا مگر فکر یہ تھی کہ میری طرف یعنی مجھے کئی لوگ خاص طور سے لڑکیاں اور خواتین دیکھ رہی تھیں۔ میں وہاں واحد آدمی تھا جس کا تعلق یورپ یا فرانس وغیرہ سے نہیں تھا۔ اگر کوئی اِدھر اُدھر کی حرکت ہوئی تو وہ مجھے بالکل پینڈو سمجھیں گے۔ اس وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی کافی کے کپ کو بار بار منہ سے لگانا پڑا۔

دیستان صاحب بھی محبت میں میرا حال احوال پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں لگی، درد تو نہیں ہے وغیرہ۔ مگر میں نے اپنے پیر کے درد کو ظاہر نہیں کیا۔ بہرحال جب میں نے کہا کہ آپ تو اس پہاڑی کی کھائی میں اسکی کرتے ہوئے کافی آگے نکل گئے تھے۔ بولے ہاں، اصل جگہ اسکی کرنے کی اس سامنے کھائی میں ہے اور یہاں پر 1968ء میں ورلڈ اولمپک بھی ہوئے تھے۔ مجھے کہا کہ اگر آپ ٹھیک ہیں، چاہتے ہیں وہاں جانا تو چلیں میں ساتھ دوبارہ چلتا ہوں۔ میں نے معذرت کر لی۔ اب انہیں کیسے بتاتا کہ میں تو صرف دو میٹر پر ہی دھڑام سے گر گیا تھا اور جو میرا پیر مڑ گیا تھا ابھی تک درد کر رہا ہے۔

جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے چیئر لفٹ اوپر والے پہاڑ پر جاتی ہے۔ کچھ لوگ وہاں جا کر بھی گھومتے ہیں اور اسکی کرتے ہیں۔ وہاں پر بھی ایک طرف کچھ کیبن نما بیرک ہے جس میں کافی، چائے اور نگ شاپ بھی ہے۔ ہم لوگ چیئر لفٹ سے اوپر والے پہاڑ پر پہنچ گئے۔ سخت سردی لگ رہی تھی حالانکہ جسم کا ہر حصہ پورے طور پر بند تھا، وہ بھی سردی کے موٹے کپڑوں سے۔ یہاں ایک گروپ لڑکے لڑکیوں کا بھی آیا ہوا تھا یعنی ٹین ایجر کا۔ ہنسی مذاق جو اس عمر کا تقاضا ہے جاری تھا اور تمام لڑکے لڑکیاں ایک ایک جوڑے کی شکل میں اسکی کر رہے تھے۔ آپس میں محبت کا اظہار جو پیار کرتا ہوتا ہے، وہ بھی دیکھنے کو ملا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ معاشرہ اپنے ٹین ایجر کو کس قدر آزادی دیتے ہیں۔ ہم لوگ کوئی ایک گھنٹا وہاں رہے۔ میں تو کافی شاپ پر بیٹھا رہا اور دیستان صاحب تقریباً ایک گھنٹا وہاں برف پر کھیلتے رہے اور اسکی کرتے رہے۔ میں گرین چائے اور چند بسکٹوں پر گزارہ کرتے ہوئے یہاں کا حسن و جمال ہی دیکھتا رہا۔ پھر ہم لوگ شام سے تقریباً آدھا گھنٹا قبل واپس آگئے۔

گروتوبل میں ٹریننگ اور رہائش کے دوران اور بھی کئی جگہوں کی سیر کی جو ہماری ٹریننگ کا حصہ تھی جن میں خاص طور سے بسورے ڈیم اور وہاں کا ایٹمی پلانٹ تھا۔ بسورے ڈیم فرانس کے شہر سودے میں ہے اور یہ گریویٹی ڈیم کہلاتا ہے یعنی پانی کا ذخیرہ جس سے بجلی پیدا کرنے کی ٹربائن چلتی ہے۔ یہ جگہ پاور پلانٹ کی سطح سے تقریباً 300 میٹر اوپر ہے۔ زمین میں خندق کھود کر، زمین دوز جگہ پر بجلی پیدا کرنے کی ٹربائن لگائی گئی ہے۔ پانی جمع کرنے کی دو جھیلیں ہیں۔ اوپر کی جھیل سے پانی گریویٹی کے ذریعے واٹر ٹربائن چلاتا ہے اور ایک جھیل میں جمع ہو جاتا ہے۔ جب بجلی کی کمی یا ضرورت ہوتی ہے تو اوپر والی جھیل کے پانی سے ٹربائن چلتی ہے اور بجلی پیدا ہوتی ہے اور اس بجلی کی پیداوار کا کچھ حصہ نیچے والی جھیل کا پانی اوپر والی جھیل میں پمپ کرنے میں صرف ہوتا ہے اور باقی حصہ بجلی کے سپلائی کرنے کے سسٹم میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک خاص ٹیکنالوجی سے پلانٹ چلایا جا رہا ہے۔

ہم لوگ اس پاور پلانٹ کو دیکھنے گئے۔ لفٹ کے

TAGPK.COM

ذریعے 300 میٹر زمین دوز جگہ پہنچے جہاں پر کھدائی کر کے اندر زمین ہموار کی گئی اور اس جگہ پورا پلانٹ لگا دیا گیا۔ قارئین کو شاید اندازہ ہو کہ ایک پاور پلانٹ کے لیے کتنی جگہ درکار ہے اور یہاں 300 میٹر نیچے سے تمام مٹی نکال کر ایک بہت بڑی خندق نما جگہ بنائی گئی جہاں نہ صرف مشینری لگی ہے بلکہ کنٹرول روم ہے۔ ایک کینٹین ہے۔ کچھ کمرے ہیں اسٹاف کے آرام کے لیے، کچھ کمرے ہیں پلانٹ کی مشینری کے پرزوں کے لیے یعنی ایک اچھی خاصی جگہ آباد ہے۔ میں تو یہ دیکھ کر حیران تھا کہ اتنی بڑی جگہ وہ بھی 300 میٹر زمین کے نیچے کھدائی کر کے کیسے اور کتنے دنوں میں بنائی ہوگی اور اس جگہ کی مٹی کہاں پھینکی ہوگی۔ اس زمین دوز جگہ سے اوپر سطح پر آنے جانے کے لیے دو لفٹیں لگی ہیں مٹل کے دونوں کناروں پر۔ سچی بات ہے مجھے بہت ڈر لگا کہ اگر کسی وجہ سے نیچے آنے جانے کی لفٹ مٹل بند ہو جائے تو سارے لوگ اندر پھنس جائیں گے اور نہ معلوم وہاں پر کتنی آکسیجن ہوگی جو لوگوں کے سانس لینے میں اور زندہ رکھنے میں معاون ہوگی۔

ٹریننگ کے دوران ایک ایسے بجلی کے پاور پلانٹ کی بھی سیر کی جو سمندر کی لہروں سے بجلی پیدا کر رہا تھا۔ یہ پلانٹ فرانس کے شہر لارنس میں ہے جس کو لارنس پاور پلانٹ کا نام دیا گیا ہے۔ ہمارے لیے یہ ایک عجوبہ تھا۔ بغیر کسی فیول کے استعمال کے سمندر کے پانی کے مدوجزر سے بجلی کی ٹربائن چلائی جاتی ہے جو بجلی پیدا کرتی ہے اور لارنس شہر کی بجلی کی ضرورت پوری کرتی ہے۔ گرونوبل سے ہم صبح صبح لارنس شہر کے لیے روانہ ہوئے تھے اور شام تک مختلف علاقوں کی سیر کرتے ہوئے اور خاص طور سے فرانس کے چھوٹے چھوٹے شہروں سے گزرتے ہوئے اور وہاں کے کلچر کو دیکھتے ہوئے واپس آ گئے۔ دوسرے دن ہمیں ایک نیوکلیئر پلانٹ کی سیر کرنا تھی۔ دیستان صاحب کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ ہمیں پلانٹ پر لے جائیں اور وہاں کی سیر کرائیں اور وہاں پر موجود انجینئر پلانٹ کی کنسٹرکشن اور کارکردگی کے متعلق معلومات دیں گے جو پہلے سے طے ہو گیا تھا۔

دوسرے دن ہم اپنے ہوٹل سے دیستان صاحب کی معیت میں ان کی کار پر صبح کے 8 بجے نکلے اور تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد پلانٹ پر پہنچے۔ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا اور پھر مجھے اشتیاق بھی کیونکہ اس سے قبل میں نے کسی بھی نیوکلیئر پاور پلانٹ کو نہیں دیکھا تھا۔ پلانٹ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ جب ہم پلانٹ کو جانے والی سڑک پر مڑے تھے وہ جگہ پلانٹ سے تقریباً پانچ سے سات کلومیٹر کے قریب ہوگی مگر پلانٹ پر نصب سسٹم نے ہمیں دیکھ لیا تھا کہ ہم لوگ پلانٹ کی طرف آ رہے ہیں اور مرکزی دروازے پر موجود گارڈ نے گاڑی کا نمبر اور سواریوں کی تعداد معلوم کر کے دروازہ کھول دیا۔ ریسیپشن پر ہمیں پلانٹ پر گھومنے سے متعلق شناختی کارڈ دیا گیا تاکہ گلے میں ڈال لیں اور جہاں جائیں پہچانے جائیں کہ ہم وزیٹر ہیں۔ پلانٹ پر ایک انجینئر صاحب جن کا نام میں بھول رہا ہوں، ہمیں سیر کرانے کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ ان کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی کہ جب تک ہم پلانٹ میں رہیں وہ ہمارے ساتھ رہیں گے اور ہماری مہمان داری کریں گے۔ نام ان صاحب کا بھول رہا ہوں۔ شاید ایلکس تھا۔ انہوں نے بتایا کہ میں پہلا پاکستانی ہوں جنہوں نے یہ پلانٹ دیکھا ہے۔ ایلکس سب سے پہلے ہمیں ایک ہال میں یا میٹنگ روم میں لے گئے اور وہاں پر ایک پروفیسر کی طرح بلیک بورڈ کے ذریعے پورے پلانٹ کی تفصیل بتائی۔ ایلکس انگلش بہت اچھی بولتے تھے اسی لیے انہیں ہماری راہنمائی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ہمیں پورے پلانٹ کی سیر نہیں کرائی گئی بلکہ یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ جگہ عام لوگوں کی سیر کے لیے ممنوع ہے۔ زیادہ وقت کنٹرول روم میں ہی پلانٹ کی اوپریشن کے متعلق معلومات دیتے رہے اور نقشے کی مدد سے پورے پلانٹ کا نظام سمجھا دیا۔ بعد میں کافی کا دور چلا اور بس پھر واپسی۔ میں اصل میں ایٹمی ری ایکٹر دیکھنا چاہتا تھا جس کی میں نے خواہش بھی کی مگر یہ کہہ کر معذرت کر لی گئی کہ وہاں صرف خاص کام کرنے والوں کو اجازت ہے جہاں انہیں خاص احتیاط کرنے کی ٹریننگ ہوتی ہے اور ایک خاص لباس پہنتے ہیں جس پر ایٹمی شعاعیں اثر یا تو بہت کم کرتی ہیں یا بالکل نہیں کرتیں۔ وہاں پر ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے چاہے وہ پلانٹ پر ہی کام کرتا ہو۔ صرف خاص لوگوں کی انٹری کی اجازت ہے۔

مغرب سے قبل ہم گرونوبل کے ہوٹل میں واپس آ گئے اور دیستان صاحب ہمیں چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے بمعہ ہدایت کے کہ کل ہفتہ ہے اس لیے فیکٹری میں چھٹی ہے لہٰذا ہم لوگوں کو کل صبح بون سٹی جانا ہے۔ وہاں پر فرانس کی سب سے بڑی فیکٹری جو شراب بناتی ہے، موجود ہے۔ اس کو دیکھنا ہے۔

TAGPK.COM

قارئین! یہ جرمنی والا بون شہر نہیں ہے جو کافی مشہور جگہ ہے۔ اس کی تفصیل بعد میں تحریر کروں گا کیونکہ یہ شہر بھی مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

فرانس کی شراب اور پرفیوم ساری دنیا میں مشہور ہیں اور جو فرانس کی سب سے مشہور شراب ہے وہ بون شہر میں بنتی ہے۔ مجھے تو نہیں معلوم کہ یہاں کی شراب میں کیا خاص بات ہے جو اس قدر مشہور ہے۔ ظاہر ہے کچھ تو ہوگا جس کی پردہ داری ہے اور اس قدر چرچے ہیں۔ دوسرے دن تقریباً دس بجے کے قریب دیستان صاحب ہوٹل کے لاؤنج میں موجود تھے۔ میں بھی ناشتا کر کے وہیں بیٹھ گیا تھا اور ان کا انتظار کر رہا تھا۔

ہم فوراً ہی روانہ ہو گئے اور تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد بون شہر کے علاقے میں داخل ہوئے۔ قارئین! فرانس میں ہائی وے اور سڑکوں کا نظام بہت عمدہ ہے۔ صاف ستھری اور خوبصورت سڑکیں ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف صرف اور صرف ہریالی ہے، کھیت ہیں یا باغات جس میں انگور کے باغات زیادہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جوں جوں ہم بون کے قریب پہنچ رہے تھے صرف اور صرف انگور کی کاشت ہی نظر آئی۔

دوپہر ڈیڑھ بجے کے قریب ہم بون شہر پہنچے۔ گرونوبل سے شاید پچاس کلومیٹر دور ہے۔ بون ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں لوگ عام طور سے انگور کی کاشت کرتے ہیں جو کہ یہ لوگ ''وائن مڑی'' یا ''وائن فروٹ'' کہتے ہیں۔ یہاں ناشپاتی کے درخت بھی ہیں، اس کے باغات ہیں۔ اس سے بھی یہ لوگ شراب بناتے ہیں۔ انگور سے تیار کی ہوئی شراب ''وائن'' کہلاتی ہے اور ناشپاتی سے تیار کی ہوئی ''جن'' کہلاتی ہے جو شراب کی اور نسل ہے۔

بون شہر شاید تین یا چار مربع کلومیٹر کے رقبے پر واقع ہے جیسے ہمارے یہاں گاؤں یا قصبہ ہوتے ہیں اور وہاں کے لوگ کاشتکار ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح سے یہاں پر بھی زیادہ تر لوگ کاشتکار ہیں جو انگور یا ناشپاتی وغیرہ کی کاشت کرتے ہیں۔ عجیب چیز جو میں بیان کرنے لگا ہوں یہ کہ پورے شہر کے نیچے بڑے بڑے تہ خانے ہیں اور اس میں شراب کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ پورے شہر کے نیچے جانے کے لیے ہر سمت میں دو تین راستے ہیں جو دو رویا سڑک سے منسلک ہیں اور اوپر جانے کے لیے علیحدہ راستے ہیں یعنی اگر شراب کی فیکٹریوں کے علاقے میں جانا ہے تو اندر کی سڑک پر چلے جائیں اور رہائش والے علاقے میں جانا ہے تو دوسرا راستہ ہے۔

اس زمین دوز انڈسٹریل اسٹیٹ کے اوپر پورا شہر بسا ہوا ہے۔ اس زمین دوز انڈسٹریل اسٹیٹ میں صرف شراب بنانے کے کارخانے ہیں اور یہاں پر بڑے بڑے ٹرک یا ٹرالی میں کھیتوں سے انگور یا ناشپاتی لائی جاتی ہیں جو یہاں کارخانوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ قارئین! آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زمین دوز انڈسٹریل اسٹیٹ میں بڑی بڑی سڑکیں، پانی کی لائنیں، بجلی کا انتظام اور اسٹوریج یارڈ اور جو بھی زمین کے اوپر ایک انڈسٹری کے لیے ضروریات ہیں، زمین کے نیچے اس جگہ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انگور سے جوس کو نکالنے کی مشینیں اور پھر بڑے بڑے سائز کے ٹینک نما لکڑی کے ڈرم جس میں انگور کا رس شراب بنانے کے لیے رکھا جاتا ہے، ہر فیکٹری میں موجود ہیں۔

یہاں یہ بھی پتا چلا کہ کوئی بھی باہر سے آیا ہوا وزیٹر کسی بھی فیکٹری میں جا کر شراب ٹیسٹ کرنے کے لیے پی سکتا ہے اور اس کا مزہ پرکھ سکتا ہے۔ مختلف قسم کی شراب مفت میں پینے کا شاید یہ واحد شہر ہے اور یہ واحد فیکٹری ایریا ہے... پھر میں اپنی بدقسمتی اور بے ثباتی پر افسوس ہی کر سکتا تھا کہ فری میں مل رہی تھی اور کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا کہ بقول مرزا غالب کے معذرت کے ساتھ کہ ''ہماری فاقہ مستی کا رنگ لائے گی'' اس کے باوجود ہم نے پرہیز کیا۔ ہمارے دوست دیستان صاحب نے دو تین جگہ ٹیسٹ کی تو ہم حسرت دل کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے اور دل میں سوچتے رہے کہ ہائے ری مجبوری۔ ابھی تک تو بچے ہوئے ہیں نہ معلوم اللہ تعالیٰ کب تک اپنی حفاظت میں رکھے۔ شراب کے گڑھ میں پہنچ کر وہ بھی فرانس میں بغیر پیے واپس آنا ایسے ہی ہے جیسے پیاسا کسی دریا یا خوب وہیل کے بہتے ہوئے پانی کو چھوڑ کر دوسری طرف منہ کر کے پیاسا ہی واپس آ جائے۔

اس زمین دوز فیکٹری ایریا کے بالکل سینٹر میں ایک بہت بڑا لوہے کا پنجرہ بنایا گیا ہے جس میں سیکڑوں شراب بھری بوتلیں رکھی ہیں۔ ان میں بھری شراب یکم جنوری 1900ء کو بنائی گئی تھی اور یہ شراب ان بوتلوں میں بھر کر سیل کر دیا گیا اور اس لوہے کے پنجرے میں رکھ دیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ جتنی پرانی شراب ہوتی ہے، اتنی ہی قیمتی اور اچھی ہوتی ہے اور یہ دنیا کی سب سے قیمتی شراب ہوگی جب سو سال بعد یعنی یکم جنوری 2020ء کو جنگلا توڑ کر یہ شراب

TAGPK.COM

بانٹی جائے گی۔ بقول شخصے سو سال پرانی شراب کا مزہ کیسا ہوگا اور یہ کس قدر قیمتی ہوگی تصور سے باہر ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یکم جنوری 1900ء سے لے کر 30 دسمبر 2000ء جو بھی اس فیکٹری ایریا کو وزٹ کرے گا اس کو ایک ٹکٹ دیا جائے گا۔ مجھے بھی ایک ٹکٹ دیا گیا... پھر جو بھی یکم جنوری 2000ء میں پہنچے گا اور اپنے ٹکٹ کی قرعہ اندازی میں شرکت کروائے گا ان میں سے ایک ہزار آدمیوں کو ایک بوتل اس شراب کی دی جائے گی۔ ٹکٹ کا انٹری لیٹر مجھے بھی بمعہ مصدقہ اسٹیمپ کے مل گیا تھا مگر جنوری 2000ء میں، میں سعودی عرب میں تھا۔ مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ یہ ٹکٹ میں کسی اور کو دے دیتا۔

ایک اور اچھی بات یہ ہوئی کہ کیونکہ ہم اس فیکٹری ایریا کو دیکھنے کے لیے دور دراز سے وارد ہوئے تھے اس لیے یہاں کی مینجمنٹ کی طرف سے واپسی پر چار مختلف شراب کی بوتلیں ایک ٹوکری میں قرینے سے رکھی ہوئی گفٹ کے طور پر پیک کر کے دی گئیں۔ یہاں کے حساب سے یہ ایک بہت بڑا تحفہ تھا اور مجھے اعزاز ہے کہ یہ مجھے پیش کیا گیا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ ضرور اس کو ٹیسٹ کریں گے۔ اس تحفے کو قبول کیا اور شکریہ ادا کیا۔ اسی طرح کا ایک گفٹ پیک دیستان صاحب کو بھی دیا گیا کیونکہ وہ میرے ساتھ آئے تھے۔

فرانس سے واپسی پر میں جب اپنے بڑے بھائی کے گھر لندن گیا تو یہ تحفہ بھی ساتھ تھا۔ میرے بھائی کے گھر کے ساتھ ان کے پڑوسی جو پرانے زمانے کے انگریز تھے اور ان کے والد صاحب ہندوستان میں بھی ڈیوٹی دے چکے تھے، مجھ سے ملنے آئے بمعہ اپنی بیگم کے۔ ادھیڑ عمر کی فیملی تھی۔ ایک بیٹی ان کی وہ بھی کسی دوسرے شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے یہ پیکٹ ان کو تحفے کے طور پر دے دیا۔ دوسرے دن شام کو ہمیں چائے پر مدعو کیا اور اس تحفے کی اس قدر تعریف کی کہ یہ بون کی اصلی شراب ہے۔ بہت قیمتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ نہ معلوم اس میں کیا خاص بات تھی کہ پھر جتنی دفعہ بھی ملاقات ہوئی، اس شراب کی وہ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

ہمیں گرونوبل میں یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ فرانس میں رہتے ہوئے تقریباً چار ہفتے ہو چکے تھے۔ آخری دو ہفتے ہمیں ایک بڑے ٹرانسفارمر بنانے کی فیکٹری، اس کے ڈیزائن اور ایک بجلی کی ترسیل سے متعلق کنٹرول سسٹم اور اس میں جو کنٹرول کرنے کے لیے ریلے استعمال ہوتی ہے اس کے ڈیزائن اور مینوفیکچرنگ دیکھنا تھی۔ بجلی کی ہائی وولٹیج پر ترسیل میں یہ ریلے ایک بہت بنیادی پارٹ کہلاتا ہے۔ الیکٹریکل کنٹرول سسٹم کی ٹریننگ ہمیں بی بی سی کمپنی کے مینوفیکچرنگ پلانٹ پر لینا تھی۔ یہ کمپنی اب اے بی بی کہلاتی ہے اور ان کا پلانٹ سوئٹزرلینڈ کے شہر باڈن میں ہے جو سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورچ کے قریب ایک قصبہ ہے۔

پروگرام کچھ اس طرح بنا کہ ہم گرونوبل سے کار میں لیون جائیں جو ڈیڑھ دو گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ وہاں ایک ٹرانسفارمر بنانے کی فیکٹری دیکھی جائے اور وہاں سے ٹرین کے ذریعے جنیوا جائیں جو دوپہر کے بعد جاتی ہے۔

دوسرے دن صبح صبح تیار ہو کر ہوٹل سے باہر نکلے تو دیکھا باہر برف جمی ہوئی ہے اور سخت سردی ہے۔ نہ معلوم درجہ حرارت نقطہ انجماد سے کتنا کم تھا۔ دیستان صاحب جن کی ذمے داری تھی کہ ہمیں لیون تک کار میں چھوڑ کر آئیں، صبح صبح ہوٹل پہنچ چکے تھے اور انہوں نے اپنی کار کو پہلے سے گرم کیا ہوا تھا مگر پھر بھی گاڑی پورے طور سے گرم نہیں تھی۔ قارئین! یہاں پر ہر کار میں بجائے ایئر کنڈیشن کے ہیٹنگ کا سسٹم لگا ہوتا ہے جس سے ٹھنڈ کی کافی بچت ہو جاتی ہے۔ ہم ہوٹل سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو سردی کا احساس ہوا یعنی نقطہ انجماد سے بھی کافی کم درجہ حرارت تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لیون کے شہر پہنچے اور سیدھے ٹرانسفارمر بنانے کی فیکٹری کے گیٹ پر جا کر رکے۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہی نہایت ٹھنڈی ہوا کا ایک تھپیڑا لگا۔ ہماری حالت دیکھنے والی تھی۔ ٹھنڈ کی وجہ سے اپنے آپ کو سکیڑ لیا۔ فیکٹری بلڈنگ کے اندر پہنچ کر کچھ سکون ہوا۔ وہاں پر ہیٹنگ چل رہی تھی۔ فیکٹری بلڈنگ میں نارمل درجہ حرارت تھا لہٰذا بہت سکون ملا۔ فیکٹری میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہاں پر مرد، عورتیں اور لڑکیاں کسی قسم کے کوئی گرم کپڑے نہیں پہنے اور بہت تکلف کیا تو ہلکا سا سوئیٹر پہن لیا۔ شاید ہمارے مقابلے میں یہ لوگ سردی برداشت کرنے کے معاملے میں زیادہ عادی ہیں۔ ادھر ہماری حالت یہ تھی کہ جو بھی گرم کپڑے ہو سکتے تھے سارے پہنے ہوئے تھے یعنی بنیان، قمیص، سوئیٹر، کوٹ اور پھر اوور کوٹ۔ اتنا وزن اٹھانے کے باوجود سردی محسوس ہو رہی تھی اور مزید سردی کم کرنے کے لیے سر پر ٹوپی وہ بھی گرم اور پھر مفلر کا بھی استعمال جاری تھا۔ سردی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی، برداشت ہی

کرنا تھی، ہمارا پروگرام پہلے سے سیٹ تھا۔ جیسے ہی ہم پہنچے ہمیں کانفرنس ہال میں لے جایا گیا جہاں ایک انجینئر صاحب بڑے ٹرانسفارمر کی مینوفیکچرنگ کے سلسلے میں معلومات دینے کے لیے موجود تھے۔ تقریباً ایک گھنٹا تک انہوں نے خاصی محنت کر کے لیکچر دیا اور ہائی پاور ٹرانسفارمر کی تیاری میں جو مراحل آتے ہیں ان کے بارے میں کافی تفصیل سے بتایا پھر ہم نے پلانٹ کے مختلف حصوں میں ٹرانسفارمر کے مختلف حصوں کو بنتے دیکھا اور اپنی ڈائری میں کچھ باتیں جو ضروری تھیں نوٹ کیں۔ ٹرانسفارمر کمپنی کی طرف سے ہمیں لنچ بھی دیا گیا اور اس کے بعد دیستان صاحب مجھے لے کر گرونوبل ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ ٹرین بھی روانہ ہونے والی تھی۔ پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ شاید چار یا ساڑھے چار بجے کا وقت تھا جب ٹرین اسٹارٹ ہو کر روانہ ہوئی۔ دیستان صاحب مجھے خدا حافظ کہہ کر واپس چلے گئے۔ ٹرین میں اچھی خاصی ہیٹنگ ہو رہی تھی۔ مجھے اپنی سیٹ تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوئی۔

راستے میں قدرتی مناظر دیکھتے ہوئے تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کا سفر کر کے جنیوا کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ راستے میں ہی ٹرین میں میرے پاسپورٹ پر سوئٹزرلینڈ کی انٹری ٹکٹ کلکٹر صاحب نے ہی کر دی اور اسٹیمپ میرے پاسپورٹ پر لگا دی۔ شام تقریباً ہو چلی تھی۔ رات کا اندھیرا شروع ہو رہا تھا جب میں جنیوا کے ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی اٹیچی جس میں چند جوڑے کپڑے تھے اور بریف کیس تھا۔ زیادہ دور پیدل چلنے میں دشواری تھی لہٰذا ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم سے ایک ٹرالی کرائے پر لی اور سامان رکھ کر باہر نکلنے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ بالکل اسی طرح کی ٹرالی تھی جیسی ایئرپورٹ پر ہوتی ہیں۔ فرق یہ تھا کہ یہ کرائے پر ملتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کی بلڈنگ سے باہر نکلتے ہی اس کو واپس کرنا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں ایک طرف چار الیکٹرک بورڈ لگے ہوئے تھے۔ اس بورڈ پر پورے جنیوا شہر کا نقشہ تھا۔ بٹن دبانے پر مختلف ہوٹلوں کی لوکیشن اور ان کے نام کی نشاندہی ہو جاتی تھی پھر یہ بھی فوراً پتا چل جاتا ہے کہ ہوٹل میں کوئی جگہ ہے یا فل ہے اور کس طرح کے کمرے کا کیا ریٹ ہے، وغیرہ۔ اگر آپ چاہیں تو اسی بورڈ پر ایک بٹن کے ذریعے سلیکٹ کیے ہوئے ہوٹل کے ریسیپشن سے بات کر سکتے ہیں اگر آپ چاہیں تو اور مختلف معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک ہوٹل میں میری بکنگ پہلے سے کرا دی گئی تھی اور اس بورڈ پر اس کا نام بھی نظر آ گیا۔ بٹن دبا کر ہوٹل کی ریسپشنسٹ سے بات کی کہ شاید یہ ان کی ٹرانسپورٹ مجھے لینے آئے مگر انہوں نے فرمایا باہر نکل کر ٹیکسی ڈرائیور کو ہوٹل کا نام بتائیں وہ آپ کو یہاں لے آئے گا اور پھر یہی ہوا۔

ایک ٹیکسی والے کو ہوٹل کا نام بتایا تو اور اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر ٹیکسی کا میٹر آن کر دیا۔ ٹیکسی کی ڈگی کھول دی اور مجھے خود اپنا سامان اس میں رکھنا پڑا۔ جیسے ہی میں ٹیکسی میں بیٹھا کوئی پندرہ منٹ میں مذکورہ ہوٹل پہنچ گیا تھا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھی ایک خوبصورت خاتون نے مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کمرا الاٹ کر دیا اور ساتھ میں مجھے انٹری کارڈ بھی بھرنے کے لیے دے دیا۔

قارئین! مجھے اس لیے یہاں دشواری نہیں ہوئی کہ فرانس سے ہی میری ہوٹل کی ریزرویشن کر دی گئی تھی۔ میرے کمرے میں پہنچتے ہی میرا پاسپورٹ واپس کرنے ایک خاتون آئیں جو میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر جمع کروا دیا تھا تاکہ وہ اپنی ضروری انٹری کر لیں۔ پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے بولیں۔ ''بونزیو'' اور پھر سوئس زبان میں جو فرنچ سے کافی ملتی ہے نہ جانے کیا بولنے لگیں۔ میں نے کہا ''نو فرنچ اونلی انگلش'' یہ سننا تھا کہ خاتون سوری کر کے واپس چلی گئیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ فرنچ زبان میں پوچھ رہی تھیں کہ آپ کو یہاں کوئی کمپنی یا نورسٹ گائڈ چاہیے تو وہ بھی تیار ہے۔ فوراً ابھی آپ کی خدمت کے لیے کمرے میں حاضر کیا جا سکتا ہے۔ اب زیادہ تر نورسٹ گائڈ لڑکیاں ہیں باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان نورسٹ گائڈ کی فیس گھنٹے کے حساب سے ہے اور ہوٹل چارجز آپ کو نورسٹ گائڈ مہیا کرنے کے پندرہ فرانک فی دن کے حساب سے ہے۔ مجھے صرف معلومات لینا تھیں جو مل چکی تھیں لہٰذا اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ پہلے خیال آیا کہ خاتون نورسٹ گائڈ کو بلا کر ملاقات ہی کی جائے۔ دیکھیں تو کہ کیا چیز ہے اور کتنی حسین ہے مگر ہمت نہیں ہوئی۔ اسلام کا غلبہ غالب آ گیا۔ ''کچھ شرم ہوتی ہے کچھ حیا ہوتی ہے۔'' اور پھر اگر واپسی پر بیگم نے پوچھ لیا تو ایک اور جھوٹ بولنا پڑ جائے گا اس لیے دل پر جبر کر کے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ بہرحال یہاں دل لبھانے کے لیے اس قسم کی سروس بھی موجود ہے اور مختلف زبان بولنے والی خواتین و حضرات آپ

کو ٹورسٹ گائڈ کے طور پر مل جائیں گے یعنی اگر میں چاہتا تو انگلش بولنے والی خاتون بھی دستیاب تھی اور شاید اردو ہندی بولنے والی بھی مل جاتی۔

جنیوا میں ہوٹل جس میں رہائش اختیار کی گئی ایک بارونق بازار کے قریب تھا۔ باہر سردی اچھی خاصی تھی۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوئی لہٰذا کپڑے تبدیل کر کے کمرے میں ہی ٹی وی دیکھتے رہے رات ڈنر کے لیے کمرے میں ہی ایک کلب سینڈوچ کی پلیٹ ریسٹورنٹ سے منگوائی کمرے کے فریج سے پانی کی بوتل لے لی جس کی قیمت بیئر کی بوتل سے تقریباً دگنی تھی۔ ہم مسلمانوں کے لیے ایک جرمانہ ہے کہ پانی مہنگا اور بیئر سستی ہے۔ ہوٹل کے ریسیپشن سے معلوم ہوا کہ صبح آٹھ بجے سے ایک بجے دوپہر تک ایک ٹورسٹ بس کے ذریعے جنیوا کی سیر کی جاسکتی ہے۔ میں نے فوراً اپنی ریزرویشن کروالی اور بس کا ٹکٹ لے لیا۔ دوسرے دن ناشتا جلدی کر کے باہر نکلے تو بس تیار کھڑی تھی۔ بس میں ہمارے ہوٹل کے منیجر کے علاوہ دوسرے ہوٹل کے لوگ بھی تھے۔ ایک صاحب جن کا نام میں بھول گیا شاید ہنری تھا یا کچھ اور، امریکا سے یہاں آئے تھے۔ انگریزی دان ہونے کے ناتے میری سلام دعا ہوگئی تو راستے میں ان سے باتیں کرتے ہوئے مزہ آیا۔ بہت دلچسپ آدمی تھا۔ ادھیڑ عمر کا شخص مگر باتیں بالکل جوانوں والی۔ وہ بھی اکیلا ہی تھا اور کسی کام سے جنیوا کے ریڈ کراس کے دفتر میں دو یوم کے لیے پہلی دفعہ آیا تھا۔ اب کام سے فارغ تھا لہٰذا جنیوا کی سیر کا پروگرام بنایا۔ کہنے لگا میں نے اپنی گرل فرینڈ کو بھی یہاں آنے کو کہا تھا مگر اس کو دفتر سے چھٹی نہیں ملی۔ وہ کسی دفتر میں کام کرتی تھی لہٰذا اکیلے ہی سیر کے لیے جا رہا ہوں۔ ہنری صاحب نے دوران گفتگو اپنی گرل فرینڈ کو کئی دفعہ یاد کیا۔ لگتا تھا کافی انسیت یا محبت ہے۔ ہمارے ہوٹل میں ہی اس کا قیام تھا۔

بس جہاں اور جس مقام پر جا رہی تھی وہاں پر ٹورسٹ گائڈ فرنچ یا سوئس زبان اور انگریزی میں تفصیل بیان کر رہا تھا۔ اس ٹرپ پر ہم نے جنیوا لیک پر مشہور فوارہ دیکھا۔ 3600 ہارس پاور کی بجلی کی موٹر پمپ، 160 فٹ کی بلندی تک پانی پھینکتی ہے۔ ہم لوگ فوارے کے قریب تک گئے۔ ٹورسٹ گائڈ نے اس فوارے سے متعلق پوری تفصیل بیان کردی تھی۔ رات میں اس کا نظارہ اور خوبصورت ہوتا ہے کیونکہ اس فوارے پر لائٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ قریب ہی ایک پارک نما جگہ ہے جہاں کافی لوگ صرف سیر کرنے یا دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہماری بس انٹرنیشنل ریڈ کراس کے دفتر کے سامنے سے گزری اور اس کے قریب ہی یونائیٹڈ نیشن یورپ سیکشن کا دفتر ہے۔ یہاں سے آگے جنیوا کی مشہور گھڑیاں بنانے والوں کا میوزیم دیکھا۔ اس کے قریب ایک پارک بھی ہے جو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ ہماری بس تھوڑی دیر کے لیے یہاں رکی تھی۔ اس جگہ کا نام یاد نہیں لیکن یہ جنیوا کی ایک مشہور جگہ ہے۔

اس کے بعد ہماری بس مشہور فلوورکاک اور کیتھڈرل سینٹ پیٹرکس کے پاس سے گزری۔ ہماری بس کی گائڈ کی زبان اس قدر تیزی سے چل رہی تھی کہ بہت سی جگہوں کی نشاندہی کی گئی لیکن میں نوٹ نہیں کرسکا۔

ہوٹل واپس آنے کے بعد اتنا ٹائم نہیں تھا کہ کچھ ریسٹ کریں یا کھانا کھائیں۔ فوراً کمرے سے سامان سمیٹا اور چیک آؤٹ کر کے ایک ٹیکسی پکڑ کر سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ وقت بہت کم تھا۔ بھاگم بھاگ ساڑھے تین بجے والی ٹرین جو جنیوا سے زیورچ جاتی ہے اپنی ریزرویشن والی سیٹ تلاش کر کے بیٹھ گئے۔ یہاں ہر ٹرین میں آپ کی سیٹ مخصوص ہوتی ہے۔ ٹرین کنڈکٹر کو بتائیں وہ فوراً آپ کو بوگی نمبر بتادے گا۔ وہاں پر تلاش کرنا مشکل نہیں۔ ٹرین ٹھیک 3 بج کر 45 منٹ پر روانہ ہوئی اور تین گھنٹے کے سفر کے بعد زیورچ ریلوے اسٹیشن پر اترے۔

یہ ایک نہایت صاف ستھرا اور خوبصورت ریلوے اسٹیشن ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی کے ذریعے بتائے ہوئے ہوٹل پہنچے۔ میرے لیے کمرا پہلے سے مختص تھا لہٰذا کاؤنٹر پر پہنچ کر ضروری انٹری کے بعد تیسرے فلور پر اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ اچھا خاصہ بڑا کمرا تھا جہاں ڈبل بیڈ اور میٹنگ کے لیے علیحدہ صوفے اور سینٹر ٹیبل تھی۔ یہاں پر ہمیں ایک چھوٹے سے قصبے میں جو یہاں سے 20 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے بجلی کے کنٹرول اور ریلے مینوفیکچرنگ پلانٹ دیکھنا تھا۔ انچی میں کمرے میں پہنچ کر واش روم سے فارغ ہوا تھا کہ ایک صاحب جن کا نام ایڈورڈ تھا، کا ٹیلی فون آیا اور بولے کہ میں اے بی بی پلانٹ پر پروٹوکول افسر ہوں۔ آپ کی پلانٹ پروزٹ کو میں ہی دیکھوں گا۔ زیورچ میں ویلکم کرنے کے بعد انہوں نے ساتھ ڈنر کرنے کی فرمائش کردی جو فوراً قبول کرلی گئی لہٰذا ایڈورڈ صاحب سے طے ہوا کہ وہ مجھے شام آٹھ بجے کے قریب ہوٹل سے لیں گے اور پھر کھانا کھانے کسی ریسٹورنٹ میں چلیں گے۔ اس تمام

پروگرام کے باوجود مجھے صرف اتنا وقت ملا کہ میں کمرے میں پہنچ کر ہاتھ منہ دھولوں اور جیسے ہی فارغ ہوا تو ریسیپشن سے ایڈورڈ صاحب کا ٹیلی فون آگیا لہٰذا انہی کپڑوں میں ایڈورڈ صاحب کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے پہنچ گئے۔ مجھے یہاں معلوم نہیں تھا کہ کس قسم کے کھانے ملتے ہیں۔ حلال یا حرام۔ لہٰذا ایک ریسٹورنٹ جہاں مچھلی ملتی ہے وہاں پر کھانا کھایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں کئی لبنانی اور ٹرکش ریسٹورنٹ بھی ہیں جہاں حلال فوڈ ملتا ہے۔

ایڈورڈ صاحب ایک دلچسپ آدمی تھے۔ انگلش بہت صاف ستھری بولتے تھے۔ ظاہر ہے یہاں کی مقامی زبان بھی بولتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ امریکن نیشنل ہیں مگر کام یہاں کرتے ہیں۔ خیر سے الیکٹرونکس انجینئر ہیں ... کیونکہ انگریزی اچھی بولتے ہیں اس لیے ان کی ڈیوٹی اکثر پروٹوکول میں کسی انگلش بولنے والے کسٹمر کے ساتھ ہوتی ہے۔ انڈیا کی سیر بھی کر چکے ہیں۔ دلی دیکھا اور آگرہ بھی دیکھا ہے، مدراس اور ممبئی کی بھی سیر کر چکے ہیں۔ یعنی ہمارے کلچر کو سمجھتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے ان کی ڈیوٹی میرے ساتھ پروٹوکول پر لگائی گئی ہے۔

ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ مچھلی فرائی کا آرڈر دے چکے تھے اسی دوران ہمیں آلو کا سوپ پیش کیا گیا۔ اصل میں جب مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ کیا کھانا پسند کرتے ہیں تو میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ ہر چیز مگر حلال۔ ایڈورڈ صاحب نے بھی آرڈر دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے سوپ کا آرڈر بھی دیا ہے بہرحال سوپ بہت اچھا لگا۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ یہاں پر کچھ ریسٹورنٹ ویجیٹیرین یعنی سبزی والے ہیں جہاں دال سبزی وغیرہ کے کھانوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا یعنی گوشت کسی قسم کا ہو یہاں دستیاب نہیں ہے۔ میں اس طرح کے ریسٹورنٹ میں نہ جا سکا مگر معلوم ہوا کہ ہندوستانی اس ریسٹورنٹ میں اکثر کھانا کھاتے ہیں۔ کئی چائنیز ریسٹورنٹ ہیں جن میں حلال کھانا ہوتا ہے اور ان ریسٹورنٹس کو چائنیز مسلمان یا ٹرکش لوگ چلاتے ہیں۔ بہرحال مجھے وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

کھانا کھانے کے دوران ہی ایڈورڈ صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور اسی دوران میں اگلے دن کے پروگرام کے متعلق معلومات بھی دی گئیں۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے کے قریب ایڈورڈ صاحب مجھے ہوٹل میں لینے آگئے۔ پروگرام کے مطابق میں پہلے سے تیار تھا اور ناشتے سے بھی فارغ ہو چکا تھا۔ ایڈورڈ صاحب اپنی کار چلا رہے تھے اور ساتھ میں پورے دن کا شیڈول بھی بتا رہے تھے کہ فیکٹری میں کئی انجینئرز سے ملاقات ہوگی۔ فیکٹری منیجر سے بھی انٹروڈکشن ہوگا۔ پہلے باقاعدہ ٹریننگ کلاس ہوگی جو فیکٹری میں ایک ڈیزائن انجینئر دیں گے پھر ورکشاپ اور پروڈکٹ اسمبلی پلانٹ کی سیر ہوگی۔ دوپہر کو لنچ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ شام کو زیورچ شہر کی کچھ سیر کی جائے گی۔

ایڈورڈ صاحب نے مجھے مصروف رکھنے کی پوری داستان سنا دی۔ اصل میں زیورچ سے کچھ فاصلے پر جس جگہ فیکٹری ہے وہ علاقہ بادن کہلاتا ہے۔ ایک بہت چھوٹا قصبہ ہے اور یہاں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو یہاں کے انڈسٹریل ایریا میں کام کرتے ہیں یا پھر کاشت کاری۔

فیکٹری عام یورپ کی فیکٹریوں کے طرز پر بنائی گئی تھی۔ ہم جیسے ہی فیکٹری میں داخل ہوئے ریسیپشن سے ہوتے ہوئے میٹنگ روم میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر میں ایک صاحب کچھ کاغذات ہاتھ میں لیے ہوئے داخل ہوئے۔ مجھے ویل کم کر کے اپنا تعارف کرایا۔ الیکٹریکل سسٹم ریلے کے یہ صاحب ماہر مانے جاتے ہیں اور چیف ڈیزائن انجینئر ہیں۔ انہوں نے تقریباً 45 منٹ کا لیکچر الیکٹریکل ریلے سسٹم پر دیا جو میں نے بڑے صبر اور تحمل سے سنا۔ کچھ چیزیں تو سمجھ میں آرہی تھیں لیکن کچھ چیزیں جو تفصیل طلب تھیں اس کے بارے میں ان صاحب سے سوال پوچھے گئے جن کا جواب تسلی بخش اور تفصیل سے دیا گیا۔ بعد میں کافی بریک کے دوران آخر انہوں نے کہہ ہی دیا کہ آپ پہلے آدمی ہیں جو کسی تھرڈ ورلڈ کنٹری سے آئے ہیں اور اس قدر تفصیل سے مجھ سے سوالات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو ایک عام بات ہے کیونکہ میں یہاں آپ سے کچھ سیکھنے آیا ہوں۔ بولے، بہت سے انجینئر آتے ہیں اور جو مختلف تھرڈ ورلڈ کنٹری کے ہوتے ہیں لیکن اتنے سوالات نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تو آپ سے سیکھنا ہے۔

یہاں فیکٹری میں بھی عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے۔ جو سب سے اچھی چیز نظر آئی وہ یہاں کی صفائی اور چھوٹے چھوٹے الیکٹرونکس کے پرزے مثلاً رزسٹر اور کپیسٹر یا چھوٹے چھوٹے سوئچ جو سرکٹ بریکر میں استعمال ہوتے ہیں، بڑے قرینے سے رکھے ہوئے تھے اور اس کو روبوٹ کے ذریعے پہچانا جاتا ہے اور صحیح جگہ پر استعمال

TAGPK.COM

ہوتا ہے۔ فیکٹری میں ٹیسٹنگ لیبارٹری بھی دیکھی اور ایک بجلی ریلے کی ٹیسٹنگ خود بھی کی۔ فیکٹری وزٹ سے فارغ ہوکر ایڈورڈ صاحب نے کہا کہ یہاں فیکٹری کینٹین میں میرے مطلب کا کھانا نہیں ہوگا اس لیے فیکٹری سے باہر جاکر کسی ریسٹورنٹ میں کھاتے ہیں۔ میں نے ہامی بھرلی۔ کہنے لگے یہاں ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ ہے جس میں مچھلی اور لنٹل سوپ اچھا ملتا ہے۔

قارئین! یورپ میں لنچ ٹائم 12 بجے دوپہر سے شروع ہوکر دو بجے تک ختم ہوجاتا ہے۔ جب ہم ریسٹورنٹ پہنچے تو کافی حد تک کھانا ختم ہوچکا تھا۔ اس وقت دو بج رہے تھے اور باقی بچی ہوئی وہ چیزیں تھیں جو میں کھا نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا چھوڑیں شام کو ڈنر کرلیں گے لیکن ایڈورڈ صاحب کہنے لگے کہ قریب میں ایک اور ریسٹورنٹ ہے جہاں شاید کھانا مل جائے۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہاں پہنچے۔ وہاں پر بھی حالات بالکل پہلے کی طرح تھے یعنی وہ چیزیں جو میں کھا سکتا تھا مثلاً مچھلی، لنٹل سوپ وغیرہ ختم ہوچکا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ یہاں ایک مسلمان گگ ہے اس کو بلا کر پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی چیز حلال بھی کھانے کو مل سکتی ہے۔ دوپہر کے وقت یعنی لنچ کا ٹائم ختم ہوگیا تھا۔ ریسٹورنٹ تقریباً خالی ہوچکا تھا اور بیرے صفائی میں مصروف تھے۔ بہرحال ایک بیرے کو بلا کر ایڈورڈ صاحب نے کہا کہ یہاں ایک صاحب گگ ہیں جو مسلمان ہیں ان سے بات کرنا ہے۔ تھوڑی دیر میں ایک صاحب گگ کے ڈریس میں حاضر ہوئے۔ ایڈورڈ صاحب نے اپنی زبان میں ان سے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ صاحب پاکستان سے آئے ہیں۔ حلال فوڈ کھانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ریسٹورنٹ کا وقت ختم ہوچکا ہے پھر بھی اگر کچھ ہے اور وہ بھی حلال ہے تو لے آئیں۔ وہ صاحب بہت خوش ہوئے اور بولے۔ ''ریسٹورنٹ میں اس وقت کوئی حلال چیز موجود نہیں ہے۔'' پھر مجھ سے بولے کہ آپ مسلمان ہیں؟''

جواب میں کہا۔ ''جی۔ ماشاءاللہ۔''

فوراً مجھ سے گلے ملنے کے لیے بڑھے اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولے۔ ''میں بھی مسلمان ہوں۔ اگر آپ آدھا گھنٹا انتظار کرلیں تو میں اپنے گھر سے حلال کھانا منگوا سکتا ہوں کیونکہ میں بھی اس ریسٹورنٹ کا کھانا نہیں کھاتا۔ گھر کا پکا ہوا کھانا کھاتا ہوں۔''

> جذبہ عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ
> کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے
>
> عزیز الرحمٰن نے اپنی کتاب ''قلم مجلس، المعروف، شعروں کی ڈکشنری جلد اوّل میں اس شعر کو انشا اللہ خان انشا سے منسوب کیا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا ہے جبکہ انشا کی کسی معتبر کلیات میں یہ شعر کہیں موجود نہیں ہے۔
>
> ڈاکٹر شفیق علی خان نے اپنی کتاب اردو کے ضرب المثل اشعار میں اس شعر کو داغ دہلوی کے نام لکھا ہے۔
>
> شمس بدایونی نے بھی اپنی کتاب ''شعری ضرب المثل، جلد دوئم: روشن پبلی کیشنز بدایوں 1988ء'' میں اس شعر کو داغ کے نام لکھا ہے جب کہ داغ دہلوی کے چاروں شعری مجموعوں ''گل زار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ، اور یادگار داغ میں یہ شعر کہیں نہیں ہے اور نہ ہی کسی معتبر کلیات داغ میں یہ موجود ہے، درحقیقت یہ شعر کسی غیر معروف شاعر کا ہے داغ، یا انشا کا ہرگز نہیں۔
>
> (ذرہ حیدرآبادی کے مضمون سے اقتباس)

ریسٹورنٹ کے دروازے بند ہوچکے تھے۔ میں اور ایڈورڈ صاحب تقریباً چالیس منٹ تک بیٹھے رہے اور بور ہوکر اٹھنے ہی والے تھے کہ وہ صاحب بمع ایک ٹرے کے جس پر دسترخوان ڈھکا ہوا تھا، حاضر ہوئے اور دسترخوان ہٹا کر افغانی پلاؤ اور پکے ہوئے گوشت کی ڈش میز پر رکھنے لگے۔ ساتھ میں معذرت بھی کہ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ مہمان پاکستان سے آیا ہے تو وہ خاص طور سے دعوت کرتے۔

بہرحال بھوک بھی کافی تھی۔ مجھے کھانا اچھا لگا لیکن ایڈورڈ نے بہت تھوڑا لیا یعنی شاید چھکا ہو۔ اس کے علاوہ ریسٹورنٹ کے کچن سے ڈبل روٹی اور سلاد بنا کر دیا۔ بھوک تو لگ رہی تھی، دوسرے کئی دنوں کے بعد ہمارے اپنے علاقے کا کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے پلاؤ بڑے شوق سے کھایا۔ جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو میں نے بتایا کہ میں نے پشاور وغیرہ دیکھا ہے مگر میں کراچی کا رہنے والا ہوں۔ ان صاحب کو صرف پشاور کا پتا تھا باقی پاکستان وہ نہیں جانتے تھے۔ ان کا نام حمد خان تھا مگر سب خان کہتے تھے جو بعد میں

TAGPK.COM

''کہان'' بن گیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے والدین برٹش آرمی میں تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ لندن سے ہوتے ہوئے سوئٹزرلینڈ آگئے۔ وجہ یہ تھی کہ لندن میں انہوں نے ایک سوئٹزرلینڈ کی خاتون سے شادی کرلی اور باڈن شہر میں آباد ہوگئے کیونکہ وہ خاتون باڈن شہر کی رہنے والی تھیں۔ یہاں پر ہی حمد خان پیدا ہوئے۔ وہ یہاں کے باشندے ہیں۔ ان کی والدہ بہت عمر رسیدہ اور بوڑھی ہوگئی ہیں۔ والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اور حمد خان صاحب کے دو بیٹے ہیں جو کسی فیکٹری میں کام کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نہیں رہتے۔ اپنی اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ رہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب بتایا وہ بھی اس لیے کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں ان کے والد کے آبائی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ ان کو یہی معلوم تھا کہ افغانستان اور پاکستان ایک ہی ہے۔ حمد خان کو اپنی علاقائی زبان یعنی پشتو نہیں آتی تھی اور وہ سوئس زبان میں بات کررہے تھے۔ جب تک ہم کھانا کھاتے رہے انہوں نے اپنی پوری سرگزشت بتادی اور ایڈورڈ صاحب مجھے انگریزی میں ترجمہ کرکے بتاتے رہے۔

کہان صاحب کی پیدائش زیورچ شہر کی ہے۔ یہاں پر ہی کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کام کرتے کرتے اب ہیڈ کک ہوگئے ہیں۔ ہمیں تعجب جب ہوا کہ ہم سے اس کھانے کا کوئی بل نہیں لیا گیا۔ ہم بہت زور لگا کر اصرار کرتے رہے کہ کم از کم کھانے کی قیمت تو لے لیں لیکن کہان صاحب کہنے لگے کہ اگر آپ ہمیں ایک گھنٹا پہلے بتادیں کہ آپ یہاں کھانا کھانے آرہے ہیں تو ہم آپ کو حلال کھانا بنا کر کھلائیں گے۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ جب آپ باڈن شہر جائیں تو وہاں برفیلے پہاڑ پر دو عدد گرم پانی کے چشمے ہیں، وہ ضرور دیکھیں۔ میں نے ایڈورڈ صاحب سے ذکر کیا تو کہنے لگے لنچ کرکے چلیں گے... مگر یہاں ہمارے لنچ میں ہی کافی دیر ہوچکی تھی اور دوسرے دن ہمیں واپس جانا تھا... پھر طے یہ ہوا کہ چلتے ہیں اور جو کچھ بھی دیکھ سکتے ہیں دیکھ کر واپس آجائیں گے کیونکہ چشمے میں نہانا نہیں ہے لہٰذا ریسٹورنٹ سے نکلتے ہی ہم سیدھے گرم پانی کے چشموں کی طرف پہاڑ پر چڑھنا شروع ہوگئے۔ اوپر پہاڑ پر چاروں طرف برف جمی ہوئی تھی اور پہاڑ کے اوپر پانی کا ایک چشمہ تھا جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یہ بھی اللہ کی شان ہے۔ پہاڑی پر برف کے ساتھ سخت سردی بھی ہے اور اس چشمے میں پانی نہ معلوم کہاں سے آرہا ہے جو بھاپ اٹھاتا گرم ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں اس طرح کا ایک اور چشمہ ہے جو اوپر پہاڑ پر ہے یعنی کافی اوپر چڑھ کر نظر آئے گا۔ جہاں تک جانے کے لیے بھی روڈ بنی ہے لیکن ہم وہاں نہیں گئے۔

جو خاص بات ہے وہ یہ کہ لوگ اس چشمے میں اپنی جلدی بیماری کی شفا کے لیے ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ جب ہم پہنچے تو شام ہونے کے قریب تھی اس لیے بس باہر سے دیکھ کر واپس آگئے اور وہاں پر موجود لوگ بھی واپسی کی تیاری کررہے تھے۔ قریب ہی ایک ریسٹورنٹ اور ٹک شاپ تھی۔ پہلے سوچا کہ کافی پیتے ہیں مگر میں نے یہ کہہ کر ریجیکٹ کردیا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہاڑ سے نیچے اترنا ہے۔ ہم لوگ پہاڑ سے واپس نیچے اتر آئے۔ اندھیرا ہوچکا تھا لہٰذا ہم سیدھے اپنے ہوٹل میں پہنچے اور ایڈورڈ صاحب مجھے چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے۔

زیورچ شہر سے ہم گزر کر باڈن میں آگئے تھے۔ زیورچ کی اوپری سیر نہیں کرسکے تھے اور پھر جب ہم گروٹوبل سے زیورچ آرہے تھے تو راستے میں ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی تھی جس کا نام لوزیانہ یا لوزان تھا۔ ٹرین جب لوزان اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو لیک لوزان کے کنارے سے گزری۔ نہایت خوبصورت منظر تھا۔ لیک کے کنارے سڑک پر ٹریفک چل رہا تھا، مختلف قسم کی گاڑیاں، ٹرک، کاریں اور بسیں رواں دواں تھیں۔ ادھر جھیل کے اندر اسٹیمر یا چھوٹے پانی کی کشتیاں چل رہی تھیں اور لوگ اس میں سفر کررہے تھے۔ سڑک سے اوپر اونچائی پر پہاڑی کے ساتھ ساتھ ٹرین چل رہی تھی یعنی سفر کے تمام ذرائع موجود تھے۔ پہاڑ پر مزید اونچائی پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ مجھے جو سب سے اچھی اور خوبصورت بات یہ لگی کہ ٹرین کی پٹری ان مکانات سے کافی نیچے تھی اور یہ جگہ مکانوں کا پچھواڑا تھا مگر ہر مکان والے نے اپنے گھر کے عقبی حصہ سے ڈھلان پر اور ریلوے ٹریک پر پھولوں کی کیاریاں بنائی تھیں۔ ہر گھر کے نیچے مختلف قسم کے پھولوں کے پودے لگے تھے۔ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ ظاہر ہے یہاں ان پودوں کو پانی تو قدرت کی طرف سے بارش کی شکل میں مل جاتا ہے اس لیے یہ خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ ہاں سخت سردی میں جب برف پڑتی ہے تو یہ پودے برف میں ڈھک جاتے ہوں گے۔

قارئین یہ وہی تاریخی شہر لوزیانہ ہے جہاں دوسری جنگ عظیم میں جب ترکوں کو شکست ہوئی اور خلافت عثمانی کا خاتمہ ہوا تو اسی جگہ پر مشہور زمانہ معاہدہ ہوا تھا کہ ترکی کی

TAGPK.COM

خلافت ختم ہوئی اور اگلے سو سال تک ترکی میں مخلوط حکومت ہوگی اور یہ اسلامی ریاست نہیں کہلائے گی۔ کمال اتاترک ترکی کے نئے سربراہ کی صورت میں آئے اور انہوں نے معاہدہ پر دستخط کیے۔ دوسری طرف ترکی کے عوام کو پابند کیا گیا کہ وہ آبنائے باسفورس سے گزرتے ہوئے پانی کے جہازوں سے کسی قسم کا ٹیکس نہیں لیں گے۔ آبنائے باسفورس ایشیا اور یورپ کو سمندر سے ملاتا ہے اور تجارت اسی راستے سے ہوتی ہے۔ دوسری شق یہ تھی کہ ترکی کسی صورت میں زمین سے تیل اور گیس نہیں نکالے گا حالانکہ ترکی کے علاقے میں بشمول سمندری حدود کے تیل اور گیس کے کافی ذخائر ایک عرصہ دراز سے دریافت شدہ ہیں۔

جب میں اس شہر سے گزر رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ ترک مسلمانوں نے جہاں ساری دنیا میں اپنی دھاک ایک عرصہ دراز تک بٹھائے رکھی وہاں اس چھوٹے سے شہر میں ایک ایگریمنٹ کر کے ایک بہت بڑی پستی میں چلے گئے تھے۔ سنا ہے لوزیانا ایک خوبصورت شہر ہے مگر میرا وہاں جانا نہیں ہو سکا کیونکہ یہ وزٹ میرے شیڈول میں نہیں تھا حالانکہ موٹر کولمبس کنسلٹنگ انجینئرز جن کے ساتھ میں لاہور پاکستان میں کام کر رہا تھا ان کا ہیڈ آفس بھی اسی شہر میں تھا۔

میں ٹرین کے ذریعے زیورچ سے لیون اور پھر وہاں سے گرونوبل ہوٹل میں واپس آ گیا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور تقریباً دن بھر کا سفر، جلد ہی نیند نے آ دبوچا اور صبح جلد تیار ہو گیا۔ میں ناشتا ہی کر رہا تھا کہ دیستان صاحب ہوٹل میں مجھے لینے کے لیے آ موجود ہوئے۔ آج ہمیں گرونوبل میکینکل یونیورسٹی جانا تھا۔ وہاں پروڈاکٹرز کے کا ایک لیکچر اٹینڈ کرنا تھا جو ہمارے [illegible] سے متعلق تھا اور [illegible] میں ہائی ووٹیج [illegible] تھا لہٰذا آج ہم ڈائیز کے کا لیکچر اٹینڈ کرنے چلے گئے تھے جو دو حصوں پر مشتمل تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر گرونوبل کی فیکٹری میں آئے۔ لوگوں سے آخری ملاقات کی اور ہوٹل آ گئے۔

رات نرین کے ذریعے ہمیں پیرس جانا تھا۔ جہاں پر دوسرے دن شائڈر کمپنی کے پیرس آفس میں ایک میٹنگ تھی اور پھر شیڈول کے مطابق شام کو پیرس سے پی آئی اے کی پرواز سے کراچی جانا تھا لہٰذا ہوٹل میں ہماری بکنگ نہیں تھی۔ صبح آٹھ بجے ہم پیرس پہنچے اور ٹیکسی پکڑ کر بتائے ہوئے پتے پر ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں ایک بلڈنگ کے سامنے اتار دیا۔

اندر ایک خاتون ریسیپشن پر موجود تھیں جو بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی ملیں۔ جب انہیں بتایا کہ میں گرونوبل سے آیا ہوں اور مسٹر ایکس یا شاید اور کوئی نام تھا جو اس آفس کے انچارج تھے، سے ملنا چاہتا ہوں۔ خاتون نے انٹر کام پر ایکس صاحب کو جب بتایا تو انہوں نے ان صاحبہ کو ہدایت دی کہ مجھے میٹنگ روم میں بٹھا دیا جائے۔ میں بہت پریشان تھا کیونکہ میرے پاس ایک اٹیچی اور بریف کیس بھی تھا اور اٹیچی کو لے کر میٹنگ روم میں جانا ایک عجیب سی بات تھی۔ پروگرام کے مطابق یہاں سے فارغ ہو کر سیدھا ائرپورٹ جانا تھا جہاں سے پی آئی اے کی پرواز سے پاکستان واپسی تھی۔ پیرس میں دو ائیرپورٹ ہیں۔ اورلی ایئرپورٹ سے پی آئی اے کی پرواز چلتی ہے۔ دوسرا ایئرپورٹ چارلس ڈیگال ہے۔ ہمیں یہ پریشانی تھی کہ فرانس میں تقریباً تین ہفتے سے زیادہ رہے اور پیرس نہیں دیکھا۔

ایکس صاحب سے تھوڑی دیر میں ملاقات ہو گئی۔ وہ کانفرنس روم میں خود ملنے آ گئے۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد دو کپ کافی یا چینو کا انٹر کام پر آرڈر دے دیا۔ مختلف قسم کی گفتگو یعنی شائڈر کمپنی کے ایکیوپمنٹ کے ٹریننگ کے سلسلے میں ہوتی رہی اسی دوران پوچھا کہ آپ کہاں رکے ہوئے ہیں۔ عرض کیا کہ ابھی کسی ہوٹل میں نہیں گئے۔ آج ہی تھوڑی دیر پہلے گرونوبل سے آئے ہیں اور شیڈول کے مطابق آج کی فلائٹ سے ہی واپس جانا ہے مگر میں اپنی فلائٹ دو دن بعد کروانا چاہتا ہوں۔ اگر ہو گئی تو پھر کسی ہوٹل میں رک جاؤں گا۔ ایکس صاحب نے نہایت مہربانی سے فرمایا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو جہاز کا ٹکٹ دے دیں میں اپنی سیکریٹری کو ایونٹی لگا دیتا ہوں جو آپ کے [illegible] کے دن جانا ہے۔ صرف دو دن بعد اور پھر اگر [illegible] ہو گئی تو یہاں قیام کے لیے کسی چھوٹے ہوٹل میں کمرا بھی چاہیے۔" میرا جواب بڑا سادہ سا تھا۔

بہرحال میں اس آفس میں شاید ڈیڑھ دو گھنٹے رہا۔ اس دوران وہاں کے اسٹاف سے سرسری گفتگو ہوئی مگر ایک دن کے بعد والی پی آئی اے کی فلائٹ پر بکنگ ہو چکی تھی۔ کچھ پینلٹی کے فرانکس دینے پڑے جو اسی دفتر نے ادا کیے۔ ایک ہوٹل جو شانزے لیزے کے قریب تھا جس میں رہائش کی بکنگ بھی ہو گئی جس کے پیسے مجھے دینا تھے جس کی منظوری میں نے دے دی۔

پیرس دنیا کے بڑے اور مشہور شہروں میں شمار کیا جاتا

ہے۔ برسوں سے پیرس اپنی خوبصورتی، رعنائی اور نزاکت اور عمدہ کھانے پکانے اور کھانے کے لیے مشہور ہے۔ یورپ کے اعلیٰ لباس، اعلیٰ کھانے اور کھانے کے طریقے پیرس کے ہی مانے جاتے ہیں یعنی یورپ کی تہذیب اور تمدن میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہاں کے لباس کے علاوہ پرفیوم بہت مشہور ہیں جو پورے یورپ کی پہچان ہیں۔ یہاں پر عوام، مرد اور خواتین، لڑکیاں لڑکے اپنی زندگی کے دن پورے طور سے انجوائے کرتے ہیں۔ میل جول، بوس و کنار پر کوئی خاص وقت کی قید نہیں ہے نہ جگہ کی۔ اور اس عمل پر نہ کوئی بندش ہے نہ کوئی شرم وغیرہ۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ پیرس کی عاشقی اور فاشقی دونوں میں ایک خاص قسم کا سلیقہ ہے۔ چاہے ہمیں اور ہمارے معاشرے کو پسند آئے یا نہیں۔ یہاں کی خواتین اور مرد دونوں خوش پوش اور خوش شکل نظر آئے۔ فرانسیسی زبان بولنے میں ایسا لگتا ہے جیسے بولنے والا کافی منہ ٹیڑھا کر کے بول رہا ہے اور آواز بہت شستہ قسم کی نکلتی ہے۔ مثلاً پیرس کو ''پیلی'' کہتے ہیں۔ میرے خیال میں محبت میں جس طرح ہم اپنے پیاروں کے نام ذرا مختلف انداز سے پکارتے ہیں اسی طرح ان لوگوں نے اپنے محبوب شہر کا نام ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہاں جوان لڑکے لڑکیاں اپنی جوانی پورے طور سے انجوائے کرتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں پیرس کی عاشقی بھی سلیقے والی اور خوشبودار ہے، فاشقی میں بھی سلیقہ ہے۔ یہاں فرانسیسی مرد اور خواتین مجھے خوبصورت لگے۔ خواہ وہ میک اپ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسرے یہاں فرانسیسی زبان بولنے پر منہ کافی ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے اور اپنی بات پر زور دینے کے لیے، پھر بھی آواز بڑی شیریں لگتی ہے۔ خاص طور سے جب کوئی حسین خاتون بولے۔ مسٹر کو ''موسیو'' کر دیا۔ پیرس کی سب سے آسان اور سستی سواری میٹرو یا انڈر گراؤنڈ ریلوے سسٹم ہے۔ ریلوے اسٹیشن نہایت صاف ستھرے۔ مجھے لندن کی انڈر گراؤنڈ ریلوے سے اچھی لگی۔ ریلوے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن بھی صاف ستھرے ہیں یعنی صفائی بہت ہے۔ یہاں پر انڈر گراؤنڈ ریلوے اور سڑکوں کا نقشہ ہر جگہ مل جائے گا پھر یہ بھی بات غور طلب ہے کہ ہر ریلوے بوگی میں ان تمام علاقوں کے اسٹیشن کا نام موجود ہے اور ترتیب سے پتا چلایا جا سکتا ہے کہ یہ ٹرین کہاں کہاں رکے گی اور اب اس وقت کہاں پر ہے؟

ہوٹل میں پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ دوسرے دن کے لیے ٹورسٹ بس میں اپنا نام لکھوا دیا اور ٹکٹ لے لیا۔ یہ بس پیرس کی سیر کرواتی ہے۔ ظاہر ہے مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ کیا کیا یہاں دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ ایفل ٹاور کا سنا تھا اور بس۔ شام کو شانزے لیزے کی سیر کرتے ہوئے کافی دور تک نکل گئے۔ یہاں پر نائٹ کلب کریزی ہورس اور لیڈو کے بورڈ دیکھے تو اشتیاق ہوا کہ کیوں نہ نائٹ کلب کی سیر کی جائے۔ میں لیڈو کی طرف جا کر مختلف ڈانس پروگرام کی تصاویر دیکھ رہا تھا پھر نہ جانے کیا ہوا کہ خیال آیا آج لیڈو میں ڈانس دیکھا جائے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ میرے حساب سے ٹکٹ بہت مہنگا ہے۔ دل پر جبر کر کے ایڈوانس ٹکٹ لے ہی لیا اور شانزے لیزے کی سیر کرتے ہوئے ایک سینڈوچ لے کر کھایا اور ساڑھے نو بجے کے قریب لیڈو کے ہال میں داخل ہوئے۔ ہلکا ہلکا میوزک چل رہا تھا اور ہال کافی خالی تھا۔ کچھ لوگ ہال سے منسلک پب میں شراب کے مزے لے رہے تھے۔ میں بھی وہاں چلا گیا اور ایک بوتل ایپل جوس کی لے لی جو نان الکوحلک تھی۔ پہلے تو خاتون نے جو شراب وغیرہ سرو کر رہی تھیں مجھے بڑی تیکھی نظروں سے دیکھا۔ میں نے بات بنانے کے لیے کہا کہ الکوحل الرجک، اپنی طرف انگلی کر کے کہا۔ وہ خاتون ذرا ریلیکس ہوئیں اور نہ جانے فرانسیسی زبان میں کیا بولنے لگیں جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ مجھے ایسا لگا کہ پوچھ رہی ہیں کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے فوراً جھوٹ بول دیا کہ انڈیا سے۔ سوچا خوامخواہ پاکستان کا نام کیوں بدنام ہو۔

یہاں زیادہ تر آدمیوں کے ساتھ خاتون بھی تھی اور جو بغیر خاتون کے آیا تھا وہاں پر کمپنی کے لیے بہت سی لڑکیاں موجود تھیں۔ شراب کے دور چل رہے تھے۔ ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ میرے پاس بھی دو دفعہ دو خوبصورت لڑکیاں مجھے اکیلا بیٹھا دیکھ کر آئیں مگر میں نے نہایت چالاکی سے انہیں منع کر دیا کہ میں کسی خاتون کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں بہت آہستہ آہستہ ایپل جوس پی رہا تھا جس کی شکل شیمپین شراب سے کافی ملتی ہے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ہال کی لائٹیں کچھ کم ہونا شروع ہوئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اب شو شروع ہونے والا ہے۔ بہت سے لوگ جو شراب کے کاؤنٹر یا اس کے قریب پڑی ہوئی میز کرسی پر بیٹھے تھے ہال میں خالی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ مجھے زندگی میں پہلی دفعہ اس قسم کے ماحول میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد مجھے تو ایسا لگا کہ تفریح کے نام پر بڑی فراغ دلی سے عریانیت کا پرچار مختلف انداز سے کیا جا رہا ہے۔ یہاں کے لوگ اس تفریح کو معیوب نہیں سمجھتے اور اس عریانیت کو بھی دل کی تسلی یا

ذہنی تشنگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اپنے اپنے کلچر اور سوچ کا انداز ہے۔ مجھے شو دیکھنے میں مزہ تو بہت آیا مگر پھر سوچتا ہوں کیا مجھے یہ شو دیکھنا چاہیے تھا یا نہیں۔ کبھی دل کہتا تھا کہ کوئی بات نہیں اور کبھی دل ملول ہو رہا تھا۔ اسی شش و پنج میں ہوٹل واپس آ گیا۔ یہاں پر کرائے کی لڑکیاں جو آپ کے ساتھ ہر طرح سے وقت گزارنے کو تیار ہیں موجود ہیں مگر ہر کام کا الگ الگ معاوضہ ہے۔ قارئین خود سمجھ دار ہیں کہ ان لڑکیوں کا کیا پیشہ ہے۔ کلب میں جانے سے قبل شانزے لیزے کے قریب کافی دور تک پیدل چل کر بازار دیکھا۔ مجھے بہت سی چیزیں اچھی لگیں مگر اس وقت جیب اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس جگہ سے قبل میں ایفل ٹاور کے قریب سے گزرا مگر اس کے اوپر نہ جا سکا کیونکہ اس کے ٹکٹ کے پیسے میں خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیڈو کے شو سے فارغ ہو کر میں ہوٹل میں واپس آ کر سو گیا کیونکہ مجھے صبح ٹورسٹ بس میں پیرس کی سیر کرنا تھی۔ دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ ٹورسٹ بس جانے میں صرف بیس پچیس منٹ رہتے تھے لہٰذا جلدی سے باتھ روم سے فارغ ہو کر کپڑے پہنے اور بغیر ناشتا کیے ہوٹل کے گیٹ سے جیسے ہی باہر آیا تو بس میں مسافر بیٹھ چکے تھے اور بس چلنے ہی والی تھی۔ میں نے جلدی سے خاتون کنڈیکٹر کو اپنی ریزرویشن ٹکٹ دکھائی اور انہوں نے مجھے بس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

تھوڑی دیر میں بس چل دی اور خاتون کنڈیکٹر کی زبان بس کی رفتار سے تیز چلنا شروع ہو گئی اور وہ جہاں جہاں سے بس گزر رہی تھی اس جگہ کے متعلق فرانسیسی اور انگلش زبان میں بتا رہی تھیں۔ بس ایفل ٹاور کے قریب جا کر رک گئی۔ کچھ لوگ اتر کر ٹاور کے قریب چلے گئے۔ میں نے قریب کی شاپ سے ایک بوتل کوک اور ایک بن لے کر کھانا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ ایفل ٹاور کے اوپر جا رہے تھے۔ میرے پاس اب اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں اوپر جانے کا ٹکٹ لے سکوں لہٰذا بس کے قریب بیٹھ کر کوک اور سینڈوچ کے مزے لیتا رہا۔ دوپہر کے بعد پیرس کے مختلف علاقوں کو دیکھتے ہوئے واپس ہوٹل آ گئے۔

ہمیں اس قسم کی سیر کرنے کا بالکل تجربہ نہیں تھا اس لیے ہم بہت سی جگہوں پر بس میں سیر کرتے رہے۔ بس کنڈیکٹر جو ایک خوبصورت خاتون تھیں ہر جگہ کی خصوصیت اور تعریف بتاتی رہیں لیکن ہمیں کچھ یاد نہیں رہا کہ کس جگہ کو کیا کہتے ہیں اور ہم نے یہاں کون کون سی مشہور جگہیں دیکھی ہیں۔ اس ٹرپ میں کسی بڑی دکان یا اسٹور پر بھی جانے کا موقع نہیں ملا صرف ایک سرسری سی سیر کی اور بس۔ نہ کسی مشہور جگہ کو دیکھا سوائے ایفل ٹاور اور دریائے سین کے کنارے کا نظارہ وہ بھی بس میں بیٹھے بیٹھے۔ یہاں دریائے سین پر کروز میں رات کو ڈنر اور میوزک شو ہوتا ہے جو کافی مشہور ہے۔ ہمیں اس جگہ جانے کی بھی ہمت نہیں ہوئی کیونکہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ بہت مشہور میوزیم بھی ہیں جو ہم نہ دیکھ سکے۔ چیمس ایلیس ایک مشہور جگہ ہے وہ بھی پیرس کی پہچان ہے۔ وہاں سے شانزے لیزے کی سڑک پر پیدل چل کر وہاں کا نظارہ کیا۔ قارئین کرام یہ وہ زمانہ تھا جب میں گورنمنٹ کا ایک افسر تھا جس کو صرف اتنی تنخواہ ملتی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے گزارا کر سکے تاوقت وہ دوسرے ذرائع استعمال کرتے ہوئے رقم بنائے۔ میرے والد صاحب نے مجھ سے قسم لی تھی کہ اوپر کی رقم یا رشوت نہیں لینا ہے اس لیے ہر وقت تنگدستی کی سی کیفیت رہی اور جب گورنمنٹ کی طرف سے مجھے باہر جا کر سیر کرنے کا موقع ملا تو اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہاں پر فراخ دلی سے خرچ کر سکوں اور مزے کر سکوں۔

ٹورسٹ بس نے شام کو ہوٹل کے پاس اتار دیا اور پھر کچھ کھا کر سو گیا کیونکہ دوسرے دن دوپہر کو ہماری واپسی کی فلائٹ تھی اس لیے دوسرے دن صبح صبح اٹھ کر سامان پیک کیا اور ٹیکسی منگوا کر ایئرپورٹ کی طرف چل دیے۔

پیرس میں دو ایئرپورٹ ہیں۔ ایک چارلز ڈیگال اور دوسرا اورلی۔ پی آئی اے کی پرواز اورلی ایئرپورٹ پر اترتی ہے لہٰذا ہم اورلی ایئرپورٹ پہنچے جو ہمارے ہوٹل سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا اور دوپہر کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے اور دوسرے دن کراچی میں اتر گئے۔ یہ میرا سفر پہلا سفر تھا جو یورپ کے کسی ملک کا کیا اور اس وقت کافی تنگدستی تھی اس لیے اتنا مزا نہیں آیا جو ایک طرح سے سیر کرنے میں آتا ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ کچھ دن بعد شاید پیرس سے واپس آنے کے سات ماہ بعد ہی دوبارہ مجھے یورپ میں اٹلی جانے کا اتفاق ہوا جس کی تفصیل اگلے سفرنامے میں لکھوں گا اور اٹلی سے واپسی پر پھر فرانس میں قیام رہا اور اس دفعہ ایفل ٹاور پر اوپر جا کر کافی پینے کا بھی اتفاق ہوا اور وہاں سے پورے پیرس کا نظارہ بھی کیا پھر شہر کے مختلف علاقوں کی سیر بھی کی۔

++

TAGPK.COM

آدم خور

انجم فاروق ساحلی

شیر کا شکار لہو گرم کرنے کا ایک بہانہ ہے لیکن جب شیر آدم خور بن جائے تو پھر تجسس و خطرات میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے



میں یعنی سید مقصود علی اس وقت ریاست میسور میں قیام پزیر تھا۔ وہاں سب سے بڑا جنگل پامارودی ہے۔ یہی جنگل اس وقت میری دوربین میں خوشنما مناظر کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ میں ایک بلند ٹیلے پر کھڑا تھا۔ علی الصباح قدرتی مناظر دیکھنا میرا مشغلہ تھا۔

اس جنگل کی سرحد پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جو دور تک بکھری ہوئی ہیں۔ سب سے اونچی پہاڑی کا نام ہوگہر خان ہے۔ یہ تقریباً ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند ہے۔ یہاں ایک جھیل بھی ہے جسے قارس کہتے ہیں۔ یہ گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان وسیع قطعہ اراضی پر بہہ رہی ہے۔ اس جھیل سے ایک ندی نکلتی ہے جو جنگلات سے نکلنے والی تنگ سڑک کے ساتھ بہتی ہے اور قصبہ برور



سے تین میل دور ایک اور جھیل میں گرتی ہے، جسے کامری کہتے ہیں۔اس جھیل کے کنارے درختوں کے گھنے جھنڈ ہیں اور پرندوں کی سریلی آوازوں سے فضا مرتعش رہتی ہے۔ جھیل میں چھوٹی بڑی مچھلیوں کے علاوہ مگر مچھ بھی پائے جاتے ہیں۔ سیاحت کرنے والے لوگ جھیل کے کنارے آنے والے مگرمچھوں کی تصاویر اتارتے ہیں اور چھیڑ خانیاں بھی کرتے ہیں۔ میں ریاست گوالیار سے آگے بنگلور کے ایک بنگلے میں اپنے دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا پھر وہاں سے اپنے سالے رفیق کے ہاں چلا آیا جو ریاست میسور میں رہائش پزیر تھا اور پریشان اور اداس تھا۔

اس علاقے کے لوگ مویشیوں کے ریوڑ پالتے ہیں جو اس علاقے کے نواحی جنگلوں سے خوراک حاصل کرتے ہیں۔اس علاقے میں شیر بھی پائے جاتے ہیں جو ہرنوں، بارہ سنگھوں، نیل گائے، جنگلی بکروں اور جنگلی سوروں کے شکار پر زندہ رہتے ہیں اور جب بھی یہ جانور میسر نہ ہوں تو شیر جنگل کے نواحی علاقے میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں مویشی کثرت سے مل جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے اس علاقے کے نزدیکی جنگل میں گھومنے والا ایک شیر آدم خور بن چکا تھا۔ میں شام کے وقت اپنے سالے رفیق کے جھونپڑے میں تھا۔ ابھی چائے کا کپ اٹھایا ہی تھا کہ شیر کی دہاڑ سن کر پیالی ہاتھ میں ساکت ہوگئی۔ میرا سالہ رفیق اپنی کرسی پر ہی کھڑا رہ گیا۔ اس کی خوف زدہ نظریں سامنے کھلی کھڑکی سے باہر بستی کے میدان کی طرف اٹھ گئیں۔ دہشت زدہ لوگ کام کاج چھوڑ کر اپنے اپنے جھونپڑوں میں بند ہونے لگے۔ قصبہ برور میں یہ جنگل سے سب سے نزدیکی بستی تھی جہاں کے لوگ کانوں اور گلے کے زیور، مٹی کے کھلونے و برتن بنا کر ریاست کے دوسرے شہروں میں بھیجا کرتے تھے۔

میں نے اپنی کرسی گھسیٹ کر رفیق سے قریب کرلی اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ رفیق نے کانپتی ہوئی انگلی سے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور رنگ زرد پڑ گیا تھا جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

''اس طرف جنگل میں ایک بڑا جسیم آدم خور شیر آیا ہوا ہے۔ ہماری بستی کے جانوروں کے علاوہ انسانوں کو بھی اٹھا کر لے جانے لگا ہے۔ اسے چرواہوں نے گھنے جنگل سے نکل کر میدان میں واقع پرانے مندر کے آس پاس گھومتے دیکھا ہے۔ مندر کے عقب میں زرد گھاس کے میدان سے آگے پہاڑی سلسلے میں گھوڑے کے منہ سے مشابہ پہاڑی غار میں کہیں جا کر چھپ جاتا ہے۔ غار کے باہر ایک بڑا برساتی تالاب ہے، اس کے کنارے، خودرو جھاڑیاں، کہیں کہیں نشیب میں درخت اور سبزے سے پُر چھوٹے چھوٹے ٹیلے بکھرے ہوئے ہیں۔ شیر وہاں بھی گھات لگا کر چھپ جاتا ہے۔ ایک چرواہا وہاں اپنے جانور ڈھونڈنے جا نکلا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ وہاں جانوروں کے نچے ہوئے جسم اور دو انسانی ڈھانچے بھی تالاب کے کنارے پڑے ہوئے ایک دہشت ناک منظر پیش کررہے تھے۔ اس طرف جانے والے دو شکاری زندہ نہیں لوٹے۔ ان کے ڈھانچے پرانے مندر کے اندر صحن میں اگی خودرو جھاڑیوں سے پولیس نے آکر برآمد کیے ہیں۔'' رفیق نے بے بسی سے ہونٹ چباتے اور انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

''رفیق! تگڑے ہوجاؤ۔'' میں نے اپنے سالے کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''اب میں آگیا ہوں۔ میں یعنی سید مقصود علی جو خونی درندوں کا جانی دشمن ہے، بس سمجھ لو کہ اس آدم خور شیر کی بھی موت آگئی ہے۔''

''یہ خونی شیر میری دو گائیں اور میرے پرانے نوکر راجو کو بھی ہڑپ کرچکا ہے اسی لیے میں نے آپ کو ریاست گوالیار سے یہاں بلوایا ہے۔'' رفیق نے جنگل کی طرف آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

اس وقت شیر کے مسلسل دہاڑنے سے جنگل اور ماحول لرز اٹھا۔ خوف زدہ پرندوں کا شور اور چھوٹے جانوروں کی سہمی ہوئی آوازیں اور بھاگتے قدموں کی آہٹیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں اپنی ایکسپریس رائفل صاف کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

رفیق کے نئے ملازم نے کھانا میز پر چن دیا تھا مگر اب کسے کھانے کا ہوش تھا۔ میں رفیق کے لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر بنائے گئے مکان سے باہر نکل آیا۔ خوف زدہ لوگ دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑے روشنیاں بجھائے، ڈرے اور سہمے ہوئے مجھے دیکھنے لگے۔ میں بندوق ہاتھ میں لیے دلیری سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

بستی کا چوپال ویران پڑا تھا۔ چوکیدار بھی کہیں چھپا ہوا تھا۔ ایک آوارہ کتا شیر کی دہاڑ سن کر ایک جھاڑی میں چھپا بیٹھا تھا۔ درختوں پر بیٹھے پرندے اس وقت خاموش اور

جھاڑیوں میں اچھل کود کرتے خرگوش بھی کہیں دبک گئے تھے۔بستی چھوٹی سی تھی۔

باہر نکلتے ہی جنگل کا علاقہ شروع ہوگیا جو شمالاً جنوباً پھیلتا چلا گیا تھا۔ کہیں کہیں قصبے کے لوگوں کے کھیت بھی دکھائی دیئے۔ جہاں وہ سبزیاں کاشت کرتے تھے۔ یہ ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ میں پشت پر بندھے شکاری بیگ کے ساتھ رائفل جھماتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں ہر چیز کو گھور رہا تھا کہ کہیں اس کے پیچھے خونی شیر چھپا ہوا نہ ہو۔

تقریباً دو گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد میرے سامنے جنگل کا ایک جھلسا ہوا حصہ آگیا۔ یہاں آتش زدگی سے درخت پودے اور زمین بھی جلی ہوئی تھی۔ کسی وقت کسی کی غلطی یا حماقت سے آگ بھڑک اٹھی ہوگی۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ ایک ایسی خبر اخبار میں، میں نے پڑھی تھی۔ میں نے اسی جگہ پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ کیا۔

میں نے میدان کا جائزہ لیا اور نئی اگنے والی کچھ خاردار جھاڑیوں کو چاقو سے کاٹ کاٹ کر ایک دروازہ چھوڑ کر گول قطعہ سا بنالیا۔ ٹھنڈی اور برفیلی نم آلود ہوا چلنے لگی تھی اور آسمان پر سیاہ بادل بھی یکجا ہو رہے تھے۔ میں نے کچھ لکڑیوں کے ٹکڑے اور جھاڑیاں جمع کر کے اپنے حصار کے باہر آگ جلا دی اور چائے پینے کے بعد سگریٹ نوشی کرنے لگا۔

اچانک مجھے آہٹ محسوس ہوئی۔ آدم خور جسیم شیر دبے پاؤں آ پہنچا تھا اور مجھ پر چھلانگ لگانے ہی والا تھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ شیر نے غضب سے گھوراء منہ سے غراہٹ نکالی اور پھر چھلانگ لگادی۔ میں نے کمال حاضر دماغی سے الاؤ میں لہکتی ایک لمبی لکڑی کے انگارہ حصے کو دوسرے سرے سے پکڑ کر شیر کے منہ پر پھینک ماری۔ شیر کا منہ جھلس گیا اور وہ خاردار جھاڑیوں پر گر کر اچھلا اور واپس بھاگ نکلا۔ میں اپنی تدبیر سے بچ گیا۔ رائفل سیدھی کرنے کا وقت نہیں تھا۔ باقی رات میں نے جاگتے ہوئے گزاری۔ علی الصباح جنگلی پھلوں سے پیٹ بھرنے اور دعائیں پڑھنے کے بعد میں نے شیر کے قدموں کے نشانات کی جستجو کی۔ زمین پر کہیں کہیں مدھم سے نشانات تھے۔ میں رائفل ہاتھ میں لیے چوکنے انداز سے آگے بڑھتے ہوئے متلاشی نگاہوں سے شیر کو تلاش کرنے لگا۔ مگر شیر کہیں نظر نہ آیا... پھر نشانات بھی ختم ہوگئے۔ وہاں سے شاید ہاتھی گزرا تھا۔ اس نے مزید نشانات مٹا دیئے تھے کیونکہ ہاتھی کے پیروں کے بڑے بڑے نشانات نم آلود زمین پر جمے دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً جنگل کے مغربی حصے سے خوف زدہ چیتل کی آواز گونجی۔ جس کے ساتھ سور بھی اپنی بھاری آواز میں شور مچانے لگے۔ ایک تو باقاعدہ ندی کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ یہ ندی میرے دائیں جانب ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یہ بھاگ دوڑ مجھے خبردار کرنے کے لیے کافی تھی۔ یقیناً انہوں نے شیر کی بُو پالی تھی۔ چند ثانیے بعد اور بھی سور بھاگتے ہوئے نظر آئے، وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے۔ ان کی بھاگ دوڑ اس حقیقت کی غماز تھی کہ شیر قریب ہی کہیں گھوم پھر رہا ہے۔ یکایک شیر کی دہاڑ ایک بار پھر گونجی اور ہرنوں کا ایک غول قلانچیں بھرتا ہوا میرے سامنے سے گزر گیا۔

میں نے اپنے عقب میں جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس کی جہاں میں رک کر متلاشی نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک جھاڑیوں میں کچھ دور شیر کا سر دکھائی دیا۔ میں رائفل سے فائر کرنا چاہتا تھا کہ وہ خطرہ محسوس کر کے غائب ہوگیا۔ میں جھاڑیوں کے بیچ بنے راستے میں داخل ہو کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ میرے آگے بڑھنے پر کیلے کے ایک جھنڈ کے پاس شیر کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے فائر کیا۔ گولی اس کی کمر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کی دہاڑ سے جنگل گونج اٹھا۔ اس کے بعد خونخوار شیر کہیں نظر نہ آیا۔ چلتے چلتے بھوک لگنے پر میں تالاب کے کنارے رکا، منہ ہاتھ دھویا اور درختوں سے تازہ پھل اتارنے لگا۔ دو پھل کھانے اور بیگ میں موجود بن کو حلق سے اتارنے کے بعد میں اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرنے لگا۔

میرا رخ خونی شیر کے مسکن گھوڑے کے منہ سے مشابہ پہاڑی کی طرف تھا۔ جس کے غار میں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔ آگے بڑھتے بڑھتے اچانک ایک پھنکار پر میرے قدم رک گئے۔ میرے سامنے زمین پر پھیلی گھاس سے نکل کر ایک چھوٹا سا سانپ اچھل کر میرے پیروں میں آچکا تھا۔ وہ مجھے ڈسنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے اپنا دائیاں جوتا اٹھایا اور پاؤں زور سے اس پر دے مارا۔ وہ میرے وار سے بچ نہ سکا اور جوتے کے نیچے پس کر رہ گیا۔ جب میں نے جوتا اٹھایا تو زمین پر اس کا سبز سبز زہر پھیلا ہوا تھا۔

میں نے اپنے جوتے کا تلوا مٹی میں رگڑا اور پھر آگے سفر طے کرنے لگا۔ راستہ اس وقت سطح اور ہموار ہی تھا۔ اچانک سامنے کی طرف سے فضا جنگلی مکھیوں سے بھری ہوئی دکھائی دینے لگی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ زہریلی ہوتی

TAGPK.COM

ہیں۔آدمی کا جسم سوج جاتا ہے۔وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو کر رہ جاتا ہے۔ مجھے تو کچھ نہ سوجھا میں جلدی سے کچے راستے پر الٹا لیٹ کر بالکل ساکت ہو گیا۔ بے حس و حرکت، مکھیاں میرے اوپر سے گزرنے لگیں۔ کچھ نے بھنبھنا کر میرے گرد چکر بھی کاٹے، پھر اڑتی ہوئی دور نکل گئیں۔ میری ترکیب کامیابی سے ہم کنار ہو چکی تھی۔ ابھی میں چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ ایک بڑی سی سبزی مائل مکڑی ایک درخت سے پھدک کر میرے سینے پر آ گری میں نے فوراً ہی اسے جھٹک کر پاؤں جما دیا یہ مکڑی بے حد خطرناک ہوتی ہے۔ میں پوری قوت سے پاؤں پر دباؤ ڈال کر کھڑا رہا۔ جب دو منٹ بعد پاؤں اٹھایا تو مکڑی دم توڑ چکی تھی۔ یہ مکڑی اپنے چھوٹے چھوٹے پنجے انسانی جسم میں پیوست کر کے ڈس لے تو انسانی جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں۔ زہر رفتہ رفتہ اعضائے رئیسہ کو ناکارہ کر دیتا ہے۔ جس سے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے خونی شیر کے مسکن کی طرف بڑھنے لگا۔ اب میرے سامنے راستے پر خودرو جھاڑیاں اور زرد زرد لمبی گھاس بکھری ہوئی تھی۔ جس میں کہیں کہیں چوہے پھدک رہے تھے۔ کچھ نہ کچھ کتر رہے تھے، کسی جگہ اچھلنے کودنے سے ان کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ آس پاس پھیلی جھاڑیوں میں کھلے جنگلی پھول بڑا خوش نما منظر پیش کر رہے تھے۔ چاندنی کی صورت میں سونا سا آسمان سے برس رہا تھا۔ مجھے ماضی کا ایک حسین لمحہ یاد آ گیا۔ گوالیار کے جنگل میں ایسے ہی ایک تالاب پر میں ایک حسین و جمیل لڑکی سے ملا تھا۔ جس کے سنیاسی باپ کو شیر کھا گیا تھا۔ میں نے سر دھڑ کی بازی لگا کے اس شیر کو ہلاک کیا تھا پھر اس لڑکی نے اپنی سالگرہ کی شام میرے نام کرتے ہوئے میرے سامنے یک خوبصورت جنگلی رقص پیش کیا تھا۔ میں نے ایک میز پر اس کے لیے پھل پھول سجا رکھے تھے۔ میں چشم تصور میں اس لڑکی کے ساتھ اپنے آپ کو تالاب کے کنارے ٹہلتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

میں بچپن سے ہی جنگل کی زندگی سے عشق کرتا آیا تھا۔ مگر اب محسوس کرنے لگا ہوں کہ صنف نازک کے جذبات کو دبایا نہیں جا سکتا۔ چاندنی رات کو گوالیار کے بنگلے یا جنگل کے کسی بھی حصے میں میرے جذبات ابھر ہی آتے تھے۔

رنگین منظر سے پیچھا چھڑا کر میں پھر شیر کو اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔

تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر اچانک سامنے ایک اونچا پہاڑی ٹیلا آ گیا جس کا رنگ رات کی ہولے تاریکی کے ساتھ مدغم تھا۔ قریب آنے پر ہی اس کے وجود و حجم کا احساس ہوا۔ میں ٹیلے کے دائیں جانب سے ہو کر خاردار جھاڑیوں سے بچتا ہوا گھوڑے کے منہ سے مشابہ پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا سفر مشرق کی جانب طے ہو رہا تھا۔ جیسے ہی میں جھاڑیوں سے نکل کر میدانی گھاس پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ایک درخت کے نیچے جہاں خشک جھاڑیاں سی پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک مردہ بھینسا اپنے نصف وجود کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔

شیر نصف کے قریب اسے کھا چکا تھا۔ اس قدر کھانے کے بعد بے حد یقین ہو گیا کہ وہ کہیں زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شیر کو تلاش کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو فوری طور پر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

شیر کی خوراک دیکھ کر میری اپنی بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ میں گھر سے کھانا کھائے بغیر ہی بندوق لے کر نکل آیا تھا۔ صرف دو بن کھائے تھے۔ اب کھانا کھانا ضروری تھا۔ میں نے شکاری بیگ سے بن اور ڈبل روٹی کے مکھن لگے پیس نکالے اور گوشت کے نرم ٹکڑوں کے ساتھ ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھانے لگا۔ تھرماس میں چائے کا بمشکل آدھا کپ ہی تھا۔ میں نے اسے پی کر خدا کا شکریہ ادا کیا اور شیر کو مارنے کا عزم اور دعا مانگ کر آگے بڑھنے لگا۔ سارا قصبہ اور نزدیکی بستی کے لوگ شیر کی کارروائیوں سے بے حد پریشان تھے۔ ان کا کاروبار اور انسانی زندگیاں دونوں خطرے میں تھیں۔ وہ فصلوں کے آس پاس بھی منڈلانے لگا تھا جس سے کام کرنے والے مزدور ادھر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کھیت اور باغ ویران ہو کر رہ گئے تھے۔ شیر دو مزدوروں کو بھی ہلاک کر چکا تھا۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے ایک جگہ رک کر نم اور خشک جگہوں پر شیر کے قدموں کے نشانات دوبارہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ شیر کے قدموں کے نشانات مختلف جانوروں کے نشانات میں ملے ہوئے تھے۔ لہٰذا میرے جیسے ماہر شکاری کو بھی ذہن پر زور دینا پڑا۔ میں آگے بڑھتے بڑھتے شیر کے قدموں کا سراغ نکالتا ہوا کھلے راستے سے ہٹ کر گول دائرے کی شکل میں پھیلی گنجان جھاڑیوں کی طرف آ نکلا جو ہری ہری گھاس کے ایک قطعے کو گھیرے ہوئے محافظ بنی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

TAGPK.COM

میں نے قطعہ میں داخل ہو کر دیکھا تو گھاس کی پتیاں خود بخود کھڑی ہو گئیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ شیر ابھی ابھی اٹھ کر یہاں سے گیا ہے۔ میں نے جھاڑیوں میں بائیں جانب کچھ دور مکھیاں بھنبھناتی ہوئی دیکھیں۔ آگے بڑھ کے جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہاں عقاب مرا پڑا ہے۔ حشرات اس کے جسم کا بیشتر حصہ ہڑپ کر چکے تھے۔ مکھیاں بھنبھناتی ہوئی جھپٹ رہی تھیں۔

اب سمجھ میں آیا کہ شیر شاید اس لیے نرم نرم گھاس کے بستر سے جلدی اٹھ کر چلا گیا ہے کہ مکھیاں عام طور پر شیروں کو بہت تنگ کرتی ہیں۔ خاص کر جب وہ سو جائیں۔ فی الحال میری کوشش بارآور ثابت نہیں ہوئی تھی۔ مگر میں کامیابی کی دعا مانگ کر آگے بڑھنے لگا۔ مسلسل سفر کرتے ہوئے میں خونی شیر کے مسکن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سامنے تالاب کے کنارے جنگلی پھول کثرت سے اگے ہوئے تھے اور ان کی خوشبو ہوا میں شامل ہو کر سانس کو للکار رہی تھی۔ میں نے دو تین گہرے سانس لیے اور اپنے آپ کو فریش محسوس کرنے لگا۔ یہاں جھاڑیوں کے بیچ چھوٹے چھوٹے درخت خال خال دکھائی دیئے۔ جھیل کے مشرق، شمال اور جنوب کی جانب پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ گھوڑے کے منہ والی پہاڑی کے سامنے ڈھلوانی راستہ سڑک نما تھا جو نیچے تالاب تک چلا آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شیر کی آمد و رفت غار تک اسی راستے ہوتی ہوگی۔

اس خوش نما ماحول کے برعکس جہاں فضا میں جنگلی پھولوں کی باس پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ منظر خوفناک بھی تھے۔ چار انسانی وجود ڈھانچے بنے تالاب کے کنارے گھاس میں لیٹے ہوئے تھے۔ یہ کھائے ہوئے پہاڑی کے راستے میں پڑے ہوئے تھے۔ قدموں میں تیزی آ گئی۔ میں نے ماحول کا طائرانہ جائزہ لیا اور پھر بچے ہوئے بیل کی دم پر پاؤں رکھتا ہوا ڈھلوانی راستے پر پہاڑی غار کی طرف سفر کرنے لگا۔ میرے فولادی اعصاب میرا خوب ساتھ دے رہے تھے۔

گھوڑے کے منہ سے مشابہ غار کے دہانے پر آ کر میں رک کر اپنا سانس درست کرنے لگا۔ میرے کندھے پر لگی بندوق آگ اگلنے کے لیے تیار تھی۔ میں نے دلیری سے چند قدم آگے اٹھائے اور غار کے منہ میں داخل ہو کر اپنی طاقتور ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔ غار تقریباً ایک فرلانگ تک سیدھا ہی چلا گیا تھا۔ مگر آگے جا کر تین حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ غار میں تعفن اور گھٹن بھی تھی۔ لہٰذا میں باہر نکل آیا اور باہر ہی شیر سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں مڑ مڑ کر غار کی طرف دیکھتے ہوئے ڈھلوانی راستے سے نیچے اتر آیا۔ میں اب اپنی ترکیب نمبر 5 پر عمل کرنا چاہتا تھا لیکن میرے خیال میں اس کے لیے وقت موزوں نہ تھا، کیونکہ شیر اس وقت غار میں بھی اور ارد گرد بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں تالاب کے کنارے چلا آیا اور ایک چوڑے تنے والے درخت سے ٹیک لگا کر خونی شیر کی قیام گاہ کو گھورنے لگا۔ رائفل میرے پاس تیار پڑی تھی۔ میگزین فل تھا۔ شکاری چاقو کو بھی میں دو تین بار چھو چکا تھا۔ میں شیر کی جھلک دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر متلاشی نظریں دوڑاتا رہا۔ وقت گزرتا گیا، منظر اور سہانا ہو گیا۔ پرندے درختوں پر چہچہانے لگے۔ توتے اڑتے دکھائی دیئے۔

تبھی مجھے غار سے باہر آتا شیر دکھائی دیا۔ خوب پلا ہوا اور طاقتور تھا۔ قدم اٹھانے میں ایک دبدبہ سا تھا۔ وہ بڑی شان سے اکڑتا ہوا ڈھلوانی راستے سے نیچے آنے لگا۔ وہ اب دہاڑنے لگا تھا۔ ایک بار تو اس نے پنجہ اٹھا کر بھی لہرایا تھا۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ سسپنس اور بے تابی کا تھا۔ بس اسی لمحے وہ پوری طرح میرے نشانے پر تھا۔ میری ایکسپریس رائفل سے پے در پے شعلے نکلے اور شیر دہاڑتا ہوا خون اگلتا تڑپنے لگا۔ ایک گولی اس کے سر میں لگی۔ دوسری اس کے پیٹ میں اور تیسری اس کی چھاتی میں گھس گئی تھی۔ شیر نے اچانک ہی اپنی ہمت مجتمع کی اور میری طرف چھلانگ لگا دی۔ وہ غیر متوقع طور پر اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کا دشمن کس جگہ چھپا ہوا ہے۔ لیکن وہ نڈھال اور زخمی تھا۔ درخت کے نیچے گر پڑا۔ میں نے رائفل جھکا کر دو گولیاں اور اس کے دماغ میں اتار دیں۔ اب شیر بھیانک سی کراہ کے ساتھ الٹ گیا۔

میں کچھ دیر تک دبکا رہا۔ جب اس کی موت کا پورا یقین ہو گیا تو میں نیچے اترا اور اپنے شکاری چاقو سے اس کی دم کاٹ کر شکاری بیگ میں رکھ لی۔ میں بستی میں واپس پہنچا تو کئی روز تک خوشی سے جشن منایا جاتا رہا اور شیر کی دم کی نمائش بھی کی جاتی رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شیر کسی وقت جانور کا شکار نہ ملنے پر بھوک کی بے تابی سے آدم خور بن گیا تھا۔ بھوک بڑی ہی خوفناک چیز ہے وہ انسان اور درندے کو کچھ بھی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

++

ہمارے یہاں اکثر نام نہاد دانشور بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ اب مسلمانوں میں سائنس کے علم کو جاننے کی جستجو نہیں رہی لیکن یہ بات سراسر غلط ہے ہر کچھ دن بعد ایک نا ایک شخصیت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے ایسا تاثر ختم ہو جاتا ہے۔ محمد عطا اللہ بھی ایسی ہی شخصیات میں سے ہیں۔ جن کی ایجادات آج کی جدید برقیات کا لازمی حصہ ہیں۔ خواہ وہ آپ کے لیپ ٹاپ کمپیوٹر ہوں، موبائل فون ہوں یا پھر ان آلات کو مستقل بجلی فراہم کرنے والے یو، پی، ایس ہوں، یا آپ کے گھر میں کسی توانائی سے چلنے والے پنکھے ہوں، محمد عطا اللہ کا ایجاد کردہ پرزہ آج

TAGPK.COM

ماہر برقیات

واجش علی انجم

دورِ حاضر کے سائنس دانوں میں ایک اہم نام عطا اللہ کنڈکٹر اسی کی ایجاد ہے کہ آج موبائل اور دیگر برقیاتی آلات کام کر رہے ہیں۔ ہر گھر میں الیکٹرونکس سامان ہے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کی ایجاد میں ایک مسلم سائنس دان کا کردار اہم ہے اگر وہ کنڈکٹر ایجاد نہ کرتا تو نہ موبائل فون ایجاد ہوتا نہ اے ٹی ایم کارڈ۔

دورِ ماضی کے ایک بڑے مسلمان سائنس دان کا تذکرہ



TAGPK.COM

ان سب میں نہ صرف استعمال ہو رہا ہے بلکہ شاید اس کے بغیر یہ آلات بن بھی نہیں سکتے اور اگر بن بھی جائیں تو زیادہ پیچیدہ اور بڑا سرکٹ استعمال کرنا پڑے گا۔ اور یہ ایجاد ''موسفیٹ ٹرانسسٹر'' (MOSFET) کہلاتی ہے۔ موسفیٹ سے مراد ''ل آکسائیڈ۔سیمی کنڈکٹر فیلڈ ایفکٹ ٹرانسسٹر'' ہے۔ اسے بعض اوقات ''موس ٹرانسسٹر'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس ایجاد نے برقی آلات میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اگر ''موسفیٹ ٹرانسسٹر'' ایجاد نہ ہوتا تو آج کا کمپیوٹر، موبائل اور دیگر آلات بھی نہ ہوتے کیونکہ ان آلات کے مائیکرو پروسیسر میں جس ٹرانسسٹر کے استعمال کیے جانے کا چرچا ہم نصابی اور غیر نصابی کتب، رسائل اور اخبارات میں پڑھتے ہیں، وہ اصل میں تکنیکی طور پر موسفیٹ ٹرانسسٹر ہی ہوتے ہیں۔ عطاءاللہ نے نیموسفیٹ 1959ء میں ایجاد کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ تھرمل آکسیڈیشن اور سرفیس پیسیویشن کا عمل ایجاد کر چکے تھے جن کے ذریعے موسفیٹ بنایا جانا ممکن ہو پایا۔ انہوں نے شوٹی ڈائی اوڈ پر تحقیق اور بعد ازاں اس پرزے کو ایجاد بھی کیا۔ اس کے علاوہ وہ کریڈٹ کارڈ کے پن کوڈ ایجاد کرنے اور صارفین کی ڈیجیٹل معلومات کی حفاظت کرنے والے پہلے ادارے ''عطاءاللہ کارپوریشن'' کی وجہ سے بھی جانے جاتے ہیں۔ یہ ادارہ آج ''ایٹم کو عطاءاللہ'' کے نام سے موجود ہے۔

محمد عطاءاللہ چار اگست 1924ء کو مشہور زمانہ سوئز نہر کے کنارے آباد کیے گئے مصر کے شہر ''پورٹ سعید'' میں پیدا ہوئے۔ پورٹ سعید میں ابتدائی تعلیم کے بعد ''قاہرہ یونیورسٹی'' میں مکینیکل انجینئرنگ میں بیچلرز کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ امریکا چلے آئے اور ریاست انڈیانا کی ''پرڈیو یونیورسٹی'' سے مکینیکل انجینئرنگ میں 1947ء میں ماسٹرز کی تعلیم حاصل کی اور پھر 1949ء میں اسی ادارے سے مکینیکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کی۔ ماسٹرز میں ان کے مقالے کا عنوان ''ہائی اسپیڈ فلوان سکوائر ڈیفیوزرز'' تھا جبکہ پی ایچ ڈی کے لیے ان کے مقالے کا عنوان ''ہائی اسپیڈ کمپریسیبل فلوان اسکوائر ڈیفیوزرز'' تھا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1949ء میں انہوں نے امریکا کی مشہور ''بیل لیبس'' میں ملازمت اختیار کر لی۔ 1950ء میں انہوں نے بیل کے نیویارک شہر میں واقع دفتر میں کام شروع کر دیا۔ یہاں انہوں نے الیکٹرو مکینیکل ریلے میں پائیداری نہ ہونے کے مسئلے پر کام کیا۔ اسی کے ساتھ ہی وہ سرکٹ سوئچڈ ٹیلیفون نیٹ ورکس پر کام کرتے رہے جہاں یہ ریلے استعمال ہوتی تھیں۔

1947ء میں ٹرانسسٹر ایجاد ہوئے تھے۔ دنیا کا پہلا ٹرانسسٹر ''پوائنٹ کونٹیکٹ ڈائی اوڈ'' تھا جو امریکی طبیعات دانوں جان بارڈین اور والٹر براٹین نے ولیم شوکلے کی سربراہی میں 1947ء میں بیل لیبس میں ایجاد کیا۔ ان تینوں کو 1956ء میں اپنے کارنامے پر طبیعات کا نوبل انعام دیا گیا۔ ولیم شوکلی نے ہی 1948ء میں دنیا کے پہلے ''بائی پولر جنکشن ٹرانسسٹر'' ایجاد کیے۔ 1950ء میں مورگن سپارکس اور گورڈن ٹیل نے ''این پی این ٹرانسسٹر'' کو عملی شکل میں ڈھالا جس میں ''جرمینیم'' استعمال کی گئی تھی۔ پہلا سائز میگا ہرٹز کی فریکوئنسی پر چلنے والا جرمینیم ٹرانسسٹر ''فلکو کارپوریشن'' نے 1952ء میں تیار کیا۔ 1954ء میں ''مورس تینھم بام'' نے سیلیکون سینا پہلا ٹرانسسٹر بیل لیبس میں ایجاد کیا اور سیلیکون سے بنا ٹرانسسٹر تجارتی پیمانے پر ٹیکساس انسٹرومنٹس نے اسی سال فروخت کے لیے پیش کیا جو کہ بیل لیبس سے ٹیکساس انسٹرومنٹس میں گئے گورڈن ٹیل نے تیار کیے تھے۔ نیم موصل مادوں سے پرزے بنانے والے اداروں نے ابتدائی سالوں میں جرمینیم (جنکشن) ٹرانسسٹر بنانے پر توجہ دی لیکن ایسے ٹرانسسٹر بھاری اور بڑے پیمانے پر تیار کرنا مشکل ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے جنکشن ٹرانسسٹر کا استعمال صرف انہی آلات تک محدود رہا جہاں ان کا استعمال ناگزیر ہوتا تھا۔ جیسے کہ جیبی ریڈیو۔

ٹرانسسٹر پر مبنی دنیا کے پہلے جیبی ریڈیو کا ابتدائی نمونہ 1952ء میں ''انٹرمیٹنل'' نامی ادارے نے پیش کیا جس کو ہربرٹ ماتارے نے قائم کیا تھا۔ جبکہ صارفین کے استعمال کے لیے پہلا جیبی ٹرانسسٹر ریڈیو ''رجنسی'' نامی ادارے نے مشہور زمانہ ٹیکساس انسٹرومنٹس کے تعاون سے ''رجنسی ٹی آر ون'' کے نام سے پیش کیا تھا۔ یہ جیبی ریڈیو انڈین ایپلس انڈیانا میں تیار کیے گئے تھے۔ اس میں چار ٹرانسسٹر اور ایک جرمینیم ڈائی اوڈ استعمال ہوتے تھے۔ جبکہ ٹرانسسٹر پر مبنی پہلا کار ریڈیو کراسلر اور فلکو کارپوریشن نے سن 1955ء میں پیش کیا لیکن عوام میں ویکیوم ٹیوب ریڈیو مقبول رہے۔ بہت بڑے پیمانے پر تیار اور فروخت ہونے والا ٹرانسسٹر ریڈیو سونی ٹی آر 63-تھا جو 1957ء میں فروخت کے لیے پیش کیا گیا اور سن ساٹھ کی دہائی تک اس کے ستر لاکھ یونٹس فروخت

ہو چکے تھے۔ سونی کی کامیابی نے ہی ٹرانسسٹر کو ریڈیو کے شعبے میں ویکیوم ٹیوب کی جگہ لینے میں مدد دی لیکن دیگر آلات میں ویکیوم ٹیوب کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ ''فیلڈ ایفکٹ ٹرانسسٹر'' نظریاتی طور پر تو جنکشن ٹرانسسٹر کا متبادل ہو سکتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ ایسے ٹرانسسٹر کاغذ پر تو خاکے کی شکل میں موجود تھے، پر ان کو عملی شکل دینے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ ''سیلیکان کی سطح کی حالت کا معما'' تھی۔ جنکشن ٹرانسسٹر میں استعمال ہونے والے نیم موصل مادوں کی برقی رو کو ایک سے دوسری جگہ پہنچانے کی صلاحیت محدود تھی کیونکہ یہاں پر کوانٹم سطح کی حالت غیر مستحکم ہو جاتی تھی جہاں الیکٹرون سیلیکون کی سطح پر آ کر لٹکتے ہوئے جوڑوں کی وجہ سے پھنس جاتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹرانسسٹر کی تیاری کے دوران غیر ہموار جوڑ سطح پر بنتے تھے۔ یہ مظہر برقی رو کو اچھی طرح سے سطح کے اندر جذب ہونے سے روکتا تھا جہاں سے یہ رو نیم موصل سیلیکون کی تہہ تک پہنچتی تھی۔ اسی وجہ سے ٹرانسسٹر اور دیگر نیم موصل پرزے بنانے کے لیے جرمینیم ہی زیادہ تر استعمال ہوتا تھا کیونکہ جرمینیم ہی ایسی صورت میں برقی رو کو نیم موصل سیلیکون تہہ تک پہنچانے کی حرکت پذیری رکھتا تھا۔

ان حالات میں عطا اللہ ٹرانسسٹر پر تحقیق کی جانب متوجہ ہوئے۔ 1956ء میں وہ بیل لیبارٹری کے ٹھنی ادارے مرے ہل لیبس منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے ٹرانسسٹرز پر تحقیق کے لیے کچھ مبتدی سائنس دانوں کو ساتھ لیا، کیونکہ اس شعبے کے ماہران کی مکینیکل انجینئرنگ کی تعلیم کی وجہ سے ان کو اہمیت نہ دے کر ان کے ساتھ کام کرنے کو راضی نہ تھے۔ 1956ء سے لے کر 1960ء تک عطا اللہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ نیم موصل مادوں پر تحقیق کی سربراہی کرتے رہے، جن میں ایلین تانیمبام، ایڈون جوزف شیفر، اور ڈان کھینگ شامل تھے۔ یہ سب ہی بیل لیبارٹری میں نئے مبتدی آئے تھے اور ان کی تحقیق کی سربراہی کوئی کہنہ مشق محقق نہیں کر رہا تھا بلکہ مکینیکل انجینئر کی تعلیم رکھنے والے محمد عطا اللہ ان کی تحقیق کی سربراہی کر رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کی تعلیم میکانکی انجینئر کی تھی اور وہ کسی پرزے کو بنانے کا علم (فزیکل کیمسٹری) نہیں جانتے تھے، انہوں نے بڑی جلدی اس شعبۂ علم اور نیم موصل مادوں کے علم (سمی کنڈیکٹر فزیکس) کی بنیادی باتیں خود ہی سیکھ لیں اور جلد ہی ان دونوں شعبوں میں اپنی اعلیٰ مہارت کو ثابت بھی کر دیا۔ بیل لیبس میں انہوں نے

اعزازات

1975 میں محمد عطا اللہ کو موسفیٹ ایجاد کرنے اور نیم موصل مادوں کے شعبے میں جدت لانے کی ان کی خدمات کے اعتراف میں ''سٹیورٹ بالانٹائین میڈل'' سے نوازا گیا۔ جو طبیعات کے میدان میں نمایاں کام کرنے والوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ یہ اعزاز آج کل ''بنجامن فرینکلن میڈل برائے طبیعات'' کہلاتا ہے۔

2003ء میں پرڈیو یونیورسٹی نے اپنے اس سابقہ طالب علم کو سائنس کے شعبے میں خدمات پر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔

نیم موصل مادوں (سمی کنڈیکٹرز) کے میدان میں کئی اہم معلومات اور اصلاحات کا اضافہ کیا۔ انہوں نے دیگر مادوں کے علاوہ سیلیکان سے بنے نیم موصل مادوں اور ان میں سیلیکا کو حفاظتی تہہ کے طور پر استعمال کرنے پر تحقیق کی۔ ابتدائی طور پر انہوں نے ''سیلیکان کی سطح کی حالت کے معمے'' (Surface state barrier) پر توجہ دی۔ اس زمانے میں استعمال ہونے والے نیم موصل مادوں جیسے کہ جرمینیم اور سیلیکون کی برقی رو کو ایک سے دوسری جگہ پہنچانے کی صلاحیت محدود تھی کیونکہ یہاں پر کوانٹم سطح کی حالت غیر مستحکم ہو جاتی تھی جہاں الیکٹرون سیلیکون کی سطح پر آ کر لٹکتے ہوئے جوڑوں کی وجہ سے پھنس جاتے تھے اور یہ اس وجہ سے ہوتا تھا کہ غیر ہموار شدہ (اَن سچوریٹڈ) جوڑ سطح پر بنتے تھے۔ یہ برقی رو کو اچھی طرح سے سطح کے اندر جذب ہونے سے روکتا تھا جہاں سے یہ رو نیم موصل سیلیکون کی تہہ تک پہنچتی تھی۔ اسی وجہ سے ٹرانسسٹر اور دیگر نیم موصل پرزے بنانے کے لیے جرمینیم ہی زیادہ تر استعمال ہوتا تھا کیونکہ جرمینیم ہی ایسی صورت میں برقی رو کو نیم موصل سیلیکون تک پہنچانے کی حرکت پذیری رکھتا تھا۔ عطا اللہ نے اس مسئلے کا حل نیم موصل پرزوں کو بنانے کے ایک نئے طریقے سرفیس پیسیویشن کی صورت میں نکالا۔ اس عمل میں ''سیلیکون ویفر'' کی سطح پر ''سیلیکون آکسائیڈ'' کی حفاظتی تہہ لگا دی جاتی تھی جس سے ہموار جوڑ بنتے جس کے نتیجے میں برقی رو پائیداری سے مسلسل نیچے موجود موصل سیلیکان تک نفوذ کر جاتی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ اگر سیلیکون ویفر کو حرارت دے کر سیلیکان ڈائی آکسائیڈ کی تہہ اگائی جائے تو سیلیکون کی سطح پر

الیکٹرونز کے مرکوز ہونے کا مظہر بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے۔ یہ عمل بعد میں تھرمل آکسیڈیشن کہلایا جو کہ سرفیس پیسیوئیشن یعنی سطح کو صاف کرنے کے عمل کے لیے ضروری ہے۔ سلیکون ویفر پر حرارت کے ذریعے سلیکون ڈائی آکسائیڈ کی تہہ اگانے سے عطا اللہ نے سطح کے اس مسئلے کا حل نکال لیا جو برقی رو کو نیم موصل تہہ تک پہنچنے سے روکتی تھی۔ اس عمل کے ذریعے نیم موصل مادے کی سطح کو ساکن کر دیا جاتا اور نیم موصل مادوں کے خواص ہوا یا دیگر مادوں سے ربط کی صورت میں سلیکون کی قلم کی سطح یا کناروں پر موجود دیگر مادوں سے تعامل کے نتیجے میں تبدیل نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ اگر ٹرانسسٹر کی مثبت منفی جوڑ کی جگہ (پی این جنکشن) پر سلیکان ڈائی آکسائیڈ کی ایک پتلی تہہ لگا دی جائے تو اس سے جوڑ کی جگہ کی برقیاتی خصوصیات کیسوں پر محیط ماحول کے باوجود بگڑتی یا ختم نہیں ہوتی ہیں۔ سلیکون کی سطح پر سلیکون ڈائی آکسائیڈ کی پتلی تہہ اگانے سے مثبت منفی جوڑ کو جو کہ سلیکون کی سطح پر رکاوٹیں کھڑی کر کے برقی رو کو پھنسا دیتی تھی، 100 کے مقابلے میں 10 فیصد تک کم کر دیا۔ اس تجربے نے ثابت کیا کہ آکسائیڈ سلیکون کی سطح کو برقی رو کے لیے مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ یوں یہ دونوں عمل سلیکان سے نیم موصل مادے جیسے کہ ٹنگسٹن اسٹیٹر یعنی سرکٹ چپس بنانے اور پلینر پروسس کی بنیاد بنے۔

ان کی یہ تحقیق فوراً ہی سائنسی حلقوں میں مقبول ہوئی اور شائع ہونے سے پہلے ہی اس حوالے سے بیل لیبس کے اندرونی مراسلوں میں اس کا تذکرہ ہونے لگا۔ ولیم شوکلی نے اپنے ادارے شوکلی سیمی کنڈیکٹر کے اعلیٰ عہدے داروں میں اس مضمون کی نقول تقسیم کیں، ان میں جین ہورنی بھی شامل تھے۔ بیل لیبس میں اس تحقیق کی اہمیت کو فوری طور پر سمجھ لیا گیا کیونکہ اس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ سلیکون آکسائیڈ جرمینیم آکسائیڈ کے مقابلے میں زیادہ متوازن ہے اسی دوران عطا اللہ بھی نیم موصل مادے میں الیکٹران کے نفوذ نہ کرنے کے مسئلے سے الجھ رہے تھے۔ سلیکون کی سطح کے جوڑوں میں الیکٹران کے پھنس جانے کے مسئلے کے حوالے سے انہوں نے سلیکون کی سطح کو ہموار کرنے کے لیے سلیکون آکسائیڈ کی تہہ لگا کر کوشش کی۔ اس دوران عطا اللہ کو خیال آیا کہ کیوں نہ سلیکون ویفر کی صاف سطح پر آکسائیڈ کی انتہائی پتلی تہہ حرارت دے کر اگائی جائے تو وہ اس کی سطح پر غیر ضروری جوڑ نہیں بننے دے گی۔ عطا اللہ نے اپنے تجربات سے حاصل شدہ نتائج سب سے پہلے بیل لیبارٹری کے اندرونی مراسلوں میں بیان کیے اور پھر الیکٹرو کیمیکل سوسائٹی کے 1958 میں منعقدہ اجلاس میں اور پھر ''ریڈیو انجینئرز سیمی کنڈکٹر ڈیوائیس ریسرچ کانفرنس'' میں پیش کیے۔ نیم موصل مادے بنانے والے اداروں نے فوراً ہی عطا اللہ کی اس تحقیق کی اہمیت کو سمجھ لیا۔ اور ''آر سی اے'' نے سرفیس آکسائیڈیشن کے عمل کو ''سلیکون کی سطح کو ہموار کرنے کی راہ میں ایک بڑا سنگ میل'' قرار دیا۔ اس تعریف سے حوصلہ پا کر عطا اللہ اور ان کے ساتھیوں نے اس عمل کو زیادہ بہتر کیا اور پھر اگلے سال مئی 1959ء میں اپنی تحقیقات شائع کرا دیں۔ سرفیس پیسیوشن اور تھرمل آکسائیڈیشن کے عمل کو بنیاد بنا کر عطا اللہ نے دھات اور آکسیجن کے مرکب کے ساتھ نیم موصل مادہ (میٹل آکسائیڈ سیمی کنڈیکٹر) یا ''موس'' بنانے کا عمل ترتیب دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے تجویز دی کہ آسٹرین ماہر طبیعات جولیس ایڈگر لیلن فیلڈ کے تجویز کیے گئے ''فیلڈ ایفکٹ ٹرانسسٹر'' کو ان کے ترتیب دیے ''میٹل آکسائیڈ سلیکون'' یا مختصراً ''موس عمل'' کے ذریعے بنایا جائے۔ انہوں نے اس کام کے لیے اپنی معاونت کی ذمہ داری ڈان کھینگ نامی کورین سائنسدان کو دی جو کہ حال ہی میں ان کے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہوئے تھے اور آخر کار وہ نومبر 1959ء میں اس پرزے کو ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ایجاد موسفیٹ (MOSFET) کہلائی جو کہ ''میٹل آکسائیڈ سیمی کنڈیکٹر فیلڈ ایفیکٹ ٹرانسسٹر'' کا مخفف بنتا ہے۔ یہ دنیا کا پہلا صحیح معنوں میں حقیقتاً مختصر ٹرانسسٹر تھا جو بائی پولر ٹرانسسٹر کے مقابلے میں کم بجلی خرچ کرتا تھا، بڑے پیمانے پر آسانی سے تیار کیا جا سکتا اور اس میں مزید مختصر کیے جانے کی گنجائش بھی تھی۔ ابتدا میں دو قسم کے موسفیٹ بنائے گئے تھے۔ مثبت قسم (پی ٹائپ) اور منفی قسم (این ٹائپ)۔ دونوں اقسام عطا اللہ اور کھینگ نے اسی وقت بنائے جب انہوں نے موسفیٹ ایجاد کیا تھا۔ انہوں نے دونوں کو بیس مینو میٹر چوڑے سرکٹ میں بنایا، تاہم اس وقت صرف مثبت قسم (پی ٹائپ) کا موسفیٹ ہی عملی طور پر کام کر رہا تھا۔ عطا اللہ اور ڈان کھینگ کے بنائے ہوئے موسفیٹ گیٹ کے آکسائیڈ کی موٹائی ایک سو (100) نینو میٹر جبکہ لمبائی بیس (20) مائیکرو میٹر تھی۔ انہوں نے اگلے چند مہینوں میں اپنی اس ایجاد کا عملی ثبوت پیش کیا۔ دونوں نے کارنیگی میلون یونیورسٹی میں سالڈ اسٹیٹ ڈیوائس کانفرنس میں موسفیٹ کی ایجاد کے نتائج

TAGPK.COM

جون 1960ء میں پیش کیے۔

موسفیٹ بنانے میں کامیابی ملنے کے بعد عطا اللہ ایک اور ایسے پرزے کو عملی شکل میں بنانے پر مصروف ہو گئے جس کا موسفیٹ کی طرح خاکہ تو موجود تھا، پر عملی صورت دینا سائنسدانوں کے لیے ایک معما بنا ہوا تھا۔ موس ٹیکنالوجی پر اپنی تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے عطا اللہ اور کھینگ نے ایک ایسے پرزے پر تحقیق شروع کی کہ جسے اس وقت ہاٹ کیریئر کے نام سے پکارا جاتا تھا، آج یہ پرزہ ''شوٹکی ڈائی اوڈ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ جرمن طبیعات دان ''والٹر شوٹکی'' کے نام پر بنا ہے۔

پوائنٹ کونٹیکٹ ڈائی اوڈ، 1947ء میں جان بورڈین اور والٹر براٹین نے بیل لیبس میں ایجاد کیے تھے اور یہ ٹرانسسٹر کی سب سے اولین شکل تھی۔ یہ کام طبیعات دان ولیم شوکلی کی سربراہی میں کیا گیا تھا۔ دراصل یہ محققین ٹھوس مادوں میں کسی ایسے طریقہ کار کی تلاش میں تھے کہ جس سے زیادہ بجلی کھانے والی بڑی بڑی ویکیوم ٹیوبز کا کم بجلی خرچ کرنے اور مختصر جسامت کا حامل متبادل تیار کیا جا سکے۔ ان محققین نے اپنے تجربات کے دوران ڈائی اوڈ کے ساتھ ایک ایسا پرزہ بنا لیا جو ایک سے دوسری حالت میں تیز رفتاری سے تبدیل ہونے (سوئچنگ) کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یوں ''پوائنٹ کونٹیکٹ ڈائی اوڈ'' نامی ٹرانسسٹر ایجاد ہوئے، یہ زیادہ پائیدار نہیں ہوتے تھے، بڑے پیمانے پر بنانے میں بھی مشکل تھے، لیکن یہ انتہائی اونچی فریکوئنسی پر سوئچنگ کی صلاحیت رکھتے تھے، یعنی سرکٹ کو ایک سے دوسری حالت میں لے جا سکتے تھے، چنانچہ یہ بطور خاص ریڈیو فریکوئنسی مکسر آلات میں استعمال ہوتے تھے۔ پہلے پہل ٹی وی سیٹوں میں ویڈیو اور آڈیو سگنل کو محسوس کرنے والے (ویڈیو آڈیو ڈیٹیکٹر) سرکٹ میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ پائیداری نہ ہونے کے باوجود ہائی فریکوئنسی آلات میں پوائنٹ کونٹیکٹ ڈائی اوڈ کا متبادل نہ ہونے کی وجہ سے ان کا استعمال مجبوری تھا۔ اس وقت تک نظریاتی طور پر شوٹکی ڈائی اوڈ بنانے کا خاکہ تو موجود تھا لیکن اسے عملی صورت میں ڈھالنے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن عطا اللہ اور کھینگ کی تحقیق سے شوٹکی ڈائی اوڈ عملی صورت میں بنانے کی راہ میں حائل تمام مسائل ختم ہو گئے۔ شوٹکی ڈائی اوڈ کہ جسے ''شوٹکی بیریئر ڈائی اوڈ'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کا خاکہ تو کئی سال پہلے پیش کر دیا گیا تھا مگر اس بات کا احساس کہ اب یہ

اعزازات

نیم موصل مادوں (سیمی کنڈیکٹر) اور معلومات کے تحفظ (ڈیٹا سیکیورٹی) کے شعبے میں نمایاں خدمات پر 2009ء میں ان کا نام امریکا کے ''نیشنل انونٹرز ہال آف فیم'' میں شامل کیا گیا۔

عطا اللہ کو ''سیلیکون کے سلطان'' بھی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے، ان کے علاوہ بھی نیم موصل مادوں کے شعبے کی بنیاد رکھنے والے دیگر سائنسدانوں کو اسی لقب سے پکارا جاتا ہے۔

صارف کے کھاتے کے لیپین کوڈ کی حفاظت کا نظام ایجاد کرنے اور سائبر سیکیورٹی کے شعبے کی بنیاد رکھنے کے اعتراف میں آج انہیں ''پن کوڈ کا باپ'' کے لقب سے بھی پکارا جاتا ہے۔

2014ء میں ''انسٹیٹیوٹ آف الیکٹریکل اینڈ الیکٹرانکس انجینئرز'' نے موسفیٹ کی ایجاد کو اپنی ''مائیلسٹ ون'' نامی فہرست میں شامل کیا۔

پرزہ عملی شکل وصورت میں بنایا بھی جا سکتا ہے، عطا اللہ اور کھینگ کی 1960ء تا 61ء میں کی گئی تحقیق کی بدولت ہی ہوا 1962ء میں عطا اللہ اور کھینگ نے نیٹو تہہ کا استعمال کرتے ہوئے دھات سے بنے نیم موصل مادے کے جوڑ (میٹل سیمی کنڈیکٹر جنکشن یا ایم ایس جنکشن) پر مبنی شوٹکی ڈائی اوڈ ٹرانسسٹر ایجاد کیا۔ انہوں نے یہ کام یوں کیا کہ دھات (میں) کے اوپر یک قلمی نیم موصل مادے کی پتلی تہیں لگائیں جو کہ ''کولیکٹر'' کا کام دیتی تھیں۔ جبکہ ''ایمیٹر'' ایک نیم موصل مادے کی تہہ تھی جو دھات کے ساتھ دبائی گئی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے سونے کی دس نینو میٹر موٹی پتی مخفی قسم کے جرمینیم (این ٹائپ جرمینیم) میں استعمال کی جبکہ ان کا نقطہ اتصال ایک منفی قسم کے سیلیکون (این ٹائپ سیلیکون) سے کیا۔ اس ٹرانسسٹر میں ایک دھات کی تہہ دو نیم موصل مادوں کے درمیان سمو دی گئی تھی۔ یہ دھات کی تہہ بیس (Base)، جبکہ نیم موصل مادے ایمٹر (Emitter) اور کولیکٹر (Collector) (ان تینوں کا تفصیلی بیان ٹرانسسٹر کے ذیل میں) کا کام دے رہے تھے۔ بہت کم مزاحمت رکھنے اور کم وقت میں ردِعمل دینے کی وجہ سے یہ

ٹرانسسٹر، بہ نسبت عام ہائی پولر ٹرانسسٹر کے، اونچی فریکوئنسی پر کام کرسکتا تھا۔ یہ تحقیق نیم موصل مادوں سے بنے پرزوں کے اندر دھات سے جوڑ لگانے کے حوالے سے بھی ایک سنگ میل ثابت ہوئی جس نے ''پوائنٹ کونٹیکٹ ڈائی اوڈ'' بنانے کے عمل میں شروع سے درپیش آنے والے تمام مسائل کا شوٹکی ڈائی اوڈ کی شکل میں متبادل حل پیش کر دیا۔ 1962ء میں عطا اللہ اور کھینگ کی اس حوالے سے تحقیق شائع ہوئی جس میں انہوں نے اس پرزے کو ''ہاٹ الیکٹران'' ٹرائی اوڈ پر مشتمل پرزہ قرار دیا کہ جو دھات پر مبنی ہیں رکھنے والا پہلا ٹرانسسٹر بھی تھا۔ آگے چل کر شوٹکی ڈائی اوڈ، ریڈیو مکسر آلات میں انتہائی اہم پرزہ کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ عطا اللہ کی بیل لیبارٹری میں آخری ایجاد تھی جس کے بعد انہوں نے اپنے افسران کی جانب سے کما حقہ توجہ نہ ملنے پر استعفا دے دیا اور 1962ء میں ایچ پی میں چلے گئے۔ ہیولٹ پیکارڈ کے ارباب اختیار پہلے ہی ان کی صلاحیتوں اور کام سے متاثر ہو چکے تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ عطا اللہ کی تعلیم میکانی انجینئر کی تھی جبکہ کام وہ الیکٹریکل انجینئرنگ کے کر رہے تھے۔ انہیں صرف کام ہو جانے سے غرض تھی۔ ایچ پی کے ارباب اختیار ان کی تحقیق کی اہمیت کو بخوبی سمجھ چکے تھے۔ لہٰذہ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس وقت تک ہیولٹ پیکارڈ ایک چھوٹا سا ادارہ تھا۔ یہاں انہوں نے 1962ء میں ہیولٹ پیکارڈ کے نیم موصل مادوں کے شعبے کی ''ہیولٹ پیکارڈ اینڈ ایسوسی ایٹیس'' نامی ضمنی ادارے کی بنیاد رکھی جس نے ہیولٹ پیکارڈ کو سالڈ سٹیٹ آلات کے شعبے میں ایک واضح برتری دلا دی۔ انہیں ایچ پی میں نیم موصل مادوں پر تحقیق کے شعبے کا سربراہ مقرر کیا گیا، اسی کے ساتھ وہ نیم موصل مادوں پر تحقیق کی تجربہ گاہ کے پہلے منتظم کا عہدہ بھی انہیں سونپ دیا گیا۔ انہوں نے رابرٹ جے آرچر کے ساتھ مل کر شوٹکی ڈائی اوڈ پر اپنی تحقیق جاری رکھی۔ ان دونوں نے مل کر انتہائی زیادہ خلاء پر دھات کی نئی پتلی سی پٹی پرزہ جات میں رکھنے کی ٹیکنالوجی ایجاد کی۔ ساتھ ہی انہوں نے پرزوں کے اندر نیم موصل مادے اور دھات کے جوڑ لگانے کے لیے ایک بہتر طریقہ کار ایجاد کر لیا۔ اس تحقیق کے نتائج جنوری 1963ء میں شائع ہوئے۔

عطا اللہ کا موس عمل کے ذریعے انٹیگریٹڈ سرکٹ بنانے کا خواب بھی آخرکار پورا ہوا جب 1962ء میں ''فریڈ ہائیمین'' اور ''سٹیون ہافسٹین'' نے ''آر سی اے'' کی تجربہ گاہ میں ایک تجرباتی موس انٹیگریٹڈ چپ بنائی۔ یہ ٹرانسسٹر چپ سولہ بٹس پر مبنی تھی۔ جس کی کامیابی اور آسانی دیکھ کر موس کے عمل کے ذریعے انٹیگریٹڈ سرکٹ بنانے کو ترجیح دی جانے لگی اور جلد ہی اسی عمل کے ذریعے سرکٹ چپس بنائی جانے لگیں۔ ساٹھ کی دہائی کے وسط تک سلیکون سے بنائے گئے تمام پرزے اور انٹیگریٹڈ سرکٹ سرفیس پیسیویشن اور تھرمل آکسائیڈیشن کے عمل کے ذریعے تیار کیے جانے لگے۔

دنیا کا پہلا ایل ای ڈی بھی عطا اللہ کی ایچ پی میں نیم موصول مادوں کی تجربہ گاہ میں تیار کیا گیا تھا۔ ایل ای ڈی نیم موصل مادے سے بنا ایسا پرزہ ہے کہ جب اس میں سے برقی رو گزرتی ہے تو بجلی کے الیکٹران نیم موصل مادے سے گزرتے ہیں تو وہاں بنے سوراخوں میں اپنی ترتیب بدل کر فوٹانز کی شکل میں روشنی خارج کرنے لگتے ہیں۔ ایل ای ڈیز کا پہلا عملی نمونہ 1907ء میں سامنے آیا تھا جب مارکونی کی تجربہ گاہ کے محقق ایچ جے راؤنڈ نے ''الیکٹرو لومینسس'' کا مظہر دریافت کیا۔ اس تجربے میں سلیکون کاربائیڈ کی قلم اور بلی کی مونچھوں کے بال استعمال کیے گئے تھے۔ روسی محقق ''اولیگ لوسیف'' نے 1927ء میں ایل ای ڈی کا ایک عملی نمونہ پیش کیا۔ ان کی تحقیق روسی، جرمن اور برطانوی سائنسی جریدوں میں شائع ہوئی لیکن عملی ایل ای ڈی بنانے میں مہنگے مادے لگنے اور کم روشنی دینے کی وجہ سے اس ایجاد کے عملی استعمال کی کوئی وجہ نہ مل سکی تو سب اسے ناکام ایجاد سمجھ کر بھول بھلا گئے اور اگلی کئی دہائیوں تک کسی نے اس جانب توجہ نہ دی۔ 1936ء میں مادام میری کیوری کی تجربہ گاہ میں ان کے ساتھ ریڈیم پر تحقیق کرنے والے سائنس دان ''جورجیس ڈیسٹرایو'' نے مشاہدہ کیا کہ الیکٹرولومینسس کا مظہر اس وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب زنک سلفیٹ کا سفوف ایل ای ڈی کے انسیولیٹر کیاد پر تان دیا جائے۔ اپنے مقالے میں ڈیسٹرایو نے کئی دفعہ اس مظہر کو لوسیف لائیٹ کا نام دیا۔ ہنگری کے ترک نژاد زولطان یا سلطان بے نے گریگوری سز گیٹی کے ساتھ مل کر 1939ء میں سلیکون کاربائیڈ پر مشتمل ایک ایسی ایل ای ڈی جیسے پرزے کا پیٹنٹ کرایا جس میں بورون کاربائیڈ کے خالص یا ناخالص ہونے کی بنیاد پر سفید، پیلی سفید یا نیلی سفید روشنی

TAGPK.COM

خارج کی جاسکتی تھی لیکن عملی استعمال دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کسی نے اس کی ترقی اور ترویج پر توجہ نہ دی۔ 1951ء میں کرٹ لیخووچ، کارل اکارڈو اور ایڈورڈ جمگوچین نے سیلیکون کاربائیڈ کی قلمیں اور پیڑی کے ذریعے یا جھماکے پیدا کرنے والے آلے (پلس جنریٹر) کے ذریعے یہ ثابت کر دکھایا کہ آخر ایل ای ڈی روشنی کیسے خارج کرسکتی ہے۔ آر سی اے لیبارٹری کے ''روبن براون سٹین'' نے سیلیکون کاربائیڈ کی جگہ ''گیلیم آرسنائیڈ'' استعمال کی تو انہوں نے دیکھا کہ ایل ای ڈی سے روشنی کی بجائے بالائے بنفشی (انفراریڈ) لہریں خارج ہوئیں۔ 1957ء میں براون سٹین نے ایک ریکارڈ پلیئر کو ایک انفراریڈ لہر خارج اور کچھ فاصلے پر ایمپلی فائر کو اسے وصول کرنے والے ''پولی کرسٹلین لیڈ سلفائیڈ ڈیٹیکٹر'' آلے کے ساتھ منسلک کرکے یہ ثابت کر دکھایا کہ جب تک انفراریڈ روشنی اسے محسوس کرنے والے آلے تک آتی رہتی، ریکارڈ پلیئر سے آنے والی آواز ایمپلی فائر تک پہنچتی اور سپیکروں کے ذریعے سنائی دیتی رہتی اور جب انفراریڈ لہر کو اسے ہاتھ یا کسی اور چیز سے روک دیا جاتا تو ایمپلی فائر سے آنے والی آواز بھی آنا بند ہو جاتی۔ یوں انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ کم فاصلے میں اگر ریڈیو کے ذریعے رابطے کی ضرورت نہ ہو تو ایسے روشنی خارج کرنے والے آلات کے ذریعے اشارے دیے جاسکتے ہیں اور مختلف آلات کا تار کے بغیر رابطہ کرایا جاسکتا ہے۔ اس تجربے نے مختلف آلات کو ایک قریبی فاصلے سے چلنے یا رکنے کی ہدایت دینے کے لیے ایل ای ڈیز کے استعمال کی افادیت تو ثابت کر دی، لیکن ان کی تحقیق بھی کوئی عملی استعمال سامنے نہ آنے کی وجہ سے سرد خانے کا شکار ہو گئی۔ موجودہ دور میں استعمال ہونے والی سرخ رنگ کی روشنی خارج کرنے والی ایل ای ڈیز پہلی دفعہ 1962 میں جنرل الیکٹرک کی نیویارک میں واقع تجربہ گاہ میں ''نک ہولونائیک جونیئر'' نے ایجاد کیں لیکن ان کا عملی استعمال بہت محدود اور مہنگے آلات میں ہوتا تھا کیونکہ اس وقت ایک انفراریڈ ایل ای ڈی یا سرخ کی رنگ ایل ای ڈی کی قیمت دو سو ڈالر ہوتی تھی، ظاہر ہے کہ اتنے مہنگے بلب کا استعمال ہر کوئی نہ کرسکتا تھا، اس لیے تجربہ گاہوں میں جانچ پڑتال کے لیے استعمال کیے جانے والے آلات اور برقی آلات کی جانچ پڑتال کے لیے استعمال ہونے والے آلات تک اس کا استعمال محدود رہا۔ اس دوران ہیولٹ پیکارڈ کا عطا اللہ کی سربراہی میں قائم ہونے والا تحقیق و ترقی کا شعبہ نیم موصل مادوں پر تحقیق کی وجہ سے ایل ای ڈی کے عملی استعمال پر تحقیق کرنے میں دلچسپی لینے لگا۔

عطا اللہ نے بطور منتظم نئے مادوں سے نیم موصل پرزے بنانے کے لیے خصوصی تحقیق شروع کرائی جس نے صرف جرمینیم کی بجائے گیلیم آرسنائیڈ، گیلیم آرسنائیڈ فوسفیٹ اور انڈیم آرسنائیڈ سے بنے پرزوں کو مستعمل کرایا۔ یوں نیم موصل مادوں کے شعبے میں ''گیلیم آرسنائیڈ''، ''گیلیم آرسنائیڈ فاسفیٹ''، ''انڈیم آرسنائیڈ'' جیسے مادے متعارف کرانے کے حوالے سے ان کا اہم اور فیصلہ کن کردار رہا۔ ان مادوں سے ایل ای ڈی نہ صرف بنانے آسان ہو گئے بلکہ یہ اتنے سستے بھی ہو گئے کہ مختلف آلات میں صارف کو کسی کام کا اشارہ دینے وغیرہ میں استعمال ہونے لگے۔ عطا اللہ نے ایچ پی کے شعبۂ تحقیق و ترقی میں روشنی دینے والی ایل ای ڈیز کے عملی استعمال کے حوالے سے 1962ء تا 1969ء میں ہونے والی تحقیق کے معاملات جو کہ ان کے شعبے کی زیل میں آتے تھے۔ ''ہاورڈ سی بورگن'' اور'' جیرالڈ پی پیخانی'' کے ساتھ مل کر چلائے۔ انہوں نے ''مونسانتو کارپوریشن'' کے ساتھ اس تحقیق میں اشتراک کار قائم کیا۔ 1968ء میں ایچ پی نے

اعزازات

2015ء میں'' آئی ٹی ہسٹری سوسائٹی'' نے عطا اللہ کا نام انفارمیشن ٹیکنالوجی کو استوار اور عام کرنے میں خدمات کے اعتراف میں اپنی ''آئی ٹی آنرز رول'' نامی فہرست میں شامل کیا۔

اس کے باوجود کہ موسفیٹ کی ایجاد کی وجہ سے ''کوانٹم ہال لنکٹ'' ثابت ہونے پر اور کیمرے کی ''چارج کپلڈ ڈیوائس'' یا (CCD) چپ ایجاد کرنے پر نوبیل انعامات دیے گئے لیکن بذات خود موسفیٹ کی ایجاد پر کبھی کوئی نوبل انعام نہیں دیا گیا۔ 2018ء میں ''رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز'' جو نوبل انعام دیتی ہے، نے تسلیم کیا کہ عطا اللہ اور کھینگ کی موسفیٹ کی ایجاد دور جدید کے مائیکرو الیکٹرانکس اور اطلاعات کے تبادلے یعنی انفارمیشن اور کمیونیکیشن ٹیکنالوجی (ICT) کے شعبوں میں انتہائی اہم ترین ایجاد تھی۔

''ایل ای ڈی ڈسپلے'' کا پہلا عملی نمونہ جبکہ مونسانٹو کارپوریشن کی طرف سے اُسی سال ''ایل ای ڈی انڈیکیٹر لیمپ'' متعارف کرائے۔ مونسانٹو نے ایچ پی کو ڈسپلے میں اپنے لیمپ استعمال کرنے کی پیشکش کی لیکن ایچ پی نے اپنی طرف سے اس پر تحقیق کرنا مناسب سمجھا۔ فروری 1969ء میں عطا اللہ، بورڈن اور پیغانی نے ایچ پی ماڈل 5082-7000 نیومرک ڈسپلے پیش کیا۔ یہ دنیا کا پہلا ڈسپلے تھا جس میں ایل ای ڈی انٹیگریٹڈ سرکٹ کی صورت میں استعمال کیے گئے تھے۔ یہ ایل ای ڈی ڈسپلے محض مختلف حرف اور اعداد ہی ظاہر کرتا تھا، لیکن ٹی وی اسکرین سے تو بہت ہی ہلکا پھلکا اور بجلی کے استعمال میں کفایت شعار تھا۔ آج یہ بات بہت کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ پہلے پہل جب ڈیجیٹل گھڑیاں، ڈیجیٹل کیلکولیٹرز اور کریڈیٹ کارڈ ریڈرز وغیرہ جیسے آلات پیش کیے گئے تو ان میں مختلف پیغامات ظاہر کرنے کے لیے ایل ای ڈی ڈسپلے ہی حروف اور اعداد پر مشتمل جواب وغیرہ دکھاتا تھا جو سرخ یا سبز رنگ کی روشنی میں نظر آتے تھے۔ لیکن ایل ای ڈی زیادہ بجلی استعمال کرتی تھیں، اس لیے بیٹری سے چلنے والے آلات میں ایل ای ڈی اسکرین ہر وقت آن نہیں رکھی جا سکتی تھی بلکہ اسکرین کو آن کرنے کے لیے ایک خصوصی بٹن ہوتا تھا جسے دبانے پر وقت وغیرہ ظاہر ہوتا ورنہ اسکرین تاریک سیاہ رہتی۔ یہ پہلا ذہین ڈسپلے تھا جس نے ڈیجیٹل ڈسپلے کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دی۔ یہ ایجاد آنے کی وجہ سے مہنگے، زیادہ بجلی استعمال کرنے والے اور بھاری ''نکسی ڈسپلے'' کا استعمال متروک ہو گیا۔ ہر وقت روشن رہنے والی ''ایل سی ڈی ڈسپلے'' کا ایسے آلات میں استعمال 70 کی دہائی کے وسط میں جا کر شروع ہوا تھا۔

یہاں یہ بات پھر دہراتے چلیں کہ پہلے پہل ایل ای ڈی صرف سرخ رنگ کی روشنی دیتے تھے۔ 1972ء میں پیلا رنگ خارج کرنے والی ایل ای ڈیز ایجاد ہوئیں۔ سفید رنگ کی روشنی دینے والے ایل ای ڈی کا ابتدائی نمونہ 1992ء میں جبکہ عملی طور پر 1997ء میں بین الاقوامی خلائی مرکز میں استعمال ہوا۔

ایل ای ڈی بنانے کے لیے نئے نیم موصل مادوں کی تلاش نے دیگر پرزوں کو بنانے میں بھی مدد دی۔ ان نیم موصل مادوں سے بنے دیگر پرزے ایچ پی کے مائیکرو ویو کے شعبے میں ایسے نیٹ ورک اینالائزر اور سوئیپر بنانے کے لیے انتہائی اہم ضرورت ثابت ہوئے جس نے بیس سے چالیس گیگا ہرٹز تک (فریکوئنسی) پر مشتمل کمیونیکیشن آلات کو عملی شکل میں ممکن بنایا اور یوں ایچ پی کو مختلف ممالک کی افواج کو کمیونیکیشن آلات فراہم کرنے کے کاروبار میں توے سے پچانوے فیصد اجارہ داری حاصل ہو گئی۔

1969ء میں عطا اللہ نے ایچ پی کو بھی خیر باد کہہ دیا اور فیئر چائلڈ سیمی کنڈکٹر میں چلے گئے۔ جہاں ان کو ادارے کا نائب صدر بنایا گیا اور ایچ پی میں ان کی مہارتوں کو دیکھتے ہوئے خصوصی طور پر مائیکرو ویو اور آپٹو الیکٹرانکس کے شعبے کی بنیاد رکھتے ہوئے انہیں اس کا جنرل مینیجر مقرر کر دیا گیا۔ انہوں نے 1969ء میں اس کے مائیکرو ویو اور آپٹو الیکٹرانکس کے شعبے کی بنیاد رکھی۔ عطا اللہ اس شعبے کے مئی 1969ء میں قائم ہونے سے لے کر نومبر 1971ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران انہوں نے ایل ای ڈیز پر اپنی تحقیق جاری رکھی۔ انہوں نے ہی یہ تجویز دی کہ یہ ایل ای ڈیز مختلف آلات میں کسی خاص مقصد کے اشارے دینے کے لیے استعمال ہو سکتی ہیں۔ یوں پہلے پہل ان ایل ای ڈیز کا ٹیپ ریکارڈروں، ٹی وی اور دیگر آلات میں بجلی کی موجودگی اور دیگر اشاروں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ مثلاً ٹی وی میں سرخ رنگ کی بتی بجلی کی ''موجودگی'' کا اشارہ دیتی تھی اور ریموٹ کے ذریعے یا بٹن سے آواز اونچی نیچی کرنے یا چینل تبدیل کرنے کی صورت میں جلتی بجھتی تھی جو کہ صارف کو اشارہ ہوتا تھا کہ وہ جو چاہ رہا ہے، اس کی ہدایت پر عمل درآمد ہو رہا ہے جبکہ ٹیپ ریکارڈر میں یہ بتی بجلی کے علاوہ کیسٹ کے چلنے کی سمت کا پتا دیتی تھی۔ اگر ٹیپ ریکارڈر دونوں سمتوں میں چلنے کی سہولت (آٹو ریورس) رکھتا تو دو ایل ای ڈیز کیسٹ چلنے کی سمت کا اشارہ دینے کے لیے ہوتیں جبکہ بجلی کی نشاندہی کے لیے ایک الگ ایل ای ڈی ہوتی۔ کچھ ایسا ہی کام مائیکرو ویو اوون میں کھانا پکانے کے لیے وقت دکھانے اور دیگر آلات میں ہوتا۔ عطا اللہ نے ہی یہ تجویز دی کہ لیزر خارج کرنے والی ایل ای ڈیز کسی طرح کے آپٹیکل ریڈر کے لیے استعمال ہو سکتی ہیں۔ اس حوالے سے دیگر سائنسدانوں کی مزید تحقیق کے نتیجے میں سی ڈی، لیزر ڈسک وغیرہ کی ایجاد ممکن ہو پائی اور اسی اصول پر آج کے ڈی وی ڈی اور بلوریے پلیئر کام کرتے ہیں۔ عطا اللہ کی تحقیق اور نگرانی کی وجہ سے ستر کی دہائی کے شروع میں فیئر چائلڈ سیمی کنڈکٹر اتنی سستی ایل ای

TAGPK.COM

ڈیز تیار کرنے لگا کہ ایک ایل ای ڈی کی قیمت پانچ سینٹ تک گر گئی۔

ریڈیو کنٹرولر اس وقت تک کوئی ستر سالوں سے موجود تھے جنھیں طیارہ اڑانے اور ٹی وی وغیرہ کو دور سے چلانے کے لیے تجرباتی بنیادوں پر استعمال کیا جا رہا تھا، لیکن وہ بہتر طور پر کام نہ کرتے تھے۔ عطا اللہ کی نئے نیم موصل مادوں کی تلاش کے لیے تحقیق کرانے کے نتیجے میں بالائے بنفشی شعاعیں خارج کرنے والی لیزر ایل ای ڈی کی قیمتیں ڈرامائی طور پر کم ہونے کی وجہ سے سن 1970ء میں آر سی اے نے دنیا کا پہلا ڈیجیٹل ریموٹ کنٹرول متعارف کرایا جس میں موسفیٹ پر مبنی میموری، لیزر کے ذریعے مخصوص ڈیجیٹل اشارے دیتی تھی۔ یہ نظام فوری طور پر رنگین ٹیلی ویژن میں اپنا لیا گیا کیونکہ اس کے ذریعے ریڈیو ریموٹ کنٹرولر اور موٹر سے چلنے والے ٹیونر کی ضرورت ختم ہو گئی لیکن اس وقت تک یہ ریموٹ کنٹرول بہت محدود نوعیت کے کام کرتے تھے جیسے کہ آواز کو کم یا زیادہ کرنا، چینل آگے پیچھے کرنا اور ٹی وی چلانا یا بند کرنا۔ بی بی سی نے 1973ء میں ٹیلی ٹیکسٹ سروس (پی ٹی وی نے 1998ء میں یہ سروس شروع کی تھی) شروع کی جس میں دو تصویروں کے درمیانی وقفے میں ایک تحریر پر مشتمل صفحہ نشر کیا جاتا جس کو دیکھنے کے لیے خصوصی ڈیکوڈر کی ضرورت پڑتی تھی، تو اس کے ریموٹ کے لیے زیادہ پیچیدہ نظام بنانے کی ضرورت پڑی کیونکہ یہاں ٹیلی ٹیکسٹ کے صفحات تین اعداد پر مبنی ہوتے تھے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ریموٹ پر ایک سے نو اور صفر کے حامل اعداد کے بٹنوں کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ دیگر نظام بھی درکار ہوتے تھے جیسے کہ تحریر سے تصویر اور تصویر سے تحریر کی طرف منتقل کرنے کا بٹن۔

نیم موصل مادوں پر اپنے کام کے معاوضے اور رائیلٹی کی مد میں انہیں اتنی آمدن ہونے لگی کہ جلد ہی نیم موصل مادوں پر تحقیق کے شعبے سے اکتا کر عطا اللہ نے 1972ء میں فیئر چائلڈ اور نیم موصل مادوں پر تحقیق کو ہی خیر باد کہہ دیا اور ایک کاروباری شخصیت کے طور پر معلومات کی حفاظت اور رمزنگاری کے شعبے میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ رمزنگاری (کرپٹوگرافی) اور معلومات کی حفاظت (ڈیٹا سیکیورٹی) کے شعبے کی بطور کاروبار بنیاد رکھتے ہوئے۔ 1972ء میں انہوں نے "عطا اللہ [illegible] ادارے کی بنیاد رکھی لیکن [illegible] عطا اللہ

دل پزیر، دل نشیں اور دل گداز تحریروں کی خالق

مصنفہ نسیم ولشاد

صراطِ عشق

پاکیزہ

کے صفحات
کی زینت
بننے جا رہا ہے

ان شاء اللہ
جولائی 2021ء

معاشرے میں پھیلے ان گنت مسائل اور ان کے موثر حل کا
بے حد خوب صورت اور دل خوش کن انداز میں اختتامی اظہار

پاکیزہ قارئین کے ادبی ذوق کے لیے باعث تسکین ہوگا

کارپوریشن'' کر دیا۔ انہوں نے اس وقت امریکا میں تیزی سے فروغ پاتے کریڈٹ کارڈ کے کاروبار میں صارف کی معلومات کی حفاظت اور رقم کی محفوظ طریقے سے منتقلی پر توجہ دی۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے ہارڈ ویئر پر مشتمل آلہ ایجاد کیا۔ 1973ء میں انہوں نے اپنا پہلا ہارڈ ویئر پر مشتمل سیکیورٹی ماڈیول جاری کیا۔ اسے ''عطا اللہ باکس'' کا نام دیا گیا۔ اس نظام کے ذریعے بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں کو صارف کی شناخت کے لیے پاس بک (پاکستان میں یہ پرانا نظام 2000ء کے ابتدا تک موجود تھا) کے پرانے اور دیر کرنے والے نظام کی بجائے پن کوڈ پر صارف کی فوری شناخت کے نظام پر منتقل ہونے کی راہ فراہم کی۔ یہ ایک پن کوڈ پر مشتمل صارف کی شناخت کی تصدیق اور بینک اور صارف کے درمیان رقم کے حوالے سے محفوظ پیغامات کے تبادلے کا ایسا نظام تھا کہ تھوڑی بہت جدت کے ساتھ آج بھی دنیا کی زیادہ تر اے ٹی ایم مشینوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ عطا اللہ کی یہ ایجاد آج کے ''ہائی سیکیورٹی ماڈیولز'' کی بنیاد بنی۔ عطا اللہ نے یہ ''عطا اللہ باکس'' 1973ء میں تجارتی طور پر بینکوں اور مالیاتی اداروں کے سامنے پیش کیا۔ یہ ''عطا اللہ باکس'' صارف اور مالیاتی ادارے کے درمیان ''پن کوڈ'' داخل کرنے اور جواب میں اے ٹی ایم مشین کے پیغامات کو رمزنگاری کے ذریعے محفوظ کر دیتا تھا تاکہ اے ٹی ایم مشین اور بینک کے درمیان جس پیغام (بائٹس) کا تبادلہ ہو تو اس کو راستے میں کوئی ہیکر اچک کر اس میں کوئی تبدیلی نہ کر دے۔ اس سے کسی صارف کے پن کوڈ کی معلومات اچک لینا (ہیکنگ) اور صارف کو جعلی اے ٹی ایم پیغامات کے ذریعے جھانسا دینا (فشنگ) ناممکن کر دیا گیا۔ ساتھ ہی نظام سے ہر وقت منسلک نہ رہنے والے آلات جیسے کہ کریڈٹ کارڈ ریڈر کے لیے پن کوڈ بنانے کی چابی (پن جنریٹنگ کی) ایسی بنائی کہ اسے ٹکہ لگا کر نہیں بوجھا جا سکتا تھا۔ عطا اللہ کا بنایا ہوا نظام اے ٹی ایم مشین کی ظاہری شکل وصورت کو بگاڑے بغیر با آسانی نصب ہو سکتا تھا، اسے لگانے کے لیے مشین کے ہارڈ ویئر میں بھی کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہ پڑتی، بلکہ یہ مشین کے پہلے سے موجود ہارڈ ویئر کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتا تھا۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ صارف کے پیغام بھیجنے اور وصول کرنے کو رمزنگاری کے ذریعے پوشیدہ کر لے۔ اس آلے میں ایک کارڈ ریڈر اور صارف کی شناخت کے لیے دو کی پیڈز کے ذریعے پن کوڈ داخل کرنے کا نظام اور ڈیٹا سافٹ ویئر اور پیغامات کو رمزنگاری کے ذریعے محفوظ کرنے کا نظام شامل تھا۔ اس کے ذریعے صارف اپنا خفیہ کوڈ مشین کے اندر داخل کرتا اور مشین کے اندر موجود کمپیوٹر سافٹ ویئر مائیکرو پراسیسر کے ذریعے اس کوڈ کو کیشیئر کے استعمال کے لیے ایک دوسرے کوڈ میں تبدیل کر دیتا تھا تاکہ کیشیئر بھی صارف کے خفیہ کوڈ کو جان کر اس کے کھاتے میں کوئی گڑبڑ نہ کر سکے۔ دراصل اس وقت کی اے ٹی ایم مشین کی دوسری جانب کیشیئر بھی موجود ہوتا تھا۔ اے ٹی ایم کا بنیادی مقصد اس وقت صرف صارف کو تیزی سے خودکار طریقے سے رقم گن کر فراہم کرنا ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے اے ٹی ایم ''آٹومیٹک ٹیلر مشین'' کا مخفف اپنے کام کی خود وضاحت کرتا ہے۔ رقم کے تبادلے کے دوران صارف کا کھاتہ کارڈ ریڈر کے ذریعے مشین پڑھ لیتی۔ یوں صارف کے تختہ کلید (کی بورڈ) کے ذریعے کھاتہ نمبر کے داخل کرنے میں صارف یا کیشیئر کے غلطی سے کوئی دوسرا کھاتہ نمبر داخل کرنے کا امکان بھی نہ رہا۔ اور یوں جلد ہی یہ ماڈیول دنیا بھر کی اے ٹی ایم مشینوں میں رقم کے محفوظ تبادلے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کے ذریعے صارف کی شناخت کے روایتی طریقہ کار جیسے کہ صارف کے دستخط لینے اور تصدیق کے لیے خفیہ سوال پوچھنے کے بجائے محفوظ پن کوڈ کے نظام کو رواج دیا۔ اس نظام میں رمزنگاری کے لیے محفوظ کیے گئے پیغام کو پڑھنے کے لیے ''کی بلاک'' نامی کوڈ کو بینک میں رقم کی ترسیل کے لیے بینک اور صارف کے درمیان موجود تمام کمپیوٹر آلات سے گزرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس ''کی بلاک'' کے محفوظ تبادلے کے لیے ایک خاص ڈیٹا فارمیٹ بنایا گیا جو کہ آج ''عطا اللہ کی بلاک فارمیٹ'' کہلاتا ہے۔ یہ نظام رمزنگاری کے ذریعے محفوظ کیے گئے تمام ڈیٹا بلاکس میں موجود ہوتا تھا اور ''پیمنٹ کارڈ انڈسٹری ڈیٹا سیکیورٹی سسٹم'' یا (DSS PCI) اور ''امریکن نیشنل اسٹینڈرڈ انسٹیٹیوٹ'' یا (ANSI) کے تمام مروجہ معیارات کو ساتھ لے کر چلتا تھا۔ یہاں بیان کیا گیا پہلا معیار ڈیٹا کے محفوظ تبادلے اور دوسرا صارف اور بینک کے پن کوڈ کا اندراج کرنے کے لیے (ANSI) کریکٹر کے نظام استعمال کرنے کے بارے میں ہے۔

1972ء میں ہی عطا اللہ نے ٹیلیفون کے ذریعے دور سے (ریموٹ) کسی صارف کی شناخت کے نظام (پرسنل

TAGPK.COM

آئیڈنٹی فیکیشن سسٹم) کے پیٹنٹ کے لیے درخواست دے دی۔ اس میں رمزنگاری کے ذریعے ٹیلی فون لنک کو محفوظ بنادیا جاتا تھا تاکہ صارف اپنا پن کوڈ داخل کرے تو اس دوران یہ پن کوڈ کوئی اور ہیکنگ کے ذریعے چرا نہ سکے۔ پن کوڈ اور دیگر رمزشدہ معلومات کا ٹیلیفون لائن کے ذریعے تبادلہ ہوتا تھا۔ یہ نظام ٹیلیفون کے ذریعے بینکاری، ای کامرس اور انٹرنیٹ پر معلومات کے تحفظ کا اوّلین نظام تھا۔ اس نظام کو بنانے اور آزمائشی تجربات کرنے کے بعد جنوری 1976ء میں ''نیشنل ایسوسی ایشن آف میونچوئل سیونگز بینکز'' کے اجلاس میں عطا اللہ نے اپنے عطا اللہ باکس کے ''آئیڈنٹی کی سسٹم'' میں اس حوالے سے جدت لانے کا اعلان کیا۔ اسے ''انٹرچینج آئیڈنٹی کی سسٹم'' کا نام دیا گیا۔ اس نظام سے بینک سے دور رہتے ہوئے کیشیئر کے بغیر بھی رقم کا تبادلہ کیا جاسکتا تھا اور نظام کے محفوظ ہونے کا بھی یقین تھا۔ یہ نظام مختلف ٹیلی فون سوئچنگ نیٹ ورکس اور دیگر نظاموں سے مطابقت رکھتا تھا۔ یہ نظام کریڈٹ کارڈ کے ذریعے بتائے گئے چونسٹھ ہزار الگورتھم میں سے کسی سے بھی خود بخود مطابقت پیدا کرلیتا تھا تاکہ کریڈٹ کارڈ میں معلومات کا محفوظ طریقے سے تبادلہ ہوسکے۔ یہ جدید نظام مارچ 1976ء میں تجارتی پیمانے پر پیش کیا گیا۔ یہ دنیا کا پہلا نظام تھا کہ جس نے بینکوں اور مالیاتی اداروں سے دور رہتے ہوئے بھی رقم کے تبادلے کی سہولت فراہم کی۔ یوں بینکوں کے علاوہ ریستورانوں، بڑی دکانوں، پیٹرول پمپوں اور اس قسم کے دیگر مقامات کہ جو بینک تو نہیں ہوتے تھے مگر جہاں بڑے پیمانے پر رقم کے لین دین کی ضرورت ہوتی تھی، بینک کیشیئر کو تعینات نہ کرنے کی ضرورت ہونے کی وجہ سے اے ٹی ایم مشینیں وہاں بھی نصب کی جانے لگیں۔ چونکہ ان مشینوں کو ہیکنگ اور چوری کا زیادہ خطرہ ہوتا تھا، اس کے لیے 1979ء میں عطا اللہ نے پہلا نیٹ ورک سیکیورٹی پروسیسر پیش کیا۔

اس نظام نے بینکوں اور مالیاتی اداروں اور صارف کی معلومات کو محفوظ کرنے کے طریقے کو بدل ڈالا اور امریکہ سمیت پوری دنیا میں یہ نظام اپنالیا گیا لیکن اس خوف سے کہ صرف عطا اللہ ہی اس نظام کے واحد اجارہ دار نہ ہوجائیں بینکوں اور کریڈٹ کارڈ جاری کرنے والوں نے اسی عطا اللہ باکس کی بنیاد پر ایک بین الاقوامی معیار بنانے کی داغ بیل ڈالی۔ یہ نظام آئی بی ایم کے بعد میں بنائے گئے ''آئی بی ایم تھری سکس ٹو فور'' نظام سے ملتا جلتا تھا۔ عطا اللہ کا بینکاری کے شعبے میں آئی بی ایم سے براہِ راست کاروباری مقابلہ تھا۔ آئی بی ایم کا یہ نظام بنانے والے ماہرین نے عطا اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر ہی یہ نظام ترتیب دیا تھا۔ پھر بھی 1998ء تک دنیا بھر کی نوّے فیصد اے ٹی ایم مشینوں میں ''عطا اللہ باکس'' ہی استعمال ہورہا تھا۔ 2006ء تک یہ تعداد گر کر چھیاسی فیصد ہوگئی لیکن اب بھی دنیا کے زیادہ تر اے ٹی ایم نیٹ ورکس میں رقم کے تبادلے کے لیے عطا اللہ کے تیار کیے گئے نظام ہی استعمال ہورہے ہیں۔ عطا اللہ کے ادارے کے تیار کیے ہوئے آلات بینکاری کے شعبے میں لازماً استعمال ہونے والے آلات و معیارات کا درجہ رکھتے ہیں۔ 2013ء میں عطا اللہ کے ادارے کے تیار کیے ہوئے آلات سے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے روزانہ پچیس کروڑ (250 ملین) دفعہ رقوم کا تبادلہ ہو رہا تھا اور پورے سال کی یہ تعداد نوّے ارب تھی۔

1987ء میں عطا اللہ کارپوریشن نے ''ٹینڈم کمپیوٹرز'' کے ساتھ انضمام کرلیا جو کہ ہر وقت آن لائن رہنے والے کمپیوٹروں (سرورز) کے حوالے سے ایک بڑا نام رکھتی تھی اور ظاہر ہے کہ عطا اللہ کے ایجاد کردہ رقم کے تبادلے کے نظام کو ایسے کمپیوٹروں کی ضرورت تھی۔ 1997ء میں ''کومپیک کمپیوٹرز'' نے ''ٹینڈم کمپیوٹرز'' کو خرید لیا۔ 2002 میں عطا اللہ کے سابقہ ادارے ''ایچ پی'' نے ''کومپیک کمپیوٹرز'' اور اس کے ذیلی اداروں کو خرید لیا۔ 2016ء میں ایچ پی نے عطا اللہ کارپوریشن سمیت اپنے تمام سافٹ ویئر پر مشتمل اثاثوں کو چلانے اور آگے ترقی دینے کے لیے ''مائیکرو فوکس'' نامی ذیلی ادارہ تشکیل دینے کا اعلان کیا جو ایچ پی سے الگ تھلگ رہ کر ان سافٹ ویئرز کو ترقی دینے کا کام کرے گا۔ یہ کام 2017ء میں مکمل ہوا۔ مئی 2018ء میں ''ایٹمکو'' نامی جرمن ادارے نے مائیکرو فوکس سے عطا اللہ کارپوریشن خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور مائیکرو فوکس کی رضامندی کے بعد امریکی حکومت سے اکتوبر 2018ء میں ہری جھنڈی ملنے پر یہ سودا طے پائے گیا۔ آج عطا اللہ کارپوریشن ''ایٹمکو عطا اللہ'' کہلاتی ہے۔

1990ء میں عطا اللہ نے اپنے ادارے سے سبکدوشی لینے کا اعلان کیا لیکن ان کی اس شعبے میں ایجادات کو دیکھتے ہوئے کئی بڑے بینکوں کے سربراہان نے عطا اللہ سے درخواست کی کہ وہ انٹرنیٹ کے ذریعے رقم کے محفوظ تبادلے کی کوئی راہ نکالیں۔ یاد رہے کہ موجودہ انٹرنیٹ کا پہلے پہل 1989ء میں استعمال شروع ہوا تھا۔ اس وقت تک انٹرنیٹ

TAGPK.COM

پر معلومات کے تحفظ کے لیے کوئی دائرہ کار طے نہیں ہوا تھا اور نیٹ پر موجود کمپیوٹر میں آنے جانے والی معلومات کے ٹکروں (بائیٹس) کو کوئی بھی اُچکا (ہیکر) با آسانی نظام میں نقب لگا کر صارف کی معلومات اچک سکتا تھا اور ان میں تبدیلی کر کے اپنی مرضی کی معلومات شامل بھی کر سکتا تھا۔ 1993ء میں ''ویلز فارگو بینک'' کے صدر ولیم زوغنڈ نٹ کے قتل کرنے کے بعد عطا اللہ نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے توجہ دی اور انٹرنیٹ پر برقی خطوط، دستاویزات اور آڈیو ویڈیو پیغامات کے محفوظ تبادلے کے لیے قوائد وضوابط اور ہارڈ ویئر آلات پر تحقیق کرنے لگے۔ اپنی تحقیق کو تجارتی پیمانے پر پیش کرنے کے لیے انہوں نے 1996ء میں ''ٹرائی اسٹار ڈیٹا سیکیورٹی'' نامی کاروباری ادارے کی بنیاد رکھی۔ اس وقت تک کسی ادارے کے کمپیوٹر نظاموں کو کسی اچکے سے بچانے کا مروجہ طریقہ کار یہ تھا کہ سارے کمپیوٹر نظام کے گرد حفاظتی ڈھال (فائر وال) ہوتی لیکن اس طریقہ کار میں خامی یہ تھی کہ فائر وال والے کمپیوٹروں کو سارے ڈیٹا کی حفاظت کرنا پڑتی تھی، یوں بہت زیادہ پراسیسنگ طاقت خرچ ہوتی تھی اور اگر ایک دفعہ کوئی اچکا اس نظام کو چکمہ دے کر اس میں گھسنے میں کامیاب ہو جاتا تو ساری معلومات اس کی دسترس میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ انہی خامیوں کو دیکھتے ہوئے عطا اللہ نے نئی راہ اپنائی۔ ان کا تیار کردہ حفاظتی نظام کسی خاص اطلاع کی حامل دستاویز جیسے کہ ورڈ فائل، ادارے کے کھاتے داروں کے کھاتے، یا برقی مراسلہ کے گرد ایک محفوظ رمز شدہ حصار یا لفافہ قائم کر دیتا تھا اور اسے کھولنے کے لیے ایک خاص برقی اجازت نامے جیسے کہ حرف یا جملہ تحریر کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے ہوتا تھا کہ کون سا مخصوص صارف ہی اس دستاویز کو کھول سکتا ہے۔ یوں فائر وال کا کام کسی اجازت نامے کے بغیر آنے والے گھس بیٹھیوں کو ڈھونڈنے اور منتظم کو ان کی نشاندہی کرنے تک محدود ہو گیا۔

عطا اللہ ایک ایسے موجد تھے کہ جن کی تعلیم تو مکینیکل انجینئرنگ کے شعبے کی تھی لیکن مشہور وہ الیکٹرانکس انجینئرنگ کے شعبے میں اپنی ایجادات کی وجہ سے ہوئے بلکہ ان علوم میں انہوں نے نئے علوم کی شاخوں کی بنیاد بھی رکھی۔ ان کا ایجاد کردہ موسفیٹ ٹرانسسٹر مائیکرو الیکٹرانکس، مائیکرو کمپیوٹر اور سیلیکون کی دنیا میں بیک وقت ایک انقلاب لے کر آیا۔ آج کے تمام جدید برقی آلات کی بنیاد موسفیٹ پر ہے۔ موسفیٹ ہر قسم کے مائیکرو پروسیسر، انٹرنیٹ سے منسلک آلات، جیسی کیلکولیٹر، ویڈیو گیم، ڈیجیٹل گھڑی، میموری چپ اور دیگر ڈیجیٹل آلات تیار کرنے کی بنیاد میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے موسفیٹ کو آج کے دور میں برقیات کے شعبے میں سب سے اہم ایجاد مانا اور اسے جدید برقیات کے شعبے کا پہیا ''کام کا گھوڑا'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور موسفیٹ کی ایجاد کو ''جدید برقی آلات کے شعبے میں پہلا قدم'' قرار دیا جاتا ہے۔ موسفیٹ کی ایجاد کو ''موسفیٹ انقلاب'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس ایجاد نے ہی نیم موصل مادوں کی صنعت کو صحیح معنوں میں ترقی دی۔ اس ایک ایجاد نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو مثبت اثر کے ذریعے متاثر کیا ہے۔۔ موسفیٹ نہ صرف نیم موصل مادوں کے شعبے میں بلکہ شاید پورے برقیات کے شعبے کی سب سے اہم ایجاد ہے۔ موسفیٹ کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہوا کہ کمپیوٹر ایک کمرے یا کئی کمروں پر مشتمل ہونے کی بجائے آج کے لیپ ٹاپ اور موبائل کی صورت میں اتنے ہلکے پھلکے بنانا ممکن ہوئے ہیں۔ اس ایک پرزے نے آج کے ڈیجیٹل آلات کے اطلاعات و معلومات کی فراوانی کا سیلاب ہمیں فراہم کیا ہے اور اس پرزے کے شریک موجد عطا اللہ تھے۔ موسفیٹ آج برقی آلات کی تاریخ میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا پرزہ بھی ہے۔ امریکہ کے پیٹنٹ آفس نے اسے ''ایک ایسی ایجاد قرار دیا ہے کہ جس نے انسانی زندگیوں اور ثقافت کو پوری دنیا میں بدل کر رکھ دیا ہے۔''

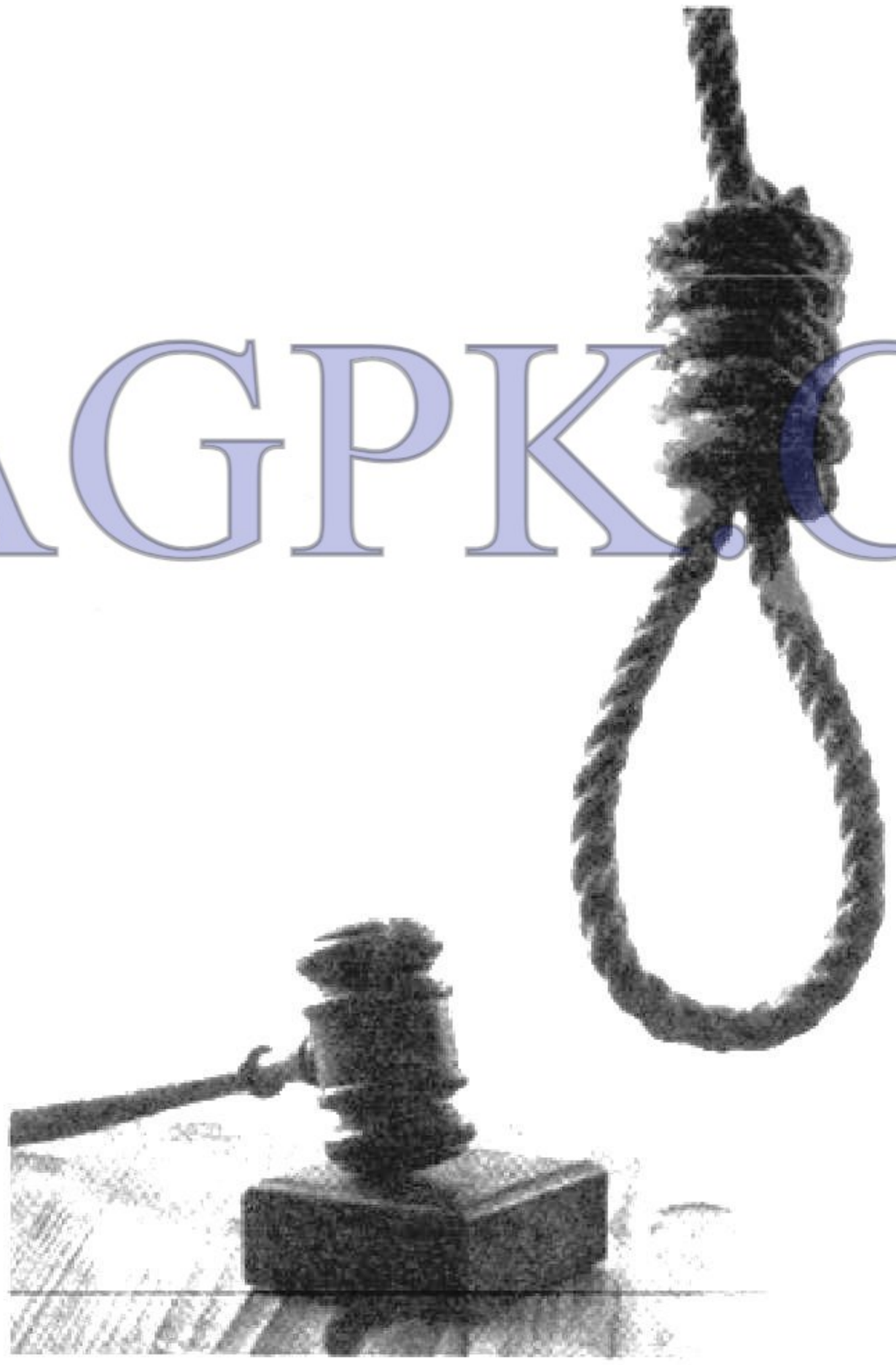
''کمپیوٹر ہسٹری میوزیم'' نے موسفیٹ کی ایجاد کو ''انسانی احساسات و تجربات کو ہمیشہ کے لیے بدل دینے والی ایجاد'' قرار دیا ہے۔ جبکہ فیئر چائلڈ سیمی کنڈیکٹر میں کام کرنے والے انجینئر چیانگ سہ نے عطا اللہ کی 1956ء تا 60ء میں کی جانے والی تحقیق کو جدید برقیات کے شعبے کی ''سب سے اہم تحقیق والی قرار دیا ہے کہ جس نے اس ٹیکنالوجی (نیم موصل مادوں) میں جدت لانے میں بہت مدد دی''۔ چیانگ سہ سروفیس پیسیویشن کے عمل کو وہ مشعل قرار دیتے ہیں جس نے اس راہ کو تاباں کر دیا کہ جس نے آگے چل کر انٹیگریٹڈ سرکٹ اور پھر کمپیوٹر پروسیسر کی راہ ہموار کی۔

جیسا دیس ویسا بھیس کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں میں مارٹن یا جون کے نام سے پکارا جانا پسند کرتے تھے۔ عطا اللہ کا انتقال تیس دسمبر 2009ء کو ایتھرٹن، کیلیفورنیا میں ہوا۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام ہل عطا اللہ ہے۔

++

TAGPK.COM

TAGPK.COM



رقیب

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

رقیب مشرق کا ہو یا مغرب کا، جذبہ رقابت یکساں ہوتا ہے. دونوں ہی فوج کے افسر تھے اور ان دونوں کے درمیان جذبہ رقابت مسلسل پروان چڑھ رہا تھا پھر اس رقابت کا شاخسانہ بھی سامنے آگیا.



یکم دسمبر 1953ء کی صبح جرمنی کے ڈائی برگ نامی مقام پر ''گلے مورگن'' بیرکس میں برطانوی فوج کے ایک سارجنٹ کی لاش رسّی کے سہارے جھولتی پائی گئی۔ پوسٹ مارٹم ہوا، انکوائری ہوئی اور سارجنٹ وارٹس کی موت، خودکشی تسلیم کر کے نظر انداز کر دی گئی۔

آرمی اسپیشل انوسٹی گیشن برانچ کے سارجنٹ والٹر کو کچھ شک ہو گیا کیونکہ معاملے کی تحقیقات کے وقت اس نے سارجنٹ ایمٹ ڈون اور مرحوم سارجنٹ وارٹس کی بیوی کے بارے میں کچھ افواہیں سنی تھیں۔ اس کے علاوہ بیرکوں میں فوجیوں کی حاضری کا جو رجسٹر رکھا رہتا تھا اس میں ایمٹ

ڈون کی حاضری کے ٹائم میں کچھ ردّوبدل کیا گیا تھا... پھر بھی جب اس کیس کو خودکشی تسلیم کرلیا گیا تو اب مزید تحقیقات یا چھان بین کرنا حماقت تھی۔

والٹر انگلینڈ واپس آ گیا۔ وہاں وہ میٹروپولیٹن پولیس میں کام کرنے لگا۔ یہاں اس نے سنا کہ 3 جون 1953ء کو ''لیڈز'' میں ایمٹ ڈون کی شادی سارجنٹ وارنس کی بیوہ سے ہوگئی ہے۔

والٹر نے فوراً جرمنی کی اسپیشل انویسٹی گیشن برانچ سے تعلق قائم کیا۔ اس برانچ نے اپنے جاسوسوں کو ڈرائیوروں کی مصنوعی وردیاں پہنا کر بیرکس میں بھیجا۔ وہاں ان لوگوں کو جو باتیں معلوم ہوئیں ان سے ایک اچھی خاصی فائل تیار ہوگئی۔

یہ فائل اسکاٹ لینڈ یارڈ کو بھیجی گئی۔ یوں یارڈ کی طرف سے کئی سپرنٹنڈنٹ جرمنی بھیجے گئے۔

سارجنٹ وارنس کی لاش قبر سے نکالی گئی۔ ہوم آفس کے پیتھالوجسٹ ڈاکٹر کیمپ بھی انگلستان سے جرمنی گئے تاکہ موت کی اصل وجہ کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے۔

ڈاکٹر کیمپ نے گردن اور ریڑھ کی ہڈی کا بغور معائنہ کیا اور جسم کے بعض حصوں کو تحقیقات کی آسانی کے لیے وہ انگلینڈ لے آئے۔ انہیں یہ پتا لگانا تھا کہ وارنس کی موت رسّی باندھ کر جھولنے سے ہوئی تھی یا دوسرے کسی سبب سے!

مارچ 1955ء کے آغاز میں ایمٹ ڈون پر سارجنٹ وارنس کے قتل کا الزام عائد کردیا گیا۔

ایمٹ ڈون چونکہ آئرلینڈ کا باشندہ تھا اس لیے انگلینڈ کی عدالت اس پر مقدمہ نہیں چلا سکتی تھی۔ اسے کورٹ مارشل کے لیے جرمنی بھیج دیا گیا۔ وہاں جون آخر اور جولائی کے پہلے ہفتے میں سات افسروں کی ایک خاص عدالت میں یہ کیس پیش ہوا۔

گراہم جان سرکاری وکیل تھے اور ایمٹ ڈون کی پیروی کرٹس بائن نے کی۔ لیورپول کے لارڈ رسل بھی صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہونے والے تھے مگر اپنی ناسازیِ طبع کی بنا پر وہ جرمنی نہ پہنچ سکے۔

ایمٹ ڈون نے اپنے اُوپر عائد کردہ الزام قبول کرنے سے انکار کردیا۔

سرکاری وکیل نے معاملے کو عدالت کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''سارجنٹ وارنس کا قتل دوشنبہ 30 نومبر 1953ء کی شام کو کیا گیا۔ اس وقت ایمٹ ڈون کورتھ انفنٹیری ورکشاپ میں کمپنی سارجنٹ میجر تھا۔ وہ تنہا گلے مورگن بیرکس میں رہتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا سوتیلا بھائی رونالڈ رہتا تھا۔ وہ بھی اسی دستے میں شامل تھا۔ وارنس ٹیکنیکل ٹریننگ اسکول میں سارجنٹ تھا۔

کچھ عرصہ پہلے وارنس نے ایک جرمن دوشیزہ سے شادی کرلی تھی اور اس کے بعد اس نے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ بیرکس سے دو میل کے فاصلے پر ایک فلیٹ میں رہنا شروع کردیا تھا۔

وارنس درمیانے قد کا آدمی تھا۔ تقریباً پانچ فٹ ایک انچ اُونچا۔ یہ بات اس کیس میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ایمٹ ڈون کافی لمبا تڑنگا شخص ہے۔ وہ کافی بہادر اور طاقت ور بھی ہے۔ سارجنٹ وارنس بہت ہی زندہ دل اور ہر دلعزیز آدمی تھا۔ اسے سیکنڈ ہینڈ کاریں خریدنے اور فروخت کرنے کا شوق تھا۔ اپنی موت کے وقت بھی اس کے پاس ایک ایسی ہی کار تھی جس کے لیے وہ گاہک تلاش کررہا تھا۔

یکم دسمبر 1953ء کو سارجنٹ وارنس ایک رسّی میں لٹک کر جھولتا ہوا پایا گیا۔ اسے اس حالت میں سب سے پہلے سارجنٹ فرائی اور ایمٹ ڈون نے دیکھا۔ اس وقت تک لاش اکڑ کر سخت ہوچکی تھی۔

ڈاکٹر ڈیک میل نے پوسٹ مارٹم کیا تھا لیکن غلط نتیجہ اخذ کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے انکوائری کورٹ کے سامنے کہا تھا کہ دم گھٹ جانے اور شاک لگنے کی وجہ سے وارنس کی موت واقع ہوئی تھی۔

اسی سال فروری کے مہینے میں قبرکشائی کرکے سارجنٹ وارنس کی لاش قبر سے نکالی گئی۔ ڈاکٹر کیمپ نے دوبارہ اس کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر کیمپ کی رپورٹ ہے کہ وارنس کی موت گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر جھولنے سے نہیں ہوئی بلکہ گلے کے سامنے کے حصے میں بھرپور وار کرنے کی وجہ سے وارنس کی موت واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی اور کئی ایسے ثبوت ملے جن کی بنیاد پر ایمٹ ڈون مجرم کی حیثیت سے عدالت کے سامنے پیش ہوا۔

☆☆☆

اس معاملہ کا آغاز 1952ء میں ہوا۔ اس وقت سے لے کر وارنس کی موت واقع ہونے تک ایمٹ ڈون کے وارنس کی بیوی سے میل جول اور تعلقات رہے۔ اس عرصہ میں یہ دونوں چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ وارنس کے ساتھ والے فلیٹ میں ٹیلی فون تھا۔ وارنس کی

بیوی کو وہاں بلا کر ایمٹ ڈون دوپہر کے وقت اکثر اس سے فون پر باتیں کیا کرتا تھا۔

اس وقت وارنس دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے کام پر جا چکا ہوتا تھا۔ بیچ بیچ میں شام کے وقت یہ دونوں تفریح کرتے تھے۔

ستمبر 1953ء میں وارنس فوج کے کسی کام سے باہر گیا۔ اس وقت ایمٹ ڈون چھٹی پر ہوتے ہوئے بھی بیرکس میں ہی رہا۔ وارنس جتنے دن گھر سے باہر رہا۔ وہ ہر روز شام کو مسز وارنس سے ملتا رہا اور اس کے ساتھ خوب سیر و تفریح کرتا رہا۔ کبھی کبھی وہ وارنس کے فلیٹ میں بھی چلا جاتا تھا اور کئی کئی گھنٹے وہاں گزارتا تھا۔

نومبر 1952ء میں ایک پارٹی میں چند دوستوں نے ایمٹ ڈون سے پوچھا کہ وہ آج کل اتنا اُداس کیوں رہتا ہے تو اس کے جواب میں ایمٹ ڈون نے کہا کہ وہ ایک شادی شدہ عورت کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔

ایمٹ ڈون جس سارجنٹ کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتا تھا اس سے ایک روز اس نے کہا تھا۔ ''ان بیرکس میں ایک آدمی ایسا ہے جس کی بیوی اگر جلد ہی اپنا رویہ نہ بدلے تو وہ خودکشی کر لے گا۔''

وارنس ایک پرانی کار فروخت کرنے کی تگ و دو میں تھا، ایمٹ ڈون کی وارنس سے دوستی تھی اور وہ اس کار کو فروخت کرانے میں وارنس کی مدد کر رہا تھا۔

اتوار 19 نومبر کو رات کے دس بجے کے قریب ایمٹ ڈون وارنس کے فلیٹ کی طرف گیا۔

وارنس نے کھڑکی میں سے سر نکالا تو ہر ایمٹ ڈون نے آواز لگا کر کہا کہ شام کا سارا وقت اس نے میجر کے ساتھ گزارا ہے۔ اب میجر چلا گیا ہے۔ وہ بھی جا رہا ہے اور اب یہ کہ وہ کل وارنس سے ملاقات کرے گا۔ میجر کی بات سچ تھی یا ایمٹ ڈون نے اپنی طرف سے گھڑی تھی۔ اس بات کا پتا اب ہمیں چل ہی جائے گا۔ عجیب بات یہ تھی کہ بیرکس سے اسٹیشن جانے کا راستہ سارجنٹ وارنس کے فلیٹ کے آگے سے جاتا تھا۔ پھر اسٹیشن جاتے وقت اس مذکورہ میجر نے رُک کر وارنس سے بات کیوں نہیں کی تھی؟ دو سارجنٹ اس شام کو تمام وقت سارجنٹ کے ''میس'' میں رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایمٹ ڈون کے ساتھ کوئی دوسرا شخص وہاں نہیں آیا تھا۔

دوشنبہ 30 نومبر کو سارجنٹ وارنس سہ پہر تین بجے ڈیوٹی پر گیا۔ وہاں وہ ایک سارجنٹ سے گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی۔ فون ایمٹ ڈون ہی کا تھا اور فون پر بات چیت کرنے کے بعد جب وہ اس سارجنٹ کے ساتھ ایمٹ ڈون کے پاس پہنچا تو ایمٹ ڈون نے اسے بتایا کہ میجر کئی گھنٹے سے آیا بیٹھا تھا۔ ابھی ابھی اُٹھ کر گیا ہے اور اب شام کو سات بجے اس سے (وارنس سے) ملاقات کرے گا۔

اسی شام کو سات بجے سارجنٹ وارنس اپنے فلیٹ سے باہر نکلا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے بیچ کر اپنی بیوی سے کچھ کہا اور باہر چلا گیا۔ بس یہیں اسے آخری بار زندہ دیکھا گیا تھا۔

ٹھیک اسی وقت ایک ٹیلی فون کال ملنے پر ایمٹ ڈون بھی بیرکس سے باہر نکلا۔ حاضری کے رجسٹر میں درج تھا کہ 7 بج کر 5 منٹ پر وہ کیمپ سے باہر نکلا۔ 7 بج کر 35 منٹ سے پہلے ہی ایمٹ ڈون واپس لوٹ آیا اور بعد میں کسی نے اس کی حاضری کے خانے میں حاضری کا وقت بدل کر 7 بج کر 40 منٹ کر دیا لیکن ایک کارپورل کا کہنا ہے کہ اس سے کافی پہلے ہی وہ لوٹ آیا تھا۔ ایک اور سارجنٹ نے بھی ایمٹ ڈون کی کار بیرکس کے سامنے پینتالیس سے پہلے ہی کھڑی دیکھی تھی۔ کار کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

7 بج کر 25 منٹ پر ایک دوسرے کارپورل نے داخلی گیٹ نمبر 3 پر تقریباً 5 فٹ لمبا اور اڑھائی فٹ چوڑا ایک بنڈل سا پڑا دیکھا۔ وہ ایک گیس کیپ سے ڈھکا ہوا تھا، لیکن اس نے جب یہ بنڈل دیکھا اس وقت ایمٹ ڈون کی کار باہر نہیں کھڑی تھی۔

بعد میں ایمٹ ڈون کی کار گیٹ نمبر 4 پر کھڑی دیکھی گئی۔ ایمٹ اس وقت کار کا شیشہ صاف کر رہا تھا۔ کار اس شکل میں کھڑی ہوئی تھی کہ دروازے کے اندرونی جانب کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے بعد ایمٹ ڈون اپنی کار وہیں چھوڑ کر گارڈ روم میں چلا گیا۔ کیوں.....؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ یہ بھی پتا نہیں کہ حاضری کی شیٹ میں ایمٹ ڈون کی واپسی کا وقت کس نے بدلا؟ لیکن ایمٹ ڈون بیرکس میں اس جگہ گیا ضرور تھا، جہاں حاضری کا وہ شیٹ اس کے ہاتھ لگ سکتا تھا۔

پھر ایمٹ ڈون نے اپنے سوتیلے بھائی رونالڈ کو بلایا تھا۔ اس کیس میں وہ پہلا اور سب سے بڑا سرکاری گواہ

TAGPK.COM

ہے۔ اس کی گواہی سے سب باتیں صاف صاف سامنے آجائیں گی۔

شوہر کے واپس نہ آنے پر مسز وارنس کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے سارجنٹ وارنس کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ سارجنٹ فرائی اور ایمٹ ڈون اس کی تلاش میں نکلے۔ کار پارک کا ایک چکر لگانے کے بعد ایمٹ ڈون نے رائے پیش کی کہ ممکن ہے کہ وارنس اپنے فلیٹ کی دوسری منزل میں ہو اور تب یہ لوگ اس دروازے سے اندر داخل ہوئے جس کے پاس ہی سیڑھی کی ریلنگ کے سہارے وارنس کا مُردہ جسم لٹک رہا تھا۔ ایمٹ ڈون نے اُوپر چڑھ کر جلدی سے رسّی کھولی۔

بعد میں ایمٹ ڈون نے اپنے بیان میں کہا۔ ''وارنس نے کل شام 7 بجے مجھے بلایا تھا کہ میں اسے بیرکس تک پہنچا دوں۔ 7 بج کر 5 منٹ پر ''سیزر برگ'' ہوٹل میں وہ مجھے مل گیا۔ اس کے ساتھ بیرکس کی طرف لوٹا۔ بڑے گیٹ پر اس نے مجھ سے کہا میں اسے باہر ہی اتار دوں۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ 7 بج کر 40 منٹ سے پہلے ہی لوٹ آئے گا اور یہ بھی کہ کیا میں اسے لینے یہاں آؤں۔ اس نے جواب میں کہا۔

''نہیں تم پریشان نہ ہو۔'' اس کے بعد میں اپنے کام سے چلا گیا۔

لاش برآمد ہونے کے بارے میں ایمٹ ڈون نے کہا ہے۔ ''زینے کی ریلنگ سے ایک رسّی کے سہارے لاش جھول رہی تھی۔ سارجنٹ فرائی فون کرنے چلے گئے۔ میں نے وارنس کی طرف دھیان دیا۔ آگ بجھانے والی ایک بالٹی اس کے پیروں کے پاس لڑھکی پڑی تھی۔ قریب ہی ایک جوتا پڑا ہوا تھا۔

میں نے رسّی کی گرہ کھولی۔ وارنس کا بے جان جسم لڑھک کر گر پڑا۔ زمین سے اس کے پیر تقریباً چھ انچ اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ گرتے وقت اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں اُسے کاریڈور میں لے جا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کی جان نکل چکی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے تک میں وارنس کی لاش کے پاس ہی بیٹھا رہا۔''

اسی روز صبح تھوڑی دیر بعد مسز وارنس کو یہ خبر دینے خود ایمٹ ڈون ہی گیا۔

ڈاکٹروں نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ وارنس کی موت رسّی میں لٹک کر جھولنے سے واقع نہیں ہوئی بلکہ گردن کے اگلے حصے میں مہلک ضرب پہنچانے سے ہوئی تھی۔

گلے پر موجود نشان سے یہ بات واضح تھی کہ وار کافی طاقت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ہتھیلی کے پچھلے حصے سے اس قسم کی شدید چوٹ پہنچانے کی ٹریننگ آرمی فوج کی ایک خصوصی ٹریننگ میں دی جاتی تھی۔ اس ٹریننگ میں ایمٹ ڈون بھی شامل تھا اور وہ بھی اس قسم کی ٹریننگ حاصل کر چکا تھا۔

وارنس کی موت رسّی کے پھندے میں جھولنے سے واقع نہ ہونے کے اور بھی کئی ثبوت ہیں۔ ایک تو دم گھٹ کر جان نکلنے پر آنکھوں اور پھیپھڑوں کی رگیں پھٹ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ویل لیک نے سب سے پہلے لاش کا معائنہ کیا تھا۔ ان کا بھی یہی بیان ہے کہ شریانوں کے پھٹنے یا ٹوٹنے کے کوئی نشان نہیں پائے گئے۔

اس کے علاوہ..... پوسٹ مارٹم کے وقت دیکھا گیا کہ کاندھوں کے بالائی حصے، بانہوں کے اُوپری حصے اور سینے میں کچھ دھبے تھے۔ یہ دھبے موت کے بعد چند گھنٹوں کے اندر پڑے تھے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ موت کے بعد جسم کا جو حصہ نیچے رہ گیا اور جس میں خون نہیں تھا، اس کی جانب خون کا تیزی سے دوران ہوا۔ اگر گلے میں پھندا لگنے سے اس کی موت واقع ہوتی تو اس کے سر کے حصے میں خون منجمد پایا جاتا۔ جسم کے جن حصوں میں یہ داغ ملے ہیں ان سے یہ بات عیاں ہے کہ موت کے بعد جسم ایسی کسی پوزیشن میں پڑا رہا جس میں جسم کے یہ حصے ہی سب سے نیچے رہے۔

سرکاری وکیل کے ذریعہ اس طرح کیس پیش کیے جانے کے بعد عدالت نے جائے وقوع کا معائنہ کیا پھر گواہوں کے بیانات لیے گئے۔

ایک سارجنٹ نے کہا۔ ''وارنس کو شک تھا کہ ایمٹ ڈون کے اس کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ ایک بار اس نے موضوع پر مجھ سے بات چیت کی تھی۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ آیا اس کے (وارنس کے) پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ثبوت تو کوئی نہیں بس مجھے اس پر شک ہے۔''

ایک وارنٹ آفیسر نے بتایا۔ ''ایمٹ ڈون اور مسز وارنس کے آپس میں گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں نے ایک آدھ بار ایمٹ ڈون کو سمجھایا بھی تھا کہ وہ مسز وارنس کا خیال دل سے نکال دے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو مسز وارنس کی جانب اس کا یہ جھکاؤ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔''

سارجنٹ فرائی نے وارنس کی لاش برآمد ہونے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''وارنس کا سر اس وقت جھکا ہوا تھا۔ میں فون کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔ جب واپس آیا تو ایمٹ ڈون مجھے کچھ پریشان سا نظر آیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جونہی اس نے (ایمٹ ڈون نے) لاش رسی کے پھندے سے نکالی۔ اس میں سے عجیب قسم کی آواز نکلی تھی۔ اسی آواز کی وجہ سے وہ اس قدر خوف زدہ نظر آرہا تھا۔''

''لاش کس طرح پڑی ہوئی تھی؟'' سرکاری وکیل نے پوچھا۔

''مردہ جسم کے ہاتھ کچھ عجیب حالت میں تھے۔ میرے خیال سے انہیں جہاں ہونا چاہیے تھا اس سے دو تین انچ اوپر تھے۔ لاش اکڑ کر سخت ہوگئی تھی۔ آگ بجھانے والی بالٹی لاش کے پیروں کے عین نیچے نہیں تھی۔'' فرائی نے کہا۔

سارجنٹ وائٹر نے کہا۔ ''وارنس بہت خوش مزاج آدمی تھا۔ ضرورت کے وقت وہ سب کی مدد کرتا تھا۔''

''اس کے کسی برتاؤ سے کیا آپ یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ کبھی خودکشی بھی کر سکتا ہے؟'' سرکاری وکیل نے پوچھا۔

''جی نہیں''۔ وائٹر نے بہ یک ٹرنت جواب دیا۔

اس کے بعد ایمٹ ڈون کے سوتیلے بھائی رونالڈ کی گواہی ہوئی۔ اس کی گواہی سب سے اہم رہی۔ اس نے بتایا کہ 30 نومبر کی شام کو ساڑھے سات بجے کے لگ بھگ ایمٹ ڈون نے مجھ سے کہا۔ ''تم میرے بھائی ہو نا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں''

تب اس نے کہا کہ اس کی (ایمٹ ڈون) اس آدمی (وارنس) سے کچھ تکرار ہوگئی تھی اور اس نے (ایمٹ ڈون نے) مشتعل ہو کر اس پر مکّے سے وار کر دیا تھا۔

ہم دونوں کئی منٹ تک باہر ٹہلتے اور باتیں کرتے رہے۔ کیونکہ ایمٹ ڈون نے کہا تھا کہ ہمارا اس طرح ٹہلنا اس کے لیے سودمند ہوگا... پھر ہم چار نمبر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ ایمٹ آگے آگے زینے کی طرف بڑھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔

زینے کے پاس پہنچ کر اس نے لاش پر ڈھکا ہوا کپڑا ہٹا دیا تھا۔

''اس وقت لاش کس حالت میں تھی؟'' سرکاری وکیل نے پوچھا۔

''دونوں گھٹنے سینے کی جانب مڑے ہوئے تھے اور سر نیچے جھکا ہوا تھا۔ چہرہ نظر آرہا تھا۔ ایمٹ نے کہا کہ وہ اسے خودکشی کی شکل دینا چاہتا ہے۔ اس نے لاش اٹھانے کی کوشش بھی۔ عین اسی لمحے زینے پر سے کچھ لوگوں کے اترنے کی آہٹ ہوئی۔ میں دوڑ کر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ ایمٹ ڈون نے جھپٹ کر لاش پر کپڑا ڈال دیا۔ جب میں لوٹ کر آیا تو ایمٹ نے کہا کہ کسی نے بھی لاش کی طرف نہیں دیکھا ہے۔

تب ہی اچانک میں نے دیکھا کہ زینے کے کنارے پر لگے ہوئے آہنی کھمبے سے ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ ایمٹ نے مجھ سے دوڑ کر آگ بجھانے والی ایک بالٹی لانے کو کہا۔ پھر میں نے لاش اٹھانے میں اس کی مدد کی۔ ایمٹ ڈون بالٹی اوندھی رکھ کر اس پر چڑھ گیا۔ اس نے لاش کی گردن میں رسی کا پھندا پھنسا دیا اور اس کے بعد وہ بالٹی پر سے اتر آیا۔''

''اس کے بعد.....؟''

''بالٹی کو ٹھوکر مار کر پرے کر دیا گیا۔''

''یہ کام کس نے کیا؟''

رونالڈ نے جواب میں کہا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے۔ شاید میں نے ہی ایسا کیا تھا۔ اس کے بعد لاش پر ڈھکا ہوا کپڑا مجھے دیتے ہوئے ایمٹ ڈون نے کہا کہ میں اس کپڑے کو جلا دوں۔ میں نے اسے جلایا نہیں بلکہ اپنے ساتھ انگلینڈ لے گیا۔''

سرکاری وکیل نے پوچھا۔ ''اس شام کیا ایمٹ ڈون نے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ اس پر کوئی حملہ کر رہا تھا؟''

''نہیں..... اور انگلینڈ میں جب مجھے معلوم ہوا کہ ایمٹ ڈون، وارنس کی بیوی سے شادی کر رہا ہے تو اسی وقت میں نے پولیس میں اس معاملے کی رپورٹ کر دی۔''

''کیا تمہارا خیال ہے کہ ایمٹ ڈون نے وارنس کا خون اس لیے کیا تھا کہ وہ اس کی بیوی کے ساتھ شادی کر سکے؟''

''جی ہاں۔''

اس کے بعد مسٹر رابرٹ کی شہادت ہوئی جو آرمی فوج کے دستے کو کسی قسم کے اسلحے کے بغیر لڑنے کے داؤ پیچ سکھاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ مخصوص وار صرف اسی موقع پر کیا جاتا ہے جب اپنے مدّ مقابل کی جان لینا مقصود ہو۔

TAGPK.COM

''کیا اس مخصوص وار سے مدمقابل کو بے ہوش کیا جاسکتا ہے؟'' صفائی کے وکیل مسٹر کرٹس بنٹ نے کہا۔

''ہاں''۔ مسٹر رابرٹ نے جواب دیا۔

''اگر میں آپ کے قریب ہوں اور آپ کی جانب ایک ریوالور تنے رہوں تو کیا آپ میری گردن پر اسی قسم کا وار کریں گے؟'' کرٹس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تب آپ کیا کریں گے میرے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کے لیے؟''

''میں سیدھا ریوالور پر جھپٹ پڑوں گا... کیونکہ اس حالت میں ریوالور ہاتھ میں رکھنے والا شخص یہ بھانپ بھی نہیں سکے گا کہ دوسرا شخص کیا کرسکتا ہے۔''

اس کے بعد پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کا بیان لیا گیا۔ انہوں نے یہ بات قبول کرلی کہ وہ ایک نئے ڈاکٹر تھے اور ان کی تشخیص غلط ہوگئی تھی۔ انہوں نے یہ بات بھی تسلیم کرلی کہ گلے پر وہ زبردست وار پڑنے کے تقریباً فوراً بعد ہی وارٹس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر کیمپ نے بھی کہا کہ گلے پر کافی طاقت کے ساتھ بھرپور پڑنے کی وجہ سے وارٹس کی موت ہوئی تھی۔ صفائی کے وکیل نے کہا۔ ''اس قسم کے وار اگر ہلکے سے کیا جائے تو یہ بھی ممکن تھا کہ وارٹس چکرا کر گر جاتا؟''

''ہاں'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''لیکن اس شدید قسم کے وار سے وارٹس کے مرنے ہی کے آثار زیادہ تھے۔''

سرکاری جانب کی گواہیاں ختم ہوئیں۔ صفائی کی جانب سے وکیل نے کہا۔

''اس سے پہلے کہ میرا مؤکل اپنا بیان دے مجھے کہنا ہے۔ کسی شخص کی چوٹ سے اگر کوئی شخص مرجاتا ہے ضرب پہنچانے والے کو سزا دینے سے پہلے سب باتیں اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے وار سے کسی کی موت ہوجاتی ہے تو اسے قتل نہیں کہا جاسکتا۔ اگر یہ وار غیر قانونی ہو تو حملہ کرنے والے کو قاتل کہا جاسکتا ہے اس کے مدِمقابل کو نہیں۔ اگر قانونی طور پر کسی طریقے پر وار کیا جائے تو وہ قتل نہیں ہے۔ انگلینڈ کا قانون یہی کہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ معاملہ ہے اپنی جان کی حفاظت کا..... ایمٹ ڈون کے سامنے بھرا ہوا ریوالور تھا۔ ایسی حالت میں اگر وہ ریوالور چھین کر وارٹس کو مار دیتا تو قتل نہیں ہوتا۔ انگلینڈ میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ''اپنا بچاؤ نہ کیجیے اور خاموشی کے ساتھ قتل ہو جائیے۔'' ایسے نازک وقت میں خواہ جس طرح بھی ہو۔ دشمن سے ہتھیار چھین کر اپنی جان بچانا نہایت ضروری ہے۔ ایمٹ ڈون نے بھی ایسا ہی کیا، یہ اور بات ہے کہ وہ گھبراہٹ میں اتنا شدید وار کر بیٹھا کہ اس سے وارٹس کی موت ہی واقع ہوگئی۔ میں مانتا ہوں کہ ایمٹ ڈون نے اس معاملے کے فوراً بعد پولیس کے پاس نہ جاکر بے وقوفی کی۔ اس وقت کی پوزیشن سے وہ اس قدر پریشان ہوگیا تھا کہ ان سب باتوں کا خیال رکھنا بھی اس کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔''

اس کے بعد مقدمے کے سب سے اہم حصے کا آغاز ہوا۔ ایمٹ ڈون نے اپنے بیان کے شروع میں ہی کہا۔

''میں نے اپنے بچاؤ کے لیے ہی وارٹس پر حملہ کیا تھا۔''

''وارٹس کی بیوی سے تمہارے کیسے تعلقات تھے؟'' سرکاری وکیل نے پوچھا۔

''محض دوستانہ تعلقات تھے۔'' ایمٹ نے بڑی سادگی سے جواب میں کہا۔

''کیا تم دونوں کے ناجائز تعلقات تھے؟''

''نہیں، ہرگز نہیں.....'' ایمٹ نے سختی سے تردید کی۔

''اس روز کار پر کیا ہوا تھا؟''

''میں نے وارٹس کو بیرکس کے داخلی دروازے نمبر 3 پر اُتار دیا تھا۔ پھر ذرا توقف کے بعد میں یہ دیکھنے کے لیے اندر گیا تھا کہ وہ وہاں کیا کر رہا تھا۔ وہ میری طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ وہ زینے کی ریلنگ سے ایک رسی باندھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری کار کہاں ہے؟'' میں نے جواب میں کہہ دیا۔

''گیٹ نمبر 3 کے سامنے... اور پھر وہ میرے ساتھ آکر کار میں بیٹھ گیا تھا۔''

صفائی کے وکیل نے اپنے مؤکل ایمٹ ڈون سے پوچھا۔

''کیا وارٹس نے ہی آپ سے بات چیت شروع کی تھی؟''

''ہاں.....'' ایمٹ ڈون نے کہا۔ ''اس نے کہا تھا کہ میرے اس کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں اور اس کے پاس اس کا ثبوت ہے۔ میں نے اسے یقین

TAGPK.COM

دلایا کہ اس کی بیوی سے میرے محض دوستانہ تعلقات ہیں لیکن اس نے میری بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی ناراضگی بڑھ کر طیش کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اب وہ میری یہ حرکت سدا کے لیے بند کر دے گا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی کوٹ کی جیب سے اچانک ایک ریوالور نکال لیا تھا۔ ریوالور پہلے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے اس پر سے کپڑا ہٹا دیا تھا۔ وہ اعشاریہ 38 کا ریوالور تھا۔ میں اس ریوالور کا تم نہیں جانتا۔ اس نے ریوالور کا رخ میری جانب کیا ہوا تھا۔ ریوالور کی نال کا رخ میری پیشانی کے وسطی حصے کی جانب تھا۔ اس میں کم سے کم چار گولیاں تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ریوالور کا سلنڈر گھوم رہا ہے۔ میں نے فوراً اپنا بایاں ہاتھ اُٹھایا۔ لائٹ کا سوئچ میرے اس ہاتھ کے بالکل قریب ہی تھا۔''

''کیا تم لائٹ آف کرنے والے تھے؟'' کرٹس بینٹ نے پوچھا۔

''نہیں، میں اس کے جبڑے کے پاس اور کان کے عین نیچے مکہ مارنے والا تھا تاکہ وہ چکرا جائے اور ریوالور میرے ہاتھ لگ جائے۔ میں جان بوجھ کر اسے کوئی ضرر نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ بس، میں نے اس پر مکّہ مارا اور وہ جھپٹ پڑا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے اسے کار پر پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ وہ دروازے سے لگ کر پیچھے کی طرف کھسک گیا، میں نے دوسری طرف جا کر اس طرف کا دروازہ کھولا۔ وارنس کو اُٹھا کر میں نے اسے کھڑا کرنے کی کوشش چاہی۔ پھر میں اسے کاندھے پر ڈال کر دروازہ نمبر 4 کی طرف لے گیا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اسے ہوش آتا جا رہا ہے۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں مجھ سے کہا اور لمحہ بھر بعد ہی پھر بے ہوش ہو گیا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔ اس کے بے ہوش ہونے پر میں گرتے گرتے بچا اور وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر نیچے آ رہا۔ میرا پیر ایک رسی میں اُلجھ گیا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر طمانچہ مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش چاہی، مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے منہ پر ہلکا سا ''فلیس'' آ گیا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی تو وہ بالکل ساکت و سامت تھی۔ تب میں بہت گھبرایا۔ میں نے اسے دیوار کے سہارے ٹکا دیا اور اپنا کوٹ اُڑھا دیا... پھر میں میڈیکل روم میں گیا... وہ بند تھا۔ دروازہ نہ کھلا۔''

کرٹس بینٹ نے پوچھا۔ ''اگر میڈیکل روم میں کوئی ہوتا تو تم اسے کیا بتاتے؟''

''سب کچھ سچ سچ بتا دیتا۔''

''یہ بات تھی تو تم نے کسی افسر کو اس معاملہ کی اطلاع کیوں نہ دی؟''

''میں بری طرح ڈر گیا تھا۔ میں نے اپنے بھائی کو بلایا۔ آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہم نے اسے خودکشی کی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد ہی سب کچھ ہوا جس کا ذکر ابھی ابھی رونالڈ نے کیا ہے۔ بعد میں کار میں مجھے ریوالور ملا۔ اس میں چار گولیاں تھیں۔ گولیاں نکال لینے کے بعد میں نے ریوالور اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ اس کے ایک دو دن بعد ہی میں گرفتار ہو گیا۔''

''ریوالور کا تم نے کیا کیا؟''

''کارپورل روگرس ہمارا کھانا لے کر آتا تھا۔ میں

کلام: ساغر صدیقی

ہے دعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں
میرے نغمات کو انداز نوا یاد نہیں

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

میں نے جن کے لیے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں

کیسے بھر آئیں ہر شام کسی کی آنکھیں
کیسے تھرائی چراغوں کی ضیا یاد نہیں

صرف دھندلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا کون ہوا کس سے خفا یاد نہیں

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغرؔ کو خدا یاد نہیں

TAGPK.COM

نے اس سے کہا کہ میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے رکھنا خلافِ قانون ہے۔ کیا تم اسے کسی طرح ٹھکانے لگا سکتے ہو؟ کارپورل نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کھانے کے برتنوں میں وہ ریوالور اور چاروں کارتوس رکھ کر اس کے حوالے کر دیئے۔ کسی کو شبہ تک نہ ہوا اور وہ لے کر چلا گیا۔"

"لاش برآمد ہونے پر تم نے کیا کیا؟" کرنل بینٹ نے پوچھا۔

رسی اسی طرح بندھی ہوئی تھی کہ مجھے سیڑھی پر چڑھ کر اسے کھولنا پڑا۔ داہنا ہاتھ ریلنگ کے اندر ڈال کر میں نے وارنس کے مردہ جسم کو جیکٹ کے کالر سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے رسی کی گرہ کھولنے کی کوشش چاہی۔ جیکٹ کا کالر پھٹ گیا اور لاش میرے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر پڑی کیونکہ عین اسی لمحہ رسی کی گرہ کھل گئی تھی۔

میں وارنس کی بیوی سے اس لیے ملتا تھا کہ مجھ پر کورٹ مارشل کا ایک کیس چل رہا تھا اور سزا بھگتنے سے پہلے میں انگلینڈ واپس جانا چاہتا تھا۔ انگلینڈ جانے کے لیے مجھے کرنسی تبدیل کرانے کی ضرورت تھی اور اس سلسلہ میں مجھے وارنس کی بیوی سے مدد ملنے کی اُمید تھی۔ ابھی جن گواہوں نے میرے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سب دروغ گو۔ اور جھوٹے ہیں ان لوگوں سے میں نے اس قسم کی کبھی کوئی باتیں نہیں کیں۔

جہاں تک وارنس کی بیوہ سے میری شادی کا سوال ہے تو لیڈز میں اس سے میری ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی اور چوں کہ میرے اس وار سے ہی وارنس کی موت واقع ہوئی تھی اور یہ بات میرے ضمیر کو ملامت کر رہی تھی، اس لیے اس کی تلافی کے لیے میں نے وارنس کی بیوی کے سامنے شادی کی تجویز رکھی اور اس نے میری یہ پیش کش قبول کر لی۔"

"تمہارے خلاف یہ الزام ہے کہ تم نے باقاعدہ پلان بنا کر وارنس کو موت کے گھاٹ اُتارا اور پھر بعد میں اسے خودکشی کا لبادہ پہنا دیا۔ تاکہ تم بچ جاؤ اور اس کی بیوہ سے شادی کر سکو۔"

صفائی وکیل نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔ "اس کے بارے میں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اس میں رتی بھر بھی سچائی نہیں ہے۔" ایمٹ ڈون نے پُرسکون لہجہ میں کہا۔ "میں نے تو صرف وارنس کے ہاتھ سے وہ ریوالور چھیننا چاہا تھا۔"

اس کے بعد ایمٹ ڈون نے عدالت کے سامنے اپنی برانی کار میں اس روز کے واقعات کا مظاہرہ کیا۔ سرکاری وکیل اور صفائی کی جانب کے وکیل اور ڈاکٹر کیمپ نے بھی یہ مظاہرہ دیکھا۔

ایک سپاہی اس جگہ بیٹھا جہاں اس روز وارنس بیٹھا تھا۔ ایمٹ ڈون ڈرائیور کی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے عملی طور پر مظاہرہ کر کے بتایا کہ اس روز وارنس اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا بایاں پیر ایمٹ ڈون کے پیر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس سپاہی کے ساتھ ایمٹ ڈون نے ہلکی سی جدوجہد اور تکرار کی۔ پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی اسی طرح سے مگر نہایت آہستگی سے سپاہی کی گردن کے اگلے حصے پر مار کر دکھائی۔ پھر ایک ریوالور (جو کہ ظاہر ہے خالی تھا) سپاہی کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور ایمٹ ڈون نے ایک بار پھر اسی طرح وار کر کے پستول اس کے ہاتھ سے نیچے گرا دیا۔

"اس روز ریوالور کیا تمہارے سینے کے پاس تھا؟" سرکاری وکیل نے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں ہے۔"

"جب تم نے وار کیا اس وقت وارنس کا سر کس حالت میں تھا؟"

ایمٹ ڈون نے اپنا سر اسی ڈھنگ سے رکھ کر دکھا دیا۔

سرکاری وکیل نے پھر پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کار کی چھت میں لگے ہوئے لیمپ کی ہلکی سی روشنی میں تم نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ریوالور کے اگلے چیمبر میں گولی تھی؟"

"جی ہاں"

عدالت میں واپس پہنچ کر سرکاری وکیل نے پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جن لوگوں نے تمہارے خلاف گواہی دی ہے وہ سب دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں اور تم واحد شخص ہو جو سچ بول رہے ہو۔"

"میں ان گواہوں کے بارے میں اب کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" ایمٹ نے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ "مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک ایک حرف سچ ہے۔"

"وارنس کی موت سے پہلے کیا اس کی بیوی کے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات نہیں تھے؟"

"ہمارے درمیان ایسے کوئی تعلقات نہیں تھے۔"

''لیڈز میں جب تمہاری ملاقات وارنس کی بیوی سے ہوئی۔ اس سے پیشتر کیا تمہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ وہاں اپنی نند کے پاس رہتی ہے؟''

''جی نہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ انگلینڈ میں ہے۔''

''تمہارے اور مسز وارنس کے درمیان کسی قسم کی خط وکتابت نہیں ہوئی تھی؟''

''جی نہیں، میں ڈانس دیکھنے اور میوزک سننے کی غرض سے اس ''کیفے'' میں گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کیفے کی مالکن وارنس کی بہن ہے۔ ایک بار وہ اپنے بھائی سے ملنے جرمنی آئی تھی جہاں اس نے مجھے دیکھا تھا، اسی لیے اس نے مجھے دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا، پھر مجھے معلوم ہوا کہ مسز وارنس بھی ان دنوں وہاں تھیں اور اس طرح میری ملاقات وارنس کی بیوی سے ہوئی۔''

''تم تو لیڈز میں ایک مکان کا بندوبست کرنے گئے تھے؟''

''جی ہاں، اپنے رہنے کے لیے۔''

''اس وقت تک تمہیں اس سے محبت نہیں ہوئی تھی۔''

''جی نہیں۔''

''اس کے بعد تم نے جنوبی کمان میں اپنا تبادلہ کرانے کی خواہش ظاہر کی تھی؟''

''جی ہاں، وارنس کی بیوی کو دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کا وہ المناک حادثہ یاد آ گیا تھا اور میں نے چاہا تھا کہ لیڈز سے دور..... بہت دور چلا جاؤں... تاکہ پھر یہ بات یاد ہی نہ آئے مجھے .....لیکن پھر تین ہفتے بعد بازار میں پھر اتفاقیہ طور پر ہماری ملاقات ہوگئی ... ہم نے ساتھ .... چائے پی۔''

''کیا اسی وقت تم نے مسز وارنس سے شادی کی پیش کش کی تھی؟''

''جی ہاں۔ میری ہی وجہ سے وہ گھر سے بے گھر اور شوہر کے سہارے سے محروم ہوگئی تھی۔ اس کی تلافی اسی طرح ممکن تھی کہ میں اس کا سہارا بن جاؤں۔''

''اس کے بعد مسز وارنس ایک فلیٹ میں رہنے لگی تھیں جہاں تم اکثر آتے جاتے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''اسی فلیٹ میں تم دونوں نے چند راتیں اکٹھے رہ کر بسر کی تھیں؟''

''جی نہیں۔''

''تم نے کہا ہے کہ بیرکس میں داخلی دروازے کے قریبی زینے سے وارنس ایک رسی باندھ رہا تھا۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ خودکشی کرنے والا تھا؟''

''جی ہاں، لیکن میرا خون کرنے کے بعد۔''

سرکاری وکیل نے پھر کہا۔ ''تم نے نومبر کے وسط میں کہا تھا کہ وارنس خودکشی کرنے والا ہے۔''

''جی نہیں، یہ بالکل جھوٹا بیان ہے۔''

ایک ریوالور دکھا کر اس سے پوچھا گیا۔ ''کیا یہی وہ ریوالور ہے جو تم نے روگرس کو دیا تھا؟''

ایمٹ ڈون نے پستول لے کر غور سے دیکھا پھر اسے واپس دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ اس سے ملتا جلتا ہے مگر وہ ریوالور نہیں ہے یہ..... اس کا نمبر میں نے اپنی نوٹ بک میں درج کرلیا تھا۔''

''اس معاملے کو خودکشی کی شکل دینے کے بعد کیا تمہارا دماغ اتنا پُرسکون تھا کہ تم نے اس کا نمبر بھی نوٹ کیا تھا؟''

''اس نوٹ بک میں فوج کے گمشدہ سامان کی لسٹ رکھتا تھا۔ میں نے اس میں دیکھا تھا کہ اس نمبر کا ریوالور درج ہے یا نہیں اور وہ اس فہرست میں درج نہیں تھا۔ اس لیے میں نے درج کرلیا تھا۔''

''تمہاری وہ نوٹ بک کہاں ہے؟''

''مجھے علم نہیں کہ میرے وہاں سے چلے آنے کے بعد میرے سامان کا کیا ہوا۔''

''تم نے اپنے بھائی کو یہ بات کیوں نہیں بتائی تھی کہ وارنس تمہیں قتل کرنے آ رہا تھا؟''

''اس لیے کہ یہ بتانے کے بعد مجھے اس کی وجہ بھی بتانی پڑتی اور میں خود کو بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

''تو تم وارنس کے خون کا الزام قبول نہیں کرتے؟''

''میں اس الزام کو ماننے سے قطعی انکار کرتا ہوں، کیونکہ میرا مقصد وارنس کو قتل کرنا یا اسے سخت چوٹ پہنچانا نہیں تھا۔ میں تو محض اس سے ریوالور چھیننا چاہتا تھا۔''

اس نے وارنس کی سابقہ بیوی اور ایمٹ ڈون کی موجودہ بیوی مارتھا کا بیان لیا۔

مارتھا نے کہا۔ ''میرے سابق شوہر مسٹر وارنس کے جیتے جی مسٹر ایمٹ ڈون کے ساتھ میرے کسی بھی قسم کے تعلقات نہیں تھے۔ یہاں تک کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے بھی نہ دیکھا تھا۔''

''سارجنٹ وارنس کے پاس ریوالور تھا؟''

TAGPK.COM

''جی ہاں۔''

''ایمٹ ڈون سے ان دنوں آپ کس لیے ملا کرتی تھیں؟''

''انگلینڈ جانے کے لیے انہیں کرنسی حاصل کرنے میں میری وجہ سے کچھ کامیابی ہوئی تھی۔ ہمارے درمیان محض دوستانہ تعلقات اور وہ بھی علیک سلیک تک ہی قائم تھے۔ شام کو چہل قدمی کے لیے میں نکلتی تھی تو راستے میں اتفاقیہ طور پر ہماری مڈبھیڑ ہو جاتی تھی اور یونہی باتوں باتوں میں ہم کبھی کبھی اگلے دن ملاقات کا پروگرام بنالیا کرتے تھے۔''

''لیڈز میں آپ کی شادی ہوئی تھی کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ سہاگ رات آپ نے کہاں منائی تھی؟''

''شادی کے بعد بھی لیڈز میں ہی رہی۔ میرے موجودہ شوہر ایمٹ ڈون اس وقت ''کیٹ رک'' میں تھے۔ لیڈز سے پچاس میل دور چند روز بعد ''کیٹرک'' میں ہمیں شادی شدہ فوجیوں کے کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر مل گیا تھا۔ جس روز ہمیں کوارٹر ملا اسی روز اچانک ان کا تبادلہ ''ناٹن'' ہوگیا۔ ناٹن میں ہی ہم نے اپنی سہاگ رات منائی تھی۔''

''شادی سے پہلے کیا آپ کو ایمٹ ڈون سے محبت تھی؟''

''جی نہیں۔''

''اور اب.....؟''

''اب میں ان سے محبت کرتی ہوں۔''

''جس شام کو آپ کے سابق شوہر مسٹر وارٹس کا انتقال ہوا تھا اس شام ان کا برتاؤ آپ سے کیسا تھا؟''

''انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کار انہوں نے سارجنٹ نیکولائی کے ہاتھ فروخت کر دی تھی، اس کے بعد یہ کہہ کر وہ جلد ہی لوٹ آئیں گے، وہ باہر چلے گئے تھے۔ بس اسی وقت ہی میں نے انہیں آخری بار زندہ دیکھا تھا۔''

مارتھا نے سرکاری وکیل کے ایک اور سوال کے جواب میں کہا۔

''شوہر کی موت کے بعد جب میں ان کا اور اپنا سب سامان باندھ کر وہاں سے چلی تو اس میں ان کا ریوالور نہیں تھا۔''

کارپورل روگرس نے اپنے بیان میں کہا۔ ''ایمٹ ڈون نے مجھے ریوالور دیا تو ضرور تھا مگر یہ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ واقعہ مسٹر وارٹس کی موت سے پہلے کا ہے یا بعد کا۔''

ایک اور سارجنٹ نے اپنے بیان میں کہا۔ کارپورل روگرس نے 4 مارچ 1955ء کو ایک ریوالور دیا۔ میں نے وہ ریوالور ''لینس کارپورل'' کو دے دیا تھا۔ انہوں نے اس پستول کو 1955ء سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کر دیا تھا۔

سرکاری وکیل نے آخری بحث سے پہلے ڈاکٹر کیمپ کو ایک بار پھر عدالت کے سامنے پیش کیا۔

''ڈاکٹر کیمپ نے کہا۔ ''ایمٹ ڈون نے مظاہرہ کیا تھا اس میں کیے گئے وار سے مسٹر وارٹس کی موت واقع نہیں ہو سکتی تھی۔ وارٹس پر کافی زور سے وار کیا گیا تھا۔ جو عملی مظاہرہ ایمٹ ڈون نے کیا ہے اس کے مطابق اس کی کہنی گلے کے کافی نچلے حصے میں پڑتی تھی اور اس حالت میں اس سے وارٹس کی جان نہیں جا سکتی تھی۔ وارٹس کے مردہ جسم پر پائے گئے نشانات اس مظاہرے سے قطعی مشابہت نہیں رکھتے۔''

صفائی کی جانب سے وکیل نے کہا۔ ''کسی بھی حادثے کا دوبارہ مظاہرہ کیا جائے تو اس میں کچھ فرق تو آ ہی جاتا ہے۔''

ڈاکٹر کیمپ نے کہا۔ ''یہ میں مانتا ہوں لیکن اس فرق پر ہی تو یہ منحصر ہے کہ اس وار سے کسی کی موت واقع ہو سکتی ہے یا نہیں۔ دو باتیں بالکل صاف اور عیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مصنوعی مظاہرہ کیا گیا۔ اس سے بالکل مختلف حالت میں حقیقی حادثے کے وقت دونوں اشخاص رہے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ حقیقی حادثے کے وقت کافی طاقت کے ساتھ یہ وار کیا گیا ہوگا۔''

اس کے بعد وکیل صفائی نے بحث کا آغاز کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ سچ پوچھا جائے تو اتنے گواہوں کے بیانات اور بحث و مباحثے کے بعد بھی یہ معاملہ صاف نہیں ہوا ہے اور جب تک معاملہ بالکل صاف نہیں ہو جاتا اس وقت تک مشتبہ مجرم کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ قتل کے روز سے پیشتر رات کے دس بجے میرے مؤکل نے باہر سے چلا کر مسٹر وارٹس سے ایک میجر کے بارے میں گفتگو کی اور اس کی بنیاد پر اگلے دن وہ وارٹس کی بیوی کو حاصل کرنے کے لیے اس نے وارٹس کا خون کر دیا۔ مگر یہ بات اب تک ثابت نہیں ہو سکی نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ اس وقت میرے موکل کے مرحوم وارٹس کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔

ریوالور وارنس کا تھا۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایمٹ ڈون اس پستول کو روگرس کے حوالے کیوں کرتا؟ اگر وہ اس کا ریوالور ہوتا تو وہ اسے اپنے پاس ہی رہنے دیتا' کیونکہ پستول چلا کر وارنس کا خون کرنے کا الزام تو کوئی اس پر نہیں لگا سکتا تھا' پھر اگر ایمٹ ڈون یہ بات مان لیتا کہ اس کا مسز وارنس سے ناجائز تعلق تھا اور مسز وارنس اس بات کی توثیق کر دیتیں تو اس کا کیس اور بھی مضبوط ہو جاتا' کیونکہ اس حالت میں ہم یہ بات زیادہ وثوق سے کہہ سکتے تھے کہ وارنس، ایمٹ ڈون کی جان لینا چاہتا تھا لیکن ایمٹ ڈون اور مارتھا نے ایسا نہیں کیا۔ یہ صرف اس لیے کہ ایمٹ ڈون بے گناہ ہے اور اس کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔

ایمٹ ڈون کار کی پچھلی سیٹ سے کچھ نکالنے کے لیے پیچھے جھکا تھا۔ اس درمیان میں وارنس نے جیب سے ریوالور نکال لیا تھا۔ جب میرے موکل ایمٹ نے اپنی جان خطرے میں دیکھی تو اس نے وہ وار کر دیا۔ قانونی نقطہ نظر سے یہ غلط بھی نہیں کیونکہ میرے مؤکل نے صرف اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں وارنس کی موت واقع ہوگئی۔ ان سب بیانات کے بعد اب بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمٹ نے وارنس کا خون کرنے کے لیے نہ تو پہلے سے کوئی منصوبہ تیار کیا اور نہ اس نے جان بوجھ کر اسے قتل کیا۔

صرف مسز وارنس کے ساتھ شادی کر لینے کی وجہ سے ایمٹ ڈون شک کے دائرے میں آ گیا ہے۔ وہ اگر مارتھا سے شادی نہ کرتا تو وارنس کے قتل کرنے کا اس کا کوئی مقصد ہی ثابت نہ ہوتا۔ ذرا سوچیے کہ اگر اس نے جان بوجھ کر قتل کیا ہوتا تو بعد میں ڈر کر ہی وہ مسز وارنس سے شادی کرنے سے باز رہتا؟ آخر میں، میں اتنا عرض کروں گا کہ میرا مؤکل ایمٹ ڈون بالکل بے گناہ ہے اور یہ کہ اسے باعزت طور پر رہا کر دیا جائے۔" اتنا کہہ کر وکیل صفائی اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سرکاری وکیل نے صفائی کی بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

اس کیس میں اگر ایمٹ ڈون کا یہ بیان صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے وارنس پر مہلک وار کیا تھا تو وہ قاتل ہے اور اس کی سزا اسے ملنی چاہیے۔

مسز وارنس سے اس کا شادی کر لینا اس قتل کا ایک زبردست مقصد ہو سکتا ہے، لیکن وہ مقصد تھا یا نہیں یہ فیصلہ کر لینا مشکل ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر کیمپ کا کہنا ہے کہ وارنس پر کافی طاقت کے ساتھ وار کیا گیا تھا اور جس قسم کے وار کا مظاہرہ ملزم نے عدالت کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ اس بھرپور وار سے بالکل مختلف ہے جو ایمٹ نے حقیقی حادثے کے وقت کیا تھا۔

ایمٹ ڈون کا یہ بیان بھی صداقت کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا کہ وارنس کی گردن پر چوٹ لگائی تھی اس حالت میں مناسب تو یہی تھا کہ وارنس سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرتا اور بعد میں خودکشی کر لیتا۔ اپنی بیوی کے عاشق زار..... کو ختم کرنے کے بعد وہ بھلا مرنا کیوں چاہتا؟

اس کے علاوہ جب ایمٹ ڈون نے اپنے سوتیلے بھائی رونالڈ کو بلا کر یہ بات اس کے گوش گزار کی تھی کہ اس سے ایک آدمی کا خون ہو گیا ہے تو یہ بات بھی اس نے (ایمٹ ڈون) رونالڈ کو کیوں نہ بتا دی کہ وارنس اس کی جان لینا چاہتا تھا۔ اور اپنی جان بچانے کے لیے ہی اس نے وارنس پر وار کیا تھا؟ جب اسے یقین ہو گیا کہ قتل کی بات رونالڈ کسی پر ظاہر نہیں کرے گا تو یہ عدم اعتماد اسے کیوں تھا کہ رونالڈ اس کی بدنامی کی بات دوسروں پر ظاہر کر دے گا؟ ضرور اس کے دل میں کچھ چور تھا ورنہ وہ اسی وقت سب صاف صاف بھائی سے کہہ دیتا۔

اگر اپنی جان بچاتے ہوئے غلطی سے وارنس کا خون ہو گیا تھا تو اسی وقت اس نے یہ بات اپنے افسروں کو کیوں نہیں بتائی۔ ایسا کرنے میں اسے کس بات کا ڈر تھا؟ کس چیز کی ہچکچاہٹ تھی؟

ریوالور کا نمبر نوٹ کرنے کی بات مزاح خیز اور سراسر ذہنی پیداوار ہے۔

سات بج کر پانچ منٹ سے ساڑھے سات بجے کے درمیان ایمٹ ڈون موٹر پر ہیز برگ ہوٹل گیا تھا۔ وہاں سے سارجنٹ وارنس کو اپنے ساتھ لایا تھا اور اسے بیرکس تک پہنچایا تھا۔ وارنس نے رسی زینے کے ستون میں باندھی تھی اور پھر وہ دونوں واپس چلے گئے تھے۔ راستے میں ان کے درمیان یہ بھیانک حادثہ پیش آیا جس کے نتیجے میں وارنس جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس کے بعد واپس آ کر ایمٹ ڈون نے اس کی لاش تین نمبر کے دروازے میں رکھ دی تھی۔ بیس پچیس منٹ کے اندر اتنے سارے کام ہوئے تھے۔ یہ بھی ناممکنات میں سے ہے۔

TAGPK.COM

جہاں تک میرا دماغ کام کرتا ہے۔ ہوا شاید یہ تھا کہ ہوٹل سے وارنس کو بیرکس تک لاتے ہوئے راستے میں ایمٹ ڈون نے قتل کر دیا تھا... اور ایسی حالت میں اسے قتل ماننا ہی ہوگا جو پہلے سے بنائے گئے منصوبے کے مطابق کیا گیا تھا۔

جب ایڈوکیٹ جنرل نے اس کیس کے اہم اور قابلِ توجہ واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب تک جو ثبوت ہمیں مل سکے ہیں انہیں مندرجہ ذیل پانچ شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

نمبر ایک: ایمٹ ڈون اور مارتھا کا وارنس کی زندگی ہی میں ملنا اور چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرنا اور بعض کے بیان کے مطابق ان کا آپس میں ناجائز تعلق قائم ہونا۔

نمبر دو: وارنس کا سلوک کچھ گواہوں کے بیان کے مطابق اس کے خودکشی کرنے کا تصور۔

نمبر تین: اس پُراسرار میجر کا ذکر جس کے ذریعے ایمٹ ڈون وارنس کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

نمبر چار: 30 نومبر 1953ء کی رات کے واقعات جب وارنس کا خون ہوا تھا۔

صفائی کی جانب کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ایمٹ ڈون نے وہ وار محض اپنی جان بچانے کے لیے کیا تھا کیونکہ وارنس نے پستول دکھا کر ایمٹ کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ سرکاری وکیل کا کہنا تھا کہ یہ بات بالکل من گھڑت ہے۔ وارنس کا قتل پہلے سے تیار شدہ پلان کے مطابق کیا گیا ہے۔

نمبر پانچ: لیڈز میں ایمٹ ڈون اور مارتھا کی ملاقات جو اگر اتفاقیہ بھی تو ایک عجیب اتفاق تھا۔

جج نے ڈاکٹر کیمپ کی رائے کو اہمیت دیتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر کیمپ کی اس رائے کے بعد کہ گردن پر وار کافی طاقت سے اور سامنے کی جانب سے کیا گیا تھا یہ فیصلہ کرنا آپ لوگوں کا کام ہے کہ جس پریشانی کی حالت میں ایمٹ ڈون اس شام کو تھا اس میں یہ وار اس نے اچانک اور محض اپنی جان بچانے کے لیے کیا تھا یا کہ جان بوجھ کر اور وارنس کی جان لینے کے لیے۔ اس معاملے میں یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ ایمٹ ڈون کا کہنا ہے کہ وہ قتل کے بعد میڈیکل روم میں گیا تھا لیکن وہاں قفل لگا ہوا تھا۔ جب کہ اس کمرے کے چپراسی کا کہنا ہے کہ کمرا اس وقت کھلا ہوا تھا اور اس چپراسی کا بیان صحیح تسلیم کر لینے پر ایمٹ ڈون کا بیان جھوٹا ثابت ہو جاتا ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ایمٹ ڈون نے اس شام کو وارنس پر جو بھرپور وار کیا تھا وہ جان بوجھ کر اور مکمل منصوبہ کے مطابق کیا گیا تھا یا صرف اپنے بچاؤ کے لیے۔''

ساتوں فاضل جج آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

پورے 75 منٹ بعد وہ واپس آئے۔ انہوں نے باتفاقِ رائے ایمٹ ڈون کو قتل کا مجرم قرار دے دیا۔

ایمٹ ڈون کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا لیکن ایمٹ ڈون کو پھانسی ملنے سے پہلے ''صلح نامہ پیرس'' پر دستخط ہو گئے۔ جس کے مطابق جرمن فیڈرل پبلک عالمِ وجود میں آئی اور اس ری پبلک نے یہ اعلان کیا کہ فیڈرل ریاست میں فوجی افسروں کی عدالت سے دی گئی سزائے موت اس وقت کارآمد نہ ہو سکے گی جب تک جرمن قانون اس سزا کی توثیق نہ کر دے۔ اس طرح ایمٹ ڈون کی سزا عمر قید میں بدل دی گئی۔

اس کے بعد کی خبر یہ ہے کہ 7، دسمبر 1955ء کو ایمٹ ڈون کے وکیل جارج کولمین نے کہا تھا۔

''ہم انگلینڈ میں اس کیس کی کافی چھان بین اور تحقیقات کر چکے ہیں۔ جرمنی میں چند باتوں کی اور چھان بین کرنی ہے۔ اس کے بعد ہم اپیل کریں گے۔''

انہوں نے مزید کہا کہ اب تک ہمیں بعض ایسے ٹھوس ثبوت مل چکے ہیں جن سے مستقبل قریب میں ہی یہ ثابت ہو جائے گا کہ ایمٹ ڈون نے اپنی جان بچانے کے لیے ہی وارنس پر حملہ کیا تھا۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہماری پٹیشن پر ملکہ کے قانونی مشیروں کو فوجی عدالت کے خلاف فیصلہ دینا پڑے گا۔

☆☆☆

اب بہ ظاہر ایسا ہی نظر آتا تھا کہ تقدیر ایمٹ ڈون کا ساتھ دے رہی تھی۔ سزائے موت سے عمر قید اور صلح نامہ پیرس..... اس کے بعد اس کے وکیل جارج کولمین کا یہ کہنا۔

9 جون 1956ء میں بالآخر ایمٹ ڈون کا کیس ری اوپن ہوا اور اس کی سزا میں تخفیف کرنے اور بعد میں اچھے چال چلن کے سبب..... اسے 7 اگست 1956ء کو رہا کر دیا گیا۔

TAGPK.COM

ابھی اس دلچسپ مگر لرزہ خیز واردات اور کیس پر مختلف اخبارات میں مزے دار فیچرز اور چٹخارے دار کالمز لکھے جارہے تھے کہ..... 27 ستمبر 1956ء میں لیڈز کے ایک فلیٹ میں جانکاہ دن اور لرزہ خیز شام کا آغاز ہوا۔

لندن کی وہ شام بارش سے بھیگی ہوئی تھی۔ چہار سو ایک دھند چھائی ہوئی تھی۔ ایلون کمرشل اسٹریٹ سنسان پڑی تھی کہ..... ایک خاکروب ..... کو فلیٹ کی کھڑکی کے نیچے سے ..... پانی کی لکیر ٹپکنے کے انداز میں گرتی نظر آئی۔ وہ یہی سمجھا کہ کسی نے نلکا کھلا چھوڑ دیا ہے، جب وہ آگے بڑھا تو چونک گیا۔ جہاں پانی کی لکیر گر رہی تھی وہاں پانی کا پھیلاؤ ویسا نہیں تھا جیسا کہ ہونا چاہیے۔ قریب ہو کے غور سے دیکھنے پر اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ خون کی لکیر تھی۔ جو نیچے میزنائن کے زینے پر بہے بہے کر جم رہا تھا۔

اس نے فوراً پولیس کو مطلع کر دیا۔ پولیس کی ٹیم نے فلیٹ کا دروازہ توڑا تو اندر سے دو لاشیں برآمد ہوئیں۔ ایک مارتھا کی اور دوسری ..... ایمٹ ڈون کی..... وہ اس طرح کہ..... ایمٹ ڈون کے عین دل کے مقام پر گولی لگی ہوئی تھی اور وہاں سے خون بہے بہے کر کمرے کی کھڑکی کے نچلے سوراخ سے نیچے جاتا تھا۔ جبکہ اس کے تھوڑے فاصلے پر اس کی بیوی مارتھا..... بھی آڑی ترچھی لاش کی صورت گری پڑی تھی اور اس کے منہ کی باچھوں سے خون بہے رہا تھا۔ تفتیشی ٹیم نے بعد میں زہر کی شیشی بھی برآمد کر لی تھی۔

ایک بار پھر انگلینڈ سے جرمنی تک ''وارنس مرڈر کیس'' کی سنسنی پھیل گئی۔ چوں کہ فوجی حوالے سے یہ کیس غیر معمولی شہرت اختیار کیے ہوئے تھا، اسی لیے نئی کورٹ کے تحمنی بنچ نے قانون کی ایک شق کی خانہ پری کرتے ہوئے اس کیس کی تمام روداد ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر ایڈگر ہوم کے سامنے رکھ دی۔ اس نے دو دنوں کی مہلت مانگی اور بالآخر اس نے اپنی اسیسمنٹ دے ڈالی، جس کا ہر کسی نے خیر مقدم کیا اور یوں یہ اُلجھا ہوا اور لاینحل کیس اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔

ماہر نفسیات ڈاکٹر ایڈگر ہوم کے مطابق ''سارجنٹ وارنس کا قاتل صرف ایمٹ ڈون ہی نہیں بلکہ مارتھا بھی تھی، کوئی بعید نہ تھا کہ مارتھا نے ہی ایمٹ کو اپنے شوہر وارنس کے قتل پر اُکسایا ہوگا۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ لمبے تڑنگے اور بہادر (جیسا کہ کیس کی روداد والی فائل کے ابتدا میں تھا) کے مقابلے میں پانچ فٹ ایک انچ وارنس اسے ناپسند ہونے لگا۔ مارتھا اور ایمٹ کی چاہے ابتداء میں رسمی یا لیک سلیک سہی، مگر وہ بعد میں ایک ''تعلق'' میں بدل گئی ایسا تعلق جو احساسِ محرومی کے سبب جرم کرنے پر اُکساتا ہے چاہے وہ اخلاقی جرم ہی کیوں نہ ہو۔ اس مختصر اجمالی تفصیل کے بعد اب میں نفسیات کی رو سے اصل بات کی طرف آتا ہوں۔

مارتھا اور ایمٹ نے جب دیکھا کہ وارنس کو ان کے ''تعلقات'' پر شبہ ہو چکا ہے تو مارتھا نے ہی ایمٹ کو اس ''بہادری'' پر اُکسایا ہوگا کہ وہ وارنس کو قتل کر ڈالے۔

ایمٹ نے ایسا ہی کیا۔ دونوں کو کامیابی ہوئی۔ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ایک خمار دماغ اور ذہن سے اُترا تو سب سے پہلے مارتھا کے ضمیر نے کچوکا لگانا شروع کیا۔ ایسے میں جب ایمٹ کو گرفتار کر لیا گیا اور کیس پر طویل بحث و مباحثے کے دوران ..... مارتھا جو کہ اس واردات کی اصل ''ماسٹر مائنڈ'' تھی۔ نفسیاتی جنگ یا پیچیدگیوں کا ذہنی طور پر شکار ہو گئی۔ جب اس کے دوسرے شوہر کو سزائے موت ہوئی تو ممکن ہے اس کے اندر دُکھ کا ایک دھچکا پہنچا ہو، لیکن پھر جب وہی سزائے موت عمر قید اور بعد میں بریت ہوئی تو مارتھا کے ذہن نے ایک یوٹرن لیا۔

یہاں آخر میں، میں پولیس کی تحقیقات پر اپنی رپورٹ کا اختتام کروں گا، جس کے مطابق پڑوسیوں سے حاصل کردہ معلومات سے پتا چلا کہ انہی دنوں دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے اُکھڑا اُکھڑا دیکھا جانے لگا۔ بلکہ اس میں زیادہ دخل مارتھا کا تھا وہ گم صم رہنے لگی۔ کسی سے بات نہ کرتی، حالانکہ ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ دونوں خوش ہوتے۔ پڑوسیوں کو اس بات پر بہر حال اچنبھا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ..... مارتھا کے ضمیر نے اسے ملامت کرنا شروع کر دیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق پستول پر مارتھا کی اُنگلیوں کے نشانات تھے۔ زہر کی شیشی پر بھی اسی کے ہی نشان تھے۔ اس جرم نے اس کے اندر ایک ہل چل مچا دی تھی۔ نفسیات کی رو سے اسے ''MANIA'' کہا جاتا ہے۔ وہ مینک ہو کر رہ گئی تھی۔ بالآخر اس نے پہلے زہر پیا اور بعد میں اپنے قاتل شوہر کو گولی مار دی۔''

اس رپورٹ کے ساتھ ہی وارنس مرڈر کیس کو ہمیشہ کے لیے مہر بند کر دیا گیا۔

++



ستر شوان حصہ

روسیاہ

عارف شہزاد

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آبنوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

جب علی کو ہوش آیا تو وہ ایک اسٹیمر کے کیبن میں موجود تھا۔ اسٹیمر خراب تھا اور اس کے علاوہ وہاں راڈک اور پال موجود تھے۔ علی کو بلیک پوائنٹ جزیرے پر لے جایا جارہا تھا۔ راڈک نے بتایا کہ اس نے بابر اور کلارا کو بے ہوشی کے عالم میں سمندر میں پھینک دیا ہے۔ علی ان سے بچھڑ گیا۔ اسی دوران وہاں راڈک اور پال کے دشمن دوسرے اسٹیمر پر پہنچ گئے اور راڈک گولی کا نشانہ بن گیا۔ پال ان کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ علی نے ایک رات اسی اسٹیمر میں گزاری۔ اگلے روز پھری قزاق اسٹیمر اپنے جزیرے پر لے گئے۔ اس جزیرے پر باس، بیرٹ اور گریٹا موجود تھی۔ علی نے قریباً چار پانچ روز جزیرے پر گزارے پھر اسے موقع ملا تو وہ اسٹیمر لے کر فرار ہوگیا۔ دو روز کے سفر کے بعد اسٹیمر میں ایندھن ختم ہوگیا تو وہ کھلے سمندر میں رک گیا۔ اسی روز ہی بیرٹ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے علی کو گولیاں مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن علی نہ صرف بچ گیا بلکہ اس نے بیرٹ پر قابو پالیا پھر وہ دونوں اچھے دوست بن گئے اور بیرٹ نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کرلیا۔ بیرٹ علی کو اپنے جزیرے پر لے گیا اور سارے واقعات باس کے گوش گزار کردیے۔ باس نے بتایا کہ وہ ہیری نام کے کلب میں کام کرتا رہا ہے اور بلیک پوائنٹ جزیرے کے بارے میں جانتا ہے چنانچہ اگلے روز بیرٹ اور میکس علی کو بلیک پوائنٹ جزیرے پر چھوڑ آئے۔ علی ایک ہفتہ وہاں خوار ہوتا رہا لیکن اسے زمین دوز عمارت نہ ملی۔ وہ جنگل میں موجود تھا کہ وہاں ایک شیر آگیا۔ شیر کے خوف سے علی ایک گپھا میں چھپ گیا۔ خاموشی کے بعد جب وہ گپھا سے باہر آیا تو اچانک کسی نے اس پر حملہ کرکے اسے بے ہوش کردیا۔

(اب آگے پڑھیں)

ہوش میں آتے ہی مجھے سر کے پچھلے حصے میں، جہاں کسی چیز کی ضرب پڑی تھی، ہلکی سی ٹیس محسوس ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ برقرار تھی جو رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ جیسے ہی میں ہوش وحواس کی دنیا میں آیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں خود کو نرم و گداز بستر پر موجود پاکر حیران ہوا۔ میرے اوپر ایک گرم لحاف تھا۔

میں چند لمحے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا، جب بے ہوش ہونے کے سارے واقعات ذہن میں آگئے تو میں نے لحاف ایک سائیڈ پر کرکے اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ میرا لباس بھی بدلا ہوا تھا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ میں اس وقت کہاں تھا۔ میرے پاس ریوالور اور اس کے ایکسٹرا میگزین بھی نہیں تھے اور نہ ہی پنڈلیوں پر بندھے خنجر۔

نامعلوم میں کہاں تھا۔ مجھے بے ہوش کرنے والے کون تھے اور مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ یہ وہ سوالات تھے جن کے جواب دینے کے لیے کمرے میں کوئی دوسرا موجود نہیں تھا۔

کمرا خاصہ بڑا تھا اور دیواروں پر سفید پینٹ کیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چاروں طرف سفید برف پڑ رہی ہو۔ میرے دائیں طرف عجیب و غریب ساخت کی دو مشینیں تھیں جو پلاسٹک کے کور سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ بائیں جانب بیڈ سے چند انچ کے فاصلے پر ایک میز اور ایک کرسی موجود تھی۔ میز پر پانی سے بھرا جگ اور ایک گلاس پڑا تھا۔ پانی دیکھتے ہی مجھے پیاس محسوس ہوئی تو میں نے بستر سے اتر کر گلاس میں پانی بھرا اور گلاس منہ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگا۔

پانی پینے اور گلاس واپس میز پر رکھنے کے بعد میں دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرے کا جائزہ لینے کے دوران ہی مجھے دو کونوں میں کیمرے دکھائی دیے جن کے رخ بستر کی طرف تھے۔ شاید کیمرے کی آنکھوں سے میری حرکات و سکنات دیکھی جارہی تھیں۔ وقت کا بھی کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہاں دیوار گیر گھڑی بھی موجود نہیں تھی کہ جس سے وقت کا پتا چلتا۔ بہرکیف، میں نے دروازے کا جائزہ لیا تو وہ کافی مضبوط تھا اور باہر سے لاک تھا۔ میں نے ہینڈل گھمانے کے ساتھ ہی آوازیں بھی دیں لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ کچھ سوچ کر میں ایک کیمرے کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ ''پلیز..... میری بات سنو۔ پلیز۔''

دیکھنے والوں نے دیکھ تو لیا ہوگا اور یقیناً میری بات بھی سن لی ہوگی لیکن کافی دیر گزرنے کے باوجود کمرے میں کوئی نہ آیا تو میں دانت کچکچا کر رہ گیا۔ اسی لمحے مجھے واش روم جانے کی حاجت محسوس ہوئی تو میں واش روم میں چلا گیا۔ فریش ہونے کے بعد میں آیا تو میز پر ایک بڑی سی ٹرے رکھی تھی۔ جس میں کھانا تھا۔ یقیناً میرے واش روم میں جانے کے بعد ہی کوئی میرے لیے کھانا رکھ گیا تھا۔

بھوک تو مجھے لگی ہوئی تھی اور اللہ نے میرے لیے کھانا بھی بھجوا دیا تھا اس لیے میں نے اللہ کا نام لے کر کھانا کھا

لیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ایک بار پھر کیمرے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھنے والوں کو مخاطب کیا۔ ''پلیز..... میری بات سن لو۔ مجھے اس کمرے سے باہر نکالو۔ کون ہو تم لوگ اور میں کہاں ہوں۔ پلیز۔ میری بات سن لو۔''

ہنوز خاموشی برقرار رہی۔ اگر میں واش روم نہ جاتا اور کھانا لے کر آنے والے پر قابو پا لیتا تو شاید باہر نکلنے کا راستہ مل جاتا یا یہ پتا چل جاتا کہ میں کہاں ہوں؟ وقت گزرتا رہا اور کمرے میں کوئی نہ آیا۔ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اس وقت دن تھا یا رات... کیونکہ نہ ہی کسی دیوار پر کوئی گھڑی تھی اور نہ ہی کمرے کا کوئی روشن دان تھا۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ میں عالم اضطراب میں کمرے میں ٹہلتا رہا، سوچتا رہا، مخمصے کا شکار رہا لیکن کچھ سمجھ نہیں آیا اور نہ ہی کسی نتیجے پر پہنچا۔

ٹہل ٹہل کر جب تھک گیا تو بستر پر بیٹھ کر کیمرے کی طرف دیکھتا رہا۔ ایسے جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہو اور میں اسے دیکھ رہا ہوں لیکن ہم دونوں خاموش ہوں۔ کافی دیر بیٹھے رہنے کے بعد جب مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تو میں بستر پر لیٹ گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد میں نیند کے مزے لے رہا تھا۔

مجھے اس کمرے میں قید تین چار روز ہو گئے لیکن اس دوران وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ شاید کوئی اپنی شکل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ دیوار کے کونے میں ایک کھڑکی تھی۔ جس میں لوہے کی گرل تھی۔ اسی کھڑکی کے ذریعے مجھے کھانا دیا جاتا تھا۔ کھڑکی کے ساتھ اتنی جگہ بنائی گئی تھی کہ وہاں آسانی سے ٹرے رکھی جاتی۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تو کھڑکی کھل جاتی اور ٹرے رکھنے کے بعد دوبارہ بند ہو جاتی۔ میں ٹرے اٹھا کر میز پر آ جاتا اور کھانا کھانے کے بعد ٹرے وہیں کھڑکی میں رکھ دیتا۔ یہ کام اتنی تیزی سے ہوتا کہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی کھڑکی بند ہو جاتی۔

میں نے اپنے طور پر کھڑکی بھی کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن نہیں کھلی تھی۔ دستک دینے کے باوجود جواب بھی نہیں ملا تھا۔ میں نے آج قصد کیا ہوا تھا کہ جب کوئی کھانا دینے آئے گا تو میں اس سے بات کروں گا۔ میں انتظار کرنے لگا۔ میری نظریں کھڑکی پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ دفعتاً کھڑکی کھلنے لگی تو میں جلدی سے بستر سے اتر کر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ قبل اس کے کہ ٹرے کھڑکی میں رکھ کر بند کر دی جاتی میں کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک سیاہ فام آدمی، جو سیاہ لباس میں ملبوس تھا، ٹرے کھڑکی میں رکھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی لیکن کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہ کیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کھڑکی بند کرتا، میں نے جلدی سے اُس سیاہ فام آدمی کو مخاطب کیا۔ ''سنو.....''

میری بات کے جواب میں اس نے انتہائی درشتگی سے کہا۔ ''اے چپ..... اپنا کھانا اٹھا اور جا کر کھا لے۔''

''مجھے بات کرنی ہے۔'' میں نے احتجاجاً کہا۔ مجھے اس کا لہجہ پسند نہیں آیا۔

''چپ.....'' سابقہ لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ گویا مجھے اشارہ کر رہا تھا کہ میں چپ رہوں۔

''کیا میں ہیری ٹام کی قید میں ہوں؟'' میں نے دریافت کیا لیکن اس نے میری بات ان سنی کر دی اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے جھٹکے سے کھڑکی بند کر دی۔ میں نے ہونٹ بھینچے اور اسے کوستے ہوئے ٹرے اور بوتل اٹھا کر میز پر آ گیا۔ اُس کے طرزِ تخاطب پر میں بھنا گیا تھا لیکن کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔

مجھے اس کمرے میں کتنے روز قید رہنا تھا کچھ اندازہ نہ تھا۔ البتہ مجھے یقین تھا کہ میں ہیری ٹام کی قید میں ہوں اور اسی جزیرے پر ہوں۔ اب تو مجھے اس کمرے میں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی روزینہ کی بھی فکر تھی۔ شاید ہم دونوں ایک ہی جزیرے پر موجود تھے لیکن وہ میری آمد سے بے خبر تھی۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو کہ میں اس کی بازیابی کے لیے جزیرے پر پہنچ گیا ہوں لیکن یہ میرا اپنا قیاس تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں بلیک پوائنٹ جزیرے کی بجائے کسی اور جگہ پر موجود ہوں۔

ایک رات میں نے خواب میں روزینہ کو دیکھا، وہ کسی تاریک غار میں بھٹک رہی تھی، چیخ رہی تھی، اپنی مدد کے لیے کسی کو بلا رہی تھی۔ ''کوئی ہے جو مجھے اس غار سے باہر نکالے۔ کوئی ہے..... کوئی ہے.....'' لیکن اس کی آواز غار میں بازگشت بن کر گونج جاتی۔ بالآخر وہ کھردری زمین پر بیٹھ گئی اور اپنا سر گھٹنوں میں دے کر سسکیاں بھرنے لگی۔ چند لمحے سسکیاں بھرنے کے بعد وہ اٹھی اور اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ دوڑتے دوڑتے وہ غار سے نکل کر ساحلِ سمندر پر پہنچ گئی۔ سمندر کا ٹھاٹھیں مارتا پانی اس کے پیروں سے ٹکرا کر واپس چلا جاتا۔ روزینہ سمندر کو سپاٹ نظروں سے دیکھتی ہوئی کسی گہری سوچ میں غرق تھی یوں جیسے اسے پتھر کا بت بنا

دیا گیا ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ میکانکی انداز میں چلتی ہوئی سمندر کی طرف بڑھ گئی۔

اُس کے عقب سے امی کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ بھی ساحلِ سمندر پر موجود تھیں اور اسے رکنے کا کہہ رہی تھیں۔ ''رک جاؤ..... رک جاؤ..... روزینہ..... رک جاؤ..... میں آ گئی ہوں۔ خود کو موت کے حوالے نہ کرو۔ رک جاؤ۔''

ان کے لہجے میں التجا میں تھیں، خوف تھا، دلاسا تھا۔ روزینہ نے امی کی آواز سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن اسے وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ چند لمحے وہ شکتے کی کیفیت میں مبتلا رہی پھر بولی۔ ''امی! آپ کہاں ہیں، آپ مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہیں۔ میں مرنے جا رہی ہوں۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ ذلت کی زندگی سے بہتر ہے میں مر ہی جاؤں۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ مڑ کر سمندر کی گہرائی کی طرف بڑھی۔ اب امی کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ صرف پانی کا شور تھا۔ رفتہ رفتہ روزینہ گہرے پانی میں چلی گئی اور بالآخر سمندر میں ڈوب گئی۔

یکدم میری آنکھ کھلی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سردی کے باوجود میرا وجود پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ میں لمبی لمبی سانس لے رہا تھا۔ یہ کیسا خواب تھا جس نے مجھے جھنجوڑ دیا تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو میں اُسی کمرے میں بستر پر موجود تھا۔

''یا اللہ! میری بہن کی حفاظت فرما۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میں نے گلاس میں پانی بھرا اور گلاس منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ پانی پینے سے میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے۔

اِس خواب کی تعبیر کیا تھی، اپنے طور میں نے اندازہ لگایا کہ روزینہ مصیبت میں ہے۔ دوسری تعبیر یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس نے خود کو موت کے حوالے کر دیا ہو۔ سوچتے ہوئے میری نظر کھڑکی کی طرف پڑی تو وہاں ٹرے اور بوتل موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ صبح ہو چکی ہے۔ میں نے ٹرے اور بوتل میز پر رکھی اور واش روم میں گھس گیا۔

وہ سارا دن روزینہ کے بارے میں ہی سوچتا ہوا گزرا۔ اس کی یادیں مجھے ایک پل کے لیے سکون نہیں دے رہی تھیں۔ جیسے جیسے میں اس کے بارے میں سوچتا تو مضطرب ہو جاتا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کافی دیر تک ٹہلتا اور روزینہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں کب سویا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اگلی صبح میں بیدار ہوا تو درد سے مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہوا۔ شاید رات دیر تک جاگنے اور سوچنے کی وجہ سے سر میں درد ہو رہا تھا۔ بہرکیف، میں چند لمحے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر پیشانی تھامے، آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ ابھی تک ناشتا بھی نہیں آیا تھا۔ واش روم جانے کی حاجت ہوئی تو میں واش روم میں چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد واپس آیا تو اچانک آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ چھا گئی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میری بینائی اچانک چلی گئی ہو۔ اگلے ہی لمحے مجھے چکر آنے لگے اور میں گرنے سے پہلے ہی بستر پر بیٹھ گیا۔ دماغ میں تاریکی غلبہ پانے میں مصروف تھی۔ میرے ساتھ ایسا کیوں..... اور کیا ہو رہا تھا سمجھ سے باہر تھا۔

بستر پر بیٹھے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ مجھے اپنے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جن کے رینگنے کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ جیسے جیسے چیونٹیاں رینگ رہی تھیں مجھے اپنے دماغ میں اذیت محسوس ہوئی۔ درد کی تیز لہریں دماغ میں یوں گردش کرنے لگیں جیسے گولہ گھومتا ہے۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ اچانک میرے دماغ میں چیونٹیاں کیوں رینگنا شروع ہو گئی تھیں۔ جس سے میری حالت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ چند سیکنڈز کے بعد دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اگر چیونٹیاں اسی طرح رینگتی رہیں تو حقیقتاً میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ ایسی حالت سے میں پہلی بار متعارف ہوا تھا۔ قریب تھا کہ میرے منہ سے اذیت ناک چیخ نکل جائے گی۔ گو کہ میں نے خود پر جبر کیا ہوا تھا لیکن کب تک؟

تکلیف کی شدت سے میں بے حال ہو گیا تھا۔ اب یہ حالت ہو گئی کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا ہوا تھا۔ بال ایسے نوچ رہا تھا جیسے میں حقیقتاً پاگل ہو گیا ہوں۔ اُس لمحے میری کیفیت واقعی پاگل کی سی تھی۔ عالم اذیت میں میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں بے جان ہو کر بستر سے لڑھک کر فرش پر گر گیا۔ میں نے بہ دستور اپنا سر تھاما ہوا تھا اور بالوں کو بری طرح سے نوچ رہا تھا۔

جب درد برداشت سے باہر ہو گیا تو میں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے..... کوئی ہے..... مجھے اس اذیت سے نجات دلاؤ..... کوئی ہے..... کوئی

TAGPK.COM

ہے.....''

میری چیخیں کمرے میں بازگشت بن کر واپس میری ہی سماعت سے ٹکرا گئیں لیکن مجھے بالکل بھی ہوش نہیں تھا۔ کیمروں کی آنکھوں سے دیکھنے والوں سے میری حالت پوشیدہ نہیں تھی۔ کوئی بھی کمرے میں آتا اور مجھے اس اذیت سے نجات دلانا گوارا نہیں کر رہا تھا۔ دیکھنے والے میری حالت سے شاید محظوظ ہو رہے تھے۔ بعد ازاں میری ناک اور آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہو گیا۔ بہ مشکل تمام میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن چند قدموں کا فاصلہ عبور کرنے کے بعد میں لڑکھڑا کر گر گیا۔ ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔

''ک..... ک..... کوئی..... ہے..... کوئی..... ہے..... م..... م..... میری..... مد..... دو..... کرو..... پ..... پ..... پلیز..... میری مدد کرو۔'' میں زور زور سے دوبارہ چلایا۔ وہ سب ہی بے رحم اور سفاک تھے۔ جو مجھے اذیت میں مبتلا دیکھنے کے باوجود نہیں آ رہے تھے۔

میں دوبارہ چلایا۔ ''پ..... پلیز..... پلیز..... م..... میری مدد کرو..... میرا دماغ..... آہ.....'' ٹیسیں تھیں کہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں اور کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔

میں دوبارہ اٹھنے کی کوشش میں گر گیا۔ ساتھ ہی میں چلایا۔ ''بد..... بختو! ک..... ک..... کیا تم بہرے ہو۔''

میں دوبارہ اٹھنے لگا تھا کہ دھپ سے سینے کے بل فرش پر گر گیا۔ تبھی دروازہ کھلا اور کچھ افراد داخل ہوئے۔ میں دھندلی آنکھوں سے اندر داخل ہونے والوں کی صرف ٹانگیں ہی دیکھ سکا۔ وہ دو آدمی تھے۔ میرے قریب آ کر انہوں نے مجھے اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ کے باعث ان کے چہرے واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہیولے حرکت کر رہے ہوں۔ ایک آدمی نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سرنج نکال کر میرے بازو میں گھونپ دی۔ میں پہلے ہی ذہنی اذیت میں تھا، سوئی سے ہونے والی اذیت کا کچھ پتا ہی نہ چلا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دماغی اذیت بھی آہستہ آہستہ جاتی رہی اور آخر کار میں بے ہوش ہو گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں بستر پر نیم دراز تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ بہ دستور موجود تھی جو آہستہ آہستہ چھٹ گئی۔ میں نے دیکھا، دو آدمی میرے بیڈ کے دائیں بائیں الرٹ سے کھڑے تھے۔ ان دونوں نے اپنے سر کے بالوں کو پونی کیا ہوا تھا۔ دونوں کلین شیو تھے لیکن ایک کی آنکھیں چھوٹی تھیں جبکہ دوسرے کی آنکھیں بڑی تھیں۔ خباثت ان دونوں کے چہروں سے ٹپک رہی تھی۔

میں نے ان کا جائزہ لینے کے بعد اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش تو اگلے ہی لمحے میں بے اختیار چونک پڑا۔ میرے دونوں بازو بیڈ کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ میرے دماغ میں پہلا سوال ہی یہی ابھرا کہ مجھے باندھا کیوں گیا ہے؟ میں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا کہ یقیناً قید کرنے والوں کو مجھ سے خطرہ ہے۔ میں تہی دست تھا اور تہی دست سے بھلا کیسے خطرہ ہو سکتا ہے؟

اس سے پہلے کہ میں ان دونوں آدمیوں سے بات کرتا، کمرے کا دروازہ کھلا اور تین افراد داخل ہوئے۔ دو آگے تھے اور ایک ان کے پیچھے تھا۔ وہ تینوں چلتے ہوئے میرے بیڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آگے چلنے والے افراد کو تو دیکھ کر میں نہ صرف چونکا بلکہ میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ یکدم میری آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس لمحے مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔

وہ دو افراد اسماعیل شاہد اور ہیری ٹام تھے۔ ان کے چہروں پر ماسک تھے۔ میں نے اسماعیل شاہد کو اس کی چال اور آنکھوں سے پہچانا تھا جبکہ ہیری ٹام کی پہچان اس کا سگار تھا جسے اس نے مخصوص انداز میں انگلیوں کے درمیان دبایا ہوا تھا۔ اس کا یہ انداز میں نے اُس وقت نوٹ کیا تھا جب میں نے اسے پہلی بار جولیا پیٹرک کے ساتھ دیکھا تھا۔

وہ میرے بیڈ کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اسماعیل شاہد کی آنکھوں میں استہزائیہ چمک تھی۔ ان دونوں کے پیچھے آنے والا ہیری ٹام کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اُدھیڑ عمر تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ اس کا چہرہ داڑھی اور مونچھ سے عاری تھا۔ اس نے شرٹ کے اوپر سفید کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے گلے میں اسٹیتھسکوپ تھا۔ شاید وہ ڈاکٹر تھا۔ مجھے تو یہی لگا تھا۔

''ہیلو..... علی.....'' اسماعیل شاہد کی کھلکھلاتی آواز میری سماعت میں پڑی تو میرے وجود میں نفرت اور غصے کی تیز لہر دوڑ گئی۔ ساتھ ہی میری مٹھیاں بھی خود بہ خود بھنچ

گئیں۔ روسیاہی انسان ہر بار مجھ پر سبقت لے جاتا تھا۔

''تم..... رزیل انسان.....'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی میں نے رسیاں جھنجوڑیں۔ جیسے میں نے انہیں توڑنے کی کوشش کی ہو۔ اسے دیکھ کر واقعی میرے اندر پارہ سا بھر گیا تھا۔ دماغ میں الاؤ سا جل اٹھا تھا۔

اسماعیل شاہد نے میری بات کا برا نہیں مانا کیونکہ وہ سرتاپا ڈھیٹ اور مکار انسان تھا۔ اس نے ماسک کھینچ کر ٹھوڑی پر کیا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ ''مجھے یہاں دیکھ کر تم ضرور حیران ہو رہے ہو گے۔''

''نہیں، میں حیران نہیں ہوں۔'' میں نے لفظوں کو چباتے ہوئے جواباً کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم بھی یہاں ضرور موجود ہو گے۔'' یہ بات میں نے تکے سے کہی تھی۔ میری بات پر اس نے قہقہہ لگایا۔

''تمہارا تکا صحیح لگا۔'' اس نے ہمکاری بھر کر کہا۔ ''خیر، ویسے میں تمہاری ہمت، جرأت اور بہادری کی داد دیتا ہوں۔ تم جیسا نوجوان میں نے آج تک نہیں دیکھا، البتہ کہانیوں میں ضرور پڑھا ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے تو مسٹر ہیری سے کہا تھا کہ تمہیں مار کر سمندر برد کر دیا جائے لیکن یہ نہیں مانا۔ اس نے بتایا کہ یہ تمہیں اپنے گروہ میں شامل کرے گا اس لیے اس نے تمہیں زندہ رہنے دیا ورنہ اس نے تمہیں ایسی اذیت ناک موت مارنی تھی کہ مرنے کے بعد تمہاری روح ہلبلاتی رہتی۔ بہرحال، اب تم خوش ہو جاؤ۔ تمہاری باقی کی زندگی عیش و عشرت میں گزرنے والی ہے، ایسی زندگی جس کا تم نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔'' آخر میں اس نے معنی خیز لہجے میں کہا تھا جس پر میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ اس کی بات میں سمجھ گیا تھا کہ کیسی عیش والی زندگی کی بات کر رہا ہے۔

''کیا میری بہن یہیں موجود ہے؟'' میں نے روزینہ کے بارے میں استفسار کیا۔

''نہیں.....'' اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں چونکا۔ میرے وجود میں ایک لہری دوڑ گئی۔

''پھر وہ کہاں ہے.....؟''

اسماعیل شاہد نے ہیری ٹام کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ ''کیا بتا دوں؟'' ہیری ٹام نے آنکھیں جھپکیں اور سر کو ہلکی سی جنبش دی گویا اس نے اسماعیل شاہد کو بتانے کی اجازت دے دی ہو۔ اسماعیل شاہد نے میری طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے اپنے دائیں رخسار پر ہلکی سی

اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''علی! مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ..... تمہاری بہن اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر تو جیسے میں سُن ہو گیا۔ میری حالت ایسی ہوئی جیسے میں پتھر کا بت بن گیا ہوں۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں اسماعیل شاہد کو دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد جب میرا سکتہ ٹوٹا اور میں ہوش میں آیا تو میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''ک..... ک..... کیا مطلب؟''

''مطلب واضح ہے۔'' اسماعیل شاہد نے کندھے اچکائے۔ ''میں نے کوئی مشکل بات تو نہیں کی جو تمہاری سمجھ میں نہ آئی ہو۔ بہرحال پھر بتا دیتا ہوں کہ تمہاری بہن اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ دوسری دنیا چلی گئی ہے۔ وہ دنیا جہاں سب نے باری باری جانا ہے۔''

مجھے اپنے اندر ٹوٹ پھوٹ محسوس ہوئی۔ حلق میں گرہیں سی پڑیں۔ ''ک..... کیسے؟''

''پہلے میں واضح کر دوں کہ ہم میں سے کسی نے اسے نہیں مارا۔ ہم بے قصور ہیں۔'' اسماعیل شاہد نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور پھر چھوڑ دیے۔ وہ مجھ سے اردو میں بات کر رہا تھا۔ ''ایسا نہ ہو کہ تم مجھے یا ہیری ٹام کو ہی موردِ الزام ٹھہراؤ۔ ہمارا اس کے دوسری دنیا میں جانے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میری بات کا یقین کرو۔''

میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ تاہم میں نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تو اُسے کس نے مارا ہے؟''

''کہا تو ہے اسے کسی نے نہیں مارا۔'' اسماعیل شاہد صراحت سے بولا۔ ''اس نے خودکشی کی ہے۔''

نا جانے مجھے اس کی بات پر یقین کیوں نہیں آیا، میں نے مدھم آواز میں دُہرایا۔ ''خودکشی؟''

''ہاں، خودکشی.....'' اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ''یا یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے موت کو گلے لگایا ہے جیسا کہ ہماری اردو اور پنجابی فلموں میں بھی اکثر دکھایا جاتا ہے۔ جب ولن یا کوئی اور اپنی پسند کی لڑکی کو اغوا کرتا اور اس کی عزت لوٹنا چاہتا ہے تو لڑکی کے ہاتھ میں خنجر یا کوئی اور چیز لگ جاتی ہے تو وہ خود کو مار دیتی ہے..... لیکن تمہاری بہن نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

میں ہونٹ بھینچے اس ملعون کی باتیں سن رہا تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے بات آگے بڑھائی۔

"میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔ تحمل سے سنو۔ جب اُسے یہاں لایا جا رہا تھا تو اس کے ساتھ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ شاید کسی لڑکی نے اُسے بتا دیا تھا کہ اسے کس مقصد کے تحت جزیرے پر لایا گیا ہے۔ بہرحال جب اسٹیمر سے لڑکیوں کو جزیرے پر اتارا جا رہا تھا تو اُس نے اسٹیمر کی دیوار کود کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اسے بچانے کی بے حد کوشش کی گئی لیکن افسوس، وہ آن واحد میں شارک کا شکار ہوگئی۔ مجھے اس کی موت کا بے حد افسوس ہے لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔ ایک نہ ایک روز تو سب نے ہی جانا ہے۔ شاید اس کے اس دنیا سے جانے کا وقت ہوگیا تھا اس لیے وہ تم سے اور تمہاری فیملی سے ملے بغیر ہی دوسری دنیا میں چلی گئی۔ کاش، مجھے تمہیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا، اس بات کا مجھے افسوس رہے گا۔ کم از کم تمہیں امریکا آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی اور نہ ہی تم اپنی زندگی دشوار بناتے۔ اب دیکھ لو، تمہیں اس گروہ کا حصہ بنایا جائے گا جس کا تم نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔"

اس کی طنزیہ باتیں میرا دل چیر رہی تھیں۔ وہ ایسے انداز میں کہہ رہا تھا جیسے کوئی عام سی بات ہو حالانکہ یہ عام سی بات نہیں تھی۔ جس پر گزرتی ہے یا جس کے ساتھ گزرتی ہے اسے پتا ہوتا ہے۔ جب روزینہ کی موت کی خبر میری فیملی کو ملے گی تو ان کی کیا حالت ہوگی؟ خاص کر امی کی..... وہ تو پہلے ہی اس کی جدائی میں اذیت کا شکار ہیں۔ کیا وہ روزینہ کی موت کی خبر برداشت کر سکیں گی؟ میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والے حالات کیا ہوں گے۔

میں خود بھی کرب کا شکار ہوگیا۔ مجھے روزینہ کی موت کا بے حد غم تھا۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ اس نے اپنی عزت کی دھجیاں بکھرنے نہیں دی تھیں۔ عزت بچانے کی خاطر اس نے موت کو ترجیح دی تھی اور میرا سر فخر سے بلند ہوگیا تھا۔ ذلت کی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ وہ بھیڑیوں سے بچ گئی تھی جنہوں نے اسے دن رات نوچنا تھا۔ اُس کی ویڈیوز کے منظرِ عام پر آنے سے ہماری عزت بھی خاک میں مل جاتی۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ دنیا میرے بارے میں کہتی، یہ وہ نوجوان ہے جس کی بہن پورن ویڈیوز میں کام کرتی ہے..... تو اس لمحے میری کیا حالت ہوتی۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔ میں نے دل میں کہا۔

کبھی کبھی میرے دل میں یہ بھی خیال آتا تھا کہ اگر زندگی میں میرا روزینہ سے سامنا اس حال میں ہوا کہ وہ ایک پورن اسٹار ہے تو کیا وہ مجھ سے نظریں ملا پاتی؟ کیا اسے دیکھ کر میرے دل پر خنجر نہیں چلتے؟ کیا میری غیرت یہ گوارا کرتی کہ میری بہن غلط کام کرے۔ بے شک اس میں اس کی رضا شامل نہ ہوتی، مجبوراً وہ ایسا کرتی لیکن جب غیرت جاگتی ہے تو انسان سب کچھ تہس نہس کرنے کی ٹھان لیتا ہے لیکن اللہ نے ہمیں وہ دن ہی دیکھنے نہیں دیا۔ اس سے پہلے ہی روزینہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ مجھے اب کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میری بہن پاکیزہ تھی۔ اس کا دامن داغ دار نہیں تھا۔

"شکر ہے میرے مالک! تُو نے میری بہن کو بے آبرو ہونے سے بچا لیا۔" میں نے سکھ کا سانس لیا۔ "اور میرا سر بھی تُو نے جھکنے نہیں دیا۔"

غم تو تھا لیکن روزینہ کے بے آبرو نہ ہونے کا سن کر میں سرشار بھی تھا۔ اس سارے عرصے میں ہیری ٹام خاموش کھڑا تھا۔ بات وہی تھی کہ ہم اردو میں بات چیت کر رہے تھے جو اس کے سر سے گزر رہی تھی۔ یا ہو سکتا ہے وہ ہماری بات چیت سمجھ رہا ہو۔ بعض گورے ایسے بھی ہیں جو ایشیائی لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے اردو نہ صرف سمجھ لیتے ہیں بلکہ اٹک اٹک کر بول بھی لیتے ہیں۔ شاید ہیری ٹام کا شمار بھی ان گوروں میں تھا لیکن اس نے اردو میں بولنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ وہ خاموش کھڑا ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

"چلو، تمہارے سر سے بہن کا بوجھ تو ہلکا ہوا۔" اسماعیل شاہد نے بھی طویل سانس لینے کے بعد کہا۔

میں نے دانت پیسے۔ "بے شک میرے سر سے میری بہن کا بوجھ اتر گیا ہے لیکن ایک بوجھ ایسا ہے جو اُس وقت ہلکا ہوگا جب میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کروں گا۔ تب مجھے سکون ملے گا۔"

میری بات پر اسماعیل شاہد نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارا یہ خواب..... خواب ہی رہے گا۔ اب تم کبھی بھی اس جزیرے سے نہ نکل پاؤ گے۔ ہماری یہ آخری ملاقات ہے۔ اب لوگ تمہیں پورن ویڈیوز میں ہی دیکھیں گے۔ ہاہاہا۔ اور میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ یہ وہی علی ہے جو میرے پاس ملازمت کرتا تھا لیکن اب پیسوں کے لالچ میں پورن ویڈیوز میں کام کر رہا ہے۔ سب تم پر تھوکیں گے۔ ہاہاہا۔"

اسے قہقہے لگاتے دیکھ کر غصے اور نفرت کی ملی جلی لہر

مجھے اپنے وجود میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں شرر بار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ قہقہہ لگانے کے بعد اسماعیل شاہد نے اپنا کان کھجاتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ''اور ہاں..... یہ بات ذہن میں بٹھا لو، اگر تم سیدھی طرح بات مان گئے تو خوش و خرم رہو گے ورنہ جس ذہنی اذیت سے تم تھوڑی دیر پہلے دوچار ہوئے ہو دوبارہ بھی ہو سکتے ہو... اور اس وقت تک ہوتے رہو گے جب تک تم ڈاکٹر کی بات مان نہیں لیتے۔ یہ بھی سن لو، مسلسل اذیت کے باعث تم پاگل بھی ہو سکتے ہو۔ پاگل ہونے کی صورت میں تمہیں گولی مار کر سمندر برد کر دیا جائے گا اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم ہیری ٹام کے گروپ میں شامل ہو جاؤ۔ پیسا بھی کماؤ گے اور عیش و آرام بھی ملے گا۔ ویسے یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ تمہاری طرح کئی نوجوان اس بزنس سے وابستہ ہیں اور پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔''

''اپنا مشورہ اپنے پاس ہی رکھو رزیل انسان۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''ویسے ایک بات کہوں..... تمہیں برا تو لگے گا لیکن مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔''

''ہاں ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اسماعیل شاہد ہمہ تن گوش ہوا۔

میں نے لمحہ بھر کو سوچا۔ میں جو بات کرنے جا رہا تھا اس سے اسماعیل شاہد کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھنی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ میرا گلا بھی دبا دے لیکن اسے آئینہ دکھانا ضروری تھا۔ ''تم دوسروں کی بیٹیوں کو اغوا کرا کے انہیں پورن اسٹار بنا دیتے ہو۔ تمہاری بھی ایک بیٹی ہے، کیا خیال ہے اگر تم اسے بھی.....''

وہی ہوا جس کا میں نے سوچا تھا۔ اسماعیل شاہد میری بات کا مفہوم سمجھ کر گویا بم کی طرح پھٹ ہی پڑا۔ ''بکواس بند کرواتو کے پٹھے۔ میری بیٹی کا نام بھی لیا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔'' اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔

''ارے ارے کیوں غصہ ہو رہے ہو۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔'' وہ ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔ ''تم نے میری بیٹی کا نام بھی کیسے لیا۔''

غصے سے وہ میری طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ہیری ٹام نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ ''کول ڈاؤن مسٹر اسماعیل..... کول ڈاؤن.....'' اس نے انگریزی میں کہا تھا۔

اسماعیل شاہد پھنکارا۔ ''اس نے میری بیٹی کا نام لیا ہے مسٹر ہیری۔ میں اس کی زبان کھینچ کر کتوں کو کھلا دوں گا۔''

''او کے، او کے۔ کول ڈاؤن۔'' ہیری ٹام مسلسل اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''پلیز لمبے لمبے سانس لو۔''

تب اسماعیل شاہد نے لمبے لمبے سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ بھی سرخ تھا اور آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ میں نے اس کی دھکتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

''دوسروں کی بیٹیوں کی تمہاری نظر میں کوئی عزت نہیں۔ جب اپنی بیٹی پر بات آئی تو سیخ پا ہو گئے۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے مسٹر اسماعیل.....'' میں نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔

''میں تمہاری کھال کھینچ لوں گا بدبخت۔'' وہ دہاڑا۔ تبھی ہیری ٹام نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ٹھنڈا رہنے کی تلقین کی۔

''کول ڈاؤن مسٹر اسماعیل۔'' ہیری ٹام نے پھر اسے سمجھایا۔

''یاد رکھو مسٹر اسماعیل۔ اگر کبھی دوبارہ میرا سامنا عذرا سے ہوا تو میں اسے تمہاری اصلیت ضرور بتاؤں گا۔ ایک بار پہلے بھی میں نے اسے تمہارے کرتوت بتائے تھے لیکن وہ بیٹی تھی نا، باپ کے کرتوتوں پر یقین نہ کر سکی۔ بہرحال اللہ نے چاہا تو میں ایسا ثبوت حاصل کروں گا کہ تم دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ شاید خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''ایسی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔'' وہ یقین بھرے لہجے میں بولا۔

''وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔'' میں نے کہا۔ ''اور ویسے بھی وقت کسی کا دوست نہیں ہوتا۔''

اِس بار اسماعیل شاہد نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مڑ کر ہیری ٹام کی طرف دیکھا اور اسے اشارہ کیا۔ ہیری ٹام نے گردن موڑ کر ڈاکٹر سے انگریزی میں کہا۔ ''ڈاکٹر! اسے پورنوگرافی کے لیے ذہنی طور پر تیار کرو۔''

''او کے مسٹر ہیری.....'' جواباً ڈاکٹر نے سر کو خم دے

TAGPK.COM

کر کہا۔

''اور اگر یہ آمادہ نہ ہو تو اسے ٹارچر کرتے رہو..... اُس وقت تک جب تک یہ پورن ویڈیوز میں کام کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو جائے۔ اور ہاں، اسے مرنا نہیں چاہیے۔ گو اس کے مرنے سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا لیکن میں اسے ہر قیمت پر مسٹر پورن اسٹار بنانا چاہتا ہوں۔ یہ مسٹر اسماعیل شاہد کی فرمائش ہے۔'' ہیری ٹام نے میری طرف دیکھ کر ڈاکٹر کو ہدایات دیں۔

''آپ بے فکر رہیں مسٹر ہیری۔ یہ کیا، اس کا باپ بھی آمادہ ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر نے مکروہ لہجے میں کہا تو ہیری ٹام کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''او کے۔ ہم جا رہے ہیں۔ اب یہ تمہارے حوالے۔'' ہیری ٹام نے کہا اور اسماعیل شاہد سے استفسار کیا۔ ''چلیں مسٹر اسماعیل؟''

''چلیں۔'' اسماعیل شاہد نے کہا اور مڑ کر ہیری ٹام کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ وہ رکا اور مڑ کر مجھے دیکھا۔ ''گڈ بائی آلویز مسٹر علی.....''

میں دانت کچکچا کر رہ گیا۔ وہ چلے گئے۔ کمرے میں اب میرے علاوہ تین افراد رہ گئے تھے۔ تبھی ادھیڑ عمر ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''مسٹر علی! میرا نام بوب ہے..... ڈاکٹر بوب.....'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔ اس کی آواز زنانہ تھی۔ جیسے وہ تیسری جنس سے تعلق رکھتا ہو۔

''تو کیا کروں؟'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

میرا جواب سن کر ڈاکٹر بوب زیر لب مسکرایا۔ ''کافی جوشیلے انسان ہو۔ خیر، تمہارا یہ سارا جوشیلا پن ختم ہو جائے گا۔''

''کیا تم مجھے ذہنی ٹارچر کرو گے؟''

''اگر تم شرافت سے بات مان لو گے تو نہیں کروں گا۔'' ڈاکٹر بوب بدستور مسکرایا۔

میں نے کچھ سوچا اور استفسار کیا۔ ''مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

''پورن ویڈیوز میں کام۔'' اُس نے معنی خیز لہجے میں کہا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اس پر بے حد غصہ آیا۔

''بکواس بند کرو۔ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔'' میرے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

''یہ بکواس نہیں ہے۔'' ڈاکٹر بوب نے کہا۔ ''تمہیں اُس وقت تک ذہنی ٹارچر کیا جاتا رہے گا جب تک تم پورن ویڈیوز میں کام کرنے کی ہامی نہیں بھر لیتے۔ سوچ لو، اذیت برداشت نہیں کر سکو گے۔ موت کی تمنا کرو گے لیکن موت نہیں ملے گی۔''

''تم لوگ کچھ بھی کر لو میں کبھی ایسے واہیات کام نہیں کروں گا۔'' میں نے اسے چیلنج کیا۔

''شاید تم خود کو کافی مضبوط سمجھتے ہو اس لیے چیلنج کر رہے ہو۔'' ڈاکٹر بوب ہنسا۔

''جو مرضی سمجھو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''شاید تمہیں اپنی قوت برداشت پر بہت اعتماد ہے؟'' وہ زیر لب مسکرایا۔ ''کیسے انسان ہو، کیا تمہیں دولت نہیں چاہیے؟ میں حیران ہوں۔'' وہ شاید واقعی حیران تھا یا حیرت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے صرف نظر کیا۔ ''دولت ہے تو سب کچھ ہے۔ اگر دولت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں.....''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''مجھے دولت نہیں چاہیے اور نہ ہی تم مجھے دولت کا لالچ دے کر بہکا سکتے ہو۔''

''میں لالچ نہیں دے رہا۔ حقیقت بتا رہا ہوں۔'' ڈاکٹر بوب نے کہا۔

''میں ایسی دولت پر کروڑوں بار لعنت بھیجتا ہوں۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اب.....''

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روکا۔ ''نہیں..... نہیں، دولت پر لعنت نہیں بھیجتے۔ یہ تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، دولت کے حصول کے لیے لوگ غلط کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کوئی اسمگلنگ کرتا ہے، کوئی فراڈ کرتا ہے، کوئی چوری، ڈاکا زنی..... یہاں تک کہ نوجوان.....''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''مگر میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔ سمجھ گئے تم۔''

''تم شاید کتے کی دم ہو؟'' ڈاکٹر بوب نے ہونٹ بھینچے۔

''اور تم کتیا کی دم ہو۔'' میں نے دوبدو جواب دیا۔

میرے جواب پر ڈاکٹر بوب کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ آنکھوں میں غصے کی سرخی چھا گئی۔ تاہم اس نے خود کو نارمل کر لیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''میں نے تو کوشش کی تھی کہ تمہیں پیار سے سمجھاؤں، تمہیں ذہنی ٹارچر نہ دینا پڑے لیکن تم ویڈیوز میں کام نہ کرنے پر بہ ضد

TAGPK.COM

ہو لیکن میں سوچنے کے لیے تمہیں ایک گھنٹا دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو، اگر آمادہ ہو جاؤ گے تو نہ صرف زندہ بچ جاؤ گے بلکہ عیش و عشرت کی زندگی گزارو گے۔ تمہارے پاس سب کچھ ہوگا۔ دولت..... لڑکیاں..... عیش.....''

یہ بات سن کر ہی مجھے گھن آنے لگی بلکہ میری روح تک لرز گئی۔ جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ایسی غلاظت زدہ اور گناہ سے بھرپور زندگی گزارنے کا تو میں تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر بوب نے ایک بار پھر مجھے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے ایک گھنٹا سوچنے کی مہلت دینے کے بعد اپنے ساتھیوں سمیت چلا گیا۔

میں جھنجلا گیا۔ اس سے بہتر تھا کہ ہیری ٹام مجھے غلاظت میں دھکیلنے کی بجائے موت کے منہ میں پہنچا دیتا۔ بہن تو میری رہی نہیں تھی اب مجھے اس جزیرے پر رہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں کچھ کلک ہوا۔ 'کہیں اسماعیل شاہد نے مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولا کہ..... میری بہن نے سمندر میں کود کر خودکشی کر لی ہے۔'

اس طرف تو میرا دھیان ہی نہ گیا تھا۔ میں خود پر حیران تھا کہ میں نے اسماعیل شاہد کی باتوں پر کیسے اعتبار کر لیا ہے؟ وہ تو ایک دغا باز، جھوٹا، مکار اور رزیل انسان ہے۔ ہو سکتا ہے، شاید میری توجہ ہٹانے اور بہلانے کے لیے اُس نے روزینہ کی موت کا شوشہ چھوڑا ہو تاکہ میرے اندر اُسے تلاش کرنے کی جستجو ختم ہو جائے۔ یہ باتیں دماغ میں آتے ہی مجھ پر اضطراری کیفیت طاری ہو گئی اور میں پہلو بدل کر رہ گیا۔

''یا اللہ! میری مدد فرما۔'' میں نے اللہ سے مدد طلب کی۔ میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ ہمت وہ ہارتے ہیں جو اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں اور آخر میں تصور وار اپنی قسمت کو کوسنے لگتے ہیں کہ..... قسمت میں یہی لکھا تھا۔

رسیاں کس کر باندھی گئی تھیں اس لیے میں بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ میں نے ذہنی طور پر خود کو تیار کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید مجھے ذہنی طور پر ٹارچر کر کے وہ اپنے گروہ میں شامل کر لیں گے لیکن میں نے بھی قصد کر لیا تھا کہ ہیری ٹام کے گروہ میں شامل نہیں ہوں گا اور آخری دم تک ان سے لڑوں گا۔

ڈاکٹر بوب نے مجھے سوچنے کے لیے ایک گھنٹا دیا تھا لیکن میں ایک منٹ میں ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر بوب اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھر آدھمکا۔ ''ینگ مین! کیا سوچا ہے پھر؟''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں۔'' میں نے خوں لہجے میں کہا تو وہ زیرِ لب مسکرایا۔

''یعنی..... تم پورن ویڈیوز میں کام نہیں کرو گے؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''قطعاً نہیں۔''

''اگر کہو تو میں تمہیں سوچنے کے لیے مزید وقت دے سکتا ہوں۔'' وہ مجھ پر احسان جتانے والے انداز میں بولا۔ ''بولو، کتنا وقت چاہیے؟''

''ایک منٹ بھی نہیں۔''

''ہمم.....'' اس نے ہنکاری بھری۔ ''ایک بار پھر سوچ لو مسٹر علی۔ قسمت کی دیوی بار بار دستک نہیں دیتی۔ دولت تمہاری منتظر ہے اور تم ہو کہ اس سے دور بھاگ رہے ہو۔''

میرے مسلسل انکار پر بالآخر وہ سمجھ گیا کہ میں اس کے بہکاوے میں آنے والا نہیں ہوں چنانچہ وہاں سے جانے سے پہلے اس کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے مجھے رسی سے آزاد کر دیا۔ مسلسل بندھے رہنے سے میرے بازو اکڑ گئے تھے۔ میں بستر سے اتر کر اپنے بازوؤں کو گھمانے لگا۔

پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے دماغ میں چیونٹیوں نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا ہو۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے ایک مخصوص قسم کی ریز کمرے میں پھیلائی جاتی تھی جو سیدھی دماغ پر ہی اٹیک کرتی تھی۔ یقیناً وہاں سائنسی نظام قائم تھا کیونکہ مجھے نہ ہی انجکشن لگایا گیا، نہ ہی کوئی دوائی پلائی گئی۔ شاید دکھائی نہ دینے والی ریز پھیلائی جاتی تھی جس سے میری دماغی کیفیت بدل جاتی تھی۔ اب بھی میری پہلے جیسی کیفیت ہو گئی تھی۔

چیونٹیاں پہلے آرام آرام سے رینگتیں رہیں پھر ان کے رینگنے میں تیزی آنے لگی۔ ان کی تیزی کے ساتھ ہی میری اذیت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ سر درد سے پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ پہلے پہل تو میں دانتوں پر دانت جمائے اس اذیت کو برداشت کرتا رہا لیکن کب تک..... برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب

TAGPK.COM

برداشت حد سے بڑھ جائے تو انسان بالآخر پھٹ ہی پڑتا ہے۔

میری حد ختم بھی بالآخر ہوگئی اور میری اذیت بھی ناقابل برداشت ہوگئی تو میں چیخنے، چلانے پر مجبور ہو گیا۔ ''اس اذیت کو ختم کرو..... پلیز..... پلیز۔''

لمحہ بہ لمحہ میری حالت دگرگوں ہوتی جارہی تھی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔ اب حالت یہ تھی کہ میں اپنے سر پر زور زور سے مکے مار رہا تھا۔ گویا دماغ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کررہا ہوں کہ شاید اذیت ختم ہو جائے لیکن یہ خام خیالی ہی رہی۔ اذیت تو کسی طور کم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھتی ہی جارہی تھی۔

''ڈا..... ڈاک..... ٹر.....'' میرے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے لیکن وہ بے رحم اور سفاک انسان تھا۔ میری آہ وفغاں کا اس پر کچھ اثر نہیں پڑا۔

بالآخر میں سر تھامے فرش پر گر گیا اور زور زور سے ایڑیاں رگڑنے لگا۔ سر پر میں مسلسل مکے برسا رہا تھا۔ یہ کیفیت ہی ایسی تھی کہ جیسے مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہو۔ آنکھوں اور ناک سے پانی نکل آیا تھا۔ یہاں تک کہ منہ سے کف بھی بہنے لگا۔ وہ بے حد خوفناک اذیت تھی جو کسی طرح برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دماغ میں چیونٹیوں کے رینگنے کی شدت کم ہو رہی ہے۔ شاید اَن دیکھی ریز کا اثر کم ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری دماغی حالت قدرے بہتر ہو رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میری دماغی حالت تو ٹھیک ہوگئی تھی لیکن سر بہ دستور بھاری ہو رہا تھا اور شاید دماغ میں تاریکی بھی غلبہ پا رہی تھی۔ میں نے فرش سے اٹھنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن یوں محسوس ہوا جیسے جسم میں جان ہی نہیں رہی۔ بار بار کی کوشش بالآخر بے ہوشی کے نتیجے پر انجام پائی اور میں بے ہوشی کی وادی میں پہنچ گیا۔

☆☆☆

نا جانے مجھے کب ہوش آیا، کچھ اندازہ نہ تھا۔ میں اسی حالت میں ہی فرش پر پڑا تھا جیسے بے ہوش ہونے سے پہلے کی حالت تھی۔ دماغ پر اب کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا لیکن جسم پر نقاہت طاری تھی۔ میں کچھ دیر عالم ہوش میں پڑا چھت کو گھورتا رہا پھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بہت ہی خطرناک ذہنی اذیت تھی جس نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگر مجھے اس حالت سے باہر نہ نکالا جاتا تو شاید اب تک میں پاگل ہو چکا ہوتا یا میرے دماغ کی شریان پھٹ چکی ہوتی۔ ایسا میں نے انگریزی فلموں میں دیکھا تھا لیکن آج میں اس عمل سے بھی گزرا تھا اور شاید آگے چل کر بھی گزرنا تھا۔

میں فرش سے اٹھ کر میز کی طرف آیا۔ گلاس میں پانی انڈیلا اور کھڑے کھڑے ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق سے نیچے اتار دیا۔ پانی نیچے سے سکون کی ایک خوشگوار لہر میرے وجود میں سرایت کرگئی۔ اس لمحے بے حد سکون ملا۔

میں بیڈ پر بیٹھ کر پیش آنے والے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ ظاہری بات ہے، میرے انکار پر ڈاکٹر بوب پھر مجھے ذہنی کرب و اذیت میں مبتلا کردے گا۔ میری حالت دوبارہ خراب ہو جائے گی لیکن میں نے قصد کیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، بے شک میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے لیکن میں ایسے غلیظ کاموں کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گا۔ میں کبھی خود کو کمزور نہیں ہونے دوں گا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کھڑکی کے ذریعے میرے لیے کھانا آگیا۔ میں ٹرے اٹھا کر لے آیا اور کھانا کھانے کی بجائے ٹرے میز پر رکھ دی۔ کھانا کھانے کو ابھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ گو دماغ میں سکون تھا لیکن دل اوب رہا تھا۔ اس کی وجہ روزینہ تھی۔ میرے دماغ میں بار بار اسماعیل شاہد کی بات گردش کرتی تھی۔ میرا دل اس کی بات ماننے کو قطعی تیار نہیں تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ سچ کب سامنے آئے گا۔

یہ بات بھی میرے پیش نظر تھی کہ ڈاکٹر بوب مجھے ذہنی اذیت کیوں دے رہا تھا۔ وہ دوائیوں کے ذریعے بھی تو میری ذہنی حالت بدل سکتا تھا۔ مجھے جدید طریقوں سے بھی تو کنٹرول کرکے پورن ویڈیوز میں کام کرنے پر آمادہ کرسکتا تھا۔ آخر وہ مجھے ذہنی طور پر ٹارچر کیوں کررہا تھا؟ وقت آنے پر میں یہ سوالات ڈاکٹر بوب کے سامنے ضرور رکھوں گا۔

اندازاً ایک گھنٹا ہی گزرا تھا کہ ڈاکٹر بوب اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھر آگیا۔ اس بار میں بیڈ سے بندھا ہوا نہیں تھا لیکن میری قوت مدافعت کمزور تھی۔ میں اس کے دونوں ساتھیوں سے ٹکرا نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر بوب کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی جبکہ اس کے ساتھیوں کے چہرے سپاٹ تھے۔ میرے بیڈ سے قریباً دو فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہیلو ینگ مین! طبیعت کیسی ہے تمہاری؟''

''تمہیں کیسے دکھ رہا ہوں؟'' میں نے سوچ لیا تھا کہ

میں خود کو پُرسکون رکھوں گا، تاکہ اسے یہ محسوس ہو کہ وہ مجھے ذہنی ٹارچر کرنے سے میرے ارادے نہیں بدل سکا اس لیے میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہم...'' پہلے ڈاکٹر بوب نے ایک گہری سانس لی پھر ہنکارا بھرا۔ ''لیکن میں! تمہاری اعصابی قوت زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی۔ ابھی بھی وقت ہے، میری بات مان جاؤ۔ ویسے تمہیں ایک بات بتادوں، میرے پاس ایسی گئی دوائیاں ہیں، اگر ان میں سے ایک دوائی بھی تمہیں کھلادوں تو تم فوراً آمادہ ہوجاؤ گے۔ کیا کہتے ہو، دوائی کھلاؤں؟''

شاید ڈاکٹر بوب نے نفسیاتی طور پر مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے بات کی تھی۔ حالانکہ یہی بات کچھ دیر پہلے میرے ذہن میں بھی ابھری تھی۔ تاہم میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر بوب! کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں اپنی دوائیوں پر اعتبار ہے تو وہ بھی آزمالو۔ اللہ نے چاہا تو تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔''

ڈاکٹر بوب کے چہرے سے یکدم مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر گہری سانس لی اور بولا۔ ''شاید تمہیں اپنی قوت برداشت پر بہت زیادہ اعتماد و ناز ہے۔ بہرحال دیکھتے ہیں کہ تم میں قوت برداشت کتنی ہے۔''

وہ اپنے ساتھیوں سمیت واپس چلا گیا اور میں کچھ دیر بیٹھا اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی تو جیت ہونی تھی۔ دیکھتے ہیں جیت کس کے مقدر میں لکھی تھی۔ خیر اور شر کی جنگ تو ازل سے جاری تھی۔ میرے نزدیک یہ بھی خیر اور شر کی جنگ تھی اور ان شاء اللہ جیت خیر کی ہی ہونی تھی۔ مجھے اپنے رب پر اور خود پر پورا بھروسا تھا۔

اگر آپ کا ایمان مضبوط ہو، ارادے پختہ ہوں اور نیت صحیح ہو تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو آپ کے ارادے سے متزلزل نہیں کرسکتی۔ شیطان آپ کو ورغلانے کی بھرپور کوشش کرے گا لیکن آپ کا صاف دل اسے کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

بھوک محسوس ہوئی تو میں نے کھانا کھالیا۔ ٹرے واپس کھڑکی پر رکھ آیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ٹرے وہاں سے اٹھالیا گیا۔ کافی دیر میں سوچتا رہا، لائحہ عمل طے کرتا رہا لیکن کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ ڈاکٹر بوب اور اس کے ساتھیوں پر قابو پانا ضروری تھا میں تبھی اس کمرے سے باہر نکل سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی طاری ہوئی تو میں نے سیدھا لیٹ کر خود پر لحاف ڈالا اور آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں کے بعد میں نیند کی وادی میں کھوگیا۔ نا جانے کھانے میں کوئی نشہ آور چیز ملائی گئی تھی کہ جسے کھانے کے کچھ دیر بعد ہی مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی تھی یا واقعی مجھے نیند آرہی تھی۔ دفعتاً میری نظروں کے سامنے ایک لڑکی کا چہرہ ابھر آیا۔ میں اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا لیکن وہ خوبصورت اور گوری رنگت کی مالک تھی اور میرے سرہانے بیٹھی میرے سر کے بالوں میں اپنی نرم و نازک انگلیاں پھیر رہی تھی۔

''ک.....ک..... کون ہو تم؟'' اسے دیکھ کر میں پریشان ہوگیا تبھی اس کی طرف دیکھ کر ہکلایا۔

''میں..... تمہاری فرینڈ..... ڈورا۔'' پہلے وہ مسکرائی پھر وہ بولی تو اس کی آواز بہت دلکش تھی۔

''م.....م..... میری فرینڈ؟..... ڈ..... ڈورا۔'' میں نے ناسمجھی کے عالم میں کہا۔ میری تو ڈورا نام کی کوئی فرینڈ ہی نہیں تھی۔ صرف شانزے تھی جس سے میں محبت کرتا تھا۔

''ہاں۔ میں تمہاری فرینڈ ہوں۔ شاید تم مجھے بھول گئے ہو؟'' وہ ادائے ناز سے بولی۔ ''کوئی بات نہیں، میں تمہیں یاد دلادوں گی۔''

لمحہ بھر میں تذبذب کے عالم میں موجودہ صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب کوئی بات سمجھ نہ آئی تو میں نے سر کو جھٹکا اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ تبھی اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ہنی! لیٹے رہو۔''

مجھے اس کا سینے پر ہاتھ رکھنا اور بالوں میں انگلیاں چلانا قطعی پسند نہیں آیا۔ میں بدقماش، عیاش اور بدفطرت نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کبھی غلط صحبت اختیار کی تھی۔ میرے والدین نے میری بہت اچھی تربیت کی تھی اور اسی تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ میں آج تک کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوا تھا۔ کوئی میرے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کردار کا برا ہوں۔ بے شک میں گناہگار ہوں، زندگی میں کئی گناہ کیے ہوں گے لیکن دوسروں کی بیٹیوں اور بہنوں کی طرف کبھی گندی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی برے خیالات ذہن میں لایا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے پہلے ناگواریت سے ڈورا کی طرف دیکھا پھر میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹایا اور تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

ڈورا کو میرا اس کا ہاتھ جھٹکنا شاید برا لگا تھا۔ وہ

برافروختہ ہوگئی۔ ''کیا ہوگیا ہے ہنی۔ تم نے میرا ہاتھ کیوں ہٹایا؟''

''بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ وہ نازیبا لباس میں ملبوس تھی اور مجھے کراہیت کی محسوس ہو رہی تھی۔

''ہنی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں تمہاری فرینڈ ہوں۔'' شاید اسے میرا کہنا برا لگا تھا اس لیے وہ خفگی اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

''تم میری فرینڈ نہیں ہو۔'' اس کا بار بار میرا فرینڈ کہنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں نے درشتگی سے کہا۔ ''اور جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' میرے درشت لہجے نے بھی اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ میں کسی اور کمرے میں موجود تھا۔ کمرے کی سجاوٹ سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کسی کی خواب گاہ ہے۔ وہاں صرف میں اور وہ لڑکی ڈورا موجود ہیں۔ میں تو دوسرے کمرے میں قید تھا پھر اس کمرے میں مجھے کون لایا تھا؟

''ہنی! میری آنکھوں میں دیکھو۔'' دفعتاً لڑکی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔ نہ وہ پلکیں جھپک رہی تھی اور نہ میں..... نا جانے اس کی آنکھوں میں ایسا کیا سحر تھا کہ مجھے اپنا آپ اس کی طرف مبذول ہوتا محسوس ہوا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ آنکھوں میں نشہ سا بھرنے لگا۔ شاید وہ ہپناٹزم کی ماہر تھی اور میرا دماغ اپنے کنٹرول میں کرنا چاہتی تھی۔ یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہی کیونکہ میں نے اپنا چہرہ دائیں طرف موڑنے کے ساتھ سر کو جھٹک دیا جس کی وجہ سے میں اس کے سحر سے نکل آیا۔

اگر یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار رہتی تو شاید میرا دماغ اور دل دونوں ہی اس کے کنٹرول میں آ جاتے اور وہ جو چاہتی میں کرتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں خفیہ کیمرے نصب ہوں اور ہماری ویڈیو بن رہی ہو۔ ڈورا نے مخمور لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ''ہنی۔''

''کیا ہنی ہنی کی رٹ لگا کر بیٹھی ہو۔ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم سے گھن آ رہی ہے۔ جاؤ۔ پلیز جاؤ۔''

''ہنی۔ میں نے کہا نا، میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ لاڈ بھرے لہجے میں مسکراتی ہوئی بولی اور دوسرے ہی لمحے اس نے میری شرٹ کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں اس کا ارادہ سمجھ گیا۔ میں نے تیخ پا ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ چیختی ہوئی اچھل کر بیڈ سے قالین پر جا گری اور سسکیاں بھرنے لگی۔ لمحہ بھر کے بعد اس نے اپنے بائیں رخسار پر ہاتھ رکھ کر شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے اسے میرے اس رویے کی توقع نہ تھی۔

''ہنی!'' شاید میرا تھپڑ مارنا اس سے برداشت نہیں ہوا تھا تبھی وہ روہانسی لہجے میں بولی۔ ''تم نے مجھے تھپڑ کیوں مارا؟''

''اگر تم یہاں سے دفع نہ ہوئی تو اس سے بھی زیادہ برا حشر کروں گا تمہارا۔ جاؤ یہاں سے۔'' مجھ سے اس کا وجود برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد اس کمرے سے دفع ہو جائے اسی لیے میں حلق کے بل چیخا۔ لڑکی سسکیاں بھرتی ہوئی غصیلی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں خونخوار نظروں سے اسے۔

عین اسی لمحے میری آنکھیں کھل گئیں اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا وجود پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا، میں اسی کمرے میں موجود تھا جہاں روز اوّل سے تھا۔ سب چیزیں اپنی جگہوں پر موجود تھیں۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ میں نے اپنے بے اعتدال سانس پر قابو پایا اور ساتھ ہی اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ سب خواب تھا۔ حقیقت نہیں تھا لیکن مجھے خوشی تھی کہ خواب میں بھی اللہ نے مجھے بھٹکنے سے بچا لیا تھا۔ مجھ سے گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔ اللہ نے میرے ارادوں میں کمزوری نہیں آنے دی تھی۔ مجھے ثابت قدم رکھا تھا۔

بعض چیزیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں لیکن اس سے سرزد ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات نہ چاہنے کے باوجود ایسی لغزش ہو جاتی ہے کہ انسان ساری زندگی پچھتاتا رہتا ہے۔ خود کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے اور وہ ساری زندگی ضمیر کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔

میں نے بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائی اور لمبے لمبے سانس لے کر خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں

TAGPK.COM

اس خواب کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے وجود میں سرسراہٹ سی دوڑ جاتی ہے اور میں بے اختیار اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے گناہ کی دلدل میں اترنے نہیں دیا۔

☆☆☆

مجھے شک تھا کہ رات کا جو کھانا مجھے دیا جاتا تھا اس میں ایسی کوئی دوا ملا دی جاتی تھی جس سے مجھے ہرے ہرے خواب آنا شروع ہو گئے تھے۔ ویسے ہی خواب جیسا گزشتہ رات میں نے دیکھا تھا۔

اب تین روز گزر گئے تھے۔ میں جیسے ہی رات کا کھانا کھا کر فارغ ہوتا تو کچھ دیر کے بعد میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونا شروع ہو جاتی۔ باوجود کوشش کے میں خود کو بیدار نہیں رکھ پاتا تھا اور بادل نخواستہ میں سو جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی خواب دیکھنا شروع ہو جاتا۔ میرے ہر خواب میں گوری چمڑی والی نئی لڑکی ہوتی جس نے نازیبا لباس پہنا ہوتا اور وہ اپنی اداؤں سے مجھے گناہ کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی لیکن صد شکر کہ میں نے جتنے بھی خواب دیکھے تھے، لڑکیوں کے دلکش ہتھکنڈوں کے باوجود میں گناہ کی دلدل میں نہیں گرا تھا۔ میں ان کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرتا جیسا میں نے ڈورا کے ساتھ کیا تھا۔

ان تین دنوں میں ڈاکٹر بوب نے مجھے ذہنی اذیت سے دوچار نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے میرے پاس آ کر پوچھا کہ کیا میں اس کی بات ماننے کے لیے تیار ہوں؟ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ ذہنی ٹارچر کرنے والا حربہ کامیاب نہیں ہوا تو کھانے میں دوا ملا کر کھلانے سے میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ خواب میں خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر گناہ کی دلدل میں اترنے پر مجبور ہو جاؤں گا اسی لیے وہ روزانہ رات کے کھانے میں دوا ملا دیتا تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس نے دیکھا کہ میرے ارادوں میں کمزوری نہیں آ رہی تو ایک روز اس نے دن کے کھانے میں بھی دوا ملا کر مجھے کھلا دی۔ کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی اور میں بالآخر سو گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد پھر حسب معمول برا خواب شروع ہو گیا۔ جس کا اختتام پہلے جیسا ہی ہوا۔ جیسے ہی میں ہوش میں آتا تو میں خود کو پسینے میں شرابور پاتا۔ پسینے کی بدولت مجھ پر دوا کا اثر بھی نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی دماغ پر بھاری پن کا احساس ہوتا۔ شاید دوا کا توڑ پسینا تھا۔ جیسے ہی مجھے پسینا آتا تو میری آنکھ کھل جاتی اور میں عالم مدہوشی سے باہر آ جاتا۔

ایک رات جب مجھے کھانا دیا گیا تو میں نے سوچا کہ اُس رات کھانا کھائے بغیر ہی سو جاتا ہوں۔ دوران نیند میں برا خواب دیکھتا بھی ہوں یا واقعی دوا کا اثر تھا۔ اُس رات واقعی مجھے کوئی برا خواب نہیں آیا تھا۔ پُرسکون نیند سویا تھا۔ اس سے ثابت ہو گیا تھا کہ واقعی ڈاکٹر بوب میرے کھانے میں نشہ آور چیز ملا دیتا تھا۔ صبح اٹھ کر فریش ہونے کے بعد میں نے رات والا کھانا کھڑکی پر رکھ دیا۔ ٹرے رکھ کر میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے اپنے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر بوب مجھے ذہنی طور پر ٹارچر کر رہا ہے پھر واقعی اس نے مجھے ذہنی ٹارچر دیا۔ میرے چیخنے چلانے، تڑپنے اور سسکنے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ بالآخر جب ذہنی ٹارچر برداشت سے باہر ہو گیا تو میرے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو گئے اور میں بے ہوش ہو گیا۔

ہوش آیا تو میں فرش پر پڑا تھا۔ سر میں بے حد درد ہو رہا تھا۔ میں نے رات سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا اس لیے بھوک کی وجہ سے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ میں بہ مشکل اٹھ کر بیڈ پر تو بیٹھ گیا لیکن درد کے باعث سر چکرا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میری حالت نارمل ہو گئی تو میں نے کھڑکی پر جا کر اپنا ناشتا اٹھایا اور میز پر رکھ کر کھانے بیٹھ گیا۔ ناشتا کرنے کے بعد مجھے اپنے وجود میں توانائی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن ساتھ ہی یہ بھی خدشہ تھا کہ دوا کے باعث میں دوبارہ سو نہ جاؤں۔ سونے کی صورت میں دوبارہ برا خواب آ سکتا تھا۔ صد شکر کہ ناشتے میں دوا نہیں ملائی گئی تھی کیونکہ ناشتا کرنے کے بعد مجھ پر نہ ہی غنودگی طاری ہوئی اور نہ طبیعت مکدر ہوئی۔ ٹرے کھڑکی پر رکھ کر میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

رات کو جب دوبارہ مجھے کھانا دیا گیا تو میرے دل میں خدشات سر ابھار رہے تھے کہ اس میں نشہ آور دوائی نہ مکس کی گئی ہو، کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں۔ عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے کھانا نہ کھانے کا فیصلہ کر کے ٹرے میز پر رکھ دی اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ دوپہر کو جو کھانا دیا گیا تھا اس میں بھی نشہ آور دوا مکس نہیں کی گئی تھی لیکن ڈر تھا کہ رات کے کھانے میں ضرور دوا مکس کی گئی ہوگی۔ بہرحال میں نے آنکھیں موند لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے شب و روز مصنوعی روشنی میں ہی گزر رہے

تھے۔ اب تو میں روشنی کا عادی ہو چکا تھا۔ یوں سمجھ لیں میری آنکھیں روشنی سے بہت زیادہ مانوس ہو چکی تھیں اس لیے جب میں رات کو یا کسی وقت بھی سوتا تھا تو مجھے وقت نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ میں اندھیرے میں سونے کا عادی تھا لیکن یہ وقت، وقت کی بات تھی۔ وقت نے مجھے کہاں لا کھڑا کیا تھا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور وقت مجھے آگے کہاں لے جائے گا یہ میرا رب ہی بہتر جانتا ہے۔ بس میں ہر وقت یہی دعا کرتا رہتا تھا کہ رب مجھے کسی بھی موقع پر کمزور نہ پڑنے دے۔

غالباً میں بیس، پچیس منٹ ہی سویا تھا کہ میری آنکھیں یکدم کھل گئیں۔ مجھے اپنے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور ہلکی ہلکی اذیت بھی ہو رہی تھی۔ شاید اسی اذیت کا اثر تھا کہ میں بیدار ہو گیا تھا۔ میں جلدی سے بستر سے اٹھ بیٹھا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ بالکل پہلے جیسی اذیت تھی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ وہی عمل دہرایا جا رہا تھا۔ مجھے قائل کرنے کے لیے پرانا ہتھکنڈا استعمال کیا جا رہا تھا۔ جب اذیت حد سے بڑھ گئی تو میں چیخ اٹھا اور میں نے اپنے سر پر مکے برسانے شروع کر دیے کہ شاید کسی طرح یہ اذیت کم ہو جائے۔ یہاں تک کہ میں سجدے کی حالت میں بیڈ پر گر گیا۔ پھر وہی کچھ ہوا جو ہوتا تھا۔ میں لڑھک کر فرش پر گر گیا۔ ایڑیاں رگڑنے اور اس اذیت کو ختم کرنے کے لیے میں اپنے سر پر مکے برساتا رہا۔ چیخیں بھی جاری تھیں جو بازگشت بن کر میری ہی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ بالآخر جب محسوس ہوا کہ میرا دماغ ابھی کے ابھی پھٹ جائے گا تو جس طرح کیمرے کا شٹر بند ہو جاتا ہے اسی طرح میرے دماغ کا شٹر بھی بند ہو گیا۔ تاریکی بھر گئی اور میں بے سدھ سا ہو گیا۔

☆☆☆

ایک مہینا گزر گیا۔ میرے ساتھ یہ اذیت ناک عمل جاری تھا۔ کبھی ذہنی اذیت دی جاتی تو کبھی کھانے میں نشہ آور دوا مکس کر دی جاتی۔ اب تو ناشتے اور دن کے کھانے میں بھی دوا مکس کر کے دی جا رہی تھی۔ اگر میں کھانا نہ کھاتا تو مجھے ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑتا۔ نتیجتاً ایڑیاں رگڑ رگڑ کر میں بے ہوش ہو جاتا۔ اگر کھانا کھا لیتا تو اس کے بعد حسب معمول وہی ہوتا۔ میرے خوابوں میں ینگ اور حسین لڑکیاں آتیں جو اپنی دلکش اداؤں اور باتوں سے مجھے بہکانے کی کوشش کرتیں لیکن اس کا نتیجہ بھی آخر میں ان کو تھپڑ مارنے کا ہی نکلتا۔ پھر میری آنکھیں کھل جاتیں اور جسم پسینے سے شرابور ہوتا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ اگر اسی طرح مجھے ذہنی اذیت دی جاتی رہی تو میں ایک روز پاگل ہو جاؤں گا۔ میری یادداشت کھو جائے گی اور پھر میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا نہیں جانتا تھا۔ میں اپنی ضد پر قائم تھا اور جواں مردی سے اذیت ناک حالات کا مقابلہ کر رہا تھا لیکن سوال وہی تھا کہ کب تک.....؟ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مجھے اس کمرے میں بند ہوئے صدیاں گزر گئی ہوں۔ دنیا سے میں کٹ گیا ہوں۔ میں نے سوچا، مجھے اس کمرے اور جزیرے سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا ورنہ میں ساری زندگی وہاں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔ بعد ازاں میں نے سوچا کہ اگر میں یادداشت کھو جانے کا ڈراما کروں تو شاید مجھے ذہنی اذیت سے نجات مل جائے اور یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے اس کمرے سے باہر نکال لیا جائے۔ مجھے یاد ہے، جب چودھری باسط مجھے اغوا کر کے اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا تو میں نے یادداشت کھو جانے کا ڈراما کیا تھا اور کامیاب بھی ہوا تھا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ قسمت ہر جگہ میرا ساتھ دے۔ بہرحال قسمت آزمانے میں کوئی حرج بھی نہیں ہوتا۔ میں نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اس وقت کا انتظار تھا جب مجھے ذہنی اذیت کا شکار کیا جائے گا۔

میں نے منصوبہ بنایا کہ جب میں بیدار ہوں گا تو پاگلوں جیسی حرکتیں شروع کر دوں گا۔ چیخوں گا، چلاؤں گا، بے ہنگم قہقہے ماروں گا۔ کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میرا ذہنی توازن کھو گیا ہے۔ شاید اس طرح میں اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جاؤں۔

دو روز گزرنے کے بعد مجھے دوبارہ ذہنی اذیت کے عمل سے گزارا گیا۔ اذیت برداشت کرتے ہوئے میں فرش پر گر گیا اور چیخنے، چلانے کے ساتھ ساتھ ایڑیاں رگڑتا رہا۔ میری اذیت کے ختم ہونے کا اختتام بالآخر میرے بے ہوش ہونے پر ہی ہوا۔ جب بیدار ہوا تو میں فرش کی بجائے بیڈ پر موجود تھا۔ دماغی حالت تو ٹھیک تھی لیکن نقاہت طاری تھی۔ پیٹ میں بھی اینٹھن تھی کیونکہ میں نے رات کو کچھ کھایا نہیں تھا۔ کھانا نہ کھانے کے نتیجے میں ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا۔ میں نے غیر ارادی طور پر گردن بائیں طرف موڑی تو اگلے

ہی لمحے میں بے اختیار چونک پڑا اور میری آنکھوں میں حیرت در آئی۔ کرسی پر ایک لڑکی براجمان تھی جس کی عمر لگ بھگ چوبیس پچیس سال ہوگی۔ اس نے نیلے رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ صد شکر کہ وہ پورے لباس میں ملبوس تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ ہوسکتا ہے میرا مغالطہ ہو، اس کی ہم شکل دیکھ لی ہو لیکن فی الحال یہ سوچنے کا بالکل بھی وقت نہیں تھا۔

وہ لڑکی مجھے ہی دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اس کے لب ہلے۔ ''ہائے ہنی!''

میں نے سوچا کہ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ میں جواب دینے کی بجائے اسے دیکھتا رہا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ تبھی میرے کانوں میں ڈاکٹر بوب کی آواز پڑی۔ وہ اس لڑکی سے پوچھ رہا تھا۔ ''جیفر! کیا تم تیار ہو؟''

نا جانے وہ اس سے کس تیاری کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جیفر عالم تذبذب میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔ ''یس ڈاکٹر بوب۔ میں تیار ہوں۔''

''اوکے۔'' ڈاکٹر بوب نے کہا۔ ''کیمرا ریڈی ہے۔''

میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو اگلے ہی لمحے مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میرے دائیں طرف قدرے فاصلے پر اسٹینڈ پر ایک کیمرا موجود تھا۔ کیمرے کے پیچھے ایک نوجوان اور ڈاکٹر بوب موجود تھے۔ ان سے پیچھے وہی دو افراد موجود تھے جو ہر بار ڈاکٹر بوب کے ساتھ آتے تھے۔ ساری صورت حال واضح ہونے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہ لگی۔ میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ خود کو پاگل پن کا شکار کرلوں۔ میں نے گردن موڑ کر جیفر کی طرف دیکھا تو وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی نازیبا حرکت کرتی، میں نے ایک زوردار چیخ ماری اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''آہ..... آہ.....'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی میں نے اپنا سر بھی دائیں بائیں مارنا شروع کر دیا۔

مجھے چیختے دیکھ کر جیفر تیزی سے چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے کیا تاثرات تھے، میں نے نہیں دیکھا تھا لیکن میں اس کے پیچھے ہٹنے کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ میری حالت دیکھ کر پریشان ضرور ہوگئی ہے۔ میں نے خود کو بستر پر گرا لیا اور ایسے تڑپنے لگا جیسے بکرا ذبح ہوتے وقت تڑپتا ہے۔

''ڈاکٹر..... اسے کیا ہو رہا ہے؟'' جیفر کی سرسراتی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ قبل اس کے کہ وہ میری طرف بڑھتا، میں نے اٹھ کر زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے میں سچ میں پاگل ہوگیا ہوں۔ میرا دماغی توازن کھو گیا ہو۔

''اوہو..... کہیں یہ پاگل تو نہیں ہوگیا؟'' جیفر کی آواز دوبارہ میری سماعت سے ٹکرائی۔

''شاید۔'' ڈاکٹر عالم تذبذب میں بولا۔ ''میں اسے چیک کرتا ہوں۔''

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے چیک کرے اور میرے پاگل پن کا راز فاش ہو اس لیے میں نے اسے روکنے کی غرض سے چیخ کر کہا۔ ''رک جاؤ..... ورنہ.....''

میرے کہنے پر ڈاکٹر بوب کے بڑھتے قدم رک گئے اور وہ غائرانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ جیسے جائزہ لے رہا ہو کہ کیا میں واقعی پاگل ہوگیا ہوں یا ڈراما کر رہا ہوں۔ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے استفسار کیا۔ ''ورنہ کیا.....؟''

میں نے ایک قہقہہ لگایا اور اپنے ہاتھوں کو فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ..... ورنہ میں تمہیں..... کھا جاؤں گا۔ ہاہاہا۔'' کہتے ساتھ ہی میں نے بے ہنگم سا قہقہہ لگایا۔

''ڈاکٹر! یہ واقعی پاگل ہوگیا ہے۔'' کیمرا مین نے ڈاکٹر بوب سے کہا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ پاگل پن کا ڈراما کر رہا ہو۔'' ڈاکٹر بوب کو شاید میرے پاگل پن کا ڈراما لگ رہا تھا اس لیے اس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ڈراما.....؟'' کیمرا مین بھی چونکا۔

''ہاں ڈراما۔'' ڈاکٹر بوب نے جواباً کہا۔ ''یہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ جتنا نارچ میں نے اسے کیا ہے شاید ہی کسی اور کو کیا ہو۔ میرا خیال تھا کہ یہ دو تین بار کے نارچ سے ذہنی طور پر پورنوگرافک کے لیے تیار ہو جائے گا لیکن ڈیڑھ مہینا ہونے کو ہے، میں اسے لائن پر نہیں لا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے لگتا ہے یہ پاگل پن کا ڈراما کر رہا ہے۔''

اس دوران میں قہقہے لگانے کی بجائے معصومانہ انداز میں چھت کو گھورتا رہا۔ ساتھ ہی میں انگلی سے گنتی بھی کرتا رہا

TAGPK.COM

جیسے میں آسمان کے تارے گن رہا ہوں۔ حالانکہ چھت پر چند بلب لگے تھے۔ جیفر بھی متذبذب سی کھڑی تھی۔ کیمرا مین نے ڈاکٹر بوب سے استفسار کیا۔ ''پھر اب تم کیا کرو گے؟''

''اس کا دماغ مشین سے چیک کرنا پڑے گا کہ آیا یہ واقعی پاگل ہو گیا ہے یا ڈراما کر رہا ہے؟'' ڈاکٹر بوب کی فیصلہ کن بات مجھے سنائی دی۔

''اگر یہ پاگل ہو گیا ہو تو؟'' شاید کیمرا مین کے اندر تجسس کا زیادہ مادہ بھرا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر بوب سے سوال پر سوال کر رہا تھا۔

''تو .....'' ڈاکٹر بوب نے 'تو' کو لمبا کھینچا اور سانس بھر کر بولا۔ ''تو اسے مار کر، اس کی لاش سمندر میں پھینک دی جائے گی جیسا کہ ہم پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔''

کچھ دیر کے بعد وہ سب وہاں سے چلے گئے لیکن جاتے وقت ڈاکٹر بوب مجھے سکون آور انجکشن لگانا نہیں بھولا تھا۔ ان کے جاتے ہی چند منٹ کے بعد میں بھی عالم مدہوشی میں ڈوب گیا۔ صد شکر کہ میرا ڈراما کامیاب رہا تھا اور ڈاکٹر بوب تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اب جب تک مجھے مشین سے چیک کیا جاتا، میں نے پاگل پن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ ساتھ ہی مجھے مشین کو بھی شکست دینی تھی تاکہ ڈاکٹر بوب واقعی یہی سمجھ لے کہ میرا دماغی توازن کھو گیا ہے لیکن اس کی آخری بات بھی میرے پیش نظر تھی کہ اگر میں پاگل ہو گیا ہوں تو مجھے مار کر میری لاش سمندر میں پھینک دی جائے گی۔

انجکشن کا اثر ختم ہوا تو میں بیدار ہو گیا۔ میں کمرے میں اکیلا تھا۔ چونکہ مجھے کیمرے کی آنکھوں سے دیکھا جا رہا تھا اس لیے میں نے اداکاری جاری رکھی۔ میں کسی طرح بھی ڈاکٹر بوب کو شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھا اور بھول پن سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے میں خود کو اُس کمرے میں پا کر حیران ہو رہا ہوں۔ اگلے ہی لمحے میں نے بے ہنگم انداز میں قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی تالیاں بجانے لگا۔

پاگل پن کی اداکاری کرنا خاصہ مشکل کام تھا لیکن مجھے ایسا کرنا تھا۔ میں اُن اداکاروں کو بھی داد دینے پر مجبور ہو گیا جو ڈراموں میں پاگل پن کی اداکاری کرتے رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ واقعی پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ حقیقت کے قریب تر اداکاری کرتے ہیں۔

ساتھ ہی میرے ذہن کے کسی گوشے میں جیفر کا نام اور چہرہ بھی ابھرا تھا۔ میں نے جیفر کو کہیں دیکھا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا تھا پھر پہلے والی بات میرے دماغ میں ابھری کہ شاید میں نے جیفر کی ہم شکل دیکھی ہو گی اور گمان یہی ہو رہا تھا کہ جیفر کو کہیں دیکھا ہے۔ ''جیفر ..... جیفر ..... جیفر .....'' سوچتے سوچتے اچانک دماغ میں کچھ کلک ہوا۔

''جیفر کی شکل جولیا پیٹرک سے ملتی ہے۔ وہی جولیا پیٹرک، جس نے مجھے بلیک پوائنٹ جزیرے کے بارے میں بتایا تھا۔ اوہو ..... کہیں جیفر جولیا پیٹرک کی بڑی بہن تو نہیں۔ اس نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ اس کی بہن کو ہیری ٹام نے اغوا کیا تھا۔ شاید وہی جیفر ہے۔'' میرے دل و دماغ ایک دوسرے سے ہم کلام تھے۔ اگر وہ اکیلی یہاں موجود ہوتی تو میں اس سے تصدیق کر لیتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ روزینہ کے بارے میں بھی جانتی ہو۔ اُمید کی ایک نئی کرن میرے وجود میں پھوٹی تھی۔

اب یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جیفر سے دوبارہ سامنا ہوتا ہے یا نہیں۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے ڈاکٹر بوب کے ساتھی کمرے سے نکال کر ایک اور کمرے میں لے گئے۔ لے جانے سے پہلے انہوں نے میرے ہاتھ نہیں باندھے تھے۔ اُس کمرے میں عجیب ساخت کی چند مشینیں پڑی تھیں۔ مشینوں کے آگے کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ مجھے ایک مشین کے سامنے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ ڈاکٹر بوب پہلے سے ہی وہاں موجود تھا اور اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری وجہ سے شش و پنج میں مبتلا ہے۔ ایک آدمی نے میرے سر پر کنٹوپ چڑھا دیا اور ڈاکٹر بوب مشین کو آپریٹ کرنے لگا۔ یہ جدید ترین مشین تھی جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ شاید ڈاکٹر بوب اس مشین کے ذریعے میرا دماغی توازن معلوم کرنا چاہتا تھا۔

مشین کی اسکرین پر آڑھی ترچھی لکیریں ابھری ہوئی تھیں اور آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے مشین پر ایک دماغ ابھر آیا اور ڈاکٹر بوب غور سے میرے دماغ کو دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے دماغ کو ہر طرح کے خیال سے دور رکھا کہ مبادا ڈاکٹر بوب میری سوچ ہی نہ پڑھ لے۔ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ انسان کے دماغ سے ایسی ایسی باتیں معلوم کر لی جاتی ہیں جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ جو کنٹوپ میرے سر پر رکھا گیا تھا ہو سکتا ہے اس کے ذریعے میرے دماغ میں ابھرنے والی سوچیں ڈاکٹر بوب پڑھ رہا ہو۔

TAGPK.COM

بہرکیف، ڈاکٹر بوب کافی دیر تک مشین پر میرے دماغ کا معائنہ کرتا رہا۔ میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ شاید وہ بے حد الجھن اور مخمصے کا شکار تھا۔ نا جانے مشین اسے میری دماغی کیفیت کے بارے میں کیا بتا رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ جاری تھے۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے طویل سانس لیتے ہوئے ایک بٹن پریس کر کے مشین آف کر دی اور میرے عقب میں کھڑے آدمیوں میں سے ایک سے مخاطب ہوا۔ ''اس کے سر سے کنٹوپ اتار دو۔''

میرے سر سے کنٹوپ اتار دیا گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا دماغ جکڑ بند سے آزاد ہو گیا ہو۔ میں نے خالی الذہنی نظروں سے ڈاکٹر بوب کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے؟'' ایک آدمی نے ڈاکٹر بوب سے دریافت کیا۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر بوب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ نہیں لیکن چالیس فیصد اس کی دماغی حالت خراب ہو گئی ہے۔ اس کی دماغی کیفیت بتا رہی ہے کہ یہ کچھ دیر تا مل رہے گا پھر اس کی دماغی حالت بگڑ جائے گی۔ یہ عمل مسلسل جاری رہے گا۔''

''پھر اس کا کیا کریں گے؟'' دوسرے نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں اس کا علاج کروں گا۔''

''کیا یہ علاج سے ٹھیک ہو جائے گا؟''

''بالکل۔'' ڈاکٹر بوب تیقن سے بولا۔ ''میں اس کا ایسا علاج کروں گا کہ یہ نہ صرف ٹھیک ہو جائے گا بلکہ یہ میرے تابع بھی ہو جائے گا۔ میں اسے جو حکم دوں گا یہ بلا چوں چرا کرے گا۔'' کہتے ساتھ ہی اس کے چہرے پر تمسخر مسکراہٹ ابھر آئی اور میں دل ہی دل میں اس کی باتوں پر ہنس رہا تھا۔ شاید اس کے دماغ میں مجھے لے کر بہت سارے منصوبے تھے۔ مجھے خوشی بھی تھی کہ میرا ڈراما کافی حد تک کامیاب رہا تھا اور مشین بھی دھوکا کھا گئی تھی کہ چالیس فیصد تک میرا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔

''کیا اس کا علاج آج سے شروع کریں گے؟'' پہلے آدمی نے ڈاکٹر بوب سے دریافت کیا۔

''نہیں، کل سے۔'' ڈاکٹر بوب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''فی الحال اسے جیفر کے کمرے میں پہنچا دو اور اسے میرا پیغام دے دو کہ وہ اس کی بھرپور دل جوئی کرے اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھے۔''

لفظ 'ہر طرح' اس نے معنی خیز انداز میں کہا تھا اور میں بھی سمجھتا تھا کہ اس نے کس پیرائے میں یہ بات کی ہے۔

دونوں مجھے بازوؤں سے پکڑ کر مختلف راہداریوں سے گزارتے ایک کمرے میں لے آئے جہاں جیفر موجود تھی۔ وہ کافی بڑی اور روشن عمارت تھی۔ جگہ جگہ کیمرے اور سماعتی آلات لگے ہوئے تھے۔ مجھے راہداریوں میں جتنے بھی کمرے دکھائی دیئے تھے ان سب کے دروازے بند تھے البتہ مسلح افراد دندناتے پھر رہے تھے۔ شاید وہ چیکنگ اور نگرانی کر رہے تھے۔ دونوں مجھے جیفر کے پاس چھوڑ کر اور ڈاکٹر بوب کا پیغام دے کر چلے گئے۔ جیفر نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بیڈ پر بٹھایا اور ایک گلاس پانی بھر کر مجھے دیا۔ مجھے اس وقت پیاس بھی لگی ہوئی تھی لیکن میں گلاس پکڑے چہرے پر بھول پن کا مصنوعی خول چڑھائے گلاس کو ہی تکتا رہا۔ دماغی توازن بگڑنے کی ایکٹنگ کرنے کے دو فائدے ہوئے تھے۔ ایک تو یہ کہ میں ذہنی اذیت سے بچ گیا تھا، دوسرا فائدہ، میں گناہ کی دلدل میں اترنے سے بچ گیا تھا۔

جیفر نے میری کیفیت دیکھی تو نرم لہجے میں بولی۔

''شاباش۔ پانی پیو۔''

لیکن میں نے پانی نہ پیا صرف پانی کو گھورتا رہا۔ یہ میں اس لیے کر رہا تھا کیونکہ میں نے کمرے میں داخل ہوتے وقت کیمرا دیکھ لیا تھا جو سامنے والی دیوار کے کونے میں تھا اور اس کا رخ بیڈ کی طرف تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے ایسی غلطی سرزد ہو جائے کہ میں مشکوک ہو جاؤں اور میری ایکٹنگ کا بھید کھل جائے۔

جیفر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر دوبارہ بولی۔ ''کیا تم میری بات سن رہے ہو؟''

میرے جواب نہ دینے اور پانی کو گھورنے پر اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنی انگلی میری ٹھوڑی پر رکھ کر میرا چہرہ اپنی طرف کیا۔ وہ ہو بہو جولیا پیٹرک کی کاپی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس کا چہرہ گول تھا جبکہ جیفر کا چہرہ تھوڑا لمبا تھا۔ میں نے بھول پن سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بولی۔ ''تم پانی کیوں نہیں پی رہے؟''

''میں پانی پینا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو پھر پیو۔''

TAGPK.COM

''تم پلاؤ۔''

وہ مسکرائی۔ 'اوکے' کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لیا اور میرے لبوں سے لگاتی ہوئی بولی۔ ''چلو، میں تمہیں پانی پلاتی ہوں۔'' کہتے ساتھ ہی اس نے گلاس اوپر کیا اور میں پانی پینے لگا۔ جب میں نے پانی پی لیا تو اس نے گلاس ہٹایا اور میز پر رکھ کر میری طرف متوجہ ہوئی۔ پانی پینے سے مجھے اپنے جسم میں توانائی کا احساس ہوا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے میرے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ جواباً میں خاموش رہا۔

''اپنا نام بتاؤ۔'' اس نے دوبارہ کہا لیکن میں نے جواب نہ دیا۔

''شاید یہ اپنا نام بھی بھول گیا ہے۔'' وہ کفِ افسوس ملتی ہوئی ہلکی سی آواز میں بڑبڑائی۔ وہ اٹھ کر میرے سامنے آئی اور مجھے شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر لٹاتے ہوئے بولی۔ ''تم آرام کرلو، میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔''

وہ واش روم میں چلی گئی تو میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں لیکن میرا دماغ جاگ رہا تھا اور کان کھلے تھے۔ میں نے ہر لمحہ خود کو بیدار اور ہوشیار رکھا تھا۔

اب میں جیفر کے کمرے میں رہ رہا تھا۔ مجھے وہاں رہتے ہوئے دوسرا روز تھا۔ اس کا بیڈ کافی چوڑا تھا اس پر تین افراد باآسانی سو سکتے تھے۔ ایک کنارے پر میں اور دوسرے کنارے پر جیفر سو جاتی تھی۔ وہ مسلسل اپنی طرف سے بھرپور انداز میں میری دل جوئی کر رہی تھی۔ ناشتا، لنچ اور ڈنر اپنے ہاتھوں سے کراتی تھی۔ یہاں تک کہ واش روم میں بھی وہی مجھے لے جاتی تھی۔ واش روم میں چھوڑ کر وہ باہر چلی جاتی تھی لیکن دروازہ لاک نہیں کرتی تھی۔ صرف بھیڑ دیتی تھی۔ وہ میرا ہر طرح سے خیال رکھ رہی تھی لیکن صد شکر کہ اس نے کوئی نازیبا حرکت نہیں کی تھی البتہ وہ کبھی کبھار نازیبا لباس میں ملبوس رہتی تھی اور میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں مجھے کراہیت محسوس ہوتی تھی۔

ابھی تک ڈاکٹر بوب نے میرے پاگل پن کا علاج شروع نہیں کیا تھا حالانکہ جب اس نے میرے دماغ کا معائنہ کیا تھا تو اس نے عندیہ دیا تھا کہ وہ کل سے میرا علاج شروع کردے گا۔

تیسرے روز ڈاکٹر بوب کمرے میں آگیا۔ اس کے پاس ایک شیشی تھی جس میں سرخ رنگ کی گولیاں تھیں۔ اس نے وہ شیشی جیفر کو دیتے ہوئے کہا۔ ''جیفر! ہر کھانے کے بعد اسے ایک گولی پانی کے ساتھ کھلاتی رہنا۔''

''کیا ان گولیوں سے اس کی دماغی حالت ٹھیک ہو جائے گی؟'' جیفر نے پوچھا۔

''ہاں بالکل۔'' ڈاکٹر بوب نے تیقن سے کہا۔ ''لیکن تمہاری طرف سے کسی قسم کی غفلت معاف نہیں کی جائے گی۔'' اس کا لہجہ آخر میں بے حد سرد تھا۔

''میں غفلت نہیں کروں گی ڈاکٹر۔'' جیفر نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا اور اس سے شیشی لے لی۔

''ہر صورت اس کا پاگل پن دور کرنا ہے۔ مجھے اُمید

علی بن محمد جرجانی

(740ھ/1339ء۔ 816ھ/1413ء)

کنیت ابوالحسن المعروف سید شریف۔ ایک عالم دین و مصنف استرآباد کے قریب تاجو میں پیدا ہوئے۔ 766ھ/1365ء میں وہ قطب الدین محمد الرازی التحتانی سے علم حاصل کرنے کی خاطر ہرات گئے لیکن انہوں نے اپنے شاگرد مبارک شاہ سے جو مصر میں مقیم تھے تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ 770ھ/1368ء تک وہ ہرات ہی میں ٹھہرے رہے۔ اس کے بعد قرمان گئے اور محمد الفناری کی شاگردی اختیار کی بعد میں ان کے ہمراہ مصر گئے اور مبارک شاہ اور اکمل الدین کے درس سے مستفیض ہوئے۔ 776ھ/1374ء میں قسطنطنیہ کا سفر کیا اور پھر وہاں سے شیراز پہنچے جہاں پر 779ھ/1377ء میں شاہ شجاع نے انہیں معلم مقرر کیا۔ جب تیمور نے شیراز فتح کیا تو سید شریف کو اپنے ساتھ ہی سمرقند لے گیا۔ یہاں پر ان کی سعد الدین تفتازانی سے بحثیں ہوئیں۔ تیمور کی وفات کے بعد سید شریف شیراز واپس آگئے۔ سید شریف نے مختلف موضوعات پر پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی زبان میں منطق اور صرف و نحو کی کتابیں لکھیں۔ متکلم کی حیثیت سے انہوں نے فلسفے کو بہت بڑا مقام دیا۔

مرسلہ: بدرالدین۔ گجرات

TAGPK.COM

ہے کہ چند روز میں اس کی دماغی حالت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

نا جانے وہ کس قسم کی گولیاں تھیں۔ جیفر ناشتے، لنچ اور ڈنر کے بعد باقاعدگی سے مجھے ایک، ایک گولی دے دیتی تھی اور میں اس کے سامنے تو یہی مظاہرہ کرتا تھا کہ میں گولی کھا رہا ہوں لیکن میں گولی نگلنے کی بجائے دانتوں کے پیچھے رکھ لیتا اور موقع ملتے ہی اسے نکال کر اپنی پتلون کی جیب میں چھپا لیتا۔ جب میں واش روم جاتا تو وہی گولی فلش میں بہا دیتا تھا۔

میرے دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ میں اس سے بات کروں۔ اسے بتاؤں کہ اس کی بہن جولیا پیٹرک اس کی تلاش میں تھی، اسی نے مجھے بلیک پوائنٹ جزیرے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ میرے ساتھ یہاں آنا چاہتی تھی لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ ہیری ٹام کے ہاتھوں ماری گئی ہے لیکن خدشہ وہی تھا کہ اگر ہماری باتیں سن لی گئیں تو بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ میرا بھید کھل سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ڈاکٹر بوب مجھے دوبارہ ذہنی اذیت سے دوچار کرتا۔

میرے اور جیفر کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ شاید ڈاکٹر بوب کو یہ فاصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ اُس روز ہم ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ وہ ہمارے کمرے میں آدھمکا۔ آتے ہی وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''جیفر! میں نے تم سے کہا ہے کہ اس کی دل جوئی کرو اور اسے اپنی طرف مائل کرو لیکن تم تو کچھ بھی نہیں کر رہی۔''

''میں کوشش کر تو رہی ہوں۔'' جیفر شاید اس سے ڈرتی تھی اس لیے اس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

ڈاکٹر بوب کو اس کا یہ جواب پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''کیا خاک کوشش کر رہی ہو۔ ایسے کوشش کرتے ہیں۔ اسے اپنی طرف مائل کرو۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری پورنوگرافی اس کے ساتھ ہوگی۔''

''اوکے ڈاکٹر۔'' جیفر نے کہا۔ ''لیکن تم نے دیکھا ہوگا کہ یہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔''

''ہاں دیکھا ہے میں نے۔ بہرحال اس کی دماغی حالت کیسی ہے اب؟'' ڈاکٹر بوب کے تنے ہوئے اعصاب اب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ''ویسے تو میں اس کی حرکات و سکنات چیک کر رہا ہوں لیکن تم بہتر بتا سکتی ہوں کیونکہ یہ مسلسل تمہارے ساتھ ہے۔''

''پہلے سے قدرے بہتری آ رہی ہے۔'' جیفر نے جواباً کہا۔

''مثلاً کیسے؟'' ڈاکٹر بوب نے استفسار کیا۔ ''تم نے کیا خاص بات نوٹ کی ہے؟''

''یہی کہ.....'' جیفر سوچتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''میرے ساتھ باتیں بھی کرتا ہے، کھانا خود کھاتا ہے اور واش روم بھی خود جاتا ہے۔''

''گڈ۔'' ڈاکٹر بوب نے ستائش بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، اچھا ہے یہ جلد از جلد نارمل ہو جائے۔ اگر اسماعیل شاہد کی ضد نہ ہوتی تو اب تک میں اسے مار کر سمندر میں پھینک چکا ہوتا۔ یہ واحد نوجوان ہے جو ہمارے قابو نہیں آیا۔ اسے ہر حالت میں قابو میں لانا ہے اور یہ کام تم نے کرنا ہے۔ تمہاری اس سے ذہنی ہم آہنگی ہوگی تو کام بنے گا۔ میں چلتا ہوں۔''

ڈاکٹر بوب کے جانے کے بعد جیفر نے ایسے سانس لیا جیسے اس کے سر سے بہت بڑی بلا ٹل گئی ہو۔ ساتھ ہی وہ نخوت سے دھیمے لہجے میں بڑبڑائی۔ ''باسٹرڈ.....''

مجھے معلوم تھا کہ اس نے ڈاکٹر بوب کو گالی دی تھی تاہم میں نے بھول پن سے استفسار کیا۔ ''مجھ سے کچھ کہا؟''

''نہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ''میں ڈاکٹر بوب کو کوس رہی ہوں۔ کاش اس کی بھی کوئی بہن یا بیٹی ہوتی اور وہ بھی یہیں ہوتی اور اس کے سامنے اس کی پورنوگرافی ہوتی تو تب اسے پتا چلتا۔ مجھے تو اپنی بہن کی بھی بہت یاد آ رہی ہے۔ نا جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔''

وہ اپنے دل کا غبار نکال رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ اپنی بہن کے بارے میں بھی پریشان تھی۔ مجھے اس کے ساتھ رہتے ہوئے جتنے دن بھی ہوئے تھے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے نازیبا حرکت نہیں کی تھی البتہ وہ مجھ سے باتیں کرتی تھی اور میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہتا۔ کبھی کبھی جواب بھی دے دیتا تھا۔ اُس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اسے بھی پورنوگرافی سے نفرت ہے۔ وہ اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہے لیکن مجبور ہے۔ شاید اسے فرار کی کوئی راہ دکھائی نہیں دی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اگر میں جیفر پر ورک کروں، اسے یہاں سے نکلنے کے لیے اکساؤں تو شاید میرے لیے یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے۔ مجھے ڈاکٹر بوب کی بھی بات یاد تھی۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسماعیل شاہد چاہتا ہے کہ میری

TAGPK.COM

پورن ویڈیو بنے اور میری جگ ہنسائی ہو۔

''گھٹیا انسان، اس کی موت میرے ہاتھوں ہی ہو گی۔'' میں نے دل ہی دل میں اسماعیل شاہد کو کوستے ہوئے عہد کیا۔

''کن سوچوں میں گم ہو؟'' دفعتاً جیفر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں سوچوں کے حصار سے باہر نکلا۔

''کک..... ک..... کچھ نہیں۔'' میں ہکلایا۔ پھر میں نے اس کی تعریف کی۔ ''تم بہت اچھی ہو۔''

''تھینکس۔'' اسے اپنی تعریف اچھی لگی تھی۔ ''تم بھی بہت اچھے انسان ہو۔ تم مجھے پسند آئے ہو۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے۔ سوری، اتنے دنوں سے میں تمہارا نام بھی نہیں پوچھ سکی۔ ڈاکٹر بوب نے بھی نہیں بتایا۔''

''میرا نام مورس ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''مورس..... ہم۔''

''جیفر! ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟''

''ہاں پوچھو۔'' جیفر نے جواباً کہا۔ ''ویسے تمہیں باتیں کرتا دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔''

''تم نے میری بات سن کر چونکنا نہیں، خود کو نارمل رکھنا ہے۔'' میں نے اس کی خوشی صرف نظر کی۔

''یقیناً تم کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہو۔'' جیفر نے کہا۔ نا جانے اس نے کیا اندازہ لگایا تھا۔

''ہاں، ایسا ہی سمجھ لو۔''

''اچھا پھر بولو۔''

''تمہارے خیال میں..... کیا ہماری گفتگو سنی جا رہی ہے؟'' میں نے بیڈ کی چادر کو گھورتے ہوئے اس کی رائے پوچھی۔

اس نے چند لمحے کچھ سوچا پھر یقین بھرے لہجے میں بولی۔ ''شاید نہیں۔''

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''یقین..... سے تو نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ یہاں سائنسی نظام قائم ہے۔'' وہ بولی۔ ''لیکن تمہارے پُراسرار لہجے نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ تمہاری تو دماغی حالت.....''

''میں..... ٹھیک ہوں۔'' میں نے ایک بار پھر بستر کی چادر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں پاگل پن کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔''

''کیا واقعی؟'' اگر میں نے اسے خبردار نہ کیا ہوتا تو وہ یقیناً حیرت کی شدت سے چلا ہی اٹھتی اسی لیے وہ نارمل لہجے میں مستفسر ہوئی۔ تاہم اس کے لہجے میں حیرت کا ہلکا سا عنصر ضرور موجود تھا۔

''پلیز، خود کو نارمل رکھو۔'' میں نے استدعا کی کیونکہ چہرے کے تاثرات بھی نوٹ کیے جا رہے ہوں گے۔

''اوکے۔'' اس نے خود کو نارمل کر لیا۔ ''میں سمجھ گئی ہوں تم نے ایسا کیوں کیا؟ کاش میرے دماغ میں بھی یہ بات آئی ہوتی تو میں بھی پاگل پن کی ایکٹنگ کر کے خود کو محفوظ رکھ پاتی۔ میری عزت محفوظ رہتی۔'' اس کے لہجے میں حسرت و یاس کی ملی جلی کیفیت شامل تھی۔

''کیا تمہاری بہن کا نام..... جولیا پیٹرک ہے؟'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور پانی کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے نا سمجھی میں میری طرف دیکھا۔ ''کیا چاہیے؟''

''پانی پینا ہے۔'' میں نے بھولپن مگر قدرے اونچی آواز میں کہا۔ تاکہ دیکھنے والے ہماری کسی حرکت سے چونک نہ پڑیں۔

''اوکے۔ دیتی ہوں۔'' جیفر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اٹھی اور گلاس میں پانی ڈال کر گلاس مجھے پکڑا دیا۔

میں جانتا تھا جولیا پیٹرک کا نام سن کر وہ یقیناً چونک پڑی ہو گی کیونکہ میں نے اس کے چہرے پر تاثرات بدلتے دیکھے تھے۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی اور میں نے آرام آرام سے پانی پیا اور گلاس اسے واپس کر دیا۔ پانی پینا میری پلاننگ کا حصہ تھا جو اُس وقت میرے دماغ میں چل رہی تھی لیکن میں کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے والوں کو کسی قسم کے شبے میں مبتلا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

''ہاں میری بہن کا نام جولیا پیٹرک ہے۔ وہ مجھ سے دو سال چھوٹی ہے۔'' گلاس واپس میز پر رکھنے کے بعد وہ دوبارہ میرے مدمقابل آ بیٹھی۔ ''کیا تم اس سے ملے ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''بعد میں بتاؤں گا۔ مجھے خدشہ ہے کہ ہماری باتیں سنی نہ جا رہی ہوں اس لیے ابھی اس ٹاپک کو کلوز کر دیتے ہیں۔''

اس نے اصرار نہ کیا اور خاموش ہو گئی۔ لمحہ بھر کے بعد وہ اٹھی اور واش روم میں چلی گئی جبکہ میں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔ جیفر کی چمکتی آنکھوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اپنی بہن کا سن کر اندر ہی اندر بے حد خوش ہے۔ مجھے اس کے ساتھ مل کر آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنا تھا لیکن

TAGPK.COM

احتیاط ضروری تھی۔ میری ذرا سی حرکت سے ڈاکٹر بوب شک میں مبتلا ہوسکتا تھا جو کہ میں نہیں چاہتا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی اور ہمارے لیے لنچ پہنچا دیا گیا۔ جیفر ہی مجھے اپنے ہاتھوں سے ناشتا، لنچ اور ڈنر کروایا کرتی تھی۔ ناشتے اور کھانے کے بعد جب وہ مجھے گولی دیتی تو میں اسے نگلنے کی بجائے دانتوں کے پیچھے چھپا لیتا اور پانی پی جاتا۔ پھر میں واش روم جا کر گولی منہ سے نکال کر فلش میں بہا دیتا۔

اُس وقت بھی لنچ جیفر نے اپنے ہاتھوں سے کروایا تھا۔ دوران لنچ اس نے مجھ سے دھیمی آواز میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے فی الوقت خاموش رہنے کا کہا۔ وہ جولیا پیٹرک کے بارے میں جاننے کے لیے مضطرب تھی۔

لنچ سے فراغت کے دس منٹ بعد ہی ڈاکٹر بوب نے جیفر کو بلا لیا اور وہ خاموشی سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے دھڑکا لگا اور دماغ میں مختلف سوالات سر اٹھانے لگے کہ ڈاکٹر بوب نے جیفر کو کیوں بلایا ہوگا۔ وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتا ہوگا۔ یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ کہیں اس نے ہماری باتیں سن تو نہیں لیں۔ تاہم یہ سوچتے ہوئے میں نے خود کو نارمل رکھا۔ جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔

بیس پچیس منٹ کے بعد ہی جیفر واپس آ گئی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے ہلکی آواز میں کہا۔ ''خاموش رہو۔''

میں بے تاثر رہا۔ اس کے کہنے کے انداز سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ یقیناً ہماری گفتگو سنی گئی تھی اور ڈاکٹر بوب نے جیفر کو اس لیے اپنے پاس طلب کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ ہماری ہر ایکٹویٹی دیکھنے کے ساتھ ساتھ گفتگو بھی سنی گئی تھی لیکن ہم نے دھیمے لہجوں میں بات کی تھی اس لیے وہ ہماری کوئی بات سن نہیں سکے تھے۔

تاہم ہم بے حد محتاط ہوگئے۔ جیفر کسی مصلحت کے تحت خاموش تھی اور اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی خاموش تھا لیکن پاگل پن کی ایکٹنگ جاری تھی۔ بیٹھے بیٹھے میں پاگلوں کی طرح ہنسنا شروع کر دیتا۔ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ٹانگیں چلانا شروع کر دیتا اور جیفر..... وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے نارمل کرنے کی کوشش کرتی۔

ایک روز میں پاگلوں کی طرح حرکتیں کر رہا تھا کہ اسی دوران مجھے واش روم جانے کی حاجت ہوئی تو میں نے جیفر سے کہا۔ ''میں واش روم جانا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں جاؤ۔''

''تم مجھے دروازے تک چھوڑ آؤ۔'' میں نے لاؤ بھرے لہجے میں کہا۔

''اوکے آؤ، میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔''

جیفر میرا ہاتھ پکڑے مجھے واش روم کے دروازے تک لے آئی۔ جب میں دروازہ کھول کر جانے لگا تو وہ سرسری انداز میں بولی۔ ''آئینہ دیکھ لینا۔''

مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ جس لہجے میں جیفر نے بات کی تھی یقیناً کوئی خاص بات تھی۔ ضروریات سے فراغت کے بعد میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ آئینے میں مجھے اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں غور سے خود کو دیکھنے لگا۔ میری شیو بڑھی ہوئی تھی۔ سر کے بال بھی بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔

اچانک مجھے آئینے کے کونے کے پیچھے ایک کاغذ دکھائی دیا۔ کاغذ اس طرح پھنسایا گیا تھا کہ پہلی نظر میں وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جیفر کی بات یاد آئی تو میں نے وہ کاغذ نکال لیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کاغذ تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس پر ایک تحریر لکھی تھی۔ ''تمہاری بات درست تھی۔ ہماری باتیں سنی جا رہی تھیں۔ تھینک گاڈ، ان کو واضح سنائی نہیں دیا اسی لیے ڈاکٹر بوب نے مجھے بلایا تھا کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ میں نے اسے نارمل دیا۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟ اپنا جواب اس کاغذ کے پیچھے لکھ کر کاغذ وہیں دبا دینا جہاں سے نکالا تھا۔ پین واش بیسن کے نیچے ٹونٹی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔''

میں نے ایک طویل سانس لیا۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ واقعی ہماری باتیں سنی جا رہی تھیں۔ چونکہ ہم دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے اس لیے کسی کو ہماری باتیں سنائی نہیں دی تھیں۔ جیفر بھی اس دلدل سے نکلنا چاہتی تھی اور میں بھی جانا چاہتا تھا۔ پتا نہیں جیفر پین اور کاغذ کہاں سے اور کیسے لائی تھی۔ بہرحال یہ میرا دردِ سر نہیں تھا۔ تاہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ میں نے واش بیسن کے نیچے جھانکا تو وہاں ٹونٹی کے ساتھ ایک بال پوائنٹ اٹکا ہوا تھا۔

TAGPK.COM

میں نے پین نکالا اور لکھنے لگا۔ ''ہاں، میں تمہاری مدد کروں گا۔ تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟ یہ بتاؤ کہ کیا تم نے ایسی کوئی لڑکی یہاں دیکھی ہے جس کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہو؟ وہ میری بہن ہے اور میں اسے بازیاب کرانے آیا ہوں۔'' اتنا لکھ کر میں نے پین ٹونٹی کے ساتھ اٹکایا اور کاغذ آئینے کے کونے میں پھنسا کر باہر آ گیا۔ جیفر کرسی پر بیٹھی شاید میرا ہی انتظار کر رہی تھی کیونکہ میرے باہر آتے ہی وہ اندر چلی گئی۔

میں نے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ جیفر اپنا جواب لکھ کر ہی واپس آئے گی۔ کچھ دیر کے بعد وہ واش روم سے باہر آ گئی۔ بیڈ پر اپنی سائیڈ کی جگہ پر بیٹھتی ہوئی وہ بولی۔ ''میں نے اپنا جواب نہیں لکھا لیکن تمہاری بہن کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال تمہیں اپنے پاگل پن کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ میں لیٹ رہی ہوں۔ میں تمہارے سینے پر جب ہاتھ رکھوں تو تم نے چیخ مار کر اٹھ بیٹھنا ہے اور زور زور سے چیخنا کہ جیسے تم پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔'' کہتے ساتھ ہی وہ بھی سو گئی۔ میں نے ہمکاری بھر کے اسے اوکے کا سگنل دے دیا تھا۔

قریباً بیس منٹ کے بعد جیفر نے کروٹ بدل کر اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب پاگل پن کا مظاہرہ کرنے کا وقت آن پہنچا ہے چنانچہ میں نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا اور یکدم چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ چونکہ جیفر تیار تھی اس لیے وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور متوحش نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ک..... ک..... کک..... کیا ہوا؟'' وہ حیرت اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

جواباً میں زور زور سے چلانے لگا۔ ساتھ ہی میں نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے۔ جیسے مجھے ذہنی اذیت دی جا رہی ہو اور میں اس سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

''آہ..... آہ..... میرا سر..... میرا سر.....'' میں چلاتا رہا۔

''کیا ہوا ہے؟'' جیفر بھی بوکھلائی ہوئی تھی۔ وہ بھی قابل داد ایکٹنگ کر رہی تھی۔

''میرا سر..... درد سے پھٹا جا رہا ہے..... آہ..... میرا سر..... آہ۔'' میں نے کراہنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

جیفر نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھرا اور میرا سر اپنے کاندھے سے لگا کر میرے کندھے پر تھپکی دیتی ہوئی دھیمے لب و لہجے میں بولی۔ ''سوری، مائنڈ نہ کرنا۔ ایسا کرنا مجبوری ہے۔ تم بہت اچھی ایکٹنگ کر رہے ہو۔ چند لمحوں کے بعد تم پُرسکون ہو کر خود کو ایسے ظاہر کرنا جیسے تم بے ہوش ہو گئے ہو۔''

گو اس کا مجھے بازوؤں میں بھرنا عجیب سا لگا تھا لیکن میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ کچھ دیر چیخنے چلانے کے بعد میں نے اپنے وجود کو آہستہ آہستہ ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا ہوں۔ جیفر مسلسل تھپکی دے رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے انتہائی احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا اور میرے سرہانے بیٹھ کر میرا سر دبانے لگی۔

دو تین روز اسی طرح خاموشی سے گزر گئے۔ میں کبھی کبھی پاگل پن کی ایکٹنگ کر لیتا تھا کیونکہ یہ ہماری پلاننگ کا حصہ تھا۔ جیفر مسلسل میری دلجوئی میں لگی ہوئی تھی۔ اس دوران ڈاکٹر باب بھی دو تین بار کمرے میں آیا تھا۔ وہ جب بھی آتا تو اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ طاری ہوتی۔ اس کی جھنجلاہٹ زچ کی آخر حد کو چھو رہی تھی۔ وہ ہر بار جیفر سے یہی پوچھتا تھا، ''آخر تم اسے کب لائن پر لاؤ گی؟ یہ کب ٹھیک ہوگا؟''

جواب میں جیفر یہی کہتی۔ ''میں اپنی پوری کوشش کر رہی ہوں کہ یہ لائن پر آ جائے لیکن اس کی دماغی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہوئی۔ میں جب بھی اسے ہاتھ لگانے کی کوشش کرتی ہوں تو اسے پاگل پن کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ یہ کہیں مجھ پر ہی حملہ نہ کر دے۔''

''میں حیران ہوں کہ گولیوں کا بھی اس پر کچھ اثر نہیں پڑ رہا۔'' ڈاکٹر باب نے اس کی بات نظر انداز کی تھی۔ ''کیا یہ باقاعدگی سے گولی کھا رہا ہے؟''

''ہاں۔ میں اسے تینوں ٹائم ایک گولی دے رہی ہوں۔'' جیفر نے کہا۔

''اب تک تو اسے ذہنی طور پر ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا۔ بہرحال میں ہیری ٹام سے بات کرتا ہوں۔ یہ تو ہم پر بوجھ ہی بن گیا ہے اور اس کی وجہ سے میرا بہت زیادہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس پاگل سے اب۔'' یہ سب باتیں اس نے جھنجلاہٹ میں کہیں تھیں۔

اُس کے زچ ہونے پر میں اندر ہی اندر بے حد خوش تھا۔ مجھے کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ ہیری ٹام سے کیا بات کرتا ہے اور ہیری ٹام اسے کیا احکامات دیتا ہے۔ میں نے اپنی

بہترین ایکٹنگ پر خود کو دادِ تحسین بھی دی۔ جیفر نے بھی مجھے دبے لفظوں میں خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے ذہنی و جسمانی طور پر تیار تھا۔ اس نے اُسی روز واش روم میں ایک کاغذ پر تحریر لکھ دی تھی اور جب میں واش روم جانے لگا تو اس نے وہی جملہ دہرایا تھا کہ ''آئینہ دیکھ لینا۔''

ضروریات سے فراغت کے بعد میں نے آئینے سے کاغذ نکال کر تحریر پڑھی۔ جیفر نے لکھا تھا۔ ''تم نے اپنی بہن کے بارے میں پوچھا ہے، جب میں یہاں لائی جا رہی تھی تو میرے ساتھ بہت سی لڑکیاں تھیں۔ انہی میں تمہاری بہن بھی تھی جس کی شکل تم سے ملتی تھی۔ میں نے پہلے غور نہیں کیا لیکن جب تم نے پوچھا تو کافی سوچنے کے بعد میرے ذہن میں تمہاری بہن کا چہرہ آیا۔ وہ بہت معصوم اور خوبصورت تھی۔ وہ بہت رو رہی تھی، التجائیں کر رہی تھی۔ اسی روز ہی مختلف ممالک سے لوگ آئے تھے۔ یہاں لڑکیوں کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے۔ ہر ماہ بعد ایک روز لڑکیوں کی خریداری کے حوالے سے بولی لگتی ہے۔ خریدار اپنی من پسند لڑکی خرید کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اسی طرح کوئی آدمی تمہاری بہن کو خرید کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ کون تھا یہ میں نہیں جانتی لیکن اتنا معلوم ہے کہ وہ شاید انڈین تھا۔ اس کا نام رتن کمار تھا شاید۔ مجھے نام صحیح سے یاد نہیں آ رہا۔ بولی والے دن میں اور ہیری ٹام بھی وہیں موجود تھے۔''

یہ تحریر پڑھ کر میرا دماغ گھوم گیا۔ اسماعیل شاہد نے تو کہا تھا کہ روزینہ نے سمندر میں کود کر خودکشی کر لی ہے لیکن جیفر بتا رہی ہے کہ اسے کوئی خرید کر لے گیا ہے۔ اس کا مطلب، میرا خدشہ درست تھا کہ اسماعیل شاہد نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ مجھے بہکانے کی کوشش کی ہے اور میں نے اس کی بات سچ مان لی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا لیکن صد شکر کہ مجھے سچ معلوم ہو گیا تھا۔

میں نے چٹ پھاڑ کر فلش میں بہا دی اور واش روم سے باہر آ گیا۔ جیفر کمرے میں موجود نہیں تھی۔ شاید ڈاکٹر بوب نے پھر اسے طلب کر لیا ہوگا۔ میں بیڈ پر نیم دراز ہو کر اُس شخص کے بارے میں سوچنے لگا جس نے میری بہن کو خریدا تھا۔

اوہ..... اُس بولی کو لگے کتنے دن ہو گئے تھے۔ یہ تو میں نے جیفر سے پوچھا ہی نہیں تھا۔ کاغذ بھی میں نے پھاڑ کر فلش میں بہا دیا تھا۔ دوسرا کاغذ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں دوبارہ واش روم میں آ گیا کہ شاید ٹونٹی کے پیچھے کوئی کاغذ اٹکا ہوا ہو لیکن سوائے پین کے اور کوئی کاغذ مجھے نہ ملا۔ یہاں تک کہ میں نے واش روم میں موجود الماری بھی اچھی طرح چیک کر لی۔ الماری میں لیڈیز سامان کے علاوہ اور کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ میں باہر آ گیا۔ جیفر بھی آ چکی تھی اور اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کپڑے اٹھائے واش روم میں چلی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کوئی بات بتانا چاہتی تھی اسی لیے واش روم گئی تھی تاکہ کاغذ پر لکھ کر کاغذ آئینے میں چھپا دے۔ کافی دیر کے بعد وہ واپس آ گئی تو وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔

وہ اسکرٹ میں ملبوس تھی اور اس کی ٹانگیں گھٹنوں سے پاؤں تک عریاں تھیں۔ اس نے اپنے سر کے بالوں کو خوبصورت انداز میں سیٹ کیا ہوا تھا۔ ہونٹ بھی سرخ تھے۔ لیکن اس کا چہرہ بدستور سپاٹ تھا۔ اس کا یوں تیار ہونا مجھے اچنبھے میں ڈال گیا۔ وہ کس کے لیے اتنی سج دھج سے تیار ہوئی تھی۔ مجھے بہکانے کے لیے یا..... اس سے آگے میں نہ سوچ سکا اور وہ مجھ سے کوئی بات کیے بغیر ہی کمرے سے باہر چلی گئی لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں اداسی ضرور دیکھی تھی۔ اس کے جاتے ہی مجھے ہلکی سی چٹک کی آواز سنائی دی جیسے لاک لگایا جاتا ہے۔

جیفر کیوں اتنی خاموش تھی، اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا تھا۔ وہ بن سنور کر کہاں گئی تھی؟ ان سوالوں کے جواب جیفر ہی دے سکتی تھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں آیا کہ شاید وہ ان سوالوں کے جواب لکھ کر کاغذ آئینے میں پھنسا گئی ہو، لیکن جاتے وقت اس نے کہا کیوں نہیں تھا۔ میں الجھ گیا اور میری بے چینی بڑھتی گئی چنانچہ میں اپنے سوالوں کے جوابات تلاش کرنے واش روم آ گیا۔ دروازہ بند کرنے کے ساتھ ہی میں نے بے چینی سے آئینے کے کونوں میں جھانک جھانک کر دیکھا لیکن کسی کونے میں کوئی کاغذ پھنسا ہوا دکھائی نہ دیا۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھی اور سرسراہٹ کی ایک لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔

اوہ..... کہیں جیفر کو پورنوگرافک کے لیے تو نہیں بلایا گیا؟ یہ خیال میرے دماغ میں آیا تو میں نے ایک طویل سانس لیا۔ اس کے بن سنور کے جانے کا مطلب تو یہی ہو سکتا تھا۔ یہ سوچ کر ہی مجھے گھن آنے لگی۔ مجھے جیفر سے

TAGPK.COM

نفرت نہیں ہو رہی تھی، ان روسیاہی لوگوں سے نفرت ہو رہی تھی جو معصوم لڑکیوں کو اپنے ناپاک مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، ان کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مجھے اس لمحے جیفر سے بے حد ہمدردی ہوئی۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتا۔ جتنے دن ہم دونوں ایک کمرے میں رہے، اس لڑکی نے ایک بار بھی میرے ساتھ نازیبا حرکت نہیں کی۔ حالانکہ وہ امریکی معاشرے میں پرورش پانے والی لڑکی تھی۔ جہاں لڑکی اور لڑکے کا ایک ساتھ رہنا گناہ نہیں سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ ان کے بچے ہو جاتے تھے۔ بچے بڑے ہو جاتے تھے تب بھی وہ شادی نہیں کرتے تھے۔ ان کی یہی منطق ہوتی کہ ابھی ہم ایک دوسرے کو سمجھ رہے ہیں۔

میں واش روم سے باہر آ گیا۔ کئی گھنٹے گزر گئے لیکن جیفر واپس نہیں آئی۔ مجھے حقیقتاً اس کی فکر ہونے لگی لیکن میں نے خود کو نارمل رکھا۔ میں بیڈ پر نیم دراز اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ میرے اندر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ نا جانے مجھے ایسے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب واپس نہیں آئے گی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دروازے کا لاک کھلنے کی آواز سنائی دی لیکن میں بہ دستور اسی پوزیشن میں پڑا رہا۔

دروازہ کھل گیا۔ میں سمجھا کہ جیفر آئی ہو گی لیکن ایک اور لڑکی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میں بے اختیار اندر ہی اندر چونک پڑا۔ میں نے اپنے چہرے پر چونکنے کی ایک رمق بھی پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ لڑکی اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کی گھٹنوں تک سڈول ٹانگیں عریاں تھیں۔ اس نے ہاتھوں میں نرسے اٹھائی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی بھی خوبصورت تھی لیکن شکل و صورت سے چالباز، عیار اور شاطر دکھائی دیتی تھی۔

بعض چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو کچھ چہروں پر ہوتا ہے وہی کچھ ان کے اندر بھی ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ چہرہ انسان کے اندر کا آئینہ ہوتا ہے۔ نرسے میز پر رکھنے کے بعد وہ میری طرف مڑی اور دلکش آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''ہائے مسٹر مورس۔'' اسے میرا نام بتا دیا گیا تھا۔

میں نے فوری طور پر خود پر بھول پن والا خول چڑھایا اور کہا۔ ''تم کون ہو..... اور جیفر.....؟''

وہ شاطرانہ انداز میں مسکرائی۔ ''میں..... جین بارٹر۔ آج سے میں تمہاری دوست ہوں اور تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہوں گی۔'' آخری بات اس نے معنی خیز لہجے میں کہی تو میں اندر تک تپ گیا۔

لیکن میں اس کا نام سن کر اندر ہی اندر چونک پڑا۔ جین بارٹر..... کیا یہ وہی لڑکی تھی جس کی تلاش میں، میں، کلارا، بابر اور لیزا نیو دتا گئے تھے۔ اب یہ اتفاق تھا یا سوچی سمجھی پلاننگ۔ پہلے جولیا پیٹرک کی بہن جیفر سامنے آئی اور اب یہ جین بارٹر۔ میں نے اپنے اندر کے تاثرات چہرے پر ابھرنے نہیں دیے۔ جین بارٹر بہ غور مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ پُراسرار سی مسکراہٹ۔ وہ ادائے دلربائی سے میرے سامنے بیٹھی تو مجھے اس سے گھن آنے لگی۔

''جیفر..... کہاں ہے؟ پلیز بتاؤ۔'' میں نے بھول پن سے التجائیہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ.....'' اس نے 'وہ' کو لمبا کھینچا۔ ''وہ..... چلی گئی بلکہ یوں سمجھو کہ وہ اُڑ گئی۔''

''چلی گئی..... اُڑ گئی..... کہاں؟'' مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی اسی لیے میں نے اس کی کہی بات دُہرائی۔

''اپنے خریدار کے ساتھ۔ ایک شخص کو وہ پسند آ گئی اور وہ اسے خرید کر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔'' اس نے صراحت سے بتایا۔ ''شاید وہ تمہیں اچھی لگتی تھی اسی لیے تم بار بار اسے بلانے کی التجا کر رہے ہو۔ خیر چھوڑو اُسے۔ یہاں یہ تو سب چلتا رہتا ہے۔ لڑکیاں آتی ہیں اور بک جاتی ہیں۔ یہ بتاؤ، تمہارا نام کیا ہے؟ دکھنے میں تو تم کافی ہینڈسم ہو۔''

''میں نے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔'' میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''پلیز، تم جیفر کو بلاؤ، میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ پلیز۔ بلاؤ اسے۔''

میں بھی اسے زچ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اور بار بار جیفر کو بلانے کی ضد کر رہا تھا۔ بالآخر وہ زچ ہو بھی گئی۔ بیزاریت سے معمور لہجے میں چھت کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اوگاڈ..... ہیلپ می۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں؟'' اس کے بعد اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''مسٹر! کہا تو ہے کہ وہ چلی گئی ہے۔ کتنی بار کہوں، وہ اب نہیں آئے گی۔ پلیز، میری بات کو سمجھو۔ آج سے میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ہم دونوں دوستی کر لیتے ہیں۔ کیا تم مجھ سے دوستی کرو گے؟'' کہتے ساتھ ہی اس نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف

بڑھایا۔

مجھے اس سے دوستی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور روٹھے ہوئے بولا۔ ''نہیں، میں تم سے دوستی نہیں کروں گا۔ میری صرف جیفر دوست ہے۔ تم جاؤ یہاں سے اور اسے بلاؤ۔''

میری ضد نے واقعی اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔ وہ جھلا کر بولی۔ ''او گاڈ..... کہیں میں اس پاگل کے ساتھ پاگل ہی نہ ہو جاؤں؟ بار بار کہہ رہی ہوں کہ وہ چلی گئی ہے لیکن یہ تو چھوٹے بچوں کی طرح ضد کر کے بیٹھ گیا ہے۔''

میں اس کے لہجے سے سہم گیا اور سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے میری طرف دوستی کے لیے بڑھایا ہاتھ اب پیچھے کر لیا تھا۔ وہ اٹھی اور میز پر سے ٹرے اٹھا کر میرے سامنے رکھی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''اچھا چلو، پہلے میں تمہیں کھانا کھلاتی ہوں، اس کے بعد بات کرتے ہیں۔'' کہتے ساتھ ہی اس نے ایک نوالہ بنا کر میرے منہ کی طرف بڑھایا تو میں نے سرعت سے منہ پیچھے کر لیا۔

''میں نے کھانا نہیں کھانا۔ تم جیفر کو بلاؤ۔ وہی مجھے کھانا کھلائے گی۔'' میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ جین بارٹر کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

وہ چند لمحے غصے سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے خود کو بہ مشکل نارمل کرتے اور لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''پلیز..... کھانا کھا لو، ضد مت کرو۔''

''میں نہیں کھاؤں گا..... میں صرف جیفر کے ہاتھوں سے کھانا کھاؤں گا۔ پلیز۔ تم جاؤ یہاں سے..... جاؤ..... جاؤ.....'' میں نے چیخ کر کہا تو شاید جین بارٹر غصے کے گھونٹ بہ مشکل پی سکی۔

میں نے بھی آج ٹھان لی تھی کہ اسے اتنا زچ کروں گا کہ وہ خود ہی یہاں سے بھاگ جائے گی اور پھر میں یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کروں گا۔ جیفر کے جانے کا سن کر مجھے بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ وہ واقعی میری بہت اچھی دوست تھی۔ اس نے میرا بہت اچھا خیال رکھا تھا اور ہم یہاں سے فرار ہونے کی پلاننگ کرنے والے تھے لیکن شومئی قسمت، ہمارے کچھ کرنے سے پہلے ہی کوئی اسے خرید کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور میں یہاں اکیلا رہ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ نہیں کھاتے تو نہ کھاؤ میری بلا سے۔ رہو بھوکے۔ جب بھوک لگے گی اور کھانا مانگو گے تو میں تمہیں نہیں کھلاؤں گی۔'' اس نے لقمہ واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

میں بھی روٹھے ہوئے انداز میں بیڈ کے اس کونے میں لیٹ گیا جہاں جیفر لیٹتی تھی۔ مجھے اپنی پشت پر جین بارٹر کی گھورتی ہوئی نظریں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں تاہم میں اسی پوزیشن میں پڑا رہا۔ تبھی دروازہ کھلا اور اندر کوئی داخل ہوا۔ میں چونکہ لیٹا ہوا تھا اور دروازے کا رخ سر کی طرف تھا اس لیے اندر داخل ہونے والے کو نہ دیکھ سکا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ آنے والا یقیناً ڈاکٹر بوب ہی ہوگا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ ڈاکٹر بوب ہی تھا۔ اس نے جین بارٹر سے استفسار کیا۔ ''کیا ہوا؟ یہ کھانا کیوں نہیں کھا رہا ہے؟''

''ضد کر رہا ہے کہ..... جیفر کے ہاتھوں سے ہی کھانا کھائے گا۔'' جین بارٹر نے تنک کر کہا۔

''اوہو..... بہرحال تمہیں تحمل سے کام لینا ہوگا جین۔'' ڈاکٹر بوب نے تفہیمی لہجے میں کہا۔ ''اس کی دماغی حالت صحیح نہیں ہے اس لیے یہ ضد کر رہا ہے۔ اگر ہیری ٹام کا مسئلہ نہ ہوتا تو اب تک میں اسے مار کر سمندر برد کر چکا ہوتا لیکن مجبوری ہے۔ اسماعیل شاہد کا کہنا ہے کہ یہ یادداشت کھو جانے کی ایکٹنگ کر رہا ہے۔''

''ایکٹنگ.....'' جین بارٹر نے اس کی بات قطع کی اور حیرت سے بولی۔ ''اونو.....''

میں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ڈاکٹر بوب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''میں نے اس کا دماغی معائنہ کیا ہے لیکن اس کی واقعی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ اب ایکٹنگ نہیں کر رہا۔ چونکہ یہ جیفر سے کافی مانوس ہو گیا تھا اس لیے بار بار اس کی بات کر رہا ہے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں، تمہیں تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ میں خود اس سے بہت زچ ہو چکا ہوں لیکن ہیری ٹام کی بات ماننے پر مجبور ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''ہمم..... تمہاری خاطر میں ایسا کر رہی ہوں ورنہ میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہ کروں۔'' جین بارٹر کے لہجے میں بیزاریت تھی۔ ''بہرکیف، میں خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''ایسا کرنا ضروری ہے جین۔ اچھا، جو گولیاں میں نے تمہیں دی ہیں، ان کا باقاعدگی سے اسے استعمال کراتی

رہنا۔'' ڈاکٹر بوب کی تنبیہی بھری آواز سنائی دی۔ ''اُمید ہے گولیوں کے اثر سے اس کی ذہنی حالت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ صرف اس کی ایک ہی ویڈیو بن جائے وہی کافی ہے۔ اس کے بعد اسے ہیری ٹام کے پاس بھجوا دیا جائے گا۔ پھر وہ جانے اور یہ جانے.....''

''یہ کھانا بھی تو کھائے تا یا خالی پیٹ کھلا دوں۔'' جین بارٹر نے استفسار کیا۔

''نہیں، اسے گولی خالی پیٹ مت کھلانا ورنہ الٹا اثر پڑ جائے گا۔'' ڈاکٹر بوب نے تنبیہ کی۔

''اوکے، میں کوشش کرتی ہوں اسے کھانا کھلانے کی۔'' جین بارٹر نے جواباً کہا۔ ''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ میں اس کے ساتھ زیادہ دیر رہ پاؤں گی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اس کے لیے کسی اور لڑکی کو بھیجیں جو اسے برداشت بھی کر سکے۔ ویسے تم فیلیا کو یہاں بھیج دو۔ وہ اسے اچھے سے ہینڈل کر لے گی۔''

''فی الحال نہیں۔'' ڈاکٹر بوب نے کہا۔ ''پہلے تم کوشش کرو، اگر اس نے تمہیں تنگ کیا تو میں فیلیا کو بھیج دوں گا۔''

ان کے درمیان مزید بھی کچھ باتیں ہوتی رہیں، پھر ڈاکٹر بوب واپس چلا گیا لیکن میں بدستور اسی پوزیشن میں پڑا رہا۔ مجھے ایک بار پھر اپنی پشت پر جین بارٹر کی نظریں کسی تیز دھار نیزے کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ لمحہ بھر کے بعد اس نے مجھے پکارا۔ ''مسٹر مورس!'' ڈاکٹر بوب نے اسے میرا نام مورس بتایا تھا۔ جواباً میں خاموش پڑا رہا۔ تبھی جین بارٹر یہ دیکھنے کے لیے کہ میں جاگ رہا ہوں یا سو گیا ہوں، مجھ پر جھکی تو میں نے جلدی سے آنکھیں موند لیں۔

''مورس!''

میں دم سادھے پڑا رہا۔

''مورس! کیا تم جاگ رہے ہو؟'' جین بارٹر نے دوسری بار مجھے پکارا۔ تبھی میری طرف سے کسی قسم کا رسپانس نہ ملنے پر مجھے اس کی لمبی سانس لینے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی وہ مجھ سے دور ہو گئی۔ میں نے شکر ادا کیا۔

میں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا کیونکہ جیفر کے بقول، روزینہ کو ایک انڈین آدمی خرید کر لے گیا ہے۔ میں پلاننگ بنانے لگا کہ یہاں سے نکل کر پہلے میں شوفرڈ جان کے پاس جاؤں گا۔ اسے ساری صورتِ حال بتا کر اس سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے انڈیا بھجوا دے لیکن اس

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس
100 روپے
ادا کر کے اپنا پرچا بک کروا لیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے
بھیج کر سالانہ خریدار اور
750 روپے ادا کر کے 6 ماہ
کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں
اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے
پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

سے پہلے اُس انڈین کے بارے میں معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ کون تھا اور انڈیا کے کس شہر میں رہتا تھا؟ اس کے بعد ہی میں آگے بڑھ سکتا تھا۔ بشرطیکہ میں یہاں سے زندہ بچ نکلا تو... ورنہ..... اس سے آگے سوچنا فضول تھا لہٰذا میں نے خود کو قسمت کے حوالے کر دیا۔ جو قسمت میں لکھا تھا وہی ہونا تھا۔ اسماعیل شاہد نے دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ اس کے خلاف میرے دل میں پہلے سے کہیں زیادہ نفرت ہو گئی۔ سوچتے سوچتے حقیقتاً میں اور نیند دونوں ہم آغوش ہو گئے۔

☆☆☆

نا جانے میں کتنی دیر سوتا رہا۔ میں نے تو سونے کی ایکٹنگ کی تھی لیکن نیند نے تھپکیاں دے دے کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ دوران نیند مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرے سینے پر کوئی چیز رکھ دی ہو۔ اسی باعث ہی میں نیند سے بیدار ہوا تھا۔ میں نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں چند لمحے سپاٹ چھت کو گھورتا رہا لیکن اگلے ہی لمحے میں ٹھٹک گیا۔ میں نے گردن موڑ کر اپنے بائیں طرف دیکھا تو غصے کی ایک شدید لہر میرے وجود میں سرایت کر گئی۔

جین بارٹر میرے کافی قریب میری طرف کروٹ لیے بیڈ پر لیٹی سو رہی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ میرے سینے پر دھرا تھا۔ ہم دونوں پر ایک ہی لحاف تھا۔ مجھے اس کا سینے پر ہاتھ رکھنا پسند نہیں آیا۔ میں نے پہلے اپنے اوپر سے لحاف ہٹایا پھر میں نے آہستہ سے جین بارٹر کی کلائی پکڑ کر اس کا بازو بیڈ پر رکھ دیا۔ آخر میں، میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جی تو چاہا تھا کہ اس کا بازو ایک جھٹکے سے توڑ دوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ ویسے اگر میں ایسا کروں تو یہی سمجھا جائے گا کہ میں پاگل ہوں اور پاگل سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔

بیڈ سے اتر کر میں پہلے واش روم گیا۔ ضروریات سے فراغت کے بعد میں بیڈ کی طرف جانے کی بجائے دروازے کی طرف بڑھا۔ اب اسے اتفاق کہا جائے یا میری خوش بختی، دروازے کا لاک کھلا ہوا تھا۔ لاک اتفاق سے کھلا ہوا تھا یا جان بوجھ کر کھولا گیا تھا، میں نے اس بات کو اہمیت نہ دی۔ ممکن ہے یہ ڈاکٹر بوب کی چال ہو۔ وہ میری ذہنی کیفیت چیک کرنا چاہتا ہو اور اسی لیے اس نے دروازے کا لاک کھلوا دیا ہو کہ کیا میں کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میں خود کو ''ایب نارمل'' ہی رکھوں تاکہ اسی کی بدولت میں ڈاکٹر بوب کے قہر سے محفوظ رہوں۔ دروازہ کھول کر میں باہر جھانکنے کی بجائے راہداری میں آ کر ایک طرف بڑھ گیا۔ چونکہ میرے پیروں میں جوتے نہیں تھے اس لیے ماربل کے فرش پر چلنے کی وجہ سے آوازیں بھی پیدا نہیں ہو رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ پوری عمارت میں جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں اور یقیناً مجھے دیکھا جا رہا ہوگا لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ میں کسی بھی طرح برائی کی اس دلدل سے نکل جانا چاہتا تھا۔

راہداریاں تو کئی تھیں اور راستے بھی کئی تھے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کدھر جاؤں؟ راہداریاں سنسان اور ویران پڑی تھیں لیکن روشن تھیں۔ ایک راہداری منتخب کر کے میں آگے بڑھا ہی تھا کہ دفعتاً ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور خباثت زدہ چہرے والا آدمی باہر آ گیا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ اُس نے سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جسے اس نے میرے سینے پر رکھ دیا۔ لباس سے یہی لگتا تھا کہ وہ گارڈ ہے۔

''اے..... کدھر۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے کوئی جواب دیا تو اس نے دوبارہ پوچھا۔

''کیا بھاگنا چاہ رہے ہو۔'' وہ اب میرے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور ڈنڈے کو بار بار اپنی ٹانگ پر مار رہا تھا جیسے تھانیدار کرتے ہیں۔

''چلو، واپس جاؤ۔''

میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا تو وہ سیخ پا ہو گیا۔ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''واپس جاؤ۔'' کہتے ساتھ ہی اس نے میرا بازو پکڑ کر پیچھے دھکیلا۔

میں چند قدم لڑکھڑایا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس کے ناک پر مکا جڑ دیا۔ شاید اسے میرے اس ردِعمل کی توقع نہ ہو گی جبھی مکا کھاتے ہی وہ نہ صرف بلبلا اٹھا بلکہ اس کے حلق سے تیز کراہ بھی نکل گئی۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے اپنا ہاتھ ناک پر رکھا۔ پھر اس نے ''باسٹرڈ'' کہتے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے ڈنڈا میرے سر پر مارنے کی کوشش کی لیکن میں برق سرعت سے ایک سائیڈ پر ہو گیا اور ڈنڈا ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ اس نے گھوم کر دوبارہ وار کرنا چاہا تو میں نے اس کی کلائی تھام لی۔

میں نے دیکھا، اس کے ناک سے خون نکل رہا تھا۔

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''فیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تا کہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

TAGPK.COM

وہ قدرے تنومند، جسیم اور طاقتور تھا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے نہ صرف اپنی کلائی میری گرفت سے چھڑوالی بلکہ میرے پیٹ میں اپنا گھٹنا جڑ دیا۔ میرے منہ سے کراہ نکلی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری سانس رک گئی ہو۔ لمحہ بھر کے بعد پیٹ میں شدید اینٹھن محسوس ہوئی۔ یہ اس ضرب کا نتیجہ تھا جو اس نے میرے پیٹ پر لگائی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں لڑکھڑا کر فرش بوس ہوگیا۔ وہ تنتناتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس نے جھک کر مجھے گریبان سے پکڑنا چاہا تو میں نے ایک بار پھر اس کے ناک پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے پیٹ میں ہوتی اینٹھن کے باوجود اپنے جسم کو سمیٹا اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

تبھی ڈنڈا بردار نے دوبارہ مجھ پر حملہ کر دیا لیکن میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا اس لیے میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور ڈنڈا فضا میں لہراتا ہوا دیوار پر جا لگا۔ زوردار آواز پیدا ہوئی جو راہداری میں گونج اٹھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے اچھل کر اس کے سینے پر کک ماری اور وہ پشت کے بل گر گیا۔ گرنے کے باعث ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا تاکہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اسے بے کار کر دوں لیکن وہ آدمی بہرحال میری توقع سے کہیں زیادہ تیز، پھرتیلا اور لڑائی کے فن میں ماہر تھا۔ ابھی میں اس کے قریب پہنچا ہی تھا کہ وہ انتہائی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی گھومتی ہوئی لات اس قدر بھرپور انداز میں میری پسلیوں پر پڑی کہ میں ضرب کھا کر اڑتا ہوا دیوار سے ایک دھماکے سے جا ٹکرایا۔ میں دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا ہی تھا کہ وہ آدمی انتہائی حیرت انگیز انداز میں قلابازی کھا کر میرے قریب فرش پر اس انداز میں گرا کہ اس کی دونوں ٹانگیں پوری قوت سے میری ناف پر لگیں اور میرے منہ سے بے اختیار 'اوہ' کی آواز نکل گئی۔ اس آدمی نے پہلی ضرب لگاتے ہی دونوں ٹانگیں ایک بار پھر اٹھائیں تاکہ دوبارہ ضرب لگا سکے لیکن میں... تیزی سے کروٹ بدل گیا۔ کروٹ بدلنا ہی مجھے دوسری ضرب سے بچا گیا تھا۔ میں نے فرش پر لیٹے لیٹے ہی لٹو کی مانند گھوم کر اس کی ٹانگوں پر ضرب لگا دی۔ وہ ضرب کھا کر پشت کے بل گر گیا۔ گرتے ساتھ ہی اس نے میرے پہلو پر ٹانگ رسید کر دی۔

گو ضرب ہلکی تھی لیکن میرے منہ سے ایک بار پھر 'اوہ' کی آواز نکل گئی۔ صد شکر کہ ڈنڈا میرے قریب ہی پڑا تھا جسے میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا پھر میں نے جلدی سے اٹھ کر اٹھتے ہوئے اس آدمی کے سر پر ڈنڈا رسید کر دیا۔ اس کے منہ سے دلدوز چیخ نکلی اور وہ ایک دھماکے سے فرش بوس ہوگیا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ میں ڈنڈا وہیں پھینک کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ راہداری کے اختتام پر پہنچ کر میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دائیں طرف تین چار کمروں کے دروازے تھے۔ اسی لمحے مجھے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میں سمجھ گیا کہ بے ہوش ہونے والے گارڈ کے ساتھی اس کی مدد کو آ گئے تھے اور جب انہیں صورتِ حال پتا چلے گی تو وہ یقیناً میرے پیچھے آئیں گے... چنانچہ میں بنا سوچے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

اُس کمرے میں چار لڑکیاں موجود تھیں جو ایک بیڈ پر بیٹھیں آپس میں گفت و شنید کر رہی تھیں۔ دو لڑکیاں تو مختصر لباس میں ملبوس تھیں جو یورپین لگتی تھیں جبکہ دو لڑکیوں نے پورے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں ایک لڑکی شکل و صورت سے ایشین دکھائی دیتی تھی جبکہ دوسری شاید جاپانی تھی۔ بہرکیف مجھے دیکھتے ہی وہ چاروں لڑکیاں بے اختیار چونک پڑیں۔

''ڈرو..... ڈرو نہیں۔ میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گا۔'' میں نے بے اعتدال سانس کے ساتھ تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ میرا سانس یوں پھولا ہوا تھا جیسے میں ریس کا عالمی مقابلہ جیت کر آیا ہوں۔

''کون ہو تم اور کیوں منہ اٹھا کر ہمارے کمرے میں گھس آئے ہو؟'' ایک لڑکی نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''پپ..... پپ..... پلیز..... کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاؤ۔'' میں نے اتنا کہا اور ساتھ ہی میں نے مڑ کر دروازہ لاک کر دیا۔ وہ چاروں لڑکیاں بیڈ سے اتر آئی تھیں۔

''تم نے دروازہ کیوں لاک کیا؟'' اُسی لڑکی نے میرے مدمقابل کھڑے ہو کر تفتیشی لہجے میں پوچھا۔

''وہ..... وہ میرے پیچھے ہیں۔'' میں نے اٹک کر جواب دیا۔

''کون؟'' اس نے ہونٹ سکیڑے۔

''وہ گارڈ.....'' میں نے بتایا۔

''گارڈ.....؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''وہ تمہارے پیچھے کیوں ہیں۔''

''وہ.....'' میں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً باہر

TAGPK.COM

سے دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھریں تو میں کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ اس دوران میں کمرے کا جائزہ لے چکا تھا وہاں کوئی کیسرا نہیں تھا۔ چاروں کونوں میں ایک ایک بیڈ پڑا تھا اور ہر بیڈ کے ساتھ چھوٹی سی ایک میز پڑی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک بڑا سا صوفہ پڑا تھا البتہ وسط میں قابل ذکر کوئی چیز نہیں پڑی تھی۔

''اوہو..... تم وہی تو نہیں ہو جس کے بارے میں ڈاکٹر بوب نے بتایا ہے کہ وہ پاگل ہوگیا ہے۔'' لڑکی نے جانچتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں..... میں وہی ہوں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ میں نے یہ کہہ کر صحیح کیا تھا یا غلط۔ نہیں جانتا تھا۔

''اوہو.....'' وہ چاروں ہی حیران رہ گئیں۔ ''یعنی تم فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہو؟''

میں کشمکش میں مبتلا ہوگیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ عین اسی لمحے دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ ساتھ ہی ایک مردانہ آواز ابھری۔ ''زیٹا! دروازہ کھولو.....''

لڑکی کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور واش روم کے دروازے کی طرف دھکیلتی ہوئی بولی۔ ''تم واش روم میں چھپو..... میں دیکھتی ہوں۔'' پھر اس نے اپنی ایشیائی لڑکی سے کہا۔ ''شلپا! تم بھی واش روم میں چلی جاؤ اور کنڈی لگا لو۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ شلپا نامی لڑکی نے بھی واش روم میں آتے ہی کنڈی لگا دی۔ میں نے نوٹ کیا، شلپا بڑے غور سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ سانولی رنگت کی قبول صورت مگر پرکشش لڑکی تھی۔ اس کے سر کے بال گھنگریالے تھے جو اس پر بے حد جچ رہے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کاجل سے بھری ہوئی تھیں۔ گو ایک نظر دیکھنے کے بعد میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا لیکن مجھے اس کی نظریں خود پر گڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ تبھی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تو میں نے کان کمرے کی طرف لگا دیئے۔

''زیٹا! تم نے دروازہ دیر سے کیوں کھولا؟'' ایک مردانہ مگر کرخت آواز سنائی دی۔

''تمیز سے بات کرو۔'' ہمیں واش روم میں بھیجنے والی لڑکی کا نام زیٹا تھا۔ اس نے ترش روئی سے جواب دیا۔ ''ہم سو رہے تھے اور ہمیں پتا نہیں تھا کہ تم تشریف لا رہے ہو۔''

لڑکی کے بولنے کے انداز سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی نڈر اور اکھڑ مزاج کی ہے۔

''ہر وقت سوتی ہی رہتی ہو۔'' مرد نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں اس سے مطلب؟'' لڑکی کے لہجے میں کسی قسم کے خوف کی رمق نہ تھی۔ اس نے بدستور ترش روئی سے کہا۔ ''اب یہاں آنے کی وجہ بھی بتاؤ گے؟''

''کبھی تو پیار سے بات کر لیا کرو زیٹا ڈیئر۔'' مرد بھی شاید ڈھیٹ تھا۔

''تم سے پیار سے بات کرتی ہے میری جوتی۔'' لڑکی نے غصے سے جواب دیا۔

''مجھے تمہاری بات بری نہیں لگی۔'' اس کا قہقہہ گونجا۔ ''بہرحال، وہ پاگل مورس اپنے کمرے سے فرار ہوگیا ہے۔ اس نے رینڈل کو بھی زخمی کر دیا ہے۔ اُسے تمہارے کمرے والی راہداری کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ تمہارے کمرے میں آگیا ہو اور تم اسے دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی ہو۔'' آخری بات اس نے معنی خیز لہجے میں کہی تھی۔

''کیا وہ تمہیں یہاں دکھ رہا ہے؟'' زیٹا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں.....''

''پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اپنی شکل گم کرو۔'' زیٹا نے تلخی سے کہا۔

''جاتا ہوں، جاتا ہوں زیٹا ڈیئر..... لیکن میں پہلے واش روم چیک کرنا چاہوں گا۔ کیا اجازت ہے؟'' گارڈ نے نئی فرمائش کی تو یکبارگی میرا دل دھڑک اٹھا البتہ شلپا پرسکون کھڑی رہی۔

''سوری، تم واش روم چیک نہیں کر سکتے۔'' زیٹا نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''واش روم میں شلپا ہے۔''

''ہمم.....'' گارڈ کی ہنکاری بھرنے کی آواز سنائی دی۔ ''ٹھیک ہے، ویسے بھی مجھے تم پر اعتبار ہے۔ تم جھوٹ نہیں بولتیں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ یہاں نہیں آیا۔ چلتا ہوں۔''

''ہاں ہاں، جلدی سے دفع ہو جاؤ۔'' زیٹا نے ترش روئی سے کہا۔ ''میں زیادہ دیر تمہیں برداشت نہیں کر سکتی۔ گھن آتی ہے تمہارے وجود سے۔''

TAGPK.COM

جواب میں گارڈ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ''میں باس سے بات کر کے تمہیں ہمیشہ کے لیے مانگ لوں گا پھر دیکھوں گا تم کیسے نخرے کرتی ہو، کیسے مجھ سے گھن کھاتی ہوں۔''

''وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔'' زینا تیقن سے بولی۔

''آئے گا اور ضرور آئے گا ڈیئر۔ لہٰذا تم اپنا باغیانہ رویہ ترک کر دو تمہارے لیے بہتر رہے گا۔ ہاہاہا.....'' اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلنے اور پھر زور سے بند ہونے کی آواز سنائی دی تو میں نے سکون کی سانس لی۔

زینا کی ساری پلاننگ میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ نڈر اور اکھڑ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھی۔ جس طرح اس نے میرے ساتھ شلپا کو واش روم میں بھیج دیا تھا میں اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا لیکن اس کی باتوں سے بھی میں یہ اندازہ لگانے پر مجبور ہو گیا کہ وہ باغی لڑکی ہے۔ یقیناً وہ بھی حالات کی ماری ہوئی ہے۔ یقیناً اسے بھی پورنو گرافک کے لیے اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہوگا۔ گارڈ شاید اسے پسند کرتا تھا اور زینا اسے گھاس نہیں ڈالتی تھی۔

لمحہ بھر کے بعد واش روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ساتھ ہی زینا کی سرگوشی نما آواز ابھری۔ ''آ جاؤ باہر۔''

میں جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ شلپا بھی میرے پیچھے ہی باہر آ گئی۔ وہ زینا کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔

''الو کا پٹھا یہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔'' زینا گارڈ کو گالی دیتی ہوئی بولی۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''بے فکر رہو، اب وہ خبیث دوبارہ یہاں نہیں آئے گا۔''

''اگر آ گیا تو.....؟'' یہ سوال اس کی ساتھی لڑکی نے کیا تھا جو بے حد اہم سوال تھا۔

''تب کی تب دیکھی جائے گی۔''

''تم نے اسے کیوں بچایا؟'' یہ سوال دوسری لڑکی نے کیا تھا۔ یہ بھی بہت اہم سوال تھا۔

''شاید یہ ہمیں یہاں نکالنے میں ہماری مدد کر سکے۔'' زینا گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''لیکن یہ تو پاگل ہے؟'' پہلی لڑکی نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ پاگل ہے۔'' زینا نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں نا؟'' یہ بات اس نے مجھ سے پوچھی تھی۔

تصدیق کی خاطر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ شلپا اور دونوں لڑکیاں قریبی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ زینا بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''تم ہم چاروں پر اعتبار کر سکتے ہو۔ اگر ہم سے کچھ ہو سکا تو ہم تمہاری مدد بھی کریں گی کیونکہ ہم خود اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہیں۔ تمہیں یہاں دیکھا تو اُمید کی کرن ہمارے اندر پھوٹی ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس اپنے اندر انڈیلی۔ اس کی ان باتوں سے میں سمجھ گیا کہ وہ واقعی حالات کی ماری لڑکیاں تھیں اور اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہیں۔ میں نے سوچا اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح اس نے مجھے گارڈ سے بچایا تھا اعتبار کرنے کے لیے وہی کافی تھا ورنہ وہ مجھے گارڈ کے حوالے کر سکتی تھیں۔

''لیکن تم نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔'' میرے دل میں یہ بات تھی اس لیے میں نے اس سے پوچھ لی۔

''تم نے جب اندر آ کر کہا کہ گارڈ تمہارے پیچھے ہے تو میں سمجھ گئی کہ تم پاگل نہیں ہو، ورنہ پاگل انسان کو کیا پتا کہ گارڈ کیا ہوتا ہے۔'' زینا نے ایک بار پھر اپنی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔

جواباً میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم ہم پر اعتبار کر سکتے ہو۔'' زینا نے کہا۔

''جس طرح تم نے مجھے بچایا ہے اس لیے تم پر اعتبار ہے۔'' مجھے واقعی زینا اور اس کی ساتھی لڑکیوں پر بہت جلدی اعتبار آ گیا تھا ورنہ انہیں کیا ضرورت تھی مجھے بچانے کی۔

''تھینکس۔ یہاں کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو ہمارا ساتھ دے۔'' وہ مشکور لہجے میں گویا ہوئی۔ ''ہر مرد نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کا طالب ہے۔ میں نے پہلے گارڈ مائیکل پر بھروسا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خودغرض، مکار اور ہوس پرست انسان ہے اسی لیے مجھے اس سے بے حد نفرت ہے۔ اس نے صرف اس لیے مجھے یہاں سے نکالنے کی پیش کش کی کہ میں ہمیشہ کے لیے اس کی گرل فرینڈ بن کر رہوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی۔ جب تمہارے بارے میں معلوم ہوا کہ تم پورنو گرافک کے لیے تیار نہیں ہو رہے اور

TAGPK.COM

مسلسل اذیت کے زیر اثر ہو تو ہم نے سوچا کہ اگر ہم تمہاری مدد کریں اور تم ہماری مدد کرو تو شاید ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ تم ذہنی اذیت کے باعث پاگل ہو گئے ہو۔ پاگل انسان کے ساتھ کیسے فرار ہوا جا سکتا ہے یہ سوچ کر ہم نا اُمید ہو گئیں۔''

''صحیح کہہ رہی ہو۔'' وہ صراحت سے بولی۔ ''ویسے جیفر نے مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا کہ تم پاگل نہیں ہو صرف پاگل ہونے کی ایکٹنگ کر رہے ہو۔ جیفر اور میں بیسٹ فرینڈز ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارا خیال رکھوں اور میرا خیال تھا کہ تمہارا خیال رکھنے کے لیے ڈاکٹر بوب مجھے بھیجے گا تو میں تم سے مل کر کوئی پلان بنا لوں گی لیکن اُس حرامی نے اپنی منظور نظر جین بارٹر کو بھیج دیا۔''

یہ انکشاف حیران کن تھا کہ جیفر اور زیٹا دونوں بیسٹ فرینڈ ہیں اور اُس نے زیٹا کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔ ''جیفر بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس نے واقعی میرا بہت خیال رکھا ہے۔''

''اگر تم مزید کچھ دن کمرے میں جین بارٹر کے ساتھ رہتے تو جین بارٹر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔'' زیٹا نے کسی خیال کے تحت کہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس مقصد کی بات کر رہی ہے۔ ''میں اس بدبخت کی خصلت سے واقف ہوں۔ مرد کو پھنسانے کے اسے کئی حربے آتے ہیں۔''

''لیکن میں اسے اس کے حربے میں کبھی کامیاب نہ ہونے دیتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیونکہ مجھے خود پر اعتماد ہے۔ میں بہکنے والوں میں سے نہیں ہوں اور نہ ہی ہوس پرست ہوں۔''

''تمہاری پاگل پن کی ایکٹنگ کا سن کر اب مجھے تم پر یقین ہو گیا ہے کہ تم ذہین اور بہادر نوجوان ہو۔'' زیٹا تائیدی لہجے میں بولی۔ ''مسٹر مورس! کہاں سے تمہارا تعلق ہے؟''

''پاکستان سے۔'' میں نے جواب دیا تو وہ حیران رہ گئی۔

''پاکستان سے۔'' وہ حیران ہوئی۔ ''کیا تمہیں بھی اغوا کیا گیا ہے؟''

''نہیں، میں یہاں خود آیا ہوں۔'' میں نے جواباً کہا اور اس کے استفسار پر یہاں پہنچنے کی وجہ بتا دی۔ وہ چاروں میری بات سن کر حیران رہ گئیں۔

''میں نے پہلا آدمی دیکھا ہے جو اپنی بہن کی تلاش میں خود کو موت کے حوالے کرنے آیا ہے۔'' زیٹا کے لہجے میں میرے لیے ستائش تھی۔ ''ہمیں اس جزیرے پر قید ہوئے عرصہ ہو گیا ہے لیکن ابھی تک ہماری تلاش میں کوئی نہیں آیا۔''

''ہو سکتا ہے تم چاروں کو بھی تلاش کیا جا رہا ہو۔'' میں نے انہیں اُمید دلائی۔

''شاید۔'' زیٹا نے کندھے اچکائے۔ ''لیکن کسی کو کیسے پتا چلے گا کہ ہم اس جزیرے پر قید ہیں۔ ڈاکٹر بوب نے بتایا تھا جس عمارت میں ہم موجود ہیں یہ دنیا کی نظروں سے چھپی ہوئی ہے۔ یہاں کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔''

''ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں بھی ایک ہفتہ جزیرے پر بھٹکتا رہا تھا۔''

''ویسے تم نے ڈاکٹر بوب کو کیسے دھوکا دیا ہے۔'' زیٹا کے لہجے میں دلچسپی تھی۔ اس کی ساتھی لڑکیاں خاموشی سے ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ ''سنا ہے کہ ڈاکٹر بوب کی ایجاد کردہ مشینوں کو ڈاج دینا ناممکن ہے۔''

''ناممکن کوئی بھی کام نہیں ہوتا مس زیٹا۔'' اس کا پہلی مرتبہ نام لیتے ہوئے میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''مجھے بھی نہیں پتا کہ میں نے ڈاکٹر بوب کی مشینوں کو کیسے ڈاج دیا ہے لیکن کامیابی ضرور ملی ہے۔ ڈاکٹر بوب ابھی تک یہی سمجھتا ہے کہ میرا دماغی توازن درست نہیں ہے۔''

''گریٹ۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولی۔

''تم نے بتایا کہ تم نے بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ کیا تم کوئی ایسا راستہ جانتی ہو جہاں سے فرار ہونے میں آسانی ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جانتی ہوں۔'' وہ طویل سانس لے کر بولی۔ ''مجھے گارڈ مائیکل نے بتایا تھا کہ یہاں ایسی سرنگ موجود ہے جہاں سے قیدی لڑکیوں کو لایا جاتا ہے۔ اس سرنگ کے اختتام پر ایک فولادی دروازہ ہے۔ میں نے اپنے طور پر اس سرنگ کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن نہیں ملی۔ ہر جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں اور ہر کسی کی نقل و حرکت چیک کی جا رہی ہے۔ میری بھی نقل و حرکت چیک کی گئی اور مجھ سے پوچھا گیا کہ میں باہر کیوں پھر رہی ہوں۔ تب میں نے جھوٹ بول دیا تھا لیکن شاید ڈاکٹر بوب کو یقین نہیں آیا تھا تبھی اس نے مجھے ان تینوں کے ساتھ رہنے کے لیے بھیج

TAGPK.COM

دیا۔ پہلے میں اور جینفر اکٹھی رہتی تھیں۔''

پھر ہم اس حوالے سے باتیں کرنے لگے۔ اس دوران میں نے اس سے روزینہ کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بھی تصدیق کر دی کہ روزینہ کو ایک انڈین خرید کر لے گیا ہے۔ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے اور انڈیا میں کہاں رہتا ہے اس بارے میں سوائے ہیری نام کے اور کوئی نہیں جانتا۔

جیسا کہ بعد میں زینا نے بتایا کہ اس کا تعلق امریکا سے ہے۔ شلپا انڈین، کیتھرین لندن کی اور چونگ جی جاپانی ہے۔ انہیں وہاں رہتے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے اور وہ پورنو گرافک کرتی ہیں۔ ان کی کئی ویڈیوز ڈارک ویب پر وائرل ہو چکی ہیں۔ بقول زینا کے جو لڑکیاں بہ خوشی و راضی پورنو گرافک کرتی ہیں وہ آزادانہ اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتی ہیں اور جو لڑکیاں اس گھناؤنے کام کے لیے تیار نہیں ہوتیں تو انہیں زبردستی یہاں قید رکھا جاتا ہے اور ان سے پورنو گرافک کرائی جاتی ہے۔

زینا نے بتایا کہ وہ ہیری نام کے کلب میں کام کرتی تھی اور ایک روز ہیری نام نے اسے اپنے آفس بلا کر اسے پورنو گرافک ویڈیوز میں کام کرنے کی آفر کی جسے اس نے ٹھکرا دیا۔ ہیری نام کو اس کا انکار پسند نہیں آیا اور اس نے اسے اغوا کرا کے یہاں زمین دوز عمارت میں پہنچا دیا۔ کئی روز تک اسے ذہنی طور پر ٹارچر کیا جاتا رہا۔ اسے دھمکیاں دی گئیں کہ اگر وہ تیار نہ ہوئی تو اس کے بوڑھے ماں باپ کو مار دیا جائے گا۔ تبھی وہ ماں باپ کو مرنے سے بچانے کے لیے گناہ کی دلدل میں اتر گئی۔ ہر کسی کی ایک دوسرے سے ملتی جلتی کہانی تھی۔ وہ تینوں لڑکیاں مجبور و بے بس تھیں۔

اس کی باتیں سن کر مجھے بے حد افسوس بھی ہو رہا تھا اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ تبھی دروازہ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا جانے لگا تو ہم چاروں ہی چونک پڑے۔ میں نے زینا کی طرف دیکھا تو وہ تشفی آمیز لہجے میں بولی۔ ''ڈونٹ وری۔ تم بیڈ کے نیچے چھپ جاؤ۔ میں سنبھال لوں گی۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور جلدی سے ایک بیڈ کے نیچے چھپ گیا۔ میرے سامنے کیتھرین کھڑی ہو گئی اور مجھے اس کی سڈول ٹانگیں دکھائی دیں۔ میں نے سر جھکا لیا۔ تبھی زینا نے دروازہ کھول دیا۔ اندر آنے والے کے قدم مجھے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ شاید ڈاکٹر بوب تھا اور اس کے ساتھ تین گارڈ تھے۔ جیسا کہ بعد میں زینا نے بتایا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ مفرور پاگل اسی کمرے میں آیا ہے؟'' ڈاکٹر بوب نے یہ بات شاید کسی گارڈ سے پوچھی تھی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ میرے فرار پر سخت غصے میں ہے۔

''یس ڈاکٹر۔ مجھے پورا یقین ہے۔'' گارڈ نے تیقن سے کہا تو میرا دل اچھل کر میری مٹھی میں آ گیا، ساتھ ہی اس نے زور زور سے دھڑکنا بھی شروع کر دیا۔ صورت حال کمپلی کیٹڈ ہو گئی تھی اور معلوم نہیں آگے کیا ہونا تھا۔

''یہاں کوئی نہیں آیا ڈاکٹر۔'' دفعتاً زینا نے مداخلت کی۔ ''میں اسے پہلے بھی بتا چکی ہوں۔''

''یہ تو کہہ رہا ہے کہ تم نے اسے واش روم کی چیکنگ ہی نہیں کرنے دی۔'' ڈاکٹر بوب مستفسر ہوا۔

''اس وقت واش روم میں شلپا تھی تو اسے کیسے چیک کرنے دیتی۔'' زینا کے لہجے میں ناگواریت عود آئی۔ ''اب جا کر چیک کر لے، اگر کوئی موجود ہو گا تو وہ سامنے آ جائے گا۔''

چند لمحے خاموشی طاری رہی، ڈاکٹر بوب نے ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ وہ مفرور آخر گیا تو کہاں گیا۔ اس راہداری میں صرف چار کمرے ہیں۔ ہم نے تینوں کمرے چھان مارے ہیں لیکن مفرور نہیں ملا۔ اب صرف تمہارا کمرا رہ گیا ہے۔''

''ڈاکٹر۔ تم چیک کر کے اپنی تسلی کر سکتے ہو۔'' زینا نے پورے اعتماد کے ساتھ اسے آفر کی تو میرے وجود میں پریشانی کی ایک لہر سرایت کر گئی۔ اگر ڈاکٹر بوب نے اس کی آفر قبول کر لی تو پھر کیا ہو گا؟ میرا پکڑا جانا لازمی امر ہے۔

''مجھے تم پر یقین ہے زینا۔'' ڈاکٹر بوب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے گارڈوں سے کہا۔ ''چلو، کہیں اور تلاش کرتے ہیں۔'' اس نے کسی کو ہدایت دی۔ ''تم جا کر سارے کیمرے چیک کرو۔ اسے ہر صورت تلاش کرو۔ مجھے وہ پاگل زندہ چاہیے۔ جاؤ۔''

کچھ دیر کے بعد وہ سب چلے گئے تو زینا نے دروازہ بند کرتے ساتھ ہی ڈاکٹر بوب کو نفرت بھری ایک غلیظ گالی بھی دی۔ کیتھرین بہ دستور کھڑی ہوئی تھی اور میں سائیڈ سے بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔ میں نے غور کیا تو زینا کے علاوہ باقی تینوں لڑکیاں متوحش دکھائی دے رہی تھیں۔ زینا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''مسٹر مورس! میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹر بوب

TAGPK.COM

میری بات پر مطمئن نہیں ہوا۔ وہ بے حد شاطر، کائیاں اور کمینہ صفت انسان ہے۔ اُس نے یقیناً میرے ساتھ چال چلی ہے۔ اس کی نظریں ہم پر ہوں گی۔ تم بتاؤ اب کیا کریں؟''

مجھے دل ہی دل میں افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے وہ چاروں بھی مصیبت میں پھنس گئی تھیں۔ مجھے اس کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تاہم میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہو مورس۔'' زیٹا خفگی سے بولی۔ ''تمہاری وجہ سے ہمیں بھی یہاں سے فرار ہونے کی اُمید ملی ہے۔ بے فکر رہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ بس پہلے تمہیں کہیں چھپانا ہوگا باقی پلاننگ بعد میں کر لیں گے۔''

''لیکن تمہاری ساتھی تو خوفزدہ ہیں۔'' میں نے اس کی توجہ باقی تینوں لڑکیوں کی طرف دلائی۔ زیٹا نے چونک کر اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

''کیا تم واقعی خوفزدہ ہو؟''

''ہاں ہیں۔'' چونگ چی نے کہا۔ ''اگر ہم پکڑی گئیں تو.....؟''

''کیا تم یہاں اس دلدل سے نکلنا نہیں چاہتی؟'' زیٹا نے ہونٹ بھینچ کر پوچھا۔

''نکلنا تو چاہتی ہیں۔'' یہ بات کیتھرین نے کہی۔ ''لیکن مجھے نہیں لگ رہا ہے کہ ہم یہاں سے نکل سکیں گے۔''

''مایوسی کی باتیں مت کرو کیتھرین۔'' زیٹا نے تشفی آمیز لہجے میں بولی۔ ''کیا یہ ذلت کی زندگی نہیں ہے کہ ہماری پورن ویڈیوز ڈارک ویب پر موجود ہیں اور نجانے اور کتنی ویڈیوز بنائی جانی ہیں۔ کیا تم ایسی ذلت کی زندگی گزارنا چاہو گی؟''

''نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں ایسی زندگی سے نفرت کرتی ہوں۔''

''بس پھر حوصلہ رکھو۔'' زیٹا نے پُرسکون لہجے میں کہا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ''گارڈ نے چاہا تو ہم اس دلدل سے ضرور نجات پائیں گی۔''

''پہلے اسے کہیں چھپانے کا بندوست کرو زیٹا۔'' چونگ چی نے کہا۔ ''ڈاکٹر بوب دوبارہ بھی آ سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس بار وہ بیڈز کی بھی تلاشی لے۔''

''یہ بھی ممکن ہے۔'' شلپا نے کہا۔

''پھر اسے کہاں چھپائیں؟'' زیٹا الجھن میں پڑ گئی۔

''میرا خیال ہے اسے دوسرے کمرے میں چھپا دیتے ہیں۔'' شلپا نے تجویز دی۔ ''ویسے بھی ان کمروں کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر بوب کو صرف ہم پر شک ہے۔''

''لیکن یہ کمروں کی موجودگی میں دوسرے کمرے میں بھلا کیسے جا سکتا ہے؟'' چونگ چی بھی قدرے ذہین تھی۔

''ہاں، یہ مسئلہ بھی ہے۔'' زیٹا نے ہونٹ بھینچے۔ ''اب تو ایک ایک کیمرا چیک کیا جا رہا ہے۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو وہ چاروں میری طرف متوجہ ہو گئیں۔

''وہ کیا؟'' زیٹا نے استفسار کیا۔

''کیا تم کسی گارڈ کو یہاں بلا سکتی ہو؟'' میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا تو میں نے اسی کے تحت پوچھا۔

''گارڈ کو؟'' زیٹا نے ہونٹ سکیڑے۔ ''تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟''

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنی ترکیب بتا دی۔ زیٹا چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''تمہاری ترکیب تو اچھی ہے لیکن اس میں خطرہ بہت ہے۔''

''بے فکر رہو زیٹا، میں خطروں سے کھیلنے کا عادی ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''وہ تو تمہاری کارکردگی سے پتا چل گیا ہے۔'' زیٹا بھی زیرِ لب مسکرائی۔

''ہم یہاں سے ضرور نکلیں گے لیکن سب سے پہلے مجھے ایک اہم کام انجام دینا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ چونک پڑی۔

''کام..... کیسا کام؟''

''ڈاکٹر بوب کو جہنم واصل کرنے کا کام۔'' میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تو زیٹا نے پُرسکون سانس لیا۔

''میری بھی..... بلکہ ہم سب کی یہی خواہش ہے مورس۔'' زیٹا مسکرائی۔

''لیکن تم ڈاکٹر بوب کو کیسے ہلاک کرو گے؟'' اس بار شلپا نے لب کشائی کی۔ ''میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تم اس تک کیسے پہنچو گے۔ ہر جگہ کیمرے نصب ہیں۔''

''اس بارے میں میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''تم کسی گارڈ کو لے آؤ، باقی کام بعد میں کریں گے۔'' میں نے کہا تو شاید زیٹا میری بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی، تبھی وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی

TAGPK.COM

دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازہ کھول کر پہلے باہر جھانکا۔ اگلے چند لمحے اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔

''باہر دو گارڈ موجود ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کسی ایک کو بلا لو۔'' میں نے کہا۔

''اگر وہ دونوں آ گئے تو.....؟''

''میں سنبھال لوں گا۔'' میں نے یقین سے جواب دیا تو وہ مطمئن ہو گئی پھر اس نے مڑ کر دروازہ کھولا اور ایک گارڈ کو آوازیں دینے لگی۔

''کیا تم میری بات سن سکتے ہو؟''

چند لمحوں کے بعد زیٹا پیچھے ہٹی اور مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''ایک گارڈ آ رہا ہے۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا تو شلپا، کیتھرین اور چانگ چی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں پہلے ہی کمرے کا غائرانہ جائزہ لے چکا تھا۔ وہاں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس سے گارڈ پر قابو پانے میں مجھے مدد مل سکتی۔ بہرکیف اب مجھے اپنی ماہرانہ صلاحیتوں کا استعمال کرنا تھا۔ وہ چاروں بھی ہوشیار تھیں۔ چند لمحوں کے بعد ایک گارڈ کمرے میں آ گیا۔

''ہاں بولو، کیا کہنا ہے۔'' اس نے ترش روئی سے پوچھا۔

''وہ.....'' زیٹا نے وہ کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا پھر وہ خاموش ہو گئی۔

''کیا وہ.....؟'' گارڈ الجھا۔

میں دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکا تھا لیکن جیسے ہی اس کی بات پوری ہوئی کہ ہم پانچوں ہی اس پر بھوکے عقابوں کی طرح پل پڑے۔ اس دوران شلپا نے غیر محسوس انداز میں دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ گارڈ کی کراہیں یا چیخوں کی آواز باہر موجود دوسرے گارڈ کے کانوں تک نہ پہنچے۔ اگلے چند لمحوں کے بعد وہ گارڈ بے سدھ فرش پر پڑا تھا۔ اس کے ہولسٹر میں ریوالور بھی موجود تھا۔ یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اسے مار کھانے کے بعد بے ہوشی کے عمل سے بھی گزرنا پڑے گا۔

پلاننگ کے مطابق میں نے گارڈ کی دونوں ٹانگیں پکڑیں اور اسے گھسیٹتے ہوئے واش روم میں لے گیا۔ میں نے اپنا لباس اسے پہنایا اور اس کا لباس خود پہن لیا۔ آخر میں اس کا ہولسٹر والا بیلٹ اپنی کمر کے گرد باندھ لیا۔

کچھ دیر کے بعد میں واش روم سے باہر نکلا تو مکمل طور پر گارڈ کے بھیس میں تھا۔ گارڈ جب اندر آیا تھا تو اس نے اپنے چہرے پر ماسک لگایا ہوا تھا۔ میں نے اس کا ماسک لگانے کی بجائے دوسرا ماسک لگایا تھا۔

''تم تو بالکل گارڈ ہی دکھائی دے رہے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ اسمارٹ۔'' زیٹا تعریفی لہجے میں بولی۔ ساتھ ہی اس نے واش روم کی طرف اشارہ کیا جہاں گارڈ بے سدھ پڑا تھا۔

''کیا تم اس گارڈ کا نام جانتی ہو؟'' میں نے بے ہوش گارڈ کا نام پوچھا۔

''ہاں۔ اس کا نام گولر ہے۔''

''اور جو باہر موجود ہے؟''

''اس کا نام.....'' زیٹا نے یاد کیا۔ ''ہاں، اس کا نام جیکسن ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب تم چاروں کمرے میں موجود رہو۔ میں ڈاکٹر بوب کو جہنم واصل کر کے آتا ہوں۔''

''اپنا خیال رکھنا مورس۔'' زیٹا نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے نکل کر جیکسن کی طرف بڑھا۔ جو راہداری کی نکڑ پر کھڑا سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا ماسک ٹھوڑی تک کیا ہوا تھا۔ اس حالت میں دل کا دھڑکنا فطری بات تھی۔ بہرکیف، میں نے خود کو مضبوط اور پُرسکون رکھا۔

''آ گئے۔'' میں جیسے ہی قریب پہنچا تو اس نے کہا۔ ''کیا کہتی تھی وہ؟''

''ڈاکٹر بوب سے ملنا چاہتی ہے۔'' میں نے حتی الامکان گارڈ کے لب و لہجے میں بولنے کی کوشش کی۔ حالانکہ دوسرے کے لہجے میں بولنا بہت مشکل کام تھا۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ جیکسن شاید میری آواز پر چونک پڑا تھا۔

''یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے حیرت سے استفسار کیا۔ ''کافی بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔''

اس کی بات سن کر میرے وجود میں سنسناہٹ کی لہر دوڑتی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس کا ہاتھ ہولسٹر کی طرف رینگتا ہوا دیکھا تو میرے اعصاب جیسے تن سے گئے۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

TAGPK.COM

بیت بازی

ادارہ

قارئین! ان اشعار میں ایسا کون سا شعر ہے جو آپ کو بہت زیادہ پسند آیا ہے۔ عوام کی آرا کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ جس شعر کو زیادہ لوگ پسند کریں گے اس شعر پر شعر بھیجنے والے کو تین ماہ تک سرگزشت (بطور انعام) بھیجا جائے گا۔ آپ بھی کوشش کریں انعام آپ کو بھی مل سکتا ہے۔

(علی عباس کراچی کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری..... سرگودھا

یہ روز کے صدمے روز کے غم
یہ تری جفائیں تیرے ستم
یہ کون گوارا کرتا ہے
یہ میں ہی گوارا کرتا ہوں

پروین مظفر..... کراچی

یا رب یہ بھید کیا ہے کہ راحت کی فکر نے
انسان کو اور غم میں گرفتار کردیا

(خاقان مصطفیٰ کا جواب)

رضا احمد اعوان..... دریا خان

ہے آج بھی ہماری انا کا وہی مزاج
مشکل ہے اپنے دور کا اظہار آج بھی

(خالد مظفر شادی پور کا جواب)

نہال قیوم..... راولپنڈی

آجا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آجا کہ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی ہے

صابرہ بیگم..... کراچی

اپنے ہی تجربات کے سب بھینٹ چڑھ گئے
جس نے شہر اجاڑے وہ کوئی وبا نہ تھی

(ملک تنویر جہلم کا جواب)

منیر اختر..... مظفر گڑھ

نعتیں بٹ رہی تھیں روز الست
میں نے بڑھ کر وفا اٹھائی تھی

مرزا عباس بیگ..... کراچی

یا رب یہ بھید کیا ہے کہ راحت کی فکر نے
انسان کو اور غم میں گرفتار کردیا

نور العین..... فیصل آباد

گزر رہا ہوں میں سوداگروں کی بستی سے
بدن پہ دیکھیے کب تک لباس رہتا ہے

اللہ دتہ..... چنیوٹ

نہ گرد و پیش سے اس درجہ بے نیاز گزر
جو بے خبر سے ہیں سب کی خبر بھی رکھتے ہیں

شہر محمد وائیں..... کوہاٹ

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں

(مدیحہ اصغر بہاول پور کا جواب)

سہیل عباس..... ملتان

میں رونا چاہتا ہوں خوب رونا چاہتا ہوں میں
پھر اس کے بعد گہری نیند سونا چاہتا ہوں میں

(صابرہ بیگم کراچی کا جواب)

شہزاد اکبر..... کراچی

ایک آنسو بھی حکومت کے لیے خطرہ ہے
تم نے دیکھا نہیں آنکھوں کا سمندر ہونا

نسیم اکبر..... لاہور

اداسی کھینچ لائی ہے یہاں تک
میں آنسو تھا سمندر میں پڑا ہوں

ذیشان مبشر..... ملتان

اے دوست تجھ کو رحم نہ آئے تو کیا کروں
دشمن بھی میرے حال پہ اب آب دیدہ ہے

زہرہ زیدی..... سرگودھا

ایسی کیا بیت گئی مجھ پہ کہ جس کے باعث
آب دیدہ ہیں مرے ہنسنے ہنسانے والے

نازش امتیاز..... فیصل آباد

ان کی یاد میں بہتے آنسو خشک اگر ہو جائیں گے
سات سمندر اپنی خالی آنکھوں میں بھر لاؤں گا

TAGPK.COM

امتیاز احمد.....فیصل آباد

ان کے رخسار پہ ڈھلکے ہوئے آنسو توبہ
میں نے شبنم کو کبھی شعلوں پہ مچلتے دیکھا

زاہد حسین.....کوئٹہ

اس قدر رویا ہوں تیری یاد میں
آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے

(ممتاز حسن مظفر گڑھ کا جواب)

فرحت یاسمین.....لاہور

پلکوں کی حد کو توڑ کے دامن پہ آ گرا
اک اشک میرے صبر کی توہین کر گیا

(نوازش خان حیدر آباد کا جواب)

نظیر احمد.....ٹیوانہ

یہ دل کی راہ چمکتی تھی آئینے کی طرح
گزر گیا وہ اسے بھی غبار کرتے ہوئے

اسد اللہ خان.....کراچی

یوں تیری رہ گزر سے دیوانہ وار گزرے
کاندھے پہ اپنے رکھ کے اپنا مزار گزرے

اختر علی اختر.....سلطان پور

یاد آئی وہ پہلی بارش
جب تجھے ایک نظر دیکھا تھا

ندیم بٹ.....لاہور

یہ آب دیدہ ٹھہر جائے جھیل کی صورت
کہ ایک چاند کا ٹکڑا نہانا چاہتا ہے

محسن علی لاشاری.....جعفر آباد

یہ گرد بیٹھ جائے تو کچھ میں سمجھ سکوں
آنکھیں نہیں رہیں یا تماشا نہیں رہا

(نسیم عباس بہاول پور کا جواب)

عشرت پروین.....جہلم

اداس آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے ہیں
یہ موتیوں کی طرح سیپیوں میں پلتے ہیں

ذیشان احمر.....کراچی

اتنے آنسو تو نہ تھے دیدہ تر کے آگے
اب تو پانی ہی بھرا رہتا ہے گھر کے آگے

خالد چوہدری.....خانیوال

آسرا دے کے مرے اشک نہ چھین
یہی لے دے کے بچا ہے مجھ میں

محمد اقبال.....ڈی آئی خان

ہزار راہ چلے پھر وہ رہ گزر آئی
کہ اک سفر میں رہے اور ہر سفر سے گئے

(احمد جاوید کراچی کا جواب)

نصیر احمد شاد.....سکھر

یہ تیری ترچھی نگاہیں یہ تیرا حسن و جمال
نہ دل بھرے نہ نگاہیں ہٹا سکے کوئی

(اشرف شاہ بٹ لاہور کا جواب)

واجد حسین شاہ.....لاہور

سناٹے کی قبر سے اٹھ کر رات کی بھول بھلیوں میں
صدیوں سے جو بھٹک رہا ہے میں اس خواب کی خوشبو ہوں

(عباس خان حیدر آباد کا جواب)

ظفر الاسلام.....سرگودھا

ہم تو آہٹ کے بھروسے پہ سحر تک پہنچے
رات بھر آپ کو بھی نیند نہ آئی ہوگی

(ناہید شمس الدین لاہور کا جواب)

ممتاز احسن.....کراچی

سرور علم ہے کیف شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے بہتر

(فائزہ نوشاد کراچی کا جواب)

زینب حسن.....کراچی

کتنے آرام سے چھوڑ دیا تم نے بات کرنا
جیسے صدیوں سے تم پر بوجھ تھے

(مہلک علی فیصل آباد کا جواب)

زاہد انصاری.....کراچی

دو چار نہیں مجھ کو فقط ایک دکھا دو
وہ شخص جو اندر سے بھی باہر کی طرح ہو

(مبارک علی کوئٹہ کا جواب)

ثمر حسن.....کوئٹہ

رات پھیلی ہے تیرے سرمئی آنچل کی طرح
چاند نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے پاگل کی طرح

(مسرور عالم جھنگ کا جواب)

بیت بازی کا اصول ہے کہ جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کیا جاتا ہے۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً ان کا شعر تلف کر دیا جاتا ہے۔ گزارش ہے کہ اصول کو مدنظر رکھیں۔

TAGPK.COM

میرے خیال میں یہ تراشہ مصنف ..... کی تحریر سے لیا گیا ہے۔

نام:

پتا:



کوپن کے ہمراہ جوابات موزعہ 10 جولائی 2021ء تک موصول ہونا ضروری ہے

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

فون نمبر:

محترم/محترمی ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں۔

(شعر الگ کاغذ پر ہے)

05

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ'
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ'
ماہنامہ پاکیزہ' ماہنامہ سرگزشت'

کے حصول میں دقت پیش آ رہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن مینجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

TAGPK.COM

ادب شناس 08

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا نیا دلچسپ سلسلہ

ایک نیا سلسلہ "ادب شناس" شروع کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ جو آپ کو معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی دے گا۔ ہر ماہ کسی ایک مشہور مصنف کی تحریر کا اقتباس دیا جائے گا۔ آپ ذہن پر زور دیں، اندازہ لگائیں کہ یہ اقتباس کس معروف مصنف کے قلم کا شہکار ہے۔ اس اعادہ سے تحریر شناسی پر عبور حاصل ہوتا رہے گا۔ درست جواب بھیجنے والے قاری کو تین ماہ تک "سرگزشت" اعزازی طور پر بھیجا جائے گا۔ درست جواب 30 جولائی 2021 تک موصول ہونا ضروری ہے۔ بعد میں آنے والے کوپن تلف کر دیئے جاتے ہیں اگر ایک سے زیادہ قارئین کے جوابات درست ہوئے، قرعہ اندازی کے ذریعے انعام یافتہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس ماہ کا اقتباس

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

ادب شناس 07 کا جواب

قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کی یہ ابتدائی سطریں ہیں۔

"میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا ایک طاقتور نیالا دیوتا ہے۔ تند مزاج، غصیلے، اپنے موسموں اور اپنے غیض و غضب کا مالک، تباہ کن۔"

اس بار بھی اندازے سے بہت زیادہ افراد نے صحیح جواب ارسال کیا ہے اس لیے قرعہ اندازی کا سہارا لینا پڑا۔ اس بار قرعہ اندازی میں احتشام الحسن، کراچی کو انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ ان خواتین و حضرات کا جواب بھی درست ہے۔

میر پور آزاد کشمیر سے ظہیر چوہدری، نادر بھٹ، نگاہ ناز، احمد علی۔ اسلام آباد سے مجیب الرحمن، شاہنواز، اظہر حسن فاروقی، نعمت خان، ندا بتول، فصیح الدین، احمد شاہ محمود، غزل عنبرین، راحیلہ احسن۔ فاضل پور سے ظہیر الدین۔ مظفر گڑھ سے الماس بٹ۔ شہر سلطان سے عباس شاہ۔ کوٹ ادو سے ناصر خان۔ بہاولپور سے کوکب خان، زرین مجید، عباس علی۔ بہاولنگر سے ثاقب آرائیں۔ مظفر حسن۔ کراچی سے نوازش حسن، ذہین اسماعیل، محمد ظفر، کلیم اللہ، زاہد شیرازی، ساجد علی، ملک احمد، ذیشان حسن، عمران چنگیزی، طاہر علی صدیقی، منیب احمد، فیض محمد لاکھو، احمد پاشا، مرزا اسد اللہ بیگ، منیب الحسن، انجم شکیل، واحد امام، ظہیر احمد زیدی، کائنات فاطمہ، نصیر مرزا، ابرار احمد، ناصر حسین۔ لاہور سے اسماعیل محمد شاہ، زہرہ حسن، فرخندہ، احسن علی، بخت آور، جمالی شاہ، بشیر بٹ، شاہنواز آرائیں، صنوبر خالد، انتظار ملک، خاقان ملک۔ ملتان سے ذیشان احمد، ملک سلطان، علی رضا، سلطان زیدی، فخر الدین ترمذی، نعمان قریشی، فرحت جہاں، کوثر علی کوثری، فرحت شاہ، عباس علی خان۔ کوئٹہ سے تنویر حسن، نور اللہ، عباس چنگیزی، امیر حمزہ۔ سکھر سے نزہت احمد، اشرف حمید۔ سرگودھا سے اقبال احمد۔ شیخوپورہ سے حمید الدین۔ حیدر آباد سے ناہید سلطان، اشرف انصاری۔ فورٹ عباس سے غضنفر علی۔ سرگودھا

TAGPK.COM

سے عبدالقیوم، علی انوار، تہمینہ بٹ۔ ساہیوال سے اختر عباس۔ حسن ابدال سے عزیز محمد، سید محمد رضا۔ چھوٹالہ سے فیض محمد، نثار احمد۔ پشاور سے ثمر چوہدری، صالح شاہ، یوسف اچکزئی۔ پارا چنار سے عباس طوری۔ باغ آزاد کشمیر سے نصیر احمد۔ میانوالی سے نثار احمد۔ پاک پتن سے احمد جاوید۔ ڈیرا اسماعیل خان سے حمید اللہ، نسیم نیازی، معیز احمد۔ بھکر سے نیاز احمد۔ ڈیرا غازی خان سے ذیشان احمد، نیر زیدی، درشہوار ملک۔ جہلم سے سرفراز علی بنگش۔ شجاع آباد سے زوار حسین زیدی، انعام الحق۔ ٹنڈو آدم سے سکھن شاہ۔ کمالیہ سے فرحت حسین۔ نواب شاہ سے نذر خان، سلیم اللہ، خان ڈائیور۔ جہانیاں سے فرید اللہ۔ جھنگ سے زبیر احمد۔ ساہیوال سے: نصرت فتح خان، اسد خان، چوہدری اشفاق اللہ، عباس سید۔ میرپور خاص سے: مرزا طاہر الدین بیگ، ضوریز اختر، محمد طلحہ جان سرہندی، شہلا انیس، شازیہ انیس، ملکہ نوشین۔ میرپور، آزاد کشمیر سے: طلحہ جان، نصیر بھٹ۔ گلگت سے: محمود الحسن شاہ، جان شاہ، حب علی، دلدار حسن۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ، عباس لائلی۔ سرگودھا سے: طارق سلطان قریشی، عارف شاہ، نوید اظہر۔ واہ کینٹ سے: نور افضل خان خٹک، ماریہ عرفان، فیض جوکھیو۔ گوجرانوالہ سے: ندیم شوکت، نعمان اشرف۔ پشاور سے: فائزہ شہزاد، جویریہ شیر نواز۔ پشاور سے اللہ بخش چانڈیو، فیرت خان۔ حافظ آباد سے سعادت علی۔ پاک پتن سے مسعود علی خان۔ لیہ سے ظفر اسماعیل۔ جہانیاں خانیوال سے غلام جیلانی۔ شیخوپورہ سے خالد خان، طارق بٹ۔ جھنگ سے عنایت حسین۔ حسن ابدال سے نور محمد۔ چنیوٹ سے سراج الدین، سید عباس زیدی۔ ملتان سے اختر حسن، ملک مشتاق، شہزاد خان، منظر قادری، فاروق حسن، تسنیم ہاشمی، ملک صفدر، عبدالصمد۔ سرگودھا سے رابعہ گیلانی، فیضان زیدی، محمد نصیر۔ سیالکوٹ سے غفور احسان کریمی، رضا الحسن، وجیہہ زیدی، باسط درانی، کاشف نیازی۔ جھنگ سے اطہر صدیقی، عبدالرؤف، ہاشم علی، ناہید اختر۔ لاہور سے منظر علی، وردہ بتول، سعید الدین، نیاز بیگ، احمد علی۔ ملتان سے مشتاق حسین، الیاس احمد، فتح یاب انصاری، طفیل احمد، باسط علی خان، نبیل احمد۔ نواب شاہ سے رشید بسم، وصلی الحق۔ اسلام آباد سے ناصر حسین، مغنی ایاز، فہد شیخ، یاسمین مصطفیٰ، پروفیسر جمیل اختر۔ حیدرآباد سے: آصف کریم، نسرین یاسین، ملک نوروز، فتح محمد، نعمان قریشی، مرزا اسد بیگ، ابرار شیخ، رفیع اللہ انصاری، صالح الدین، نعیم انصاری، نصرت جہاں۔ بہاولنگر سے: سلیم کامریڈ (کھاٹاں) ضیغم علی۔ ڈگری سے: نعیم شاہ، فرحال ٹھوکر، شازیہ حسن۔ بہاولپور سے: آمنہ ملک، زرولی خان، اشرف حسین۔ چنیوٹ سے: مصطفیٰ حسن زیدی۔ بگرام سے: آصف خان اچکزئی۔ دیپال پور سے: امیر الدین نظامی۔ گوجرہ سے: انعم تاثیر، نوید حسن۔ گھوٹکی سے: مہوش حسن، پروین فرحت۔ منڈی بہاؤالدین سے: فیصل خان، فہمیدہ ارشد۔ ہارون آباد سے: غزالہ فرحت۔ گجرات سے: سید اظہار الحسنین جعفری۔ حویلی لکھا سے: دلنواز خان حسن زئی۔ ڈی جی خان سے: محبوب حسین نادر۔ پاک پتن سے: کاشان حسین۔ ڈی آئی خان سے: شازیہ ارم۔ بنوں سے: معظم طارق۔ میاں چنوں سے: فہیم حسن، خالق کریم کریمی۔ کراچی: فرید محمد، اقبال کاشانی، ابرار احمد، ول برحسن، محمد فیض، زار اشیخ، نعمان احمد، سبحان عثمانی، سلیم احمد خاں، اطہر حسین، نبابت خان، گل شیر، نوشین اکبر، فضل شیخ، نثار احمد۔ کراچی سے امجد خان، سلمان زیدی، اقبال قریشی، آفتاب منصور، نوشین، ملک اقبال احمد، اختر حسین، نسیم علی سید، عبدالوہاب صدیقی، نعمت اللہ خان، جمیل عثمانی، طارق مجید، عباس رضا رضوی، انوار احمد، حبیب احمد، اقبال احمد۔ لاہور سے فہیم بٹ، انور کلیم، فیض الحسن، کوکب بخاری، فیض محمد، خان بہادر، ثابت خان، یوسف محمد، ابراہیم علی، زینت انصاری، نذر احمد۔ فیصل آباد سے عقیل حسن، ملک فیض، نعیم احمد، ناہید میر، شمیم احمد، رضا رضوی، ثنا احمد، عباس چاچوری، نادر احمد، سلمان خان، شاہنہ حسن خان۔ حیدرآباد سے فضل اللہ، حبیب ولی، مصیب، ندال حسن، یوسف پٹیل، ماہ رخ، محمد ندیم، فیروز کاشمیری، کمال احمد کمال، طارق احمد خان۔ چکوال سے خلیق الزمان، اصغر اقبال، انعام اللہ۔ اوکاڑہ سے دعا زہرا، اکبر خان۔ کمالیہ سے ممنون الحسن، نوید حسن خان۔ جہانیاں سے قادر علی قادری، حسن عسکری۔ لاہور سے شیریں تبسم، فرید احمد، عارفہ حسن، فضل محمد، یاسین بٹ، نوشاد حسن، سلطان احمد، نیاز الحسن، نذیر محمد، افتخار چٹھہ، شیر علی، نادر خان، ابراہیم محمد، ناصر بٹ، افتخار حسین۔

TAGPK.COM

پل صراط

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ایک سبق بھری روداد ارسال کررہی ہوں۔ لیکن یہ بات پہلے ہی بتادوں کہ یہ روداد میری نہیں فزا کی ہے فزا جسے میں نے گھٹنیوں چلتے دیکھا۔ وہ بڑی ہوئی تو قسمت نے اسے اوج بخشا مگر وہ اس نعمت کو سنبھال نہ سکی۔ اپنے ہاتھوں سے نشیمن کو آگ لگا بیٹھی کیونکہ والدین نے صحیح طور پر تربیت نہیں کی تھی۔ لڑکی کے والدین اس سچ بیانی کو ضرور پڑھیں۔

روشن آرا
(کراچی)

میں کچھ دنوں سے ایسا محسوس کررہی تھی کہ میری خوشگوار اور ازدواجی زندگی میں کوئی طوفان آنے والا ہے جو نہ صرف مجھے تہس نہس بلکہ تاخت وتاراج کردے گا۔ تب میری زندگی میں ویرانی، سناٹے اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

اس طوفان کا پیش خیمہ دراصل عرشی کا رویہ اور بے اعتنائی تھی۔ میں نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا کہ ان کی محبت، وارفتگی اور گرم جوشی میں غیر محسوس انداز سے کمی آتی جارہی ہے۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دینے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ شک جو کسی سانپ کی طرح میرے دل کے کسی کونے میں کنڈلی مار کے بیٹھا ہے اس کا پھن کچل دوں ورنہ یہ ڈستا رہے گا۔ آخر میں کیوں سوچ سوچ کر اپنے آپ کو ہلکان کررہی ہوں۔ اپنے آپ کو کرب ناک اذیت میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ شاید دفتر کی سیاست، مصروفیت نے عرشی کو پریشان کیا ہوا ہوگا۔ جب بھی میں نے عرشی کے سرد رویہ کی وجہ سوچی تو دور دور تک کوئی بات نظر نہیں آئی اور نہ میں نے ایک بیوی ہونے کے ناتے عرشی سے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ جبکہ میں عرشی سے پوچھنے کا حق رکھتی تھی کہ تم مجھ سے غیر محسوس انداز سے دور کیوں محسوس ہونے لگے ہو۔ اس اجنبیت کی وجہ کیا ہے؟ کیا میرا حسن وشباب ڈھل گیا ہے اور میں بے کشش ہوگئی ہوں۔ خود سپردگی سے پیش نہیں آتی ہوں۔

آخر وہ طوفان آ ہی گیا جس کا خوف، خدشہ اور امکان تھا۔

یوں تو عرشی دفتر میں مصروفیت کے باعث کوئی پندرہ بیس دنوں سے گھر نو دس بجے آرہے تھے لیکن اس روز وہ دن ڈوبتے ہی آگئے ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی خاموش تھے جیسے ان کے دل کو کسی بات سے گہرا صدمہ پہنچا ہو۔ جبکہ صبح دفتر جاتے ہوئے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی۔ جانے کیوں مجھے ان کی خاموشی سے ایک ان جانا سا خوف محسوس ہونے لگا۔ نہ تو انہوں نے اپنی محبت کی گرم جوشی کا اظہار کیا اور نہ ہی اپنے بازوؤں میں محصور کرکے جذباتی ہوئے کہ مجھے اپنے بال اور لباس کو درست کرنا پڑا۔ جبکہ شادی کے بعد سے دفتر جاتے وقت اور واپسی پر ان کا یہ معمول رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی کسی دن ناغہ ہوا ہو۔

آج انہوں نے بڑی بے نیازی اور بے اعتنائی برتی تھی۔ بازوؤں میں محصور کرنا تو درکنار وہ دروازہ کھلتے ہی خواب گاہ میں کسی سنسناتے تیر کی مانند گھس گئے۔ میرے لیے یہ بڑی تعجب خیز بات تھی۔

دوسرے لمحے میں نے یہ سوچ کر اس ان جانے خوف کو دل کے نہاں خانے سے نکال پھینکا کہ کام کی زیادتی اور تھکن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہورہی ہوگی۔ وہ روزانہ دفتر صبح نو بجے جاتے تھے لیکن آج صبح سات بجے ہی نکل گئے تھے جب وہ دفتر سے بہت زیادہ تھکے ہوئے آتے تھے تو ان پر ایسی ہی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

میں تھوڑی دیر پہلے ہی نہا کر نکلی تھی اور سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑی میک اپ کررہی تھی۔ مجھے اپنی عزیز ترین سہیلی نشاط احمد کی شادی کی سالگرہ میں جانا تھا۔ میں آئینے میں عرشی کی حرکات وسکنات کا بہ غور جائزہ لے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بریف کیس تپائی پر رکھ کے میرے پاس آئیں گے۔ بہک جائیں گے جیسا کہ عموماً ہوتا تھا۔ مگر پاس آنا تو درکنار انہوں نے ہیلو تک نہیں کہا۔ انہوں نے کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر پھیلا دیا... پھر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور صوفے پر براجمان ہوگئے۔ اخبار اٹھا کر کچھ دیر تک پڑھتے رہے... پھر انہوں نے اخبار تہہ کرکے تپائی پر رکھتے ہوئے سرد اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''غزالہ.....!

TAGPK.COM

آخر تمہارا یہ میک اپ کب ختم ہوگا؟''

ان کے لہجے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے انہیں آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''بیس پچیس منٹ لگیں گے۔''

''یہ کرو۔ یہ میک اپ کچھ دیر کے لیے بند کردو۔ ادھر آکر بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ روکھے لہجے میں بولے۔

''کیا یہ باتیں رات کو نہیں ہوسکتیں ڈیئر!'' میں نے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہہ جماتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم بھی جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ نشاط نے تمہیں بھی مدعو کیا ہوا ہے۔''

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے قدرے تند لہجے میں بولے۔ ''یہ باتیں پارٹی سے زیادہ اہم ہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اس قسم کی پارٹیاں قطعی پسند نہیں ہیں۔ نہ ہی میں کبھی تمہارے ساتھ کسی پارٹی میں گیا ہوں۔ تم اکیلی ہی جاتی رہی ہو۔ آج بھی اکیلی ہی جاؤ۔''

''خیریت تو ہے میری جان!'' میں نے لپ اسٹک میز پر رکھ کے ان کی طرف گھوم کر دیکھا۔ ان کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ''کیا بات ہے جان!'' آج تم خاصے سنجیدہ دکھائی دے رہے ہو؟ کیا دفتر میں کوئی بدمزگی ہوگئی۔''

''خیریت ہی نہیں ہے سمجھو۔'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے تو ان کے لہجے سے بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ ''آج میں تمہیں ایک بہت ہی اہم فیصلہ سنانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ فیصلہ مجھے بہت پہلے ہی سنا دینا چاہیے تھا۔''

''کیسا فیصلہ.....؟'' میں نے بری طرح چونک کر اوپر سے نیچے تک حیرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا، اس لمحے

TAGPK.COM

وہ کسی جج کی طرح لگ رہے تھے اور میں اپنے آپ کو ایک مجرم محسوس کر رہی تھی جو کٹہرے میں کھڑا ہو۔

''یہ فیصلہ غیر متوقع ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''ایک دل دہلا... دینے والا فیصلہ جس کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔''

''تم فیصلہ سنانے کے بجائے مجھے دہلا کیوں رہے ہو؟'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ''جو بھی فیصلہ سنانا ہے وہ جلدی سے سنا دو۔''

''میں تمہیں دہلا نہیں رہا ہوں بلکہ ذہنی طور پر تیار کر رہا ہوں تاکہ تم اس فیصلے کو سن کر اپنے دل و دماغ پر قابو پا سکو۔''

''میں کوئی بچی نہیں ہوں جو اس فیصلے کو سن کر بے ہوش ہو جاؤں یا دل کا دورہ پڑ جائے۔'' میں تنک کر بولی۔ ''میں ہر قسم کا فیصلہ سننے کے لیے تیار ہوں۔ آخر یہ کیسا فیصلہ ہے؟''

''تم ہوش تو نہیں کھو دو گی؟ یہ فیصلہ اندر سے تمہیں کسی طوفان کی طرح تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ چونکہ تم ایک سمجھدار، تعلیم یافتہ اور حقیقت پسند عورت ہو لہٰذا تم اس فیصلے کو ٹھنڈے دل، صبر اور تحمل سے سننا۔ جذباتی نہیں ہونا اور نہ ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگنا۔ یوں بھی اس فیصلے کو سنانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔''

''فیصلہ..... فیصلہ..... فیصلہ.....'' میں چیخی۔ ''یہ تم نے کیا تکرار لگا رکھی ہے؟''

''بات یہ ہے کہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔'' عرشی نے یہ بات اس طرح آسانی سے کہہ دی جیسے وہ دوسری گاڑی خرید رہے ہیں۔

''کیا.....؟'' میں اس طرح اچھل پڑی جیسے مجھے ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ ایسا لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ہر چیز ڈولتی ہوئی لگ رہی تھی۔ پیروں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔ اگر میں جلدی سے پلنگ کے سرہانے کا سہارا نہ لیتی تو پیروں پر کھڑی نہ رہ پاتی۔ فرش پر کٹی پتنگ کی طرح گر جاتی۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عرشی یہ فیصلہ سنائیں گے۔ یہ فیصلہ نہ تھا ایک زہریلا خنجر تھا جو میرے سینے میں اتار دیا گیا تھا۔

''دوسری شادی.....؟'' میری آواز گلے میں کسی گولے کی طرح اٹکنے لگی اور کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ میں اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میں نے چند ثانیوں کے بعد سینہ دباتے ہوئے کہا۔ ''عرشی..... ! کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟ تم واقعی سنجیدہ ہو میری جان؟''

''یہ مذاق نہیں ہے۔'' عرشی کا لہجہ اکڑا ہوا تھا۔ ''میں سنجیدہ ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں اس قسم کے فضول مذاق نہیں کرتا۔''

''لیکن تم شادی؟'' میری آواز ویران، کھوکھلی، بے جان اور دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ میں باوجود کوشش ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔

''ہاں دوسری شادی.....'' عرشی میرے وجود پر جیسے ایک دہکتا انگارہ رکھتے جا رہے تھے۔ ''میں نے یہ فیصلہ بڑی مجبوری کی حالت میں نہ چاہتے ہوئے بھی کیا ہے۔ ہر پہلو پر سوچ بچار کرنے کے بعد..... زندگی میں ایسا وقت آتا ہے کہ بعض فیصلہ نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتے ہیں۔''

حیرت، نفرت، دکھ اور غصے سے میرا بدن لرزنے لگا۔ یہ منحوس فیصلہ اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ اس نے نہ صرف مجھ پر بجلی سی گرا دی بلکہ بدحواس بھی کر دیا تھا۔ میں بھونچکی سی ہو گئی تھی۔ حوصلہ برقرار رکھنے کی ہر کوشش اور جدوجہد بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ مجھے ہر سمت تاریکی کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

تاہم میں نے چند لمحوں میں خود پر کسی نہ کسی حد تک قابو پا لیا۔ عرشی خاموشی سے میرا ردعمل دیکھ رہے تھے اور مجھے جیسے سنبھلنے کی مہلت دے رہے تھے۔ میں بے ترتیب سانسوں کے ساتھ بولی تو میری زبان کسی شرابی کی طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ میں اٹک اٹک کر کہنے لگی۔

''گویا تم دوسری شادی کر رہے ہو؟ کیوں؟ کس کے لیے؟'' میری رگوں میں لہو ابلنے لگا۔ میں شعلہ بار نگاہوں سے عرشی کو گھورنے لگی۔ ''بتاؤ..... جواب دو؟''

''کیوں؟ یہ سوال مجھ سے پوچھنے کی بجائے اپنے آپ سے پوچھو۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو..... اپنے دل کو ٹٹولو تو اس کا جواب مل جائے گا۔'' عرشی نے بڑی بے اعتنائی سے کہا۔ ''تم معصوم اور انجان بننے کی کوشش مت کرو۔''

''تم مجھے مورد الزام ٹھہرا رہے ہو؟'' میں بری طرح برافروختہ ہو گئی۔ ''آخر میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے؟ میں کیا بے رخی اور سرد مہری سے پیش آنے لگی ہوں جو تم دوسری شادی کرنے پر مجبور ہو گئے ہو؟ بولو۔ بتاؤ؟''

TAGPK.COM

''تم سننا ہی چاہتی ہو تو سنو!'' عرشی ٹھہرے لہجے میں کہنے لگے۔ ''تمہاری وجہ سے دوسری شادی کی نوبت آئی ہے..... ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ دوسری شادی کروں۔'' عرشی نے توقف کر کے سانس لیا۔ پھر کہنے لگے۔ ''میں نے ازدواجی زندگی کے پانچ برسوں کے بارے میں سوچا تو مجھے احساس ہوا کہ اس عرصے میں میں نے کیا پایا؟ تم نے مجھے کیا دیا؟ مجھے نہ تو میرے خواب ملے اور نہ وہ زندگی جو میرے لیے سب کچھ تھی۔ مرد صرف عورت کی نرم جوشی، خود سپردگی اور والہانہ پن کا دیوانہ نہیں ہوتا ہے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں تم پی کر آئے ہو؟'' میں حیرت اور غصے سے بولی۔ ''آج تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو نا؟''

''میں نے پہلے کب پی ہے جو آج پی کر آتا؟ میں پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔ میں دوسری شادی اس لیے کر رہا ہوں کہ تم بیوی نہ بن سکی اور نہ ہی میری تصوراتی عورت..... مجھے ایک بیوی کی ضرورت ہے۔ اب بھی وقت ہے اور میں تمہیں مہلت دیتا ہوں کہ اگر تم ایک گھریلو روایتی بیوی بن کر رہ سکتی ہو تو اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار ہوں۔''

''میں بیوی اور عورت نہیں تو کیا کسی سیارے سے اتری ہوئی عجیب و غریب مخلوق ہوں؟'' میں نے تنک کر جواب دیا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ آج کسی نے میرے خلاف تمہارے کان بھر دی ہے۔ تم احمقانہ قسم کی باتیں کر رہے ہو؟''

''مجھے ایک ایسی لگی بندھی ڈگر پر چلنے والی روایتی بیوی چاہیے جو سیر و تفریحات اور پارٹیوں کی بجائے گھر کی چار دیواری میں رہے۔'' عرشی میرے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے بولے۔ ''وہ شوہر اور گھر کا خیال رکھے نہ کہ گھر کو نوکروں پر چھوڑ دے۔ ایک ایسی عورت ہو جس کی مجھے ضرورت ہے یعنی وہ میرے بچوں کی ماں بن سکے مجھے اس گھر میں ایک مسافر کی طرح رہنا پسند نہیں ہے۔ تم نے اس گھر کو گھر نہیں بلکہ ہوٹل بنا رکھا ہے۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ساری زندگی اسی طرح گزاری جائے؟'' عرشی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں سیر و تفریحات اور پارٹیوں سے کسی بھی قیمت پر دور نہیں رہ سکتی۔'' میں زہر خند لہجے میں بولی۔

''دور کیوں نہیں رہ سکتیں؟ آخر اس زندگی میں رکھا کیا ہے جو بے مقصد اور وقت کا ضیاع ہے۔'' عرشی نے پوچھا۔

''اس لیے کہ یہ میری بہت بڑی کمزوری ہے اور کیا تم نے ان پانچ برسوں میں ایک حسن اور رنگینی محسوس نہیں کی عرشی!'' میں نے تڑ سے جواب دیا۔ ''میں تمہاری بیوی ہوں کوئی زر خرید باندی نہیں جس پر ہر قسم کا حکم چلاؤ۔ جبر و زبردستی سے اپنی ہر بات منواؤ۔ رہی بات ماں بننے کی..... میں نے تم سے شادی کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر کہا نہیں تھا کہ تمہیں دو تین برس اور انتظار کرنا ہوگا کیونکہ بچے مجھے بالکل پسند نہیں ہیں اس لیے کہ اس میں نہ صرف حسن و شباب ڈھل جاتا ہے بلکہ عورت اپنی صحت، جسم اور کشش کھو دیتی ہے۔ میں وقت سے پہلے بوڑھی اور بے کشش ہونا نہیں چاہتی اس لیے کہ جہاں عورت کا شباب اور جسم ڈھلا مرد دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کر لیتے ہیں۔ کیا ایسے مرد نہیں ہیں جن کی دو دو، تین تین بیویاں موجود ہیں، اس لیے میں اپنے حسن اور کشش کے خزانے کی حفاظت کرتی ہوں کیونکہ مرد ذات کا کیا بھروسا؟ اس کی مثال ایک بھونرے کی سی ہوتی ہے۔''

''میرے نزدیک ایسی زندگی جہنم سے کم نہیں ہے جسے عورت کسی اور تناظر سے دیکھے۔'' عرشی نے بڑی [illegible] سے کہا۔ ''عورت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے جب تک وہ ماں نہ بن جائے۔ تبھی اسے خاندان میں عزت [illegible] ملتا ہے۔ حسن و شباب چار دن کی چاندنی ہوتی ہے۔ پھر اندھیری رات۔ وہ کوڑی کی بھی نہیں رہتی۔ تمہاری اسی سوچ اور خیالات کی وجہ سے دوسری شادی کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے خاندان کو آگے چلانے کے لیے ایک وارث کی ضرورت ہے۔''

چشم زدن میں میری نظروں میں عرشی کی پرائیویٹ سیکرٹری شازیہ کا سراپا گھوم گیا۔ وہ نہ صرف حسین اور جواں سال تھی بلکہ جسمانی طور پر اتنی پُرکشش تھی کہ لباس میں بھی بے لباس سی محسوس ہوتی تھی۔ اس پر کسی ماڈل گرل کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ جس حالت میں دفتر آئی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا وہ کسی کمرشل کی شوٹنگ کے لیے دفتر آئی ہو۔ وہ بڑی شوخ، طرح دار اور اپنے جسمانی، نشیب و فراز کی طرح بولڈ بھی تھی۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کی منگنی ہوئی تھی۔ میں نے دو ایک مرتبہ اس کے متعلق سوچا بھی تھا کہ وہ اتنی حسین اور جاذبیت سے بھری ہوئی ہے اب تک نہ اس کی منگنی ہوئی اور نہ شادی کی

ہے؟ جبکہ ایسی لڑکیوں کے لیے اُمید واروں کی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ وہ مردوں کی تصوراتی عورت تھی۔ وہ عرشی کی دو برس سے پرائیویٹ سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ آج اب اس وقت میری نظروں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عرشی نے اس کا اسیر ہو کر خفیہ شادی کر کے کسی فلیٹ میں رکھا ہو یا پھر بغیر شادی کے ہی گاڑی چل رہی ہو۔ دولت مند اور باسوں کے لیے کوئی بات بعید نہیں ہوتی ہے۔

''تم صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ تم اپنی حسین اور نوجوان سیکریٹری شازیہ سراج پر مرمٹے ہو۔ وہ حرافہ ایسی حالت میں دفتر آتی ہے کہ مرد بہک جایا کرے۔'' میں نے سختی سے مٹھیاں بھینچ لیں اور نفرت آلود لہجے میں بولی۔ ''آخر اس نے اپنے حسن و شباب کی کرشمہ سازیوں اور جلوؤں سے تمہیں شیشے میں اتار لیا۔ میں کل ہی تمہارے دفتر میں گھس کر اس کمینی کے چہرے اور جسم پر تیزاب پھینک دوں گی اور اس کا جغرافیہ بگاڑ دوں گی پھر دیکھتی ہوں کہ تم اس سے کیسے شادی کر کے گھر بساتے ہو؟''

''میں شازیہ سراج سے شادی نہیں کر رہا ہوں کیونکہ آئندہ ماہ اس کی شادی اس کے کزن سے ہو رہی ہے جو دو برس سے اس کا منگیتر ہے۔ شادی کے بعد وہ شوہر کے ساتھ امریکا چلی جائے گی۔ وہ عورت تو کوئی اور ہی ہے اسے تو تمہارے فرشتے بھی نہیں جانتے۔''

''تم اچھی طرح جان لو کہ میں کسی بھی عورت سے تمہیں دوسری شادی کرنے نہیں دوں گی۔'' میں نے زور سے فرش پر پیر پٹخا۔ ''کیوں کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ تم میری پہلی محبت ہو، میرا خواب ہو، مجھ سے دل بھر گیا تو تم نے کسی اور عورت کو دل دے دیا۔ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور دوسری شادی کر رہے ہو۔ یہ صرف کمینگی نہیں بلکہ ذلالت بھی ہے۔ کیا تمہیں یہ سب کچھ زیب دیتا ہے عرشی! میں اپنی محبت کا کسی قیمت پر خون ہونے نہیں دوں گی، یہ جان لو۔''

''مجھے دنیا کی کوئی طاقت دوسری شادی سے نہیں روک سکتی؟'' عرشی مضبوط لہجے میں بولے۔

''جانے وہ کون حرافہ اور کمینی ہے جس نے تمہیں اپنی محبت میں پاگل کر دیا ہے۔'' میں برافروختہ ہو گئی۔ پھر استہزائیہ لہجے میں بولی۔ ''اسی لیے تم فلمی ولن کے انداز میں بول رہے ہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' عرشی نے سر ہلایا۔ ''مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ کیا تم میری بھی پہلی محبت کی ہو جانان آفرین؟ میں نے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی کسی عورت کو نہیں دیکھا۔ میری امارت سے متاثر شوبز کی رنگین تتلیوں ریشہ خطمی ہونے کے لیے [illegible]۔ صرف ایک اشارے کی دیر ہے میری بانہوں میں سمٹے پھل کی طرح ٹپک پڑیں۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ تم میری باتیں مان لو تو ابھی اور اسی وقت بات ختم ہو سکتی ہے۔ تمہیں میرے حکم پر چلنا ہوگا۔ اس گھر میں اس طرح رہنا ہوگا جس طرح میں چاہوں گا۔''

''کیا.....؟ کیا تم میری آزادی سلب کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے ایک جاہل، گنوار اور اجڈ عورت سمجھ رکھا ہے؟'' میں نے حیرت سے عرشی کی طرف دیکھا جو آج پہلی مرتبہ ایک وقیانوس مرد کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ حیرت سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ عرشی کو یہ دورہ کیسے پڑ گیا ہے جو مجھ پر اس طرح کی پابندی کر رہا ہے جو نچلے اور متوسط طبقے میں ایک نوجوان کنواری لڑکی پر عائد کی جاتی ہے۔

''میں تمہاری اس آزادی کو ناپسند کر رہا ہوں جس نے تمہیں گھر سے دور، تاباں اور بیزار کر دیا ہے۔ میں تمہیں صرف اور صرف ایک گھریلو عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں عورت کا اصل حسن اور وقار ہے۔''

''اگر میں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا تو کیا کرو گے؟'' میں نے بگڑ کے برہمی سے کہا۔ ''کیا مجھے طلاق دے دو گے؟ اس لیے کہ تمہارا راستہ صاف ہو جائے؟ کانٹا نکل جائے؟'' یہ بات کہتے ہوئے میری نس نس میں سنسنی دوڑ گئی۔

''میں نے تمہیں طلاق دینے کی بات تو نہیں کی؟'' عرشی نے جواب دیا۔ ''نہ ہی میں نے اس کے بارے میں بھولے سے سوچا اور نہ ہی ایسا کوئی ارادہ ہے اس لیے کہ طلاق اللہ کو سخت ناپسند ہے اور عرش تک ہل جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے ششدر ہو کر ان کی شکل دیکھی۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''تم مجھے طلاق نہیں دو گے اور دوسری شادی بھی کرو گے؟''

''تم ٹھیک سمجھیں.....'' عرشی نے سر ہلایا۔

''دوسری شادی کرنے کی صورت میں تم مجھے طلاق کیوں نہیں دو گے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہیں تم

TAGPK.COM

دوسری شادی کی اجازت لینے کے لیے جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟ دوسری شادی کرتے ہی تم مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو گے۔''

''مجھے دوسری شادی کے لیے تمہاری محتاجی اور نہ ہی تمہاری کسی اجازت کی ضرورت ہے۔'' عرشی کہنے لگے۔

''نہ تو میں جھوٹ بول رہا ہوں اور نہ ہی مجھے اس کی کوئی ضرورت ہے۔ میں تمہیں اس لیے طلاق نہیں دوں گا کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ میں تمہیں کسی صورت میں کھونا نہیں چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ بھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ.....'' میں زہرخند مسکراہٹ سے بولی۔ ''صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم بیک وقت دو حسین اور جوان عورتوں سے دل بہلانا چاہتے ہو۔ چونکہ مجھ جیسی حسین اور پُرکشش عورت کا ملنا جوا لاکھوں میں ایک اور غیر معمولی ہے..... کیوں.....؟ اصل بات یہی ہے نا.....؟ مرد ذات عورت کے معاملے میں دور کی سوچتا ہے..... آج تمہارا اصل روپ میرے سامنے آیا ہے۔ سچ ہے کہ مرد ذات کا کوئی بھروسا نہیں۔ اسے اپنی غرض ہوتی ہے۔''

''تم غلط انداز سے سوچ رہی ہو؟'' عرشی بڑے تحمل سے کہنے لگے۔ ''تم اس تناظر میں مجھے مت دیکھو، میں کوئی عیاش آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی دوسری کسی عورت کے حسن سے متاثر یا اس کی محبت میں گرفتار ہو کر شادی کر رہا ہوں۔ اگر میں شادی محض عیاشی کے لیے کر رہا ہوتا تو مجھ سے بڑا بے وقوف اور احمق کوئی نہیں ہوتا۔ مجھے اتنی دور جانے اور جھنجٹ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اپنی سیکریٹری یا دفتر کی سب سے حسین اور جوان لڑکی سے تعلقات قائم کر لیتا۔ دفاتر میں بعض ایسی لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں اپنے خوابوں کے لیے ملازمت کرتی ہیں۔ تم نے سنا ہوگا اور سچ بھی ہے کہ ایسی لڑکیوں عورتوں سے مرد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں نے تم سے ابھی کہا ہے کہ شوبزنس کی رنگین تتلیاں میرے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ میں نے کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میرے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ بازار میں دودھ ملتا ہے تو بھینس پالنے کی کیا ضرورت؟ میں نے تم سے کوئی غلط مطالبہ نہیں کیا۔ صرف ایک جائز بات کر رہا ہوں جسے تم کسی بھی صورت ماننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو۔''

''کیا تمہارے خیال میں، میں ایک سوکن برداشت کرلوں گی۔'' میں نے بھڑک کر کہا۔ ''کیا میں تمہارے نزدیک ایک تماشائی عورت ہوں جو تم دکھانا چاہتے ہو؟''

''اگر تم سوکن برداشت کرلو تو یہ تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔'' عرشی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

''بے قوفی کی باتیں نہ کرو۔'' عرشی کا لہجہ بھی تیز ہوگیا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو؟ میری بات غور اور توجہ سے سنو، تم خود کو بدل لو، اگر خود کو نہیں بدلو گی تو مجبوراً مجھے تم پر سوکن لانی ہوگی۔ لیکن یہ بھی میرا وعدہ ہے کہ میں تم دونوں کو الگ الگ رکھوں گا۔ تمہیں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اسے دوں گا۔ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی اور نہ تمہیں اس پر ترجیح دوں گا۔ مذہب نے دوسری شادی کے لیے جو شرائط رکھی ہیں اس پر دیانتداری سے عمل کروں گا۔ تم دونوں کو بھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا ہے تو اسٹامپ پیپرز پر لکھ کر دینے کو تیار ہوں تاکہ میری ناانصافی پر گریبان پکڑ سکو۔''

''ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں؟'' میرا دماغ گھومنے لگا۔ میں اپنا غصہ دبا نہ سکی۔ ''عرشی! تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو تو بنا نہ سکو گے۔ یہ تمہاری بھول ہے، غلط فہمی ہے۔''

''ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں یہ بات میں بھی جانتا ہوں لیکن ایک شخص کی دو بیویاں ایک گھر میں رہ سکتی ہیں اور رہ بھی رہی ہیں، ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں گھر ایسے ہیں جہاں دو بیویاں ساتھ ہنسی خوشی رہ رہی ہیں؟ کیا زیدی کی دو بیویاں دس برسوں سے نہیں ہیں؟ کمال چوہدری کی تین بیویاں سو سو برسوں سے ایک ہی کوٹھی میں رہ رہی ہیں خوش و خرم ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔''

عرشی نے رک کر گہری سانس لی۔ ''یہ بات تو تم نے ہی تو بتائی تھی۔ تم نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں نے خود دیکھا نہ ہوتا تو یقین نہ آتا۔ میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں کہ میں تم دونوں کو ساتھ نہیں رکھ رہا ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے کبھی نہ ملو گی اور نہ ہی ایک دوسرے کی شکل دیکھو گی۔''

''میں کسی صورت میں بھی تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی؟'' میں صدمے اور غصے سے بولی۔

''فزا! آخر اس میں کیا برائی اور حرج ہے۔ تم جذباتی نہ ہو۔'' عرشی نے کہا۔

''اب تم میرا فیصلہ سنو عرشی!'' میں نے پُرہیجان لہجے

TAGPK.COM

میں کہا۔ ''اگر تم نے دوسری شادی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے یا پھر تم دوسری شادی چوری چھپے کر چکے ہو تو مجھے طلاق دے دو۔ میں سوکن بن کر کسی قیمت پر رہنا نہیں چاہتی۔ اس ذلت سے بہتر ہے کہ تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔ تم ابھی اور اسی وقت مجھے طلاق دے دو۔''

''طلاق؟'' عرشی کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کے لیے متغیر رہا۔ چند لمحوں تک ان پر سکتے کی سی ایسی کیفیت طاری رہی جیسے ان پر کوئی بجلی سی آ گری ہو۔ ان کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرے اس مطالبہ پر ان کے دل کو گہرا صدمہ ہوا ہے۔ وہ تحیر زدہ لہجے میں بولے۔ ''تم عورت ہو کر طلاق مانگ رہی ہو؟ طلاق کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ عورت کے لیے رسوائی، ذلت اور شرم کی بات ہے۔ کیا ابھی میں نے نہیں کہا تھا کہ جب کوئی عورت طلاق مانگتی ہے اپنے شوہر سے تو عرش لرز اٹھتا ہے۔ اللہ کو بھی یہ بات سخت ناپسند ہے۔ فرشتے اس پر لعنت ملامت بھیجتے ہیں۔ آئندہ یہ لفظ زبان سے نہ نکالنا۔''

''عورت کو بھی طلاق لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ چونکہ میرے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہو رہی ہے اس لیے طلاق لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' میرے سینے میں سانس پھولنے لگی۔ پھر میں چیخ کر نفرت آلود لہجے میں کہنے لگی۔ ''تم مجھے اپنی چرب زبانی سے بہلانے اور سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ میں کوئی پندرہ سولہ برس کی لڑکی نہیں ہوں جو تمہاری باتوں کے فریب میں آ جاؤں گی۔ اصل بات یہ ہے کہ تم ایک ٹکٹ میں دو مزے کرنا چاہتے ہو۔ آج میں نے تمہارا اصل چہرہ دیکھ لیا ہے جو گھناؤنا اور مکروہ ہے۔ تم مجھے زرخرید لونڈی سمجھتے ہو۔ کیا میں اتنا نہیں سمجھتی کہ تم اپنی ملکیت بنا کر کھلونے کی طرح دل بہلانا چاہتے ہو۔ تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ میں کسی اور مرد کی ملکیت بن جاؤں۔ وہ مجھے پا کر اپنی قسمت پر نازاں ہو جائے۔''

''نہیں فزا.....! یہ بات نہیں۔'' میرا خیال تھا کہ میری کھری کھری سن کر انہیں تارے نظر آنے لگیں گے اور شاید میرے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیں گے لیکن اس کے برعکس پہلو بدلتے ہوئے شمل سے کہنے لگے۔ ''طلاق لینے کے بعد اس عزت اور مقام سے محروم ہو جاؤ گی جو اس وقت تمہیں نصیب ہے اور تمہیں بالکل بھی اس بات کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ طلاق یافتہ عورت معاشرے میں دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مطلقہ ہونے سے بہتر ہے کہ تم سوکن بن کر رہو۔''

''اگر میں سوکن بن کر رہوں تو اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ کیا معاشرے اور خاندان میں میری عزت دوچند ہو جائے گی؟'' میں نے استہزائی لہجے میں کہا۔

''اس طرح تم پر انگلیاں نہیں اٹھیں گی۔ کوئی تمہیں نفرت اور حقارت سے نہیں دیکھے گا۔''

''عورت طلاق لے لے تو وہ دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور مرد دوسری شادی کر لے تو اسے تخدل جاتا ہے۔'' میں نے جذباتی انداز میں طنز کیا۔ ''بہت خوب..... بڑے دور کی کوڑی لائے۔ ویری گڈ۔ کیا زبردست ڈائیلاگ ہیں۔'' میں نے اگلے لمحے تالیاں بجائیں۔ ''یہ تم جیسے ہوس پرست اور مفاد پرست مردوں کی ذہنی، اختراع ہے جو اپنے حق میں دور کی کوڑی لاتے ہیں اور عورت کی توہین اور تذلیل کرتے ہیں۔ میں تمہاری اس بات کو نہیں مانتی۔ تم خودغرض ہو، مجھے کھلونا بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری باتوں کے فریب میں نہیں آؤں گی۔ میں نے طلاق لینے کا اٹل فیصلہ کر لیا ہے، مجھے طلاق چاہیے۔ طلاق، صرف اور صرف طلاق۔''

''جذبات کی رو میں بہہ کر مت سوچو فزا.....!'' عرشی نے محبت پاش لہجے میں کہا۔ ''تم ٹھنڈے دل سے سوچو۔ ایک حقیقت پسند عورت کی طرح سوچو گی تو تمہیں احساس ہوگا کہ تمہاری عزت اور ایک خوشگوار ازدواجی زندگی ایک مرد سے وابستہ رہنے ہی میں ہے اور زندگی کا سب سے خوبصورت وقت بھی یہی ہے جو بہت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے..... تم تیس برس کی ہو رہی ہو۔ علیحدگی کی صورت میں تم دوبارہ اپنا گھر بسانا چاہو گی تو یہ اتنا آسان نہیں ہوگا جیسا کہ تم سوچ رہی اور خوش فہمی میں مبتلا ہو رہی ہو کیونکہ ہزاروں حسین اور نوجوان لڑکیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی سوکھ رہی ہیں اور ان کی عمروں کے نقوش ان کے بشرے سے ظاہر ہو رہے ہیں اور پھر ہمارے معاشرے میں ایک بیوہ اور مطلقہ عورت سے چاہے وہ کتنی ہی حسین، جوان اور پُرشباب کیوں نہ ہو شادی کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں اور کسی صورت شادی ہو جانے پر اس عورت کو وہ عزت اور مقام جس کی وہ مستحق ہوتی ہے نہیں ملتا، وہ شادی کر کے پچھتاتی ہے یا پھر احساس کمتری اور محرومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ عورت کی اس دوسری شادی میں پہلی والی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم تمام پہلوؤں پر اچھی

TAGPK.COM

طرح سنجیدگی سے غور کرلو۔ عجلت سے کام نہ لو۔''

''مجھے تمہاری لیکچر بازی کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں پھنکاری۔ ''میں تمہارے دوسری شادی کرنے کی صورت میں ایک دن بھی اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ اگر تم نے مجھے طلاق نہیں دی تو میں عدالت سے خلع لے لوں گی۔''

''میں تمہیں سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔'' عرشی اک دم سے کھڑے ہوگئے۔ ''اس وقت تم نہ صرف بے حد جذباتی ہورہی ہو بلکہ تمہارا دماغ بھی ماؤف ہورہا ہے۔ بہتر ہے تم اپنے گھر والوں اور شادی شدہ سہیلیوں سے مشورہ کرلو۔ شاید ان میں سے کوئی صحیح اور مفید مشورہ دے اور رہنمائی بھی کرے۔ میں شاکر کے ہاں جارہا ہوں وہاں کئی دوست رات کے کھانے پر آرہے ہیں۔''

عرشی رکے نہیں۔ اپنا کوٹ اٹھا کے تیزی سے نکل گئے۔ میں خواب گاہ کا دروازہ بند کرکے پلنگ پر کسی کٹی پتنگ کی طرح گر گئی۔ آنسوؤں کی جو جھڑی لگی تھی وہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

اب میری زندگی میں ہر طرف گہرا اندھیرا ہی اندھیرا بادلوں کی طرح چھا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ آنسو میری اس مشکل کا حل نہیں ہیں۔ عرشی جو مجھ پر ظلم وستم کا پہاڑ توڑ رہے ہیں اس کا سدباب کرنا پڑے گا۔ کوئی ایسی تدبیر کرنا پڑے گی کہ سانپ بھی مرجائے، لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ معلوم نہیں وہ کون ایسی ساحرہ تھی جس نے عرشی کو اپنے زلف کا اسیر بنالیا تھا۔ جانے کیوں نفرت اور غصے کی کیفیت کے باوجود ایک لمحے کے لیے میرے دل کے کسی کونے میں اس عورت کو دیکھنے کا تجسس اور خواہش نے اشتیاق پیدا کیا۔

مجھے اپنی سہیلی شاہدہ کا خیال آیا جو اپنے شوہر کی پہلی بیوی تھی اور اس کے شوہر نے دوسری شادی کی ہوئی تھی۔ اس نے شاہدہ کی سوکن کو الگ رکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے مل کر مشورہ کرنا چاہیے۔ اس پارٹی میں اور بھی ایسی دو ایک شادی شدہ سہیلیاں بھی آرہی تھیں۔ ان کی رائے بھی معلوم کروں اور ان سے طلاق کے سلسلے میں مشورہ کروں۔ دیکھوں کہ ان کے کیا خیالات ہیں۔

میں اٹھی اور پھر سے تیار ہونے لگی۔ آنسوؤں نے میرے میک اپ کا ستیاناس کردیا تھا۔ جلدی سے تیار ہونے کے بعد میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے چہرے اور سراپا کا جائزہ ناقدانہ نظروں سے لیا کہ کہیں مجھ میں کوئی کمی تو پیدا... نہیں ہوگئی جس نے میری کشش، حسن، سراپا اور نشیب وفراز کو متاثر کیا ہے؟ میں نے ہر طرح اور ہر زاویہ سے جائزہ لیا۔ ایسی کوئی بات میں نے محسوس نہیں کی۔ ساڑی کسی بھی رنگ کی پہن لوں اس میں مجھے ملبوس دیکھ کر لوگوں کو سولہ برس کی دوشیزہ کا دھوکا ہوتا تھا... میں برس کی ہونے کے باوجود میری صحت ایسی تھی کہ جس سے لگتا تھا کہ میں روز بہ روز نوجوان ہوتی جارہی ہوں۔ گہرے اودے رنگ کی ساڑی میں میری اجلی رنگت، چھریرا تناسب بدن خوب سج رہا تھا۔ میں حیران تھی کہ میرے ہوتے کون عورت ہے جس کا عرشی پر جادو چل گیا ہے۔

میں اس عورت کے بارے میں سوچتی ہوئی جب اس پارٹی میں پہنچی تو وہاں رونق اپنے پورے جوبن پر تھی۔ ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ ہر چہرہ دمکتا اور آنکھیں چمکتی ہوئی تھیں۔ میرا دل اندر سے مردہ ہوچکا تھا اس لیے میرے دل کو کوئی خوشی نہ ہوسکی جو میں بھی چہکتی۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ مجھ پر کیا بجلی گری ہے اور میرا وجود ریزہ ریزہ ہوچکا ہے۔ میں دل پر جبر کی سل رکھ کر ہنستی، بولتی اور گرم جوشی سے تقریب میں حصہ لیتی رہی۔ میری جس سہیلی کی سالگرہ کی تقریب تھی وہ ماڈل گرل تھی۔ چونکہ اس کی سہیلیوں میں کئی ماڈل گرلز تھیں اور کمرشل میں بھی آتی تھیں اس لیے رقص کا اہتمام بھی کیا گیا۔ مجھے بھی شریک ہونا پڑا۔ مغربی موسیقی کی دھن پر میں بھی تھرکتی، ناچتی اور بل کھاتی رہی۔ کسی کو اس بات کا کوئی احساس نہیں ہوا کہ میں اندر سے کس قدر ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہوں۔ نہ غم بشرے سے ثابت ہونے دیا۔ پارٹی میں چونکہ اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوسکتی تھی اس لیے میں نے شاہدہ، انیلا، عنبرین اور خالدہ کو ساتھ لیا اور سی ویو گئی۔ ہم پارٹی سے جلد اٹھ گئے تھے۔ شاہدہ کو بڑی حیرت ہوئی تھی اس لیے کہ میں اصرار کرکے انہیں لے آئی تھی۔ راستے میں شاہدہ کے دریافت کرنے پر میں نے ان سے کہا تھا کہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس لیے میں اس مسئلے پر ان سے مشورہ لینا چاہتی ہوں۔

میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ یہ میری دیرینہ اور ہمراز سہیلیاں تھیں۔

ریت کے ٹیلے پر بیٹھنے کے بعد میں نے عرشی کی دوسری شادی کے بارے میں بتا کر ان سے پوچھا۔ ''تم لوگ اس ضمن میں کیا مشورہ دیتی ہو؟''

ان سب پر گہرا سکوت چھا گیا۔ وہ جیسے کچھ سوچنے لگی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد شاہدہ نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا مشورہ مانو میں کہوں گی کہ تم طلاق لینے کی حماقت کرنے اور پیروں پر کلہاڑی مارنے سے بہتر ہے کہ سوکن بن کر رہو۔ یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔''

''میں اس کمینی اور حرافہ عورت کو سینے سے لگالوں جو بسا بسایا گھر اجاڑ رہی ہے۔'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''وہ میرے محبت اور ارمانوں کا خون کر رہی ہے۔ میری محبت اور میرا شوہر چھین رہی ہے۔''

''اگر تمہیں اپنا گھر، اپنا شوہر اور محبت اتنی عزیز ہے تو عرشی بھائی کی بات مان کر حالات سے سمجھوتا کرلو۔'' شاہدہ نے مشورہ دیا۔ ''ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق زندگی گزارو۔''

''میں عرشی کی جوتی بن کر رہوں یہ مجھے پسند نہیں ہے۔'' میں اک دم سے بھڑک اٹھی۔ ''میں بیوی ہوں نوکرانی یا ملکیت نہیں۔ میں بھی برابر کے حقوق رکھتی ہوں۔ میں کوئی گرے پڑے گھر سے نہیں آئی ہوں۔''

''عورت کسی معاملے میں مرد کی برابری نہیں کرسکتی ہے۔'' شاہدہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''مرد کو جو برتری حاصل ہے وہ عورت کو نہیں۔ مذہب نے عورت کو بھی حقوق دیے ہیں لیکن مرد سے زیادہ نہیں دیے۔ اگر تم نے طلاق لے لی تو اپنی زندگی کی سب سے بھیانک غلطی کروگی۔''

''تم اس بڑھیا کھوسٹ کی باتوں میں نہیں آنا؟'' انیلا نے تیزی سے کہا۔ ''وقت اور زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ عورت بہت آگے نکل چکی ہے۔ میں سوکن بن کر رہنے کے حق میں بالکل بھی نہیں ہوں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ عورت خودکشی کرلے۔''

''یہ مرد، دوسری شادی کرکے دوسری بیوی کے غلام بن جاتے ہیں اور پہلی بیوی کی طرف دیکھنا تک گوارہ نہیں کرتے۔'' عنبرین بولی۔

''تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں اس سے اتفاق کرتی ہوں لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم عرشی کو شوٹ کیوں نہیں کردیتیں؟'' عنبرین نے مشورہ دیا۔ ''نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

''شاباش ہے۔'' شاہدہ بولی۔ ''اس غریب کو نہ صرف بیوہ کردینا چاہتی ہو بلکہ پھانسی کے پھندے پر بھی.....''

''دوسری شادی عورت پر ایک عذاب ہے۔ وہ سوکن بن کر کبھی خوش رہ ہی نہیں سکتی ہے۔'' عنبرین بولی۔

''میرے ساتھ تو ایسا نہیں ہے۔'' شاہدہ نے عنبرین کی طرف رخ کرکے کہا۔ ''وہ میرا اور میرے بچوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں جتنا دوسری بیوی اور اس کے بچوں کا۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہیں اور میں اپنے گھر میں خوش ہوں۔ میں نے کبھی ان کی محبت میں سرد مہری یا دوئی برتاؤ محسوس نہیں کیا۔''

''اس لیے کہ تم لاکھوں میں ایک ہو اور تمہارا حسن اور شباب ماند نہیں پڑا۔'' خالدہ نے کہا۔ ''پھر تمہارے شوہر نے دوسری شادی کیوں کی؟ جب کہ تم حسین بھی تھیں اور تمہارے بچے بھی ہیں۔ کیا عیاشی کے لیے.....؟''

''جب میری شادی کو تین برس کا عرصہ ہوگیا اور میں ماں نہیں بن سکی تو کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔'' شاہدہ بتانے لگی۔ ''رپورٹوں سے ظاہر ہوا کہ میں بانجھ ہوں۔ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ انہوں نے اولاد اور وارث کے لیے دوسری شادی کی اجازت مانگی تھی۔ میں نے اپنی مرضی اور خوشی سے اجازت دے دی بلکہ سوکن خود تلاش کی۔ ان کی دوسری شادی کے کوئی ڈیڑھ برس بعد ہم دونوں ناامید سے ہوگئیں۔ اللہ میاں کو میری نیکی بھا گئی۔''

''سوکن بننے سے تو بہتر ہے کہ تم عرشی بھائی جان سے طلاق لے لو۔'' انیلا نے مشورہ دیا۔ ''تم شاہدہ کی باتوں میں نہ آؤ۔''

''فرزانہ طلاق لینے کے بعد کیا کرے گی؟ کیا اس عمر میں طلاق لینا مناسب ہے؟'' شاہدہ نے سوال کیا۔

''فرزانہ عرشی بھائی سے طلاق لے کر دوسری شادی کرسکتی ہے۔'' انیلا کہنے لگی۔ ''میری جان! آج بھی تمہیں دیکھ کر کتنے مرد سرد آہ بھرتے ہیں اور تم سے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔'' وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ ''تمہارے پُرشباب بدن میں جو گداز اور کشش ہے ہزاروں میں کسی ایک عورت میں ہوتی ہے۔ اگر تم مقابلہ حسن میں شریک ہوجاؤ تو ملکہ حسن بن سکتی ہو۔ قیصر مک اپنی امریکی بیوی کو طلاق دینے کے بعد حسین ساتھی کی تلاش میں دربدر کی خاک چھان رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ طلاق کی خبر سنتے ہی تمہاری طرف ہاتھ بڑھادے۔ اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے! ڈیفنس میں اس کی ہزار گز کے رقبے پر کوٹھی ہے۔ تین

تین نئے ماڈل کی کاریں ہیں۔ اس کے علاوہ ہر تین ماہ میں ایک چکر امریکا کا ضرور لگاتا ہے۔''

''ہمارے معاشرے میں ایک مطلقہ عورت کی شادی کا ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' شاہدہ چراغ پا ہو کر بولی۔ ''تم سب فزا کو غلط مشورہ دے کر اس کی زندگی اور مستقبل غارت تو نہ کرو۔''

''کون کہتا ہے کہ مطلقہ عورت کی شادی نہیں ہو سکتی؟'' خالدہ کا پارہ چڑھ گیا۔ ''فزا کا کوئی بچہ بھی نہیں ہے جو اس کی شادی میں رکاوٹ کا سبب بن سکے۔ ہماری سہیلیوں ریحانہ اور نگہت کی دوسری شادی نہیں ہوئی ہے کیا؟ جبکہ دردانہ کی ایک نو برس کی لڑکی بھی تو تھی۔ نگہت کے تو تین بچے تھے جن کی عمریں تین سے آٹھ برس کی تھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک عورت کا شادی کے لیے حسین و جمیل اور جواں سال ہونا شرط ہے۔''

''خالدہ سچ کہتی ہے۔'' عنبرین تائیدی لہجے میں بولی۔ ''تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔''

''ان دونوں کی شادیوں کا پس منظر کیا تھا یہ بھی تو کھل کر بتاؤ۔'' شاہدہ نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ معاشقے اور ایک طرح سے بلیک میل نہیں تھا؟ ریحانہ کا شوہر ایک فرم میں کیشئر تھا۔ ریحانہ کے خواب پورے کرنے سے قاصر تھا۔ ریحانہ کا کزن امریکا سے آیا تو وہ ریحانہ پر لٹو ہو گیا۔ دونوں کی محبت رنگ لائی تو ریحانہ نے شوہر سے طلاق لے لی۔ ریحانہ کا کزن پھنس چکا تھا اسے شادی کرنے پر مجبور ہونا پڑا کیونکہ ریحانہ نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے شادی نہیں کی تو پھر وہ پولیس کے پاس جائے گی۔ ادھر نگہت جو اپنے باس کی پرائیویٹ سیکریٹری تھی وہ عمر میں اس کے باپ سے بھی بڑا تھا۔ وہ سیکریٹری کم محبوبہ بن گئی۔ اپنے حسن و شباب کا ایسا جادو چلایا کہ وہ نگہت پر ریشہ خطمی ہو گیا۔ ان کی شادی دو برس سے زیادہ چل نہیں سکی کیونکہ وہ کسی قابل نہیں رہا تھا۔ ریحانہ اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ امریکا گئی تو کسی بات پر ان دونوں میں تکرار ہوئی اور اسے طلاق ہو گئی۔ وہ ایک نائٹ کلب میں رقاصہ بن کر زندگی گزار رہی ہے۔ بچی نانی کے پاس لاہور میں ہے۔ نگہت پر اس کے بوڑھے شوہر نے تہمتیں لگا کر اور بدکاری کے ثبوت پیش کر کے طلاق دی تھی۔ وہ بیس ہزار کی ملازمت اور بوڑھے شوہر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ اب وہ ایک سپر مارکیٹ میں سیلز گرل بن کر چار ہزار پر زندگی کاٹ رہی ہے اس سے شادی کرنے پر کوئی بوڑھا اور معذور بھی تیار نہیں ہے تم یہ سب کیوں چھپا رہی ہو؟'' شاہدہ کا چہرہ تمتما گیا۔

''اس میں ریحانہ اور نگہت کی حماقتیں شامل تھیں۔'' خالدہ بولی۔ ''ورنہ انہیں طلاق نہ ہوتی۔ ادھر فزا نے عرشی سے طلاق لی تو اس سے شادی کرنے کے لیے دس اُمیدوار گھر کی چوکھٹ پر کھڑے ہوئے ہوں گے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو اپنے بھائی سے فزا کی شادی کرا دو۔'' شاہدہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تم جو تین ماہ سے ان کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہو نا..... اسے اپنی بھابی بنا لو جو چودھویں کا چاند ہے۔'' پھر اس نے توقف کر کے مجھ سے کہا۔ ''تم نے اس کے بھائی کو دیکھا ہوا ہے نا؟ جس کا نام ناصر ہے۔ خوبصورت، وجیہہ اور دراز قد بھی ہے۔ ایک بینک میں منیجر ہے اور تنخواہ بھی شاید ستر اسی ہزار ہے۔ خوب جوڑی رہے گی۔''

شاہدہ اور خالدہ میں تلخی پیدا ہو گئی تو ماحول میں بدمزگی ہونے لگی۔ میں نے ان دونوں کو بہ مشکل چپ کرایا۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے میں ان سب کو ان کے گھروں پر ڈراپ کر کے اپنے گھر پہنچی تو رات کا ایک بجا تھا۔ ہم سب تین گھنٹے تک ایسی کوئی تدبیر سوچتی رہی تھیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میری یہ خواہش تھی کہ میں طلاق نہ لوں اور عرشی دوسری شادی کا ارادہ بھی ترک کر دیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ عرشی کی تمام شرائط میں بلا چوں و چرا تسلیم کر لوں اور میں شکست مان کر ان کے آگے ہتھیار ڈال دوں۔

میرے لیے یہ بات ناممکن تھی۔ اس میں میری عزت اور انا کا سوال تھا۔ میں ذلت اور ہتک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ مر جاؤں۔ صرف ایک شاہدہ تھی جس نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ میں کسی قیمت پر طلاق نہ لوں جبکہ باقی سہیلیوں کا مشورہ یہ تھا کہ میں عرشی سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لوں۔ مگر سوکن نہ بنوں، عرشی کے دباؤ میں نہ آؤں جو ایک طرح سے مجھے بلیک میل کر رہے ہیں۔ آخر یہ مرد اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔

عرشی گہری نیند میں غرق تھے۔ ان کے بشرے پر جو سکون اور طمانیت تھی اس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دوسری شادی کا شیریں خواب دیکھ رہے ہیں۔

تاریک فضا پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا

کہ جیسے ساری کائنات ساکت ہوگئی ہو۔ میرے دل کے کسی کونے میں نفرت کی شدید لہر اٹھی۔ میرے جی میں آیا کہ کچن میں جاکر سبزی کاٹنے والی چھری لے آؤں، پوری طاقت سے ان کے سینے میں اتار دوں، پھر ان کے درد سے تڑپنے اور مرنے کا دل خراش منظر دیکھوں۔

میں کپڑے بدل کر بستر پر دراز ہونے کی بجائے بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ دل اچاٹ اور پریشان تھا۔ میں سوچنے لگی تو مالی حال بن گیا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اور پورے خاندان میں مجھ جیسی حسین لڑکی کوئی نہیں تھی۔ گو میرے والدین متوسط گھرانے کے تھے لیکن انہوں نے میری تعلیم و تربیت ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کی طرح کی۔ کیونکہ وہ نمائش و نمود پر مرتے تھے۔ میرا مستقبل انتہائی شاندار بنانا چاہتے تھے۔ میں اسکول سے سینٹ جوزف کالج پہنچی۔ اس کالج میں اعلیٰ گھرانوں کی لڑکیاں پڑھتی تھیں وہ نہ صرف بے حد ماڈرن اور مغرب زدہ معاشرے کی ماری ہوئی تھی۔ میرے والدین کا خیال تھا کہ کالج زینہ ہے کسی اعلیٰ گھرانے کی بہو بننے کا ..... ان کی یہ بات غلط بھی نہ تھی۔ انہوں نے بہت دور کی سوچی اور دور اندیشی سے کام لیا تھا۔ وہ وقت سے فائدہ اٹھانا خوب جانتے تھے۔ میں نے اس زینے پر قدم رکھ دیا تھا مجھے ایک ایک سیڑھی پر سنبھل سنبھل کر بڑے محتاط انداز سے چڑھنا تھا تب کہیں جاکر میں منزل پر پہنچ سکتی تھی۔ مجھے اشاروں کنایوں میں سمجھا دیا گیا تھا کہ اپنے سپنوں کو اس راستے پر ہی چل کر پا سکتی ہوں۔ کالج میں ایک سے ایک حسین اور طرح دار لڑکیاں موجود تھیں۔ میرا شمار بھی ان میں ہونے لگا تھا۔ مجھے ان لڑکیوں پر فوقیت اسی لیے تھی کہ میں ان سے کہیں پرکشش تھی۔ میری کشش نے میری ہم جماعت لڑکیوں کو بہت مرعوب اور متاثر کیا تھا۔ وہ میری گرویدہ ہوگئی تھیں اور اس کشش اور جاذبیت کی وجہ دریافت کرتی تھیں اور میرے جیسے تناسب اور خدوخال کی آرزو کرتی تھیں تاکہ مردوں کی توجہ کا مرکز بن جائیں۔ ان کے حسن و جمال کو داد ملتی رہے۔ اس کے لیے وہ دنیا بھر کے جتن کرتی رہتی تھیں۔ وہ بیوٹی اور سلم پارلرز جاتی رہتی تھیں لیکن یہ تو قدرت کا ایک انمول عطیہ تھا جس میں میرا کوئی دخل نہ تھا۔

جب میں نے آغاز شباب کی حدود میں قدم رکھا تھا تو امی نے یہ بات میرے ذہن میں بٹھادی تھی کہ مجھے کسی بڑے گھر کی بہو بننا ہے اس لیے میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی رہوں۔ میری خود بھی یہی خواہش اور تمنا تھی۔ مجھے ذاتی اخراجات کے لیے دل کھول کر رقم دی جاتی تھی تاکہ میری سہیلیاں یہ نہ سمجھیں کہ میرا تعلق کسی متوسط گھرانے سے ہے۔ کسی سہیلی کے ہاں کوئی تقریب ہوتی تھی تو میں ہمیشہ ایسا جوڑا پہن کر جاتی تھی جو بجز کیا ہوتا جس میں میرا بجز کیا جسم اور بھڑک کر مجھے تقریب میں متوجہ کا مرکز بنا دیتا تھا۔ کالج ریسٹ کار میں آتی جاتی تھی جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ فزا کی گاڑی ہے۔ شوفر رکھا ہوا ہے۔ یہ سہولت امی نے دی تھی۔

میرے ابو ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ میرا مستقبل تابناک اور شاہانہ اخراجات برداشت کرنے کے لیے رشوت لینے لگے تھے۔ انہوں نے گھر کی آرائش و زیبائش کے لیے ایسے لوازمات لیے تھے اور سجا دیئے تھے جو کہ ایک سرکاری ملازم کے لیے بہت مشکل تھا۔ ہر کمرے اور ٹی وی لاؤنج ہی میں نہیں بلکہ نشست گاہ میں بھی اے سی تھے۔ ملنے والے یا مہمان آتے اور کبھی تقریب ہوتی تو اے سی آن کر دیئے جاتے تھے۔ خصوصاً سہیلیوں اور ہم جماعت لڑکیاں آتیں تو ہر کمرے میں اے سی آن کر دیا جاتا۔

جب بی اے فائنل کا امتحان ختم ہوا تو ہم جماعت تہمینہ نے ایک شاندار قسم کی پارٹی اپنی تمام سہیلیوں کو دی تھی۔ اس روز اس کے ہاں پہلی بار جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس نے اس تقریب میں ہمارا تعارف اپنے گھر والوں سے کرایا تھا۔ عرشی اس کے سب سے بڑے بھائی تھے اور ایک ملٹی نیشنل فرم میں ایم ڈی کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ بہت خوبصورت، وجیہہ، دراز قد اور اسمارٹ تھے۔ اس پہلی ملاقات نے مجھے ان کا ایسا اسیر بنا دیا کہ جیسے وہ میرے تصوراتی محبوب ہوں۔ وہ بھی میری ذات سے متاثر ہوئے تھے کہ میرے حسن و شباب کا جادو ان پر چل گیا تھا۔ پھر ہم دونوں ملنے، سیر و تفریح کے لیے ہر شام جانے لگے۔ ہم دونوں کی محبت تیزی سے پروان چڑھنے لگی۔ عرشی صرف میرے لیے ہی نہیں بلکہ میرے گھر والوں کے لیے بھی آئیڈیل تھے۔ جب انہوں نے اپنا رشتہ بھیجا تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر ان سے میری شادی ہوگئی۔

ہنی مون منانے کے لیے سوات لے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کو دل نہیں کرتا تھا۔ اس ہنی مون نے میرا خواب پورا کر دیا۔ عرشی نے خوب تفریح کرائی اور دل کھول کر ہر

فرمائش پوری کی اور بڑی فراخ دلی سے خرچ کیا۔ وہ سیر وسیاحت، تفریح اور ان کے ساتھ گزرے لمحات ناقابل فراموش بن گئے تھے۔

واپس آنے کے بعد عرشی نے ایک شاندار لگژری فلیٹ خرید لیا جس میں ہم خواب گاہیں تھیں۔ اس طرح پانچ برس کسی حسین خواب کی طرح بیت گئے۔ انہوں نے مجھے شادی کی پہلی رات منہ دکھائی میں..... گاڑی بھی دی تھی لیکن آج یہ سپنا کسی مالا کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

مجھے وہ لوگ یاد آنے لگے جو یہ جانتے تھے کہ میں شادی شدہ ہوں تقریبات میں میرے قریب آنے اور مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے تھے لیکن میں نے انہیں کبھی لفٹ نہیں دی تھی۔

اس سوسائٹی میں ایسے مردوں کی کوئی کمی نہ تھی جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے شادی نہیں کی تھی اور کچھ ایسے بھی تھے جو ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے اور اپنی بیویوں کی بے راہ روی اور ہرجائی پن کی وجہ سے طلاق دے چکے تھے۔ وہ دولت مند اور صاحب حیثیت تھے۔ ان کا سوسائٹی میں مقام تھا اور انہیں شریک حیات کی ضرورت اور تلاش بھی تھی وہ میرا ہاتھ تھام سکتے تھے اس لیے میرے لیے کسی سہارے کی کوئی کمی نہ تھی۔ میرے نزدیک یہی بہتر تھا کہ سوکن کو برداشت کرنے کی بجائے عرشی سے طلاق لے لوں۔ ان میں سے کسی ایک سے شادی کر کے گھر بسالوں۔ یہ حتمی فیصلہ کر کے میں نے بڑا سکون اور طمانیت محسوس کی۔ میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی تو میرے دل کے کسی کونے میں کرب کا ذرہ برابر بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ میں کچھ ایسے مردوں کو جانتی تھی جنہیں زندگی کے ساتھی کی ضرورت تھی۔ ان کے تصور میں جلد ہی نیند کی بانہوں میں سما گئی۔

میں صبح تیار ہو کر امی کے ہاں پہنچی۔ وہ مجھے سویرے سویرے اپنے ہاں دیکھ کر چونکیں۔ پریشان، سراسیمہ اور حد درجہ خائف ہو گئیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میں صبح گیارہ بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوتی اور میں میکے سہ پہر آتی تھی۔ جب میں نے امی کو صورتحال کی نزاکت سے آگاہ کیا تو ان کا صدمے سے برا حال ہو گیا اور وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئیں۔ ابو کو اس قدر غصہ آیا کہ وہ اسی وقت عرشی کے دفتر جا کر انہیں ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جذباتی ہونے کی بجائے تحمل، بردباری اور تدبیر سے کام لیں تاکہ طلاق کی نوبت نہ آئے۔

جب میں نے امی اور ابو سے مشورہ مانگا تو ابو نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''تم اس مردود سے طلاق لے لو، اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔''

''تم بیٹی کو پاگل پن کا مشورہ کیوں دے رہے ہو؟'' امی بھڑک کر بولیں۔ ''کیا تمہیں بیٹی کے ماتھے پر طلاق کا بدنما داغ لگا دیکھنا اچھا لگتا ہے؟''

''جب عرشی دوسری شادی کر لے گا تو تب اس کے نزدیک فرزا کی کیا حیثیت رہ جائے گی؟'' ابو پھر بولے۔

اس موضوع پر امی اور ابو کے درمیان تلخی اور زبردست بحث وتکرار ہوئی۔ ابو نہیں چاہتے تھے کہ میں عرشی کے زیر اثر رہوں۔ ان کا خیال تھا کہ عرشی کی دوسری شادی کے کچھ عرصے بعد مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا جائے گا۔ ابو نے میرا حوصلہ بڑھایا اور دلاسا دیا کہ عرشی دوسری شادی پر اڑا رہا اور باز نہ آیا تو تم طلاق لے لو تمہاری دوسری شادی کوئی مسئلہ نہ ہوگی۔ میں تمہاری دوسری شادی عرشی سے بھی بڑے آدمی سے کرادوں گا۔ جو بھی تم سے شادی کرے گا تمہاری قسمت پر ناز کرے گا۔

امی طلاق کے تصور سے ہی خوف زدہ اور لرزاں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شریف گھرانوں کی لڑکیوں پر طلاق ایک ایسا بدنما داغ ہے جو ساری زندگی مٹانے پر نہیں مٹتا ہے، اور عورت خود اپنی نظروں میں دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ساری زندگی طعنوں کے زہریلے تیروں سے اس کا وجود چھلنی ہوتا رہتا ہے۔ شوہر مجازی خدا ہوتا ہے۔ عرشی جو چاہتے ہیں وہ غلط اور ناجائز نہیں ہے۔ تمہیں شوہر کا ہر جائز حکم ماننا اور بجالانا چاہیے۔ مرد کا درجہ عورت سے بلند ہوتا ہے۔ عورت کو گھر کی زینت بننا چاہیے نہ کہ کسی محفل کی۔ ایک عورت بچے کی ماں بن جائے تو نہ اس کے حسن میں فرق پڑتا ہے نہ ماند ہو جاتا ہے اور نہ ہی حسین زندگی متاثر ہوتی ہے۔ آخر دنیا میں اور بھی حسین عورتیں ہیں جن کے تین تین، چار چار بچے ہیں وہ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔ ایک ذرا سی بات کو اس قدر جذباتی اور گہرا اثر لے کر پیروں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہیے۔

میں نے امی کی ان ناصحانہ باتوں کو اس کان سے سنا دوسرے کان سے نکال دیا۔ امی کے ہاں سے واپس آئی تو عرشی سے طلاق لینے کا مصمم فیصلہ کر چکی تھی۔ میری امی ایک

بزدل، لگی بندھی ڈگر پر چلنے والی دقیانوسی عورت تھیں ان کے برعکس میرے ابو روشن خیال اور زمانے کے ساتھ چلنے والوں میں سے تھے۔ امی ہزار برس پہلے کی بات کر رہی تھیں جب عورت کے حقوق نہ ہوتے تھے اور وہ مردوں کی زرخرید لونڈیوں سے بدتر ہوتی تھیں لیکن آج عورت آزاد تھی اور مرد کے دوش بدوش چل رہی تھی۔ اب اسے نہ تو گھر کی چاردیواری میں قید کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی جانوروں کی طرح کھونٹی سے باندھا جا سکتا تھا۔

میں عرشی کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میرا مستقبل نہ صرف محفوظ ہے اور تابناک بھی ہے بلکہ مجھے دوسرا شوہر تم سے کئی گنا زیادہ اچھا مل سکتا ہے۔

عرشی نے میرا فیصلہ سنا تو وہ ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آ گئے۔ انہیں اس کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے آخری لمحے تک سمجھایا کہ میں اتنی بڑی بدنامی، ذلت اور رسوائی کا طوق اپنے گلے میں نہ ڈالوں اسی لیے انہوں نے محبت کا واسطہ دیا۔ میری منتیں کیں۔ میرے آگے ہاتھ جوڑے لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اپنے محاذ پر بڑی مضبوطی سے ایک فوجی کی طرح ڈٹی رہی۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ سوچنے اور مشورے کرنے کے لیے دو دن کی اور مہلت لے لوں لیکن میں نے یہ بات نہیں مانی کیونکہ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کس قسم کے مشورے ملیں گے اور میں ایک دوراہے پر کھڑی ہو جاؤں گی پھر میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ترین مرحلہ ہو جائے گا۔ آخرکار میں ان سے طلاق لے کر رہی۔ انہوں نے حق مہر دو لاکھ کی رقم، میرے تمام زیورات اور جہیز کا ایک ایک سامان نہ صرف واپس کر دیا تھا بلکہ میرے ابو نے جو شادی پر کیے گئے اخراجات کی رقم تین لاکھ روپے خرچ کیے تھے، وہ بھی بغیر کسی حیل وحجت دے دیے۔ جس وقت میں ان کے فلیٹ سے نکل کر جا رہی تھی تو میرا انداز فاتحانہ اور نظروں میں ان کے لیے تمسخر تھا۔ میں نے اپنی دانست میں انہیں زبردست شکست دی تھی لیکن عرشی کی کیفیت مجھ سے یکسر مختلف تھی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ میں اس لمحہ اس قدر سنگ دل بن گئی تھی کہ مجھے ذرا سا بھی دکھ کا احساس نہیں ہوا تھا۔

اس روز رات کو یک لخت مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے۔ میں نے طلاق لے کر ایک ایسی سنگین غلطی کی ہے جس کا خمیازہ مجھے ساری زندگی بھگتنا پڑے گا۔

دوسرے دن صبح گیارہ بجے مجھ سے ملنے خالدہ آئی، اس کے شوہر کو عرشی نے فون کر کے بتایا تھا کہ اس نے میری خواہش پر زبردستی طلاق مانگی تھی، طلاق دینا پڑی۔ خالدہ نے مجھے دلاسا دیا اور بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میری جان! ہمت اور حوصلے سے کام لے۔ جلد ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ تمہارے لیے رشتے آنے شروع ہو جائیں گے۔ امیدواروں کی قطار لگ جائے گی۔ تمہارے لیے انتخاب کرنا دشوار ہو جائے گا۔ میری نظر میں تمہارے لیے دو تین رشتے ہیں۔ عدت گزر جانے دو، پھر میں ان سے بات کرتی ہوں۔ عرشی تو ان کے پیر کی جوتی بھی نہیں ہے۔ تمہاری شادی پلک جھپکتے ہی ہو جائے گی۔“

”میں عرشی سے پہلے اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں تاکہ اسے یہ بتا دوں کہ میرے پروانے کتنے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا میری جان!“ خالدہ بولی۔ ”عرشی کو تم جیسی لڑکی ساری زندگی نہیں ملے گی۔ اس احمق نے ایک نایاب اور انمول ہیرے کی کوئی قدر نہیں کی۔ اب ساری زندگی سر پکڑ کے روئے گا۔“

☆☆☆

دو برس پلک جھپکتے گزر گئے۔ ان دو برسوں میں میرے لیے دو رشتے بھی نہیں آئے۔ کسی نے میرے گھر کا رخ تک نہیں کیا۔ میں نے جن کے سہانے خواب دیکھے تھے جن کے قرب اور رفاقت میں خود کو پایا تھا۔ ان کا ٹیلی فون تک نہیں آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ عدت گزرتے ہی خالدہ مجھے اپنی بھابی بنا لے گی۔ وہ بھی میرے لیے اجنبی بن گئی۔ اس نے بھائی کی شادی کسی اور لڑکی سے کر دی اور مجھے مدعو تک نہیں کیا تھا۔ میری وہ سہیلیاں جو میرا دم بھرتی تھیں اور میرے بغیر کوئی تقریب منعقد نہیں کرتی تھیں۔ میری دوستی پر نازاں تھیں۔ مجھ سے ملنے سے کترانے لگیں اور غیر محسوس انداز سے دور ہونے لگیں اور کسی تقریب میں بھولے سے بھی مدعو نہیں کرتیں۔ میں کسی کو ٹیلی فون کرتی اس کے گھر والے میری آواز سنتے ہی کہہ دیتے کہ وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔ موبائل فون پر رابطہ کرتی تو میرا نمبر دیکھتے ہی رابطہ منقطع کر دیا جاتا تھا۔ جب کبھی اتفاق سے کسی تقریب میں جاتی تو بغیر آستینوں کے کھلے بلاؤز اور ساڑی جو کمر کے خم پر باندھتی تھی جس سے بلاؤز اور اس کے درمیان بے حجابی ہو جاتی

تھی۔ میں دانستہ ایسے لباس میں اس لیے ملبوس ہوتی تھی کہ مردوں کو متوجہ کروں اور وہ مجھے اپنانے کے لیے مرمٹیں۔ ان میں سے کوئی غیر محسوس انداز سے کسی نہ کسی بہانے میری عریاں کمر پر ہاتھ رکھ دیتا۔ اس کے باوجود میرے پُرشباب بدن کا جادو کسی پر چل نہ سکا۔ میں محفل میں مفت کی تفریح بن جاتی تھی۔

صرف ایک شاہدہ تھی جو ہفتہ دس دن میں دو ایک بار مجھ سے فون پر بات کرکے دل جوئی کرتی یا جب کبھی مجھ سے ملنے آتی تو کہتی اپنی اس کوتاہی کی اللہ سے گڑگڑا کے معافی مانگو۔ نماز پڑھو۔ تم نے نیک سیرت اور محبت کرنے والے شوہر سے طلاق لے کر عرش کو ہلا دیا ہے۔ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ اپنے پیروں پر کلہاڑی نہ مارو۔

خالدہ ان دو برسوں میں صرف دو مرتبہ مجھ سے ملنے میرے گھر آئی تھی۔ وہ میرے لیے ایک گارمنٹس فیکٹری کے رنڈوے مالک کا رشتہ لے کر آئی تھی جس کے تین بچے تھے اور وہ عمر میں مجھ سے سولہ برس بڑا تھا۔ میں نے صاف انکار کردیا تھا۔

رشتہ لگانے والی عورتیں بھی جو میرے لیے رشتے لے کر آتی تھیں وہ عمر میں میرے باپ کی عمر کے تھے اور ان کی بیٹیاں میری ہم عمر تھیں۔ ان کے نواسے اور پوتے بھی تھے۔ ان میں دو ایک رنڈوے اور ان کی بیویاں بھی تھیں۔

اس عرصے میں عرشی کے ان دوست احباب نے جن سے میری دوستی اور بے تکلفی تھی جو ایک طرح سے میرے پرستاروں میں سے تھے اور وہ میرے قریب ہونے کے آرزومند بھی تھے اور میرے حسن و جمال کو آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دیتے تھے اور سراہتے بھی تھے۔ جب انہوں نے دو ایک تقریبات میں مدعو کیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں سمجھ گئی ان میں میرے حصول کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ شاید وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں ان میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام لوں۔ اپنا گھر بسالوں۔ ایک نے فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ جب میں نے ان سے کھل کر باتیں کیں تو وہ اور فری ہوگئے تھے۔ ان ملاقاتوں میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ میں بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے راستے کا مال سمجھ لیا تھا اور مجھے اپنی خودغرضی کا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ فون پر رابطہ کرتے رہتے تھے۔ میری طرف سے حوصلہ افزائی نہ پاکر مایوس ہوگئے تھے۔ پھر انہوں نے بھی فون کرنا بند کردیا تھا۔ اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ سوسائٹی میں جو عزت اور مقام نصیب ہوا تھا وہ میرے حسن و شباب کی وجہ سے نہیں بلکہ میرے شوہر کی وجہ سے تھا۔ صرف عرشی ہی نے نہیں بلکہ امی نے بھی سچ ہی کہا تھا کہ مطلقہ عورت دوکوڑی کی ہوکر رہ جاتی ہے۔ میں اپنی نظروں میں ذلیل و حقیر ہوچکی تھی۔ جب محلے کی عورتیں مجھ سے ملتیں تو ان کی نظروں میں تمسخر ہوتا تھا۔ محلے میں میرے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔

میرا غرور اور پندار حسن خاک میں مل چکا تھا۔ اب بھی میں نہایت حسین و جمیل اور غیر معمولی طور پر پُرکشش تھی... پھر بھی میرے لیے رشتے نہیں آرہے تھے۔ رشتے کرانے والیاں جو میرے لیے رشتے لاتی تھیں وہ نہ صرف بے جوڑ بلکہ نچلے طبقے کے مردوں کے ہوتے تھے۔ ان سے شادی کرنے کی بجائے گھر میں بیٹھے رہنا بہتر تھا۔

شاہدہ اور دوسری ایک سہیلیوں کے ہاں میری آمدورفت رہتی تھی۔ شاہدہ نے مجھے بتایا کہ عرشی نے مجھے طلاق دینے کے بعد تین مہینے میں فریدہ نامی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ فریدہ خواتین کے ایک کالج میں لیکچرار ہے میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ اپنی سیکریٹری سے شادی کریں گے۔ شادی کے ایک ڈیڑھ برس کے بعد وہ ایک بچے کے باپ بھی بن گئے تھے۔ دو برس کے لمبے عرصے کے بعد شاہدہ نے مجھے اپنی نند کی شادی کی تقریب میں مدعو کیا تھا۔ میں ایک سہیلی سے باتیں کررہی تھی۔ شاہدہ مجھے بلا کر ایک کونے میں لے گئی۔ اس نے مجھے ایک سمت اشارہ کیا۔ ایک میز پر ایک عورت گود میں بچے کو لیے بیٹھی تھی۔

''فرزا.....! کیا تم اس عورت کو جانتی ہو؟ کیا تم یہ بتاسکتی ہو کہ یہ عورت کون ہے؟'' شاہدہ نے پوچھا۔ میں نے اس عورت کو غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں اسے نہیں جانتی۔ اسے میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔''

''یہ عرشی بھائی کی بیوی ہے۔'' شاہدہ نے جواب دیا۔

''عرشی کی بیوی؟'' میں نے چونک کر اس عورت کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ بلا کی حسین نہ تھی لیکن کسی بھی حسین عورت سے کم نہ تھی۔ اس کے نقش ونگار میں ایک تیکھا پن تھا۔ اس میں دل موہ لینے والی جاذبیت تھی۔ اس کی گود میں ایک خوبصورت سا پیارا پیارا، گول مٹول سا بچہ تھا جسے دیکھ کر بے اختیار سا پیار آرہا تھا۔

شاہدہ کسی کام سے اپنی ساس کے ساتھ ایک طرف چلی گئی لیکن میں کتنی ہی دیر تک ساکت و جامد سی کھڑی فریدہ اور اس کے بچے کو دیکھتی رہی۔ بچہ اپنے باپ پر گیا تھا۔ اگر میں عرشی کی بات مان لیتی تو میری گود میں بھی ایسا ہی بچہ کھیلتا ہوتا۔ میری زندگی میں یہ ویرانی اور خزاں نہ ہوتی، بہار ہوتی۔ عورت کا اصل حسن اس کے ماں بننے میں ہے۔ یہ فریدہ کتنی خوش ہے، مسرور ہے۔ بچے کو بار بار بے تحاشا چوم کر اس پر کیسی سرشاری طاری ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کیسے برقی طاقتور قمقمے روشن ہیں۔

پھر میں چونکی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ عرشی سے میرا سامنا ہو اس لیے میں لمحے بھر کے لیے بھی رکی نہیں۔ گھر چلی آئی۔ میرے سینے میں خلش کا خنجر پیوست ہو گیا تھا۔ میں اپنا کمرا بند کر کے تکیے میں منہ دے کر گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔ میں نے شادی ہال سے نکلتے وقت عرشی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ عرشی بہت خوش تھے۔ آخر کیوں نہ ہوتے۔ انہوں نے اپنی منزل پا لی تھی۔ مگر میری منزل کہاں تھی؟ میں خوش نہ تھی۔ ایک پچھتاوا تھا جو کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈستا رہتا تھا اور مجھے اپنے آپ غصہ آتا تھا کہ آخر میرے لیے رشتے کیوں نہیں آ رہے ہیں اور میری شادی اب تک کیوں نہیں ہوئی۔ میں کسی بڑے خاندان کے شخص سے شادی کر کے عرشی کو بتانا چاہتی تھی کہ مجھے تم سے اچھا شوہر ملا ہے اور وہ ہر حکم کا تابع ہے۔ ادھر میں نے مشہور کر رکھا تھا کہ میرے لیے اونچے اونچے گھروں کے رشتے آ رہے ہیں۔ امریکا، کینیڈا اور جرمنی سے۔ کویت کا ایک شیخ مجھ سے شادی کرنے کے لیے مرا جا رہا ہے اور وہ اپنی دونوں بیویوں کو میری خاطر طلاق دینے کے لیے بھی تیار ہے لیکن میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اب مجھے مردوں اور شادی کے نام سے نفرت ہو چکی ہے۔

ابو نے اپنے طور پر میری شادی کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور انہوں نے دن رات شادی دفتر کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ انہوں نے رشتے کرانے والیوں سے کہہ رکھا تھا کہ بہت اچھا رشتہ ہو تو پچاس ہزار تک کا اعزازیہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے خیال میں وقت اور میری عمر تیزی سے گزرتی جا رہی ہے جس کا اثر میرے مستقبل پر پڑ سکتا ہے۔ دو ایک رشتے آئے تھے۔ میں نے انہیں اپنے قابل نہ جانا کیونکہ یہ رشتے متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے لیے اونچے گھرانوں سے رشتے اس لیے نہیں آ رہے تھے کہ میرا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔

میں نے کلب جانا بند کر دیا تھا اور پھر میرا ہائی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا برائے نام ہو کر رہ گیا تھا اس لیے میں پس منظر میں چلی گئی تھی۔ اس طرح دو برس کا عرصہ گزر گیا۔ میرے ابو میرے لیے بہت زیادہ پریشان رہنے لگے۔ میری شادی کی فکر میں روز بروز گھلنے لگے۔ ادھر امی مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ تم نے دیکھ لیا نا کہ اپنے غرور کا انجام..... اگر تم اپنے باپ کی بات نہ مانتیں۔ عرشی جیسے شریف اور نیک سیرت شوہر سے طلاق نہ لیتیں تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتے۔ آج کیا تم اپنی نظروں اور دنیا والوں کی نگاہوں میں دو کوڑی سے بھی بدتر ہو کر نہیں رہ گئی ہو۔ نہ صرف تم بلکہ تمہارا باپ بھی کیسے کرب ناک اذیت کی آگ میں جل رہا ہے۔

میرے ابو کے بچپن کے ایک دوست اسلم فریدی کی کوششوں سے میرا رشتہ جمیل سے طے ہو گیا۔ مجھے یہ رشتہ ذرہ برابر بھی پسند نہیں آیا تھا۔ کیونکہ جمیل ایک نجی فرم میں کیشئر تھا۔ اس کی تنخواہ پندرہ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنی ماں اور دو جوان بہنوں کے ساتھ رہتا تھا جو کسی سرکاری اسکول میں ٹیچرز تھیں۔ اس کی عمر چھتیس یا اڑتیس برس کی تھی۔ اس کی پہلی بیوی کا دو برس پہلے انتقال ہوا تھا۔ اس کی پہلی بیوی سے بچہ نہ تھا۔ وہ شکل و صورت کے لحاظ سے خوبصورت اور وجیہہ تھا اس کے پاس اپنی ایک موٹر سائیکل تھی۔ وہ فیڈرل بی ایریا کے جس مکان میں رہتا تھا ساتھ میں اس کی ماں اور بہن بھی رہتی تھیں۔ وہ مکان ایک سو بیس گز پر بنا ہوا تھا۔ اس میں ایک کمرا بھی اے سی کا نہیں تھا۔ صرف اس کی بہن ہی نہیں والدہ بھی سرکاری اسکول میں ٹیچر تھیں۔

پہلے تو میں نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس خیال سے کہ اس کی قلیل تنخواہ سے گزر کیسے ہوگا۔ عرشی مجھے ہر ماہ پچیس، تیس ہزار جیب خرچ کے علاوہ شاپنگ کے لیے تیس چالیس ہزار بھی دیا کرتے تھے۔ اس کی تنخواہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی۔ میں میک اپ اور ملبوسات کی خریداری پر آج بھی دس بارہ ہزار روپے خرچ کر دیتی تھی۔ پھر ایک خیال آیا کہ جمیل کی ماں بہنیں بھی تو کما رہی ہیں۔ ماں اور بیٹیاں بھی ٹیوشن پڑھا رہی ہیں۔ میں اس سے جیب خرچ کے لیے ایک معقول رقم لے سکتی ہوں۔ لیکن اس کی تنخواہ میں ایک خواب ناک زندگی گزاری نہیں جا سکتی ہے اور پھر ساس نندوں کا بھی جھنجٹ تو ہے۔ عرشی

TAGPK.COM

کے ہاں ساس، دیور اور نندوں کا سایہ تک نہ تھا۔ میں نے سنا ہوا تھا کہ بہو کو ساس اور نندوں کا زر خرید غلام کی طرح رہنا اور زندگی گزارنی پڑتی ہے اور پھر میں ایک مطلقہ بہو بن رہی ہوں۔ جانے کیا سلوک ہوگا۔

یہ رشتہ مجھے ابو کے سمجھانے بجھانے پر بادل نخواستہ قبول کرنا پڑا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں رہا تھا کیونکہ میں نے یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی تھی کہ ابو مجھے بوجھ سمجھنے لگے ہیں اور میری ذات سے بیزار ہوتے جارہے ہیں۔ امی نے بھی مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تم ایک عورت بن کر سوچو، ماڈل گرل بن کر نہیں۔ یہ رشتہ شاید تمہاری کسی نیکی کی وجہ سے آیا ہے۔

کوئی تین مہینے کے بعد میری شادی جمیل سے بڑی سادگی سے ہوگئی۔ جمیل اور اس کے گھر والوں سے کوئی بات چھپائی نہیں گئی تھی۔ انہیں صاف طور پر بتایا گیا تھا کہ میں مطلقہ ہوں۔ مجھے طلاق اس لیے ہوگئی تھی شادی کے پانچ برسوں تک میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تو میرے سابقہ شوہر نے مجھے طلاق دے کر دوسری شادی کر لی۔

میری دوسری شادی کی پہلی سہاگ رات تھی۔ میں اپنے آپ کو دلہن نہیں مردہ سمجھ رہی تھی۔ ایک مردے کو سجا کر جیسے اس کا نام دلہن رکھ دیا گیا تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں کوئی امنگ تھی، نہ سنسنی اور نہ ہی کوئی آرزو پنپ رہی تھی اور نہ ہی اس شادی سے میرے دل کو کوئی خوشی ہو رہی تھی۔ اپنے شوہر کو دیکھنے کا کوئی اشتیاق تھا اور نہ دل میں کسی ان جانے خیال سے لذتیت اور دل میں کوئی دھڑکن پیدا ہو رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ جمیل جلد از جلد آئے اور میں سہاگ رات کی رسم دنیا سے گزر کر سو جاؤں۔ میرے دل میں جو جذبے اور احساسات تھے وہ برف کی طرح سرد پڑے تھے۔ میں تو مٹی کا تودہ بنی بیٹھی ہوئی تھی۔

رات کے دو بجے جمیل حجلہ عروسی میں داخل ہوا۔ میری پہلی اور دوسری شادی میں بڑا فرق تھا۔ میری پہلی شادی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوئی تھی اور ولیمہ بھی اسی ہوٹل میں ہوا تھا۔ میرا حجلہ عروس ائر کنڈیشنڈ تھا۔ کمرا بھی بہت بڑا اور آراستہ و پیراستہ تھا۔ دوسری شادی ہال میں ہوئی تھی۔ جمیل کے گھر کا یہ کمرا زیادہ بڑا نہ تھا اور میرے جہیز کے فرنیچر سے بھر گیا تھا۔ کمرے میں گرمی تھی۔ چھت کا پنکھا ناکافی لگا تو میری چھوٹی نند افشاں نے ٹیبل فین لا کر آن کر دیا تھا۔ میں گھونگھٹ نکالے روایتی دلہن کی طرح نہیں بیٹھی تھی۔ یوں بھی آج کل دلہنوں میں شرم و حیا اور حجاب کہاں ہوتا ہے۔ وہ اسٹیج پر نکاح سے پہلے اور بعد میں اپنی سہیلیوں سے خوش گپیاں کرتی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کی شادی کو کئی دن ہو چکے ہیں۔

وہ بیڈ پر میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور مجھے جیسے ناقدانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ دوسرے لمحے اس سے نگاہیں ملیں تو میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے حسن سے متاثر ہو رہا ہے اور نہ دیدہ نظروں کی گرفت میں میرا چہرہ لیے آنکھوں میں جذب کر رہا ہے۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مخملی ڈبیا نکالی۔ اس سے ایک خوبصورت انگوٹھی نکال کر میرے ہاتھ کی مخروطی انگلی میں پہناتے ہوئے تحسین بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ واقعی بہت حسین ہیں۔ تصویروں میں اتنی حسین نہیں لگی تھیں۔“

ایک تو میں پہلے ہی کیا کم حسین تھی۔ پھر بیوٹی پارلر

ایک بہت ہی بھیانک اور عبرتناک غلطی علاؤالدین محمد خوارزم سے ہوگئی تھی۔ اس وقت اس کی سلطنت بہت طاقتور تھی، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی سلطنت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا ہے۔

اس زمانے میں منگولوں کا طوفان چنگیز خان کی صورت میں آگے بڑھتا آرہا تھا۔ چنگیز خان نے اپنے سفیر خوارزم شاہ کے دربار میں بھیجے تھے۔

خوارزم شاہ نے ایک ایسی غلطی کی جس کی سزا پوری قوم کو نسل در نسل برداشت کرنی پڑی۔

اس نے منگولوں کو کسی قابل ہی نہیں سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اجڈ وحشی لوگ اس کی تربیت یافتہ فوج کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اس نے نہ صرف چنگیز خان کی توہین کی بلکہ ان سفیروں کے سر کاٹ کر چنگیز خان کے پاس بھیج دیے۔ بس پھر کیا تھا۔ منگولوں کے طوفان، چنگیز خان نے اس کی پوری حکومت تاراج کر کے رکھ دی اور اتنے انسانوں کا خون بہایا کہ تاریخ میں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

مرسلہ: ناصر چغتائی، کراچی

TAGPK.COM

کے تیس ہزار کے سولہ سنگھار نے میرے حسن کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ میں نے اس کے تعریفی جملے پر شرما کر سر جھکایا اور نہ ہی کسی قسم کے تاثر کا اظہار کیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فرزا.....! میں آپ کو اپنے گھر والوں اور اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میری ماں میرے لیے اللہ کے بعد سب سے عزیز ہستی ہیں۔ میں انہیں بہت چاہتا ہوں اور اس کا اندازہ آپ کو رفتہ رفتہ ہو جائے گا۔ ماں کی عزت میری عزت ہے۔ میری بیوہ ماں نے اپنی اولاد کے لیے جو ایثار، قربانی اور تکلیفیں اٹھائی ہیں میں تادم نہیں بھول سکتا۔ آپ کے علم میں یہ بات آ چکی ہوگی کہ میری ماں اور بہنیں ملازمت کرتی ہیں۔ میں ان کی کمائی میں سے ایک پیسا بھی نہیں لیتا ہوں۔ تینوں بہنوں کی آمدنی ان کی شادی کے لیے جمع کی جا رہی ہے۔ میری تنخواہ میں گھر چلتا ہے۔ میری تنخواہ ماہانہ پندرہ ہزار روپے ہے، اوور ٹائم تین چار ہزار روپے بن جاتے ہیں۔ میری ماں بہنوں کی عزت اور خدمت کرنا آپ کا فرض ہے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف اور شکایت کا موقع نہ دینا۔ یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔''

وہ لمبا چوڑا لیکچر دیئے جا رہا تھا اور میں کسی بہری گونگی کی طرح ان کی باتیں سن رہی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی وہ مجھے اپنی بیوی نہیں نوکرانی بنا کر لایا ہے۔ اس نے میری حیثیت اور اوقات جتلا دی تھی تاکہ میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اگر میں مطلقہ نہ ہوتی تو شاید وہ اس قسم کی باتیں ہرگز ہرگز نہ کرتا۔ وہ مجھے اور اس کی ماں بہنیں مجھے دبا کر رکھنا چاہتی تھیں۔

میں نے بھی اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنے حسن، عشوہ، خود سپردگی اور والہانہ پن سے کٹھ پتلی بنا کر اشاروں پر نچاؤں گی۔ میں اس کے گھر والوں کی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں سے خدمت کراؤں گی۔ میرے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا۔ کیونکہ میں شعلہ مجسم تھی۔ اس نے مجھ جیسی اپنے خوابوں میں کیا اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھی ہوگی۔ اس کی پہلی بیوی ایک عام قسم کی عورت تھی جس میں حسن اور جسمانی کشش نہ تھی۔ رنگت بھی گہری سانولی تھی۔ وہ اس کے ماموں کی بیٹی تھی چونکہ اس کے لیے رشتے نہیں آ رہے تھے اس کی ماں اسے بہو بنا کر لے آئی تھی۔

جمیل نے دس برس تک اپنی پہلی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاری تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی پہلی بیوی کے بچے ضائع ہوتے رہے تھے اس لیے وہ ماں نہ بن سکی۔ آخری بچے نے اس کی بیوی کی جان لے لی۔ اسے بچوں کی بڑی تمنا ہے۔ وہ چار پانچ بچوں کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ اگر سات عدد بچے ہو جائیں تو کیا بات ہے۔ میں دو برس کے بعد اس کی زندگی میں آئی تھی۔ جس نے سوئے ہوئے سروں کو جگا دیا تھا۔

دوسری شادی کی پہلی سہاگ رات میں نے اپنے آپ کو کسی مردہ لاش کی طرح اس کے حوالے کر دیا۔ جذبات کی فراوانی میں اس نے میری اس سرد مہری کو محسوس نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اس بات کو شرم و حیا سمجھا تھا۔ تیسرے روز ولیمہ تھا۔ اس نے ولیمے کی تقریب گھر پر کی تھی۔ گلی میں شامیانہ لگایا گیا تھا۔ دن ڈوبنے کے بعد گھر میں اس کے رشتہ داروں اور مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ جس کمرے میں مجھے تیار کیا جا رہا تھا وہ لڑکیوں، عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں بظاہر انجان سی بنی سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی لیکن ان کی سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں کو برابر اور توجہ سے سن رہی تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ دلہن لاکھوں میں ایک ہے اور چودھویں کا چاند ہے۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ دلہن اتنی حسین ہوگی۔ جتنی حسین ہے اتنی ہی مغرور بھی لگ رہی ہے۔''

''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ اتنی خوبصورت بیوی کو پہلے شوہر نے طلاق کیوں دے دی؟ ایسی حسین لڑکیاں قسمت سے ہی ملتی ہیں۔''

''شاید شوہر بدصورت ہوگا..... یہ چونکہ بہت حسین ہے اس لیے نباہ نہ کر سکی۔ شوہر نے طلاق نہیں دی ہوگی بلکہ ان محترمہ نے طلاق یا خلع لے لیا ہوگا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نہایت حسین ہونے کے باعث ان کے چال چلن اچھے نہ ہوں۔''

''آپا.....! میرے میاں کہہ رہے تھے کہ اس کے پہلے شوہر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی تنخواہ دو لاکھ سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''کیا یہ حسینہ عالم اپنے میاں کے پندرہ سولہ ہزار میں گزارہ کر لے گی؟ مجھے یہ گاڑی زیادہ دنوں تک چلتی نظر نہیں آتی ہے۔''

''بہن.....! اگر یہ اپنے میاں کو غلام نہ بنا لے۔ ساس اور نندوں کو گھر سے نہ نکال دے تو پھر میرا نام بدل

دینا۔''

''جمیل بھائی نے اتنی حسین عورت سے شادی کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ماں، بہنوں کو ایسی حسین بہو ڈھونڈ کر لانا نہ تھی کیونکہ مجھے یہ کوئی بلا لگتی ہے۔''

''ویسے میں ایک بات کہوں، جمیل بھائی قسمت کے بہت تیز ہیں۔ بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ انہیں اتنی حسین عورت مل جائے گی۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔''

''یہ انہیں اس لیے مل گئی کہ مطلقہ ہے۔ مطلقہ عورت دو کوڑی کی ہوتی ہے۔''

یہ طنز اور نفرت کے فقرے جو زہریلے تیر تھے وہ میرا سینہ چھلنی کیے دے رہے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے جملے جو نیزوں کی طرح میرا سینہ چھلنی کیے دے رہے تھے نہیں سنے تھے۔ میں ان زہریلے تیروں اور فقروں کی چبھن، بڑے صبر وضبط، تحمل، اذیت اور خاموشی سے سہہ رہی تھی اور میری رگوں میں خون آتش فشاں کے لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ میں اس وقت بے بس اور مجبور سی تھی۔ میرے دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ ان عورتوں کے منہ نوچ لوں اور ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔

میرا خیال تھا کہ آج ولیمہ کی تقریب میں لڑکیاں، عورتیں میرے غیر معمولی حسن کی تعریب میں زمین آسمان ایک کر دیں گی مگر اس کے برعکس یہاں یہ ہو رہا تھا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تو میں نے افشاں سے بڑی بہن راحت کو بلا کر کہا کہ مجھے میرے کمرے میں لے چلو، مہمانوں کی وجہ سے میرا دم گھٹ رہا ہے۔

کوئی بیس بائیس دنوں تک میری ساس اور نندوں نے مجھے کوئی کام کرنے نہیں دیا اور نہ ہی خود کسی کام کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔ اٹھ کر میں نے پانی تک نہیں پیا۔

میری بڑی پذیرائی ہو رہی تھی۔ میری دونوں نندیں ہر وقت میرے آگے پیچھے گھومتی رہتی تھیں۔ میری ساس ذرا رکھ رکھاؤ کی تھیں... کیونکہ وہ اپنے اسکول میں ہیڈ مسٹرس تھیں۔ اڑوس پڑوس اور محلے کی عورتیں تو میری بڑی تعریف کر کے بتاتی تھیں میں جو جہیز لائی تھی وہ شاندار اور قیمتی تھا اور اتنا تھا کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وہ فرنیچر اور ملبوسات تھے جو میری پہلی شادی پر دیئے گئے تھے۔ فرنیچر کو پالش کروا کے بالکل نیا بنا دیا گیا تھا اور ملبوسات میں نہ صرف میرے بلکہ عرشی کے بھی دیئے ہوئے سوٹ تھے اور پھر میرے حسن و جمال نے بھی انہیں بے حد متاثر اور مرعوب کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ زیورات کے چھ سات سیٹ تھے۔ ان میں چار سیٹ عرشی کے تھے جو میں دانستہ لے آئی تھی اور عرشی نے واپس مانگے بھی نہیں تھے۔

جمیل بھی میری چاہت میں پاگل ہو رہا تھا۔ میں اس بات سے بہت ہی خوش تھی۔ مسرور بھی تھی کہ میرے جہیز اور حسن کا جادو اس پر چل چکا ہے۔ میں ایسی گرم جوشی اور خود سپردگی سے پیش آنے لگی کہ وہ کٹھ پتلی بن گیا۔ لہٰذا اب وہ، اس کی ماں اور بہنیں میری نوکروں کی طرح خدمت کرتی رہیں گی۔ میں کسی مہارانی کی طرح ان سے کام لیتی رہوں گی۔

جمیل نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اتنی رقم نہیں تھی کہ ہنی مون پر مری یا سوات جاتے۔ لہٰذا یہاں ہی ہنی مون منانے لگے تھے۔ رات ہم دونوں دیر تک جاگتے رہتے تھے اور صبح گیارہ بارہ بجے سے پہلے کمرے سے نہیں نکلتے تھے۔ ساس اور نندیں اسکول جا چکی ہوتی تھیں۔ میں نہا اور میک اپ کر کے کھانے کی میز پر آتی تو دوپہر کا کھانا میز پر چنا ہوتا تھا جو ساس اور نندیں اسکول جانے سے پہلے تیار کر کے رکھ جایا کرتی تھیں۔ کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد پھر ہم دونوں کمرے میں آ جاتے۔ بہکتے چہکتے، رات جو دیر تک جاگتے تھے وہ نیند پوری کر لیتے اور شام کو نکلتے۔ اس کے کسی دوست کے ہاں دعوت پر جانا ہوتا تو تیار ہو کر ساتھ چلی جاتی۔ جمیل کسی کام سے چلا جاتا تو میں اپنے کمرے میں بستر پر دراز ہو کر رسالے پڑھتی یا ٹی وی پر کوئی غیر ملکی چینل لگا لیتی۔ انڈین فلموں کی کیسٹ، سی ڈیز دیکھتی تو نندوں کو بلا لیتی۔ ساس ٹی وی نہیں دیکھتی تھیں۔ وہ اسکول سے آنے کے بعد اپنے کمرے میں آرام کرتیں، پنج وقتہ نمازی تھیں۔ میں نے ان کے برتاؤ سے محسوس کیا تھا کہ میرے معمولات انہیں ناگوار گزرتے ہیں۔ ساس اور نندوں کے اسکول جانے کے بعد ہم دس گیارہ بجے سے پہلے بیدار ہوتے تو جمیل ہی چائے ناشتا تیار کرتا۔ یہ بات بھی ساس کو زہر لگتی تھی۔ میں اندر ہی اندر اس بات سے بے حد سرشار تھی کہ جمیل میری مٹھی میں آ چکا ہے۔ وہ کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ میرے حسن، جہیز اور پرشباب گداز بدن سے اس گھر پر میرا راج قائم ہو گیا ہے۔

جمیل کی چھٹیاں ختم ہونے سے دو ایک روز پہلے میری ساس نے کہا۔ ''فزا بیٹی..... اکل تم کھیر بنا کر باورچی خانہ اور گھر سنبھالو گی۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ تمہیں بہو ہونے کے ناتے گھر سنبھالنا ہے۔''

میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جمیل کے گھر جا کر باورچی خانہ سنبھالنا ہوگا۔ میری امی ابو کے لاڈ پیار اور ناز و نعم نے مجھے کچھ نہیں سکھایا تھا۔ برتن تو کیا ایک پلیٹ اور گلاس تک نہیں دھوتی تھی۔ میرے نازک اور خوبصورت ہاتھوں نے جھاڑو تک نہیں تھاما تھا۔ عرشی کی بھی بڑی خواہش ہوتی تھی کہ میں اپنے ہاتھوں سے چائے اور کھانا بنا کر کھلاؤں مگر پانچ برسوں کے لمبے عرصے میں چائے بنانا اور کھانا پکا کر کھلانا تو درکنار آملیٹ تک نہیں بنایا۔

رات جب جمیل نے مجھے اپنے بازوؤں میں محصور کرلیا تب میں نے اسے صاف صاف بتادیا کہ میں خانہ داری میں بالکل صفر ہوں۔ میں نے اس کی اصل وجہ بھی بتادی۔ لہٰذا باورچی خانے کے لیے کسی نوکرانی کا بندوبست کرلیا جائے۔ وہ صفائی ستھرائی کا کام بھی کرلے گی۔ شام کو نوکرانی کی ضرورت نہیں ہوا کرے گی... کیونکہ تمہاری ماں اور بہنیں آچکی ہوتی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ جمیل میری بات بلا چوں اور چرا مان لے گا اور میری مشکل حل ہوجائے گی۔ اس نے میری بات سن کر کہا۔ ''فزا جان.....! آج تک ہمارے گھر میں کسی نوکرانی نے قدم رکھا اور نہ ہی کوئی کام کیا۔ جس گھر میں عورت ہو کسی نوکرانی کی کیا ضرورت؟ میری ماں اور بہنیں تمہیں ہر کام سکھادیں گی۔ کھانا پکانا، برتن دھونا، گھر میں صفائی ستھرائی ایسا کوئی مشکل کام نہیں..... میری مرحومہ بیوی سارے کام خود ہی کیا کرتی تھی۔ ماں، بہنوں کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھی۔ بڑی سگھڑ، سلیقہ شعار اور محنتی تھی۔''

میں نے عرشی سے اس لیے تو طلاق لی تھی کہ میں گھر بار سنبھالنا اور بچے پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر وہی بات میرے سامنے آگئی تھی۔ میری ماں نے رخصتی سے ایک دن پہلے مجھ سے صاف صاف اور تلخ لہجے میں کہا تھا، اب تم کوئی ایسی حماقت مت کرنا جو تمہاری زندگی، گھر اور مستقبل غارت کردے۔ تمہیں اس گھر میں مرتے دم تک زندگی گزارنا ہے۔ اگر تم نے پھر اپنے گلے میں ذلت اور بدنامی کا طوق [illegible] تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میں تمہیں زہر دے کر مار ڈالوں گی۔

میں نے اپنی ماں کی ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا تھا کہ یہ رسمی باتیں ہیں جو مائیں اپنی ان بیٹیوں سے کہتی ہیں جو الوداع ہو کر سسرال جانے والی ہوتی ہیں۔ فلموں، ڈراموں اور کہانیوں میں ہوتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ جمیل میرا غلام ہوگیا ہے۔ میرے اشاروں پر آنکھیں بند کرکے چلے گا۔ مگر یہ غلط ثابت ہوا تھا۔ یہ میری بھول تھی کہ میں نے اسے زن مرید سمجھ لیا تھا۔ وہ کوئی چوبیس، پچیس برس کا لڑکا نہیں تھا جو میرے حسن و شباب کا اسیر بن کے میری ہر بات بلا چوں و چرا مان لیتا۔ وہ ایک سلجھا ہوا چھتیس اڑتیس برس کا مرد تھا اس کی زندگی میں پہلے بھی ایک دو جوان عورت آچکی تھی۔ اس طرح کے مرد کو شیشے میں اتارنا آسان نہیں تھا۔ مجھے اس کا حکم ماننا پڑا۔ تاہم میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ جمیل کو اپنے عشق، وارفتگی اور خودسپردگی سے ایسا محتاج اور غلام بناؤں گی کہ وہ ایک روز اپنی ماں، بہنوں کو گھر سے نکال دے گا پھر میں بخیر و عافیت سے رہوں گی۔ میری خدمت کے لیے ایک نہیں دو دو نوکرانیاں ہوں گی۔

مجھے باورچی خانہ میں نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ میرے لیے باورچی خانہ کسی جہنم سے کم نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ اس عذاب کا عادی ہونا پڑا۔ میں نے ذرا بھی کام میں دلچسپی نہیں لی اس لیے باوجود کوشش کے میں اچھا کھانا پکانا سیکھ نہ سکی۔ اس کے باوجود کوئی کیڑے نہیں نکالتا تھا۔ ساس اور نندیں کہتی تھیں کہ کوئی بات نہیں۔ رفتہ رفتہ ہر کام آجائے گا۔ دراصل میں یہ چاہتی تھی کہ یہ لوگ میرے پھوہڑ پن سے بیزار ہو کر مجھے اس عذاب سے نجات دلا دیں لیکن ایسے آثار کوئی دور دور تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔

جھاڑو لگانا اور پوچھا دینا میری شان کے خلاف تھا۔ ساس کے لاکھ کہنے پر بھی میں نے یہ کام نہیں کیا۔ کبھی کبھی میری ساس گھر میں جھاڑو دیتیں اور پوچھا لگا دیتی تھیں گو کہ ان کی بیٹیاں انہیں یہ کام کرنے نہیں دیتی تھیں۔ ساس مجھ سے کہتی تھیں کہ بہو! اس کام میں شرم کیسی؟ ناک نہیں کٹ جاتی ہے۔ انہوں نے جمیل سے میرے انکار اور ہٹ دھرمی کی شکایت کرنے کی بجائے مجھے کئی مرتبہ سمجھایا کہ عورت گھر کی عزت ہوتی ہے۔ وہ شوہر کی خدمت اور کام کاج سے اپنا مقام حاصل کرتی ہے۔ سگھڑ اور سلیقہ مند بن کر نام پیدا کیا جاتا ہے۔ دیر تک سو کر اٹھنا، فجر کیا کسی بھی وقت کی نماز نہ پڑھنا، شوہر کو ناشتا بنا کر نہیں دینا، ٹی وی پر ہندوستانی فلمیں دیکھنا ایک اچھی عورت کو زیب نہیں دیتا ہے۔ کم از کم شوہر کا تو خیال کرلیا کرو۔ ہماری نہیں، اس کی خدمت کیا کرو۔

میں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ساس کی ناصحانہ باتوں کو اس کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا کرتی تھی۔

میں نے کبھی بھی ان کی کسی بات کی کوئی پروا نہیں کی۔ گھر سنبھالتی میری جوتی، میں دیر سے سو کر اٹھتی۔ ناشتا میری نندیں فجر کی نماز پڑھ کر تلاوت کرنے کے بعد تیار کرتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا بھی پکانا کے بعد صبح آٹھ بجے چلی جاتی تھیں۔ میں گیارہ بجے تک مزے سے سوتی رہتی۔ بستر سے نکل کر بڑی آزادی سے دیر تک نہاتی اور تیار ہوتی، کپڑے [illegible] میک اپ کرتی۔ ناشتا میز پر ہوتا تھا۔ ناشتا کر کے اخبار پڑھتی۔ دو بجے ساس اور نندیں ایک ایک کر کے آجاتیں۔ گھر اور باورچی خانہ کی حالت دیکھ کر ان کا منہ بن جاتا تھا... پھر میں اپنے کمرے میں بند ہو کر انٹرنیٹ یا موبائل پر ہر قسم کی سنسنی خیز فلمیں دیکھتی تھیں۔ انٹرنیٹ اور موبائل صرف میرے کمرے میں تھا۔ ساس اور نندوں نے کیبل کنکشن نہیں لیا ہوا تھا۔ جمیل شام کو دفتر سے گھر آتا تو کمرے سے نکلتی۔ میں جانتی تھی کہ میرے جہیز کی وجہ سے میری ساس اور نندوں کا منہ بند ہے۔ میں شام کے وقت جمیل کو کھانے کے لیے باورچی خانے میں گھس جاتی تاکہ وہ میرے خلاف زہر نہ اگلیں۔ میں راتوں کو نشاط انگیزی کے غیر محسوس انداز میں کان بھرنے لگی تھی۔

چھ مہینے کا عرصہ بڑی تیزی سے گزر گیا۔ میری ساس اور نندوں پر جو میرا سحر چھایا ہوا تھا وہ ماند پڑ گیا۔ ہمارے درمیان بدمزگی کی فضا قائم ہوگئی... پھر میں ان کے زہریلے فقروں اور طنز اور طعنوں کا نشانہ بننے لگی تھی۔ پہلے تو اشاروں، کنایوں اور غیر محسوس انداز سے کہا جاتا تھا۔ اب کھل کر کہا جانے لگا کہ تم ایک مطلقہ عورت ہو۔ ہم تمہارے حال اور تمہارے باپ کے دوست کے کہنے پر بیاہ کر لائے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ تمہارے پہلے شوہر نے بڑی ناانصافی اور زیادتی کی تھی تمہارے ساتھ..... اب پتا چل رہا ہے کہ اس شریف شخص نے تمہیں طلاق کیوں دی؟ تمہارے ماں باپ کو چاہیے تھا کہ تمہاری شادی کرنے کی بجائے ایکٹریس یا ماڈل گرل بنا دیتے۔ اگر تم یہاں سیدھی طرح نہیں رہیں تو تمہارے ساتھ وہی ہوگا جو پہلے ہو چکا ہے۔ تمہاری عزت اور بہتری اسی میں ہے کہ راہ راست پر آجاؤ۔ گھر کے ماحول اور حالات کے ساتھ چلو۔

پھر ایک روز میری ساس نندوں سے زبردست لڑائی ہوگئی۔ اتفاق سے اس روز جمیل کسی کام سے جلد گھر آگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جمیل میری طرف داری کرے گا۔ جب اس نے مجھے اپنی ماں سے بدکلامی اور زبان درازی کرتے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ اپنی ماں کو بہت چاہتا تھا۔ اس نے طیش میں آکر پیر سے جوتا نکال کر میرے دو تین لگا دیئے۔ اگر میری ساس درمیان میں نہ آتیں تو وہ شاید جوتے سے میری ایسی درگت بناتا کہ میں بے ہوش ہو جاتی اور میرے چہرے کا جغرافیہ بدل جاتا۔ میں اس ذلت اور توہین پر آپے سے باہر ہوگئی۔ میں ہذیانی لہجے میں چیخ کر بولی۔ ”کمینے..... تمہارے پاس کیا تھا.....؟ میرے باپ نے اتنا سارا جہیز اور پھول سی بچی اٹھا کر دے دی۔ تم مجھے بے عزت کر رہے ہو؟ جوتے سے مار رہے ہو؟ شرم نہیں آتی ایک عورت پر مردانگی دکھا رہے ہو.....؟“

جمیل نے میری باتیں سنیں تو اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ اگر میری ساس اور نندیں درمیان میں نہ آتیں تو وہ میرا گلا دبا دیتا۔ اس نے ماں اور بہنوں کو ہٹانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چٹان بن گئی تھیں۔ ساس نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ”جمیل..... ادیکھو۔ فزا عورت ذات ہے تم اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔“

جمیل چونکہ ماں کی بات بہت مانتا تھا اور ان کا بے حد احترام کرتا تھا اس لیے رک گیا... پھر اس نے مجھ سے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے باپ نے جو یہ سب کچھ دیا ہے وہ اس لیے کہ تمہاری ذات پر لگے ہوئے بدنما دھبے کو دھویا جائے۔ ہمیں نہیں چاہیے یہ جہیز..... اسے آج ابھی اور اسی وقت لے جاؤ۔ میں ٹرک لا کر اس میں رکھ دیتا ہوں..... اگر تمہیں اس گھر میں رہنا ہے تو ایک بیوی، عورت اور اچھی بہو بن کر رہو..... نہیں تو پھر فیصلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ گھر جا کر اپنے والدین کو بھیج دینا۔“

میں اس وقت کسی سنسناتے ہوئے تیر کی مانند جمیل کے گھر سے نکلی اور اپنے گھر پہنچی۔ ابو گھر پر موجود تھے۔ امی اور ابو نے میری شکل دیکھی تو ان کے اوسان خطا ہوگئے۔ امی نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا ہوا بیٹی فزا.....؟ خیریت تو ہے؟“

میں نے انہیں رو رو کر سارا قصہ سنایا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ امی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ جب میں انہیں اپنی رام کہانی سنا چکی تو ابو نے سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”طلاق.....!“ میں نے نفرت اور حقارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں اب اس گھر میں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔“

TAGPK.COM

''تم نے پہلے طلاق کا انجام دیکھ لیا۔ پھر بھی تم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔'' ابو نے کرخت لہجے میں کہا۔

''کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میں وہاں رہ کر ساس نندوں کے طعنے سنتی رہوں اور شوہر کے جوتے کھاتی رہوں۔'' میں نے برافروختہ ہو کر کہا۔

''یہ تمہارے لیے دنیا کی ذلت سے بہتر ہے۔'' امی زہرخند لہجے میں بولیں۔

''یہ ہے آپ کی بیٹی سے محبت.....'' میں نے بدھی سے کہا۔ ''آپ لوگوں نے کبھی بھولے سے بھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا..... ناز و نعم سے پالا اس مردود، کمینے، خبیث اور بے غیرت نے مجھے جوتے مارے تو کوئی بات نہ ہوئی.....؟''

''ہم نے تمہیں جو لاڈ و پیار اور ناز و نعم میں پال کر غلطی کی اس کا خمیازہ صرف تم ہی نہیں ہم بھی بھگت رہے ہیں۔'' امی نے گہری سانس لی۔

''آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟'' میں نے تنگ کر پوچھا۔

''تم جس طرح آئی ہو اسی طرح واپس جاؤ۔'' امی نے تیز و تند لہجے میں جواب دیا۔ ''اپنے شوہر، ساس اور نندوں سے اپنی اس بدتمیزی پر، سرکشی اور گستاخی کی معافی مانگو، کوشش کرو کہ آئندہ اس کی نوبت نہ آئے۔''

''کیا.....؟'' میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مجھے اپنی سماعت پر فتور محسوس ہوا۔ ''اگر اس ذلیل شخص نے مجھے پھر جوتے مارے تو کھالوں؟''

''ہاں۔'' امی کہنے لگیں۔ ''اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ تم سدھر جاؤ گی۔ ذلت و رسوائی سے بچ جاؤ گی اور پھر تم صحیح معنوں میں عورت بن جاؤ گی۔''

''نہیں..... یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' میں غصے سے فرش پر پیر پٹخ کر چیخی۔ ''مجھے اس خبیث سے طلاق چاہیے۔ میں اس کے ساتھ ایک دن تو کیا ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔ میں کسی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے۔''

''تو پھر ہمارا فیصلہ بھی سن لو۔'' ابو سرد لہجے میں بولے۔ ''اگر تم طلاق لینا بہتر سمجھتی ہو تو شوق سے لے سکتی ہو۔ ہم تمہیں روکیں گے نہیں..... مگر طلاق لینے کے بعد اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے اور ہم کبھی تمہاری شکل دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ تم یہ سمجھ لینا ہم مر چکے ہیں..... یہ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔''

''ابو.....! یہ آپ کہہ رہے ہیں؟'' دکھ سے میری آواز بھرا گئی۔ ''کیا آپ دونوں بھی مجھے جوتے نہیں مار رہے ہیں؟''

''ہاں بیٹی.....! یہ ہی کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارا باپ ہوں۔'' ابو دل گرفتہ لہجے میں بولے۔ ''جب بیٹی طلاق لیتی ہے تو صرف لڑکی ہی نہیں بلکہ ماں باپ کی بھی بے عزتی ہوتی ہے۔ پورا خاندان لپیٹ میں آجاتا ہے۔ تم دوسری مرتبہ طلاق لے کر پھر ہم سب کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتی ہو؟ ہم پہلے ہی سر اٹھا کے چلنے کے قابل نہیں رہے۔ اب تو کسی کو بھی منہ نہیں دکھا سکیں گے۔''

کوئی دو ایک گھنٹے کے بعد امی اور ابو مجھے ساتھ لے کر سسرال پہنچے۔ انہوں نے میری طرف سے معافی مانگی۔ میں نے بھی اپنے شوہر، ساس اور نندوں سے معافی مانگی۔ میری ساس نے مجھے گلے سے لگایا اور نندوں نے خوب پیار کیا۔ میرے شوہر نے مجھے سب کے سامنے معاف کردیا۔ اس معافی نے سب کے دل صاف کردیے تھے۔

امی اور ابو کے جانے کے بعد میں اپنی ساس اور نندوں کے پاس بیٹھی ان سے باتیں کرتی رہی۔ رات بارہ بجے خواب گاہ میں داخل ہوئی تو جمیل جاگ رہے تھے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ ''آجایئے۔''

''میں نہیں آتی.....'' میں نے پیار بھری خفگی سے کہا۔

''کیوں.....؟'' وہ میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔

''اس لیے کہ آپ نے مجھے جوتے سے کیوں مارا؟''

''جان من.....! اگر میں تمہیں جوتے سے نہیں مارتا تو تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آتی۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ ''دیکھو اس جوتے نے ہم دونوں کے درمیان کتنی محبت پیدا کردی۔''

جمیل نے غلط نہیں کہا تھا۔ انہوں نے جوتے مار کر میرا دماغ درست کردیا تھا۔ آج اس واقعے کو سات برس بیت چکے ہیں۔ میری دونوں نندوں کی شادیاں ہوچکی ہیں۔ وہ دو، دو بچوں کی مائیں ہیں۔ میری ساس حیات ہیں۔ میرے پانچ بچے، دو لڑکے، تین لڑکیاں ہیں۔ اگر اس روز جمیل مجھے جوتے سے نہ مارتے تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ میرے وجود اور شخصیت کی تکمیل نہ ہوتی۔

++

TAGPK.COM



مکافات

محترم عدیر
سلام مسنون!
ایک اور سچ بیانی ارسال کررہا ہوں جو ہمارے حیدرآباد سے کراچی تک پھیلی ہوئی سبق بھری ہے. قارئین کے مزاج پر پوری اتر گی.

عارف مجید عارف
حیدر آباد

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، مکافات عمل کا یہ فلسفہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ ہر انسان اور خصوصاً مسلمان اس بات پر یقین رکھتا ہے۔ میرا بھی اس بات پر مکمل یقین تھا مگر ابھی جو میں نے فون پر بات کی تھی اس فون کال کو سننے کے بعد تو مجھے یقین کامل ہوگیا۔ فون میرے پرانے دوست اور کلاس فیلو امجد کا تھا جو کچھ سال قبل ہی کراچی منتقل ہوا تھا۔ جو اطلاع اس نے مجھے دی تھی بظاہر مجھے اس سے بہت خوشی ہونی چاہیے تھی مگر میرا دل اداس ہوگیا تھا۔ امجد نے اپنے محلے میں رہائش پزیر ایک شخص کے متعلق بتایا تھا کہ آج اسے اس کے بیٹے نے تھپڑ مارا ہے۔ مضروب شخص کو میں جانتا تھا

گو کہ اس کی وجہ سے مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا نقصان اٹھانا پڑا تھا مگر مجھے یہ بات سن کر اچھا محسوس نہیں ہوا تھا۔

میں آپ کو ماضی میں لیے چلتا ہوں اور مکمل داستان تفصیل سے بتاتا ہوں تا کہ آپ پوری بات جان سکیں۔

☆☆☆

میرا نام اخلاق احمد ہے اور میں لطیف آباد میں اپنے والدین کے گھر میں رہائش پزیر ہوں۔ بی فارمیسی کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کرنے کے بعد میں حیدرآباد میں واقع ایک بڑے دوا ساز ادارے میں ایک بہت اچھے عہدے پر فائز تھا۔ جہاں سے مجھے خاصی مناسب تنخواہ ملتی تھی اس کے علاوہ میڈیکل کے ساتھ دوسری مراعات بھی حاصل تھیں۔ شادی کے دو تین سال بعد ہی میں اپنی امی سے اجازت لے کر اپنے الگ مکان میں منتقل ہو گیا تھا۔ میرا آبائی مکان قریب ہی واقع تھا۔ اس مکان میں میرے دیگر دو بڑے بھائی ایک بیوہ بہن اور والدہ رہتی تھیں جبکہ میرے والد کا بہت عرصہ قبل انتقال ہو چکا تھا۔ اپنے انتقال سے پہلے ہی وہ اس مکان کی ازسرنو تعمیر کرا چکے تھے۔ زیریں منزل کے علاوہ بالائی منزل پر بھی دو کمرے تھے جبکہ باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ بھی موجود تھے۔

میرے بڑے بھائی اشتیاق احمد ایک بینک میں درمیانے درجے کے ملازم تھے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دو بیٹوں کے والد بھی تھے جن کی عمر علی الترتیب آٹھ اور دس سال تھیں۔ وہ بالائی منزل پر رہائش پزیر تھے۔ ان سے چھوٹے اشفاق احمد بھائی تھے۔ وہ بھی شادی شدہ تھے۔ ان کی ایک پانچ سالہ بیٹی تھی۔ وہ حیدرآباد کی ایک مشہور کپڑے کی مل میں کلرک تھے۔ ان کے علاوہ ہم سب سے بڑی طاہرہ آپی تھیں جو شادی کے تین سال بعد ہی بیوہ ہو کر واپس گھر آ گئی تھیں۔ ان کا ایک سات سال کا بیٹا بھی تھا۔ ان کے مرحوم شوہر کی پنشن آتی تھی اس کے علاوہ مرحوم شوہر کی گریجویٹی وغیرہ کی رقم بھی قومی بچت اسکیم میں محفوظ تھی اور اس کا منافع بھی ملتا تھا جو ان کے گزر بسر کے لیے کافی تھا مگر ہم تینوں بھائی ان سے گھر کا خرچا نہیں لیتے تھے جس کی وجہ سے .... وہ کسی نہ کسی صورت خاصے پیسے ہم بھائیوں کی اولاد پر خرچ کر دیا کرتی تھیں۔

اشتیاق بھائی کی بیوی انیلہ بھابی خاصی خوبصورت تھیں۔ آٹھ دس سال کے دو بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود انہوں نے خود کو بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اشتیاق بھائی ان کے غلام بنے ہوئے تھے اور ان کی ہر صحیح غلط بات پر یقین رکھتے تھے۔ خود انہیں بھی اپنی اس خوبی کا اندازہ تھا اور وہ شوہر سے ناز نخرے اٹھوایا کرتی تھیں۔ اپنی خوبصورتی اور شباب کے علاوہ ان میں کوئی اور گن نہ تھا۔ بظاہر وہ بی اے پاس تھیں مگر یہ تعلیم بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔ وہ مغرور اور چالاک فطرت تھیں اس کے علاوہ زبان کی بھی تیز تھیں جو منہ میں آتا کہہ دیتی تھیں کیوں کہ انہیں اپنے شوہر کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ ان کے دونوں بیٹے بھی ماں کی شہ پا کر چھوٹی عمر سے ہی خودسر اور خاصے بدتمیز ہو گئے تھے مگر انیلہ بھابی ان کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کی روادار نہ تھیں۔ اشتیاق بھائی مالی طور پر خاصے بہتر تھے شاید اسی وجہ سے وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر اپنی ماں اور بھائی بہنوں پر پیسا خرچ کریں۔ اپنی شادی کے دوسرے ہی سال وہ اپنا کچن الگ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اب اشتیاق بھائی امی کو دیے گئے مہینے کے کچھ پیسے دینے کے علاوہ اور کچھ خرچا نہیں کرتے تھے۔ امی کو دی جانے والی رقم بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ انیلہ بھابی اپنے شوہر کی کمائی کو مکمل طور پر ہر ماہ ہی خرچ کرنے کی عادی تھیں۔ مہنگے کپڑے، زیورات بنانا اور باہر کھانا کھانا معمولات تھے۔ ابتدا میں ایک آدھ بار امی نے ٹوکا مگر اشتیاق بھائی نے بات سنی ان سنی کر دی اور کوئی توجہ نہ دی اور زندگی اسی طرح لاابالی سے گزارتے رہے۔

میری شادی اسی مکان میں ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا کمرا میرے حصے میں آیا تھا۔ میری بیوی مہوش بھی کچھ کم حسین نہ تھی شاید یہی وجہ تھی کہ انیلہ بھابی اس سے بغیر کسی وجہ کے خار کھانے لگی تھیں۔ دراصل ان کی فطرت تھی کہ وہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھتی تھیں، کسی سے خوش نہیں ہوتی تھیں پھر میری بیوی کی اعلیٰ تعلیم اور خاندان بھی ان کے حسد کی ایک وجہ تھا۔

شادی کے دو سال میں ہی میں دو پیارے سے بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ بچوں کے بڑھتے ہوئے سامان کی وجہ سے ہمارا کمرا اب چھوٹا پڑنے لگا تھا اس لیے میں یہ گھر چھوڑ کر قریبی بسم اللہ سٹی کے نام سے آباد ہونے والی رہائشی اسکیم میں منتقل ہونا چاہتا تھا۔ اس اسکیم میں اپنی شادی سے قبل میں نے ایک گھر بک کروالیا تھا جس کی اب کچھ ہی اقساط باقی تھیں یہ رہائشی اسکیم اب آہستہ آہستہ آباد ہو رہی تھی۔ امی نے مجھے بخوشی وہاں منتقل ہونے کی اجازت دے

دی۔ نئے گھر میں چلے جانے کے باوجود میں تقریباً ہر روز ہی امی سے ملنے آتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر ماہ انہیں اک مناسب رقم بھی خرچے کے لیے دیا کرتا تھا۔

ہم نے نئے گھر میں منتقل ہونے کی خوشی میں گھر میں خواتین کا میلاد بھی کروالیا اور ایک پُرتکلف دعوت کا بھی اہتمام کیا تھا۔ میری بیوی نے نئے مکان کی آرائش خوب کی تھی اور یہاں منتقلی سے قبل ہی پھول پودے بھی لگا دیے تھے ان کی وجہ سے بھی گھر میں بہت خوبصورتی آگئی تھی پھر نئی چیز تو نئی ہوتی ہے اس کے نظارے ہی الگ ہوتے ہیں۔ سب ہی لوگوں نے ہمارے گھر اور اس کی تزئین و آرائش کی بہت تعریف کی۔ انیلہ بھابی بھی تعریف کرنے لگیں مگر ان کے چہرے اور انداز و اطوار سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر حسد کے مارے جل بھن رہی ہیں۔

ہمارے نئے مکان کی چمک دمک غالباً ان کے دل و دماغ پر قبضہ کر چکی تھی اور شاید اس کی وجہ سے میرے اور میری بیوی کے چہرے پر چھائی سرشاری ان سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ انیلہ بھابی نے نہ جانے اشتیاق بھائی کو کیا پٹی پڑھائی کہ دس دن بعد ہی انہوں نے اپنے رہائشی بالائی منزل کی ازسرِنو زیبائش کا کام شروع کر دیا حالانکہ پہلے بھی یہ منزل بہت بہتر حالت میں تھی اور کسی اضافی کام کی قطعاً ضرورت نہیں تھی مگر انیلہ بھابی کے جو دل میں آجائے وہ اپنے شوہر سے منوا کر دم لیتی تھیں۔ اشتیاق بھائی کی تنخواہ بہت مناسب تھی مگر انیلہ بھابی کے خرچے اس میں سے کچھ بچت کرنے نہیں دیتے تھے اس لیے ان کے پاس اضافی رقم نہ تھی۔ اشتیاق بھائی نے ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے بینک سے قرض لیا تھا۔ بالائی منزل میں فرش، کچن اور واش روم وغیرہ میں پہلے ہی موزائک کا کام ہو چکا تھا.. مگر انہوں نے وہ سب اکھڑوا کر ان کی جگہ مہنگے ٹائلز لگوا دیے تھے اس کے علاوہ واش روم اور کچن کی تمام سینیٹری فٹنگ بھی تبدیل ہوئی تھی کچن کے لکڑی کے کیبن بھی نئے بنوائے گئے تھے اور ان سب کاموں کے بعد رنگ و روغن بھی نیا کیا گیا تھا۔ ان سب کاموں کے بعد انہوں نے پوری منزل پر جہاں جہاں ممکن تھا مصنوعی پھول اور دیگر شوپیس سجا دیے تھے۔ گویا دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تمام کاموں کے بعد ان کے رہائشی حصے کی ایک بہت اچھی شکل نکل آئی تھی مگر انہوں نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ شاید ہمیں دکھانے کے لیے میلاد کروایا اور ایک بہترین ضیافت کا بھی انتظام کیا تھا۔ اگر کوئی ہم سے حلفاً پوچھے تو ہمیں ان کے گھر کی آرائش دیکھ کر خوشی ہوئی تھی گو کہ ہمارے خیال میں یہ اسراف تھا۔ انیلہ بھابی کی پوری توجہ اس بات پر تھی کہ ایک ایک چیز کا ذکر بڑھا چڑھا کر کیا جائے۔ ان کا خاص مخاطب میری بیوی تھی۔ وہ اسے ہر چیز کے متعلق اس طرح بتا رہی تھیں کہ جیسے جتا رہی ہوں۔ کس کام میں کتنا خرچا ہوا۔ ٹائل کس معیار اور کس قیمت کے ہیں۔ سینیٹری فٹنگز کس اعلیٰ کمپنی کی ہیں۔ غرض یہ کہ انہوں نے یہ سب جتا کر اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

کچھ ماہ بعد ہی اشتیاق بھائی کی ترقی ہوگئی بھابی نے یہ موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ایک چھوٹی موٹی تقریب منعقد کرنے کا موقع نکال لیا حسبِ سابق خوب خرچا کیا گیا اور ہم سب کو جتایا بھی گیا۔ اس کے کچھ ماہ بعد اشتیاق بھائی کی پرموشن ہوگئی۔ شوہر کی ترقی کے بعد بھابی کے کروفر میں اور اضافہ ہو چکا تھا اور وہ اکثر کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ ہم کیونکہ الگ مکان میں رہائش پزیر تھے اس لیے ان کی اس روش سے محفوظ تھے مگر اشفاق بھائی کی بیوی شبانہ بھابی کو وہ اپنے شوہر کی زیادہ تنخواہ اور اشفاق بھائی کی محدود آمدنی کے متعلق اکثر ہی جتاتی رہتی تھیں۔ اشفاق بھائی کی بیوی فطرت کی بہت اچھی تھیں۔ کم آمدنی کے باوجود وہ اپنے شوہر سے کوئی شکوہ نہیں کرتی تھیں اور اللہ کی رضا میں راضی رہتی تھیں۔ اصل میں اشفاق بھائی بھی طبیعت کے بہت اچھے اور ہمدرد انسان تھے۔ ہم سب بھائیوں میں سب سے کم آمدنی کے باوجود وہ ہمیشہ خوش و خرم اور شکر گزار نظر آتے تھے۔ پورے خاندان میں وہ اور ان کی بیوی خاصے مقبول تھے۔

اشتیاق بھائی کی ترقی کے بعد سے بھابی کا رہن سہن اور بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ اکثر رات کو وہ کھانا پکانے کا تکلف نہیں کرتی تھیں بلکہ باہر کھانا کھانے کو ترجیح دیتی تھیں یا کسی بھی ریسٹورنٹ سے آن لائن منگوا لیا کرتی تھیں۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھی تو ہم اپنے حساب سے ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے۔

کچھ ماہ قبل اشتیاق بھائی کا بینک کا ایک ساتھی بینک سے بغیر تنخواہ کی دو سال کی چھٹی لے کر امریکا چلا گیا تھا۔ اس نے وہاں ایک اچھی نوکری حاصل کر لی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی امریکا بلا چکا تھا۔ ایک دن اس سے اشتیاق بھائی کی بات ہوئی تو اس نے انہیں بھی امریکا آنے کا مشورہ دیا بلکہ یہ پیشکش بھی کی کہ وہ جس

TAGPK.COM

مارٹ میں کام کرتا ہے وہاں اکاؤنٹس کے شعبے میں ان کی نوکری کا بندوبست بھی کرسکتا ہے۔ اس نے یہ بات شاید اس لیے بھی کی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ اشتیاق بھائی کا امریکن ویزا لاٹری میں نام آچکا ہے اور وہ ابھی بھی کارآمد ہے۔

اشتیاق بھائی نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو وہ فوراً ہی تیار ہوگئیں کہ ایسے موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اشتیاق بھائی اکیلے جانا چاہتے تھے تاکہ کچھ سیٹ ہو جائیں تو بیوی بچوں کو بھی بلالیں مگر انیلہ بھابی نے انہیں مجبور کردیا کہ وہ انہیں بھی لے کر جائیں۔ جب ایک نوکری کا آسرا ہے تو پھر گزر بسر تو ہو ہی جائے گی۔ اشتیاق بھائی کی بینک میں نوکری کا وسیع تجربہ اور ان کی اکاؤنٹس کی تعلیم کی وجہ سے ان کے دوست نے اپنے مارٹ کی انتظامیہ سے بات کرلی تھی۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا مارٹ نہیں تھا بلکہ اس ریاست میں ایک بڑی چین کا حصہ تھا اور اشتیاق بھائی کو چار پانچ مارٹ کا اکاؤنٹس دیکھنے کی ذمے داری ملنی تھی۔ ان کے دوست نے بھی فی الحال بیوی بچوں کو لانے سے منع کیا تھا مگر انیلہ بھابی کے سر میں امریکا جانے کی دھن سوار ہوچکی تھی۔ وہ اپنے میکے اور سسرال کے اک اک گھر میں یہ بات دل کھول کر بتا چکی تھیں کہ ہم لوگ امریکا منتقل ہو رہے ہیں۔ ان کی ضد کے آگے اشتیاق بھائی حسب سابق ڈھیر ہوگئے۔ تین ماہ کے عرصے میں ہی وہ بینک سے لمبی چھٹی لینے کے ساتھ بچوں کے پاسپورٹ اور دیگر معاملات مکمل کرچکے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ٹکٹ وغیرہ کے پیسے اور دیگر ابتدائی خرچوں کے علاوہ رہائش کے انتظام کے لیے بھی فوری بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ بچت وغیرہ کا لفظ تو بھابی کی لغت میں تھا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا رشتہ دار تھا جو اتنی زیادہ رقم ادھار دے سکے۔ بینک سے بھی فی الحال قرضہ ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کسی نے صلاح دی کہ سود پر پیسا لیا جائے۔ بینک کے ایک ساتھی کا ایک پٹھان دوست تھا جو یہ کام کرتا تھا۔ اس نے کچھ کم سود پر وہ رقم مہیا کردی۔ اس پٹھان نے کوئی ضمانت وغیرہ بھی نہ طلب کی کیوں کہ ایسے کام کرنے والوں کو اپنا پیسا نکالنا بخوبی آتا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے رہائشی حصے کو تالا لگا کر بیوی بچوں سمیت امریکا روانہ ہوگئے۔ ان سے بات ہوتی رہتی تھی۔ جس مارٹ میں ان کی ملازمت تھی اس کے قریب ہی وہ ایک اسٹوڈیو فلیٹ میں کرائے پر رہنے لگے اس ایک کمرے کے فلیٹ کا کرایہ بھی بہت زیادہ تھا اس کے علاوہ دیگر ضروریات زندگی بھی بہت مہنگی تھیں۔ تنخواہ کا بڑا حصہ اسی میں لگ جاتا تھا جبکہ سود کی قسط نکالنے کے بعد ان کے ہاتھ کچھ نہ بچتا تھا۔ ان کے لیے دور کے ڈھول سہانے ہی ثابت ہوئے تھے ہاں اگر وہ تنہا آتے تو خاصی بچت کر سکتے تھے۔ انیلہ بھابی بھی اس صورت حال سے بہت پریشان تھیں۔ وہ یہاں پاکستان میں عیش و عشرت سے رہتی تھیں۔ گھر کے کام کاج کے لیے ماسی تھی جبکہ امریکا کے ایک ورکنگ فلیٹ میں ان کا گزارا مشکل سے تھا۔ وہ امریکا کے جلووں کی داستان سن کر خوش خوش گئی تھیں مگر یہ بھول گئی تھیں کہ اس کے لیے وافر مقدار میں پیسا بھی لازمی ہے۔ اشتیاق بھائی نے اوور ٹائم بھی کرنا شروع کردیا تھا جس سے آمدنی تو بڑھ گئی مگر آرام کا وقت بہت گھٹ گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے ایک سال بعد ہی وہ شدید بیمار ہوگئے اور آئے دن چھٹیاں کرنے لگے جس کی وجہ سے ان کی تنخواہ میں کٹوتی ہونے لگی اور دو ماہ سے سود کی قسط بھی نہ ادا ہوسکی۔ مزید ایک ماہ بعد تو حالات اور خراب ہوگئے تو انہوں نے واپس آنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس بار انیلہ بھابی بھی ان کے اس فیصلے کی حامی تھیں۔

پاکستان آکر انہوں نے اپنی بینک کی نوکری دوبارہ شروع کردی۔ اب چار ماہ کی سود کی اقساط واجب الادا ہوچکی تھیں۔ پٹھان کے تقاضے بڑھ چکے تھے۔ اشتیاق بھائی بہت پریشان تھے کہ سود کی اقساط اور اصل قرضہ کیسے واپس ہوسکے گا۔ بالآخر انہوں نے بینک سے بڑا قرضہ لینے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس بڑی مالیت کے قرضے کے لیے مساوی رقم کے مکان یا زمین کے کاغذات گروی رکھوانے لازمی تھے۔ اس قرضے میں یہ فائدہ تھا کہ بینک کے بڑے ملازمین کو برائے نام سود ادا کرنا پڑتا تھا۔ اشتیاق بھائی نے امی سے کہا کہ وہ وقتی طور پر مکان ان کے نام کردیں تاکہ وہ یہ قرض ادا کرکے سود سے جان چھڑائیں۔ امی نے صاف انکار کردیا جبکہ ہم بھی کسی طور آمادہ نہ تھے کیوں کہ امی اور ہم ان کے اطوار دیکھ چکے تھے۔ ہمیں ان پر بھروسا نہ تھا مگر اشفاق بھائی نے ہمیں یہ کہہ کر آمادہ کرلیا کہ ہمارا بھائی ہے ہم نہیں ساتھ دیں گے تو پھر کون دے گا پھر قرضہ بھی سات آٹھ سال میں پورا ہوجائے گا تو کاغذات دوبارہ ہمارے نام ہوجائیں گے۔ اشفاق بھائی کی حمایت کی وجہ سے مکان اشتیاق بھائی کے نام ہوگیا۔ انہیں بینک سے پیسے مل گئے جو انہوں نے پٹھان کو واپس کردیے۔ انہوں نے یہ

TAGPK.COM

عقلمندی کی کہ صرف اتنی ہی رقم بینک سے لی جتنی پٹھان کو دینی تھی اس کی وجہ سے ماہوار قسط میں بھی کچھ کمی ہوگئی تھی۔اب باقی تنخواہ میں ہی وہ کسی نہ کسی طرح گزارہ کر رہے تھے۔انیلہ بھابی کے چونچلے بھی کچھ کم ہو چکے تھے مگر مزاج ویسا ہی تھا حالانکہ انہیں ہمارا احسان مند ہونا چاہیے تھا کہ ہماری وجہ سے ہی ان کی سوداسے جان چھوٹی تھی۔اگلے کچھ سالوں میں اشتیاق بھائی کی تنخواہ بھی بڑھتی رہی اور ترقی بھی ہوگئی جس کی وجہ سے پانچ سال میں بینک کا قرضہ پورا ہوگیا اور مکان کے کاغذات بھی واپس مل گئے لیکن کاغذات اشتیاق بھائی کے پاس ہی تھے۔امی دو تین بار کہہ چکی تھیں کہ کاغذات واپس کرواور سب کے نام کرو مگر اشتیاق بھائی نے کہا کہ ہاں ہاں کرتا ہوں مگر ایسا کیا نہیں۔

ایک دن ہمارے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور اشفاق بھائی اچانک وفات پا گئے۔وہ اک رات سوئے تو سوتے میں ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔اسی کمرے میں سوئی ہی ان کی بیوی کو بھی نہ معلوم ہوسکا اور وہ سکون سے یہ دار فانی چھوڑ گئے۔ان کے ناگہانی انتقال کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ مکان فروخت کر دیا جائے اور سب کو ان کے حصے دے دیے جائیں کیوں کہ اب میرا اور امی وغیرہ کا یہ خیال تھا کہ اگر زیادہ دن گزر گئے تو اشتیاق بھائی کے دل میں چور بھی آسکتا ہے دراصل ہمیں ان سے زیادہ انیلہ بھابی سے خطرہ تھا کہ وہ ایسا کروا سکتی ہیں۔ان کے نام مکان کروانے کے بعد ہماری قانونی حیثیت کمزور تھی اگر وہ اکیلے ہی مکان کے دعوے دار بننا چاہتے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن اشتیاق بھائی مکان بیچنے پر راضی ہو گئے وہ مکان تو فروخت کرنے پر تیار تھے مگر اس میں سے شرعی حصے کے بجائے کل رقم کا نصف حصہ خود رکھنے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے کیوں کہ بقول ان کے انہوں نے بالائی منزل پر بہت رقم خرچ کی ہے اس لیے ان کا آدھا حصہ بنتا ہے۔ہم میں سے کوئی یہ بات ماننے پر راضی نہیں ہوا کیوں کہ اس صورت میں تو ہمارے ہاتھ کچھ خاص رقم نہ آتی۔ہم نے تو یہ پروگرام بنایا تھا کہ میں اپنا حصہ لینے کے بعد باقی رقم سے اپنے گھر کے برابر والا مکان جو برائے فروخت تھا۔اسے امی، بہن اور اشتیاق بھائی کی بیوہ کے مشترکہ نام سے خرید لوں گا اور یہ لوگ وہاں منتقل ہو جائیں گے۔امی اور طاہرہ باجی کی پنشن آتی تھی اس کے علاوہ میں کچھ رقم ماہانہ دے دیا کروں گا۔اس طرح ان کا بھی گزر بسر ہوتا رہے گا مگر اشتیاق بھائی تو ایک نئی بات

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

TAGPK.COM

نکال بیٹھے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ پٹی انہیں ان کی بیوی ہی نے پڑھائی ہوگی۔ اب تو ان کے بچے بھی سولہ سترہ سال کے ہو چکے تھے اور ان معاملات میں اپنی ماں سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ ان کے متعلق آئے دن ان کی آوارہ گردیوں کی خبر ملتی رہتی تھی جب کہ محلے کے کچھ لوگ انہیں سگریٹ نوشی بھی کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے مگر ماں باپ دونوں کی ہی آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور اپنے بچوں کے معاملے میں کوئی بات نہیں سنتے تھے۔

امی اور اشتیاق بھائی کی کئی بار تکرار ہو چکی تھی مگر اشتیاق بھائی تو جیسے ہمارا احسان بھول چکے تھے اور اپنی قانونی حیثیت سے ہمیں مجبور کر رہے تھے کہ ہم ان کی بات مان لیں جبکہ انیلہ بھابی تو کہہ چکی تھیں کہ یہ ہماری مہربانی ہے کہ تم لوگوں کو آدھا حصہ دے رہے ہیں ورنہ تو پورا مکان ہمارے ہی نام ہے۔ ان کی اس بات پر بھی اشتیاق بھائی کو کسی قسم کی شرم نہ محسوس ہوئی۔ ایسے ہی ناخوشگوار حالات میں چھ آٹھ ماہ اور گزر گئے اب اشتیاق بھائی نے امی اور ہم سب سے رسمی بات چیت بھی بند کر دی تھی۔ ہم سب بہت پریشان تھے کہ کیا کریں۔ میں نے ایک وکیل سے بھی مشورہ کیا تھا مگر اس نے مکمل بات سن کر کہا کہ آپ لوگ اپنے ہاتھ کٹوا چکے ہیں۔ آپ کو اپنے بھائی سے ایک حلف نامہ ضرور لکھوانا چاہیے تھا۔ وکیل کی اس بات نے ہمیں مایوس کر دیا تھا۔

ایک آدھ ماہ اور اسی طرح گزر گیا۔ ایک اتوار کی صبح میں سو رہا تھا کہ میری بیوی نے مجھے اٹھایا کہ طاہرہ باجی کا فون آیا ہے۔ اشتیاق بھائی کا سامان ٹرک میں رکھا جا رہا ہے۔ شاید وہ لوگ کہیں اور منتقل ہو رہے ہیں۔ میں جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر بنا ناشتا کیے امی کی طرف چلا گیا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ واقعی اشتیاق بھائی کا سامان ٹرک میں لد چکا ہے اور وہ امی کو بتا چکے تھے کہ وہ کراچی منتقل ہو رہے ہیں۔

''بھائی جان! آپ لوگ اس طرح بغیر اطلاع کے کہاں منتقل ہو رہے ہیں۔'' میں نے ان سے پوچھا۔

''ہاں یار بس بتانے کا موقع نہیں ملا۔ ہم کراچی جا رہے ہیں۔ میں اپنا تبادلہ کروا چکا ہوں۔'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''آپ وہاں کیا کرائے کے گھر میں رہیں گے اور اس مکان کا کیا ہوگا؟'' میں نے کچھ پریشان ہوتے ہوئے ان سے کہا۔

''میں نے وہاں اپنا مکان خرید لیا ہے۔'' وہ بولے۔

''اچھا..... آپ کے پاس اتنے پیسے تھے کہ آپ نے مکان خرید لیا؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''نہیں، میں نے یہ مکان فروخت کر دیا ہے اور اپنا آدھا حصہ اور بینک سے قرضہ لے کر مکان خریدا ہے۔'' انہوں نے میرے سر پر گویا بم پھاڑتے ہوئے کہا۔

''مکان فروخت کر دیا ہے؟ ہمیں بتائے بغیر اور اب یہ لوگ کہاں رہیں گے؟'' میں نے اب اپنے لہجے میں کچھ تیزی شامل کی۔

''مکان میرے نام تھا۔ مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ آدھے پیسے میں لے چکا ہوں۔ چھ ماہ بعد باقی آدھی رقم تم لوگوں کو مل جائے گی اور پھر یہ گھر مالک کے حوالے کر دینا۔'' ان کے لہجے میں غیریت اور بے حسی تھی۔

امی کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ اشتیاق بھائی کو بد دعائیں دینے لگیں۔ اسی وقت اشتیاق بھائی تنہا امی سے آخری ملاقات کے لیے آئے مگر امی نے منہ پھیر لیا جبکہ انیلہ بھابی اور ان کے دونوں بیٹوں نے دادی سے ملنا بھی ضروری نہ سمجھا۔

وہ تو چلے گئے مگر ہمارے لیے یہ فکر چھوڑ گئے کہ مکان بک چکا ہے تو پھر امی وغیرہ کہاں رہیں گی۔ میرے مکان میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ سب کو رکھ سکتا۔ کراچی منتقلی کے بعد ایک آدھ بار اشتیاق بھائی نے امی سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر امی نے ان سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہاں رہ رہے تھے انہوں نے تو خود نہیں بتایا مگر ہمیں کسی ذرائع سے معلوم ہو گیا تھا کہ انہوں نے میکنیم مال کے قریب واقع گیلانی ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے ایک چھوٹا مگر نیا گھر خریدا تھا جس کا رقبہ سو گز تھا۔ یہ رہائش کے حساب سے خاصہ بہتر علاقہ تھا۔ گیلانی ریلوے اسٹیشن مین لائن پر نہیں تھا بلکہ کراچی سرکلر ریلوے کا حصہ تھا جو اب بند ہو چکی تھی اور یہاں سے ایک ریل گاڑی بھی نہیں گزرتی تھی۔ اسی وجہ سے یہ ایک پرسکون علاقہ تھا۔

اشتیاق بھائی کی اس حرکت پر ہم سب ہی خون کے گھونٹ پی رہے تھے مگر ہم مجبور بھی تھے کہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ آدھا حصہ تو کھا ہی چکے تھے اگر بقیہ آدھا بھی کھا جاتے تو بھی کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب جو بھی ملنا تھا وہی مل جائے تو غنیمت تھا۔ میں نے ایک دن اشتیاق بھائی سے فون پر بات کی ان سے باقی رقم کی بابت دریافت کیا تو وہ کہنے لگے کہ میں خریدار سے معلوم کر کے بتا

TAGPK.COM

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050
گوجرہ	03337805247	پاک پتن	03006946782
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400
رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279
ڈسکہ	03C0-9463975	سمبڑیال	0333-8604306
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459

منڈی بہاؤالدین	03460827027		
سیالکوٹ	0524568440		
میرپور AK	03460397119		
اٹک نٹی	057210003		
دیپالپور	03004059957		
لیہ	03002373988		
قصبہ ڈنگہ	03083360600		
عارف والا	03008758799		
لورالائی	03023844266		
کوٹلہ ارب علی خان	03016299433		
جلالپور پیروالا	03338303131		
ہری پور	03321905703		
چکوال	03348761952		
وہوا	03346383400		
حافظ آباد	03006885976		
کوہاٹ	03325465062		
ایبٹ آباد	0992335847		
چوکی	03454678832		
مانسہرہ	0333-5021421		
کوٹ رادھا کشن	03004992290		
قصور	0300-6575020		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-53 نزد ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ نارتھ ناظم آباد کراچی فون: 3689531

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

TAGPK.COM

ہوں۔اس کے ایک ہفتہ بعد ایک صاحب نے مجھ سے فون پر رابطہ کیا اور بتایا کہ انہوں نے ہی ہمارا گھر خریدا ہے اور دو تین ماہ بعد وہ اشتیاق بھائی کو رقم کی ادائیگی کے بعد قبضہ لینے آئے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ رقم اشتیاق بھائی کو نہیں ہمیں ادا کرے تو وہ بولا کہ اشتیاق بھائی ہی قانونی مالک ہیں وہی رقم لے کر مکان میرے نام کریں گے میں آپ کو رقم دینے کا پابند نہیں ہوں۔ اپنے معاملات آپ اپنے بھائی سے طے کریں۔اس کی یہ باتیں سن کر مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ اب ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ مجھے اپنے سے زیادہ امی وغیرہ کی فکر تھی کیوں کہ ان کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔میں نے ایک بار پھر بذریعہ فون اشتیاق بھائی کو رقم کی بابت تاکید کی تو وہ مجھے تسلی دینے لگے کہ فکر نہ کرو جیسے ہی رقم ملے گی تم لوگوں تک پہنچ جائے گی۔

ایک دن ایک صاحب امی والے گھر پہنچے اور فرمانے لگے کہ یہ مکان میں خرید چکا ہوں اور دس بارہ دن میں یہ میرے نام ہو جائے گا اس لیے آپ لوگ اسے خالی کرنے کا ارادہ کرلیں۔امی نے فوراً مجھے فون کیا تو میں نے امی کے فون پر ہی ان صاحب سے بات کی۔ وہ وہی صاحب تھے جن سے پہلے بھی بات ہو چکی تھی۔انہوں نے بتایا کہ وہ کچھ اور رقم اشتیاق بھائی کو دے چکے ہیں اور اگلے ہفتے کاغذات بھی ان کے نام ہو جائیں گے۔اس آدمی کے جاتے ہی میں نے اشتیاق بھائی سے بات کی تو وہ بولے کہ رجسٹری کے لیے وہ حیدرآباد آئیں گے۔اسی وقت پیسے دے دیں گے۔میں ان کی بات سے مطمئن ہو گیا۔اب ہمیں فکر تھی کہ امی وغیرہ کہاں رہیں گے۔دس دن گزر گئے اشتیاق بھائی نہ خود آئے۔۔اور نہ میرا فون اٹینڈ کیا۔البتہ گیارہویں روز وہی صاحب آدھمکے اور بولے۔

''آپ لوگ گھر خالی کردیں یہ میرے نام ہو چکا ہے۔''

''گھر کیسے خالی کردیں۔باقی رقم کہاں ہے اور اشتیاق بھائی تو ابھی تک حیدرآباد آئے نہیں۔'' میں نے اس سے کہا۔

''وہ دو روز قبل آئے تھے اور یہ مکان میرے نام قانونی طور پر کروا کر واپس چلے گئے۔'' اس شخص نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''اور بقایا پیسے؟'' اب میں واقعی پریشان ہو چکا تھا۔

''وہ تو اشتیاق صاحب لے چکے ہیں ظاہر ہے مکمل رقم کے بغیر کون کسی کے نام مکان کرتا ہے؟'' اس نے مجھے بتایا۔

اب ہمیں اشتیاق بھائی کی بددیانتی پر کسی قسم کا کوئی شک نہ رہا تھا وہ سب کچھ ہی ہڑپ کرنے کے چکر میں تھے بلکہ ہڑپ کر چکے تھے۔

اس آدمی نے بڑی مشکل سے ہمیں ایک ہفتے کا وقت دیا کہ مکان خالی کردیں۔میں نے دفتر سے چھٹی لی اور امی کے گھر کا فالتو سامان بیچ دیا اور فی الحال یہ انتظام کیا کہ انہیں اپنے گھر لے آیا۔گھر میں بالکل جگہ نہیں تھی مگر میں انہیں سڑک پر تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔میں اور میری بیوی نے یہ سوچا تھا کہ فی الحال اپنے گھر کی چھت پر ایک بڑا کمرا اور باتھ روم بنوا کر ان لوگوں کو اوپر منتقل کردیں۔ امی اور طاہرہ باجی کے پاس اتنی رقم تھی کہ یہ تعمیرات مکمل ہو جاتیں۔جبکہ گزر بسر کے لیے دونوں کی پنشن سے کچھ گزارا ہو جاتا اور کچھ میں حصہ ڈال دیتا۔اس معاملے میں میری بیوی نے بہت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ورنہ ان معاملات میں عورتیں بہت تنگ دل ہوتی ہیں۔

اب اشتیاق بھائی میرا فون بھی نہیں سنتے تھے۔ایک بار انہوں نے بات کی تھی اور کہا تھا کہ وہ جلد رقم بھجوا دیں گے۔اس کے بعد نہ رقم آئی اور نہ ان سے بات ہو سکی۔اتنی بڑی رقم ہاتھ سے جا رہی تھی اس لیے میں نے ان سے ملاقات کا ارادہ باندھا کہ روبرو بات کرنی ضروری ہے شاید اسی طرح وہ پیسے دینے پر راضی ہو جائیں۔یہی سوچ کر میں ایک دن کراچی چلا آیا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کے گھر پہنچ گیا۔یہ اتوار کا دن تھا۔اشتیاق بھائی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔وہ پھر بھی کچھ خندہ پیشانی سے ملے جبکہ انیلہ بھابی کا رویہ خشک ہی تھا۔دونوں لڑکے بھی موجود نہیں تھے۔گھر میں ہر طرف مہنگی نئی چیزیں نظر آرہی تھیں۔جب ان سے رقم کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ابھی کچھ رقم باقی ہے۔مجھے ان کی بات پر یقین نہیں آیا کیوں کہ مکان خریدنے والا مجھے حقیقت سے آگاہ کر چکا تھا اور پھر مکمل رقم کے بغیر کون کاغذات نام کرتا ہے۔پھر میں نے اس رقم کا پوچھا جو وہ قبول چکے تھے کہ رجسٹری کے موقع پر لے چکے تھے وہ کہاں ہے اور وہ اسے دینے ہمارے پاس کیوں نہیں آئے تھے۔ان باتوں کے جواب میں وہ مجھے مطمئن نہ کر سکے۔ان کا جواب تھا کہ ابھی اس رقم کا چیک ان کے اکاؤنٹ میں منتقل نہیں ہوا ہے۔صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ان کی نیت خراب ہو چکی تھی اور وہ

ہم سب کا حصہ عملی طور پر ہڑپ کر چکے تھے۔ ان کے گھر کا نیا سامان اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ یہ وہی پیسا تھا جو انہیں حال ہی میں ملا تھا لیکن پھر بھی اس سامان وغیرہ کی خریداری میں اتنی رقم نہیں خرچ ہوسکتی تھی۔ لازمی طور پر انہوں نے اس بڑی رقم سے کچھ اور خریدا تھا یا قومی بچت یا بینک میں منافع کی غرض سے جمع کروادی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ہمارا اپنا سگا بھائی یوں اس طرح ہمیں دھوکا دے گا۔ انہوں نے تو اپنے مرحوم بھائی کی یتیم اولاد کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ ہوس زر نے ان سے ساری لحاظ و شرم چھین لی تھی۔ میں غصے میں لال پیلا ہوکر واپس حیدرآباد آگیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کس کمال ڈھٹائی سے وہ سب پیسا کھا گئے تھے۔ میں مالی طور پر خاصہ خوش حال تھا مگر یہ میرے اور دیگر لوگوں کے جائز پیسے تھے جو وہ دھوکا دے کر ہڑپ کر چکے تھے۔ گھر میں سب کو ان کی بے ایمانی اور بے حسی کی داستان سنائی تو امی انہیں کوسنے لگیں جبکہ طاہرہ باجی اور شبانہ بھابی خاموش ہی تھیں۔ اب ہم نے یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ عملی طور پر ہم اس پر فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ مجھے اپنے حصے کا اتنا افسوس نہیں تھا جتنا شبانہ بھابی اور ان کی بیٹی کا تھا۔ ان کا تو کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں تھا۔ وہ بہت صابر و شاکر عورت تھیں اور ہر حال میں خوش رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کو شاید ان کی یہی ادا پسند آئی تھی اس لیے اس نے مستقبل قریب میں ایسے اسباب پیدا کردیے کہ سب کی مشکلات دور ہوگئیں۔

ہوا یوں کہ اشفاق بھائی نے کسی اچھے وقت میں ایک پندرہ ہزار والا پرائز بونڈ اپنی بیٹی کے نام پر خریدا تھا اور اپنی بیوی سے کہا تھا کہ اسے کبھی فروخت نہیں کریں گے۔ یہ ضرور میری بیٹی کے لیے خوش بخت ثابت ہوگا۔ وہ پرائز بونڈ کب سے شبانہ بھابی کے پاس محفوظ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا نمبر اپنے پاس نوٹ کرلیا تھا اور انٹرنیٹ پر اس کی گزشتہ قرعہ اندازی چیک کی مگر انعام نہیں لگا تھا۔ مجھے کوئی چھوٹا انعام بھی نہ لگنے کا بہت افسوس ہوا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے یتیم بچی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر ان کی سن لی تھی۔ اگلی ہی قرعہ اندازی میں اس پرائز بونڈ پر پہلا انعام نکل آیا۔ اب شبانہ بھابی کے دن پھر گئے تھے۔ شاباش ہے انہیں کہ اتنی خطیر رقم ملنے کے بعد بھی وہ ہم سب لوگوں کا احسان نہیں بھولی تھیں۔ انہوں نے میرے مشورے کے مطابق میرے گھر والی گلی میں ہی ساٹھ لاکھ کا ایک مکان خرید لیا اور امی اور طاہرہ باجی کے ساتھ وہاں منتقل ہوگئیں۔ کچھ نئی اور ضروری چیزوں کی خریداری کے بعد باقی رقم انہوں نے قومی بچت کی اسکیم میں محفوظ کروادی۔ اب انہیں ماہانہ پیسے بھی ملنے لگے تھے اور رقم بھی محفوظ تھی۔ اب ان کا اور ان کی بیٹی کا مستقبل محفوظ ہوچکا تھا۔ ایک طرح سے ہم سب ہی سکون کی حالت میں آگئے تھے۔ کچھ عرصے بعد امی کا انتقال ہوگیا۔ اطلاع دینے کے باوجود اشتیاق بھائی ان کے جنازے تک میں شرکت نہ کرسکے حالانکہ ان کی وجہ سے ہم نے تدفین ظہر کے بجائے عصر کے بعد کی تھی تاکہ وہ پہنچ جائیں مگر شاید ان میں ہم سب کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ پیسے کی ہوس میں وہ سب رشتے ناتے فراموش کرچکے تھے۔

لیکن مکافات کا عمل بھی تو ایک حقیقت ہے۔ اچھے کے لیے اچھا اور برے کے ساتھ برا ہونا تو لازمی ہے کیوں کہ یہی قدرت کا قانون ہے جو بوگے وہی کاٹو گے۔ ایک دن میں ٹی وی دیکھ رہا تھا تو خبر چلی کہ حکومت کراچی سرکلر ریلوے کو از سر نو بحال کررہی ہے اور اس سلسلے میں سپریم کورٹ نے ریلوے لائن سمیت ریلوے کی زمین پر قائم تجاوزات کو مسمار کرنے کا حکم جاری کردیا تھا۔ اشتیاق بھائی کے مکان والی پوری گلی تجاوزات میں شامل تھی۔ اس گلی کے تمام بارہ گھر غیر قانونی تھے۔ بلڈر نے ریلوے اور بلدیہ کے عملے سے ساز باز کرکے ایک اضافی مکانات کی قطار تعمیر کردی تھی اور بیچ دی تھی۔ ان کے کاغذات اس وقت تو اصل ہی لگ رہے تھے کیونکہ وہاں کا سرکاری عملہ بھی ملا ہوا تھا مگر اب جب یہ ناجائز قرار دیے گئے تھے تو ان کے مالکان تصدیق کے لیے پہنچے تو کاغذات اور نقشوں میں اس گلی کا وجود ہی نہیں تھا۔ بدعنوان مافیا نے وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے جعلی فائلیں غائب کرکے اصل کاغذات رکھ دیے تھے۔ بدعنوان بلڈر اور سرکاری عملہ تو یہی سوچ رہا تھا کہ اب کبھی بھی کراچی سرکلر ریلوے بحال نہیں ہوگی اور نہ ان کی چوری پکڑی جائے گی۔ ویسے تو اس کارروائی سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ وہ تو اپنے پیسے کھرے کرکے نکل لیے تھے البتہ ان گھروں کے مالکان بہت پریشان تھے۔ ان کی زندگی بھر کی کمائی لٹ رہی تھی۔ وہ جاتے تو جاتے کہاں مگر سپریم کورٹ نے صاف حکم جاری کردیا کہ مالکان کو خریدنے سے پہلے تصدیق کرنی چاہیے تھی جو غیر قانونی ہے وہ غیر قانونی ہے۔ متاثرین کو چاہیے کہ انہیں پکڑیں جن کو پیسے دیے تھے لیکن کون ہاتھ آسکتا تھا۔ سب

TAGPK.COM

آسمان سے گر کر زمیں پر آ گئے تھے۔ اشتیاق بھائی کچھ بچت کرنے والے آدمی نہیں تھے۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے ہم بہن بھائیوں اور اپنی یتیم بھتیجی کا حق کھایا تھا۔ یہ سب ان کے سامنے آچکا تھا۔ مجبوراً انہیں ایک درمیانی درجے کے علاقے کے ایک چھوٹے سے دو کمروں کے فلیٹ میں کرایے پر رہنا پڑا۔ اتفاق سے انہی فلیٹس میں میرا ایک بچپن کا کلاس فیلو امجد بھی رہتا تھا جو کچھ عرصہ قبل کراچی منتقل ہو چکا تھا۔ وہ تو اشتیاق بھائی کو جانتا تھا مگر اشتیاق بھائی اسے نہیں جانتے تھے۔ امجد ہی کی زبانی مجھے ان کی ساری کہانی کا علم ہوا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ ان کے دونوں بیٹے بامشکل انٹر تک تعلیم حاصل کر پائے تھے اور آوارہ گردیوں میں مصروف تھے۔ ان کی ماں نے انہیں کھلی چھوٹ دے کر بگاڑ دیا تھا۔ جب پیسے کی ریل پیل تھی تو ان کے لچھن مکمل بگڑ چکے تھے۔ جب حرام لقمہ پر پرورش ہوگی تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ امجد نے مجھے کچھ عرصے بعد یہ بھی انکشاف کیا تھا کہ کراچی میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہونے کے کچھ ماہ بعد ہی ان کا بڑا بیٹا ایک نشے کے اڈے سے پکڑا گیا تھا۔ پولیس نے اس کو قتل فرائی کرنے کا خوف دلا کر اشتیاق بھائی سے دس لاکھ روپے اینٹھ لیے تھے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ انہوں نے باقی رقم کہاں خرچ کی تھی۔ انہوں نے جو دوسروں کا حق مار کر حرام حاصل کی تھی وہ رقم حرام میں ہی چلی گئی تھی۔ دونوں بیٹے کوئی کام کاج بھی نہیں کرتے تھے اور ماں باپ سے کھلم کھلا بدتمیزی کرتے تھے۔ اشتیاق بھائی ریٹائر ہونے والے تھے۔ اب وہ بے حد پریشان رہتے تھے جبکہ انیلہ بھابی کے بھی کس بل نکل چکے تھے۔ وہ مختلف امراض کا شکار ہو چکی تھیں۔ میں نے ان کے موجودہ حالات طاہرہ باجی اور شبانہ بھابی کو بتائے تو انہوں نے خوش ہونے کے بجائے دکھ کا اظہار کیا کہ دیکھو سگے گھر والوں کو دھوکا دے کر بھی ان کو کیا حاصل ہوا۔ اب کتنی مشکل میں ہیں۔ دونوں نے اشتیاق بھائی کے دھوکے اور رویے کے باوجود ان کے لیے دعا بھی کی۔

امجد سے ان کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ ان کے دونوں لڑکے کسی قابل نہیں تھے۔ بجائے اس کے کہ کوئی کام کاج کرتے الٹا ماں باپ سے ہی پیسوں کے طلب گار رہتے تھے اور آئے دن ماں باپ سے بدتمیزی بھی کرتے تھے۔ جس اولاد کے مستقبل کے لیے دونوں میاں بیوی نے دوسروں کا حق غصب کیا تھا وہی اولاد ان کے قابو میں نہ تھی۔

☆☆☆

ابھی امجد کا ہی فون بند ہوا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ آج ان کے بڑے بیٹے نے دونوں ماں باپ سے بہت زیادہ بدتمیزی کی تھی جو اس کو تاکید کر رہے تھے کہ اب وہ کچھ کام کاج کرے تاکہ گھر کے حالات بہتر ہوں۔ لڑکے نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرنے لگا جس پر اشتیاق بھائی نے طیش میں آکر اسے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ ان کا بیٹا نشے کی حالت میں تھا اس نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے باپ کے چہرے پر جوابی تھپڑ رسید کر دیا۔ اپنی اولاد کے ہاتھ تھپڑ کھا کر اشتیاق بھائی وہیں گر گئے جبکہ ان کا بیٹا وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اشتیاق بھائی کی بڑی مشکل سے طبیعت سنبھلی تھی۔ اپنے لاڈ و پیار سے اولاد کو بگاڑنے والی انیلہ بھابی اسی اولاد کو کوس رہی تھیں اور ان کے مرنے کی دعا کر رہی تھیں۔

یہ مکافات عمل تھا۔ اللہ تعالیٰ جب اولاد کی نعمت سے نوازتا ہے تو ان کی اچھی پرورش اور تربیت کا حکم بھی دیتا ہے اور لقمہ حلال کھلانے کی تاکید کرتا ہے مگر انسان نادان ہے۔ وہ اپنی موج مستی میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اشتیاق بھائی نے جنم دینے والی اور پال پوس کر قابل بنانے والی ماں کے ساتھ ساتھ بہن بھائیوں اور یتیم بھتیجی کا حق مارا تھا اور ماں کو ناراض کیا تھا حتیٰ کہ ان کی میت کو کندھا بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی باتوں میں آکر خود بھی زر پرست ہو گئے تھے۔ جن کے لیے یہ سب گناہ کیے تھے وہی اولاد انہیں مار رہی تھی اور یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ دونوں میاں بیوی کو آگے کیا کیا دیکھنا تھا یہ حالات کے تناظر میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے بعد ان کی اولاد ان کے مال کو بیدردی سے خرچ کر دے گی اور انہیں اپنے گناہوں کے پاداش میں تا قیامت قبر میں جلنا ہوگا۔

ہم سب بہن بھائی سکون سے زندگی گزار رہے ہیں اور اشتیاق بھائی کے لیے بھی دعا گو ہیں کہ اللہ ان کی مشکلات آسان فرمائے۔ جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا اس کا خمیازہ وہ بھگت رہے تھے جبکہ ہم اتنی بڑی ناانصافی کے باوجود خوش خرم تھے کیوں کہ ہمارا ایمان تھا کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے اور ہم اپنے صبر کا پھل پا چکے تھے۔ بے شک اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔

++

جہنم کے دن

محترم سید سرگزشت
السلام علیکم!

یہ سرگزشت میری ہے جسے میں نے عام سے انداز میں بیان کی ہے۔ اسے آپ میری نوسٹالجیا کہہ سکتے ہیں۔ اپنے بچپن اور جوانی کے حالات بیان کردیے ہیں۔ اگر سرگزشت کے معیار کی ہے تو شائع کرکے مجھے فون کردیں گے۔

ڈاکٹر شاہد عباسی
(کراچی)



مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اب کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوگا۔ پرانے لوگوں کی ارواح فضا میں گردش کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہے کوئی ہمیں اپنانے والا بس کوئی سقراط کا رول اپنا لیتا ہے اور کوئی فرعون بن جاتا ہے۔ آگے وہ لکھتے ہیں کہ گلیلیو نے امام حسینؓ کو رول ماڈل مان لیا۔ جس طرح حسینؓ نے یہ کہا تھا کہ ''مجھ جیسا شخص تجھ جیسے شخص کی کس طرح بیعت کرسکتا ہے اور پھر اس بیعت نہ کرنے پر وہ آخری سانس تک ڈٹے رہے۔''

گلیلیو نے بھی یہی کیا کہ ایک بار جب اس نے کہہ دیا کہ زمین گول ہے تو اس پر آخری سانس تک ڈٹا رہا۔ کلیسا کے حکم پر پہلے اس کی آنکھوں میں گول سلائیاں پھرا دی گئیں کہ اب یہ کیسے اس بارے پڑھ کر دیکھے گا۔ اندھا ہو جانے کے باوجود گلیلیو یہی کہتا رہا کہ جب چاند گول ہے اور باقی سیارے بھی گول ہیں تو زمین کیسے چپٹی ہوسکتی ہے جبکہ کلیسا کی دلیل تھی

TAGPK.COM

کہ انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ زمین چپٹی ہے۔ جب کلیسا اسے نہ روک سکا تو فیصلہ کیا گیا گلیلیو کو اس ٹاور سے نیچے پھینک دیا جائے جس پر چڑھ کر وہ دوربین کے ذریعے کائنات کا مطالعہ کرتا ہے۔ جس شخص کو یہ ذمے داری دی گئی تھی کہ وہ ٹاور سے گلیلیو کو زمین پر پھینکے وہ گلیلیو کا پرانا واقف کار تھا اور گلیلیو کے ساتھ ٹاور کی آخری حد تک آیا تھا۔ اس نے گلیلیو کو آخری دھکا دینے سے پہلے کہا ''اب بھی کہہ دے کہ زمین گول نہیں ہے تو میں تجھے بچالوں گا۔'' گلیلیو پہلے مسکرایا اور پھر کہا ''میں ایک بار نہیں لاکھ بار یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ زمین گول نہیں ہے لیکن میرے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ زمین تو گول ہے اور گول ہی رہے گی جملہ ختم ہوتے ہی گلیلیو کو آخری دھکا دے دیا گیا۔ اتنی بلندی سے گرنے کے بعد وہ کہاں زندہ رہ سکتا تھا۔ پورا مجمع یہ منظر دیکھتا رہا ان میں سے کچھ لوگ آخری سانس لیتے ہوئے گلیلیو کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں میں گلیلیو کی آواز آئی وہ ٹوٹتی ہوئی سانسوں میں کہہ رہا تھا ''زمین گول ہے اور گول ہی رہے گی۔''

یہ تمہید اس لیے ضروری تھی کہ آپ اس ہستی کو اچھی طرح سمجھ سکیں جس کی ایک ذات میں فرعون سے لے کر ہٹلر تک سما چکے تھے۔ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ تو کبھی نہیں کیا لیکن جب بھی گفتگو ہوتی تھی خدا کے لہجے میں ہوتی تھی۔

''اے کچھ پڑھ لیا کر یہ کھیل تیرے کام نہیں آئے گا۔'' وہ جب بھی گفتگو کا آغاز کرتی تھی اس کا فقرہ یہیں سے ہوتا تھا۔ ''شاہد کو دیکھ جس کا کام ہی صرف پڑھنا ہے۔''

''اپیا یہ بتاؤ میں کبھی فیل ہوا ہوں۔'' میں پلٹ کر سوال کرتا تھا۔

''اب تک تو اسکول کے اندر ہی امتحان ہوتے ہیں تو پاس ہو جاتا تھا اس وقت تجھے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا جب بورڈ کے امتحان آئیں گے'' اپیا کسی طرح اپنی شکست ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی تھیں۔ ''کل آئی تھیں بڑی خالہ نانا سے ملنے، ان کی زبان اپنے بیٹے کی تعریفیں کیے نہیں تھکتی تھیں، ایک تو ہے جس کی ہر ہفتہ اسکول سے کوئی نہ کوئی شکایت آتی ہے۔'' اپیا نے اپنے لیکچر کا دوسرا ورق پلٹا تھا۔

''شاہد کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کی ماں حیات ہیں۔''

''تو کیا یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے تجھے ماں کی طرح نہیں پالا۔'' اپیا کا پارہ اچانک آسمان کو چھونے لگتا تھا۔ ''سات سال بڑی ہوں تجھ سے، اگر اماں آج زندہ بھی ہوتیں تو اس طرح نہیں پال سکتی تھیں جس طرح میں نے تجھے پالا ہے۔'' اپیا کی آواز تیز ہو جاتی تھی۔

''یار اپیا یہ بتاؤ تم کب تک یہ طعنے دیتی رہو گی۔'' میں نے کہا تو ان کا خون نقطہ کھولاؤ سے بھی آگے بڑھ گیا۔

''یہ یار اپیا کیا ہوتا ہے۔'' وہ اچانک چیخنے کی حد کو چھونے لگی تھیں۔ ''کیا میں تمہارے برابر کی ہوں یا دوست ہوں تمہاری کہ مجھ سے اس طرح مخاطب ہو۔''

''سارا قصور اس چرچ کے اسکول کا ہے کہ بڑوں کی عزت کا کچھ خیال نہیں ہے۔'' اپیا نے کہا تھا۔

اب معاملہ میری برداشت سے تقریباً باہر ہونے لگا تھا۔ ''چرچ میں تو آپ نے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔'' میں نے کہا اور یوں محسوس ہوا جیسے میں نے زور سے ان کی چٹکی کاٹ لی ہو۔

''چرچ کے اسکول میں بھی، چرچ کے کالج میں بھی پڑھی ہوں لیکن تمہاری طرح نہ کبھی بدتمیز تھی نہ بدتمیز ہوں۔'' اپیا کا کہنا ہوتا تھا۔ پھر بورڈ کے امتحانوں کا زمانہ بھی آ گیا اب اپیا کے لیکچر طویل تر ہونے لگے تھے ''دیکھ لینا دو یا ایک پرچوں میں تو ضرور فیل ہوگا۔''

''وہ شاہد تمام پرچے پاس کرلے گا اور تیری وجہ سے خاندان میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔'' اپیا کی صبح اس سے شروع ہوتی تھی اور رات میں سونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک روز نانا کو کہنا پڑا تھا ''کیوں ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔'' اور اپیا منہ بسور کر کونے میں بیٹھ گئیں۔

''اسی کے بھلے کے لیے کہتی ہوں اگر شاہد سے ایک قدم بھی پیچھے رہ گیا تو آپا اس کی تعلیم کے خرچ سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔'' اپیا نے کونے میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''شاہد کا اس سے کیا مقابلہ'' نانا نے کہا تھا۔ ''وہ تو رٹو توتا ہے۔'' نانا نے کہا اور میرے خون میں اچانک کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

اب جب بھی اپیا مجھے شاہد کا طعنہ دیتیں تو میں کہتا ''اچھا آپ اس رٹو توتے کی بات کر رہی ہیں؟''

اور اپیا صرف مل کھا کر رہ جاتیں۔ نویں کے رزلٹ آئے تو میں اور شاہد دونوں چار چار پرچوں میں پاس تھے۔ مارکس شیٹ آئی تو میرے بہتر اشاریہ آٹھ فیصد مارکس تھے اور شاہد کی اماں نے ایک نئی ڈویژن کو جنم دیا تھا۔ نانا نے بڑی خالہ سے معلوم کیا، شاہد کے مارکس کے بارے میں تو

انہوں نے کہا: ''گڈ سیکنڈ ڈویژن ہے۔'' میری کزن فرحت جو اپیا کی ہم عمر تھی اور ان کی ہم جماعت تھی وہ پوچھ بیٹھی پھر بھی یہ کون سی ڈویژن ہوتی ہے'' اور بڑی خالہ نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا تھا: ''پچاس فیصد اور ساٹھ فیصد کے درمیان جو مارک ہوتے ہیں اسے گڈ سیکنڈ ڈویژن ہی کہتے ہیں۔''

بڑی خالہ کے جواب پر فرحت چپ نہ رہ سکی ''میں بی اے میں آگئی ہوں لیکن میں نے تو کبھی نہیں سنا اس ڈویژن کے بارے میں۔''

بڑے ماموں یعنی فرحت کے والد بھی وہیں موجود تھے وہ بھی خاموش نہ رہ سکے تھے۔ ''تم بی اے کی بات کر رہی ہو میں انجینئر بن گیا لیکن میرے کان کبھی اس ڈویژن سے پہلی بار روشناس ہوئے ہیں۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوئے: ''تمہاری پرنسپل کتنی رہی۔''

میں کچھ شرارت کے موڈ میں تھا اس لیے جواب تھا ''گڈ فرسٹ ڈویژن''۔

نانا اور فرحت سمیت سب نے قہقہہ لگایا۔

''یہ کون سی ڈویژن ہوتی ہے'' ماموں نے سوال کیا۔

''ساٹھ اور ستر فیصد کے درمیان تو فرسٹ ڈویژن ہوتی ہے، اگر ستر فیصد سے بات آگے نکل جائے تو وہ گڈ فرسٹ ڈویژن ہوتی ہے۔'' میں نے کہا اور کمرے میں موجود ہر شخص کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

''ابا آپ دیکھ رہے ہیں اس کی بدتمیزی۔'' بڑی خالہ نے اپنے باپ یعنی میرے نانا سے شکایت کی۔

''اس نے ایسا کیا کہہ دیا کہ آپ کو بدتمیزی محسوس ہوئی۔'' نانا کی بجائے ماموں نے سوال کیا تھا۔

''یہ آپ لوگوں کی تربیت ہے کہ جسے ان کا باپ نہیں پوچھتا آپ لوگوں نے انہیں سر چڑھا رکھا ہے۔'' بڑی خالہ کا وار ایسا تھا کہ اپیا خاموش نہ رہ سکیں۔

''ابا ہمیں پوچھتے ہیں یا نہیں یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔'' اپیا نے یہ کہنے میں دیر نہیں کی تھی۔ ''اللہ ہمارے نانا کی عمر دراز کرے اور دونوں ماموں کا سایہ سر پر رکھے، ہمیں کسی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے اپیا کے فقرے کے آخری لفظ سنے تھے لیکن فرحت آپا نے بعد میں بتایا کہ تم تو وہاں سے چلے گئے تھے مگر بابا اور پھوپو میں زوردار جھڑپ ہوئی تھی جس کی ابتدا بابا کے اس فقرہ سے ہوئی تھی: ''آپا آج تو آپ نے تمام حدیں کراس کر دیں'' اور پھوپو نے دادا سے کہا تھا: ''آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔''

پھوپو کا خیال تھا کہ دادا ان کی حمایت کریں یا کم سے کم تسلی ہی دیں گے لیکن دادا نے کہہ دیا کہ ''کیا غلط کہا ہے اس نے، اگر وہ نہ کہتا تو میں یہی فقرہ کہتا۔'' دادا کے اس فقرہ کے ساتھ ہی پھوپو اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں اور تیز لہجے میں بولیں: ''اب میں اس گھر میں جب تک قدم نہیں رکھوں گی جب تک یہ تینوں بلکہ چاروں میرے گھر آکر مجھ سے معافی نہیں مانگ لیں۔'' انہوں نے یہ کہا اور پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں۔

''چاروں کون۔''

''ایک تو آپ بہن بھائی اور ایک میں اور میرے ابا۔'' فرحت آپا نے کہا تھا۔

''میں تو کبھی بھی معافی نہیں مانگوں گا۔'' میں نے کہا تو فرحت آپا بولیں: ''تمہاری بہن نے بھی یہی فقرہ کہا تھا۔''

''اب سارا معاملہ تمہارا اور تمہارے ابا کا ہے۔'' میں نے کہا اور فرحت آپا ہنس دی تھیں۔

''ہم نے تمہاری حمایت کی اور تم ہم باپ بیٹی کا مذاق اڑا رہے ہو۔'' فرحت آپا نے کہا تو میں مسکرا دیا تھا۔

نویں جماعت میں بہتر فیصد نمبر لانے پر کچھ دن تک اپیا کی فرعونیت میں کچھ فرق پڑا تھا لیکن ان کی خدائی میں زیادہ فرق شاہد کے اکیاون فیصد مارکس سے پڑا تھا کچھ دن کی خاموشی کے بعد ان کی طعنہ زنی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ اب ان کا نشانہ ریڈیو بھی تھا۔ اسکول میں بزم طلبہ کے انچارج اسکول کے سالانہ فنکشن میں آئے تھے جس کی کمپیئرنگ میرے ذمے تھی۔ پروگرام کے دوران ہی وہ میرے پاس آئے تھے۔

''تم بزم طلبہ میں کیوں حصہ نہیں لیتے۔'' انہوں نے سوال کیا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ بزم طلبہ میں کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ حصہ لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایسی کوئی بھی پابندی نہیں۔ صرف ریڈیو وائس ہونی چاہیے اور تلفظ بہتر ہو تو کام چل جاتا ہے اور تم پر تو کسی کام کی ضرورت بھی نہیں ہے، قدرت نے تمہیں ریڈیو وائس دی ہے اور تلفظ تمہارا بہتر ہے۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''میں اگلے روز ہی ریڈیو پہنچ گیا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ نانا کے گھر اور اسکول کے درمیان ریڈیو پاکستان آتا تھا۔ میں ٹرام کے ذریعے اسکول جاتا تھا اور واپسی بھی ٹرام سے ہی ہوتی تھی۔ گھر آکر میں نے سب سے پہلے اپیا کو اطلاع دی تھی۔

TAGPK.COM

''یہ تو ایک اور بکری پال رہا ہے۔'' اپیا نے خوشی کے اظہار کی بجائے طنز کیا تھا۔

ریڈیو پر پہلا پروگرام ریکارڈ کروا کر آیا تب بھی میں نے اپیا کو ہی بتایا تھا مگر اپیا نے آدھے گھنٹے میں ہر ایک کو یہ خبر سنا دی اور جب بزم طلبا شروع ہوا تو پورا گھر ریڈیو کے گرد جمع تھا۔

ہر کسی نے پروگرام کی تعریف کی سوائے اپیا کے۔''یہ تیری آواز کیسے بھاری ہوگئی تھی کوئی معجون دیا تھا ریڈیو والوں نے۔'' اپیا کا سوال تھا۔

''مائک کے سامنے بیس میں بولنا پڑتا ہے آپ نے کبھی ریڈیو پروگرام کیا ہو تو معلوم ہو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ضرورت نہیں پندرہ روپے کے لیے لوگوں کی خوشامد کرنے کی۔'' اپیا کا جواب تھا۔

''وہ کیا کہتے ہیں فرحت آپا ناچ نہ جانے آگے کیا ہے۔'' اس وقت ہم تینوں ہی وہاں تھے۔''ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا'' فرحت آپا نے محاورہ مکمل کیا اور اپیا اسے گھور کر رہ گئیں۔

''تم بھی فرحت بہت بڑا لونا ہو۔'' اپیا نے میری حمایت میں بولتے پر فرحت آپا پر چڑھائی کر دی تھی لیکن انہوں نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ دن گزرتے رہے اپیا اور فرحت نے گھر پر ٹیوشن دینی شروع کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے اسٹوڈنٹ کی تعداد اتنی بڑھی کہ انہیں اپنا ٹیوشن سینٹر چھت پر منتقل کرنا پڑا تھا۔ اپیا اور فرحت آپا کا اعلان تھا کہ وہ اپنی کار میں کالج جائیں گی مجھے اس میں اپنا فائدہ یہ نظر آ رہا تھا کہ مجھے وہ اسکول میں اتار دیں گی اور مجھے جو نرام میں بھاگ کر چڑھنے اور پھر جہانگیر روڈ سے پیدل اسکول جانے سے نجات ملنے والی تھی... مگر اب بڑی خالہ کے ایک نئے پروپیگنڈے کا سامنا تھا، تم دیکھنا اس بار شاہد اگلی پچھلی تمام کسر نکال دے گا۔ بڑی خالہ احتجاج کرتے ہوئے گئی تھیں لیکن ہفتہ نہیں ہوا کہ وہ پہلے کی طرح آنا شروع ہو گئی تھیں اور اپیا ان کے پروپیگنڈے میں فوراً آ جاتی تھیں۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ ایک بار تکہ چل گیا تو تیری توجہ اور ہٹ گئی ہے پڑھائی پر سے۔ چلو مان لیا کہ اسپورٹس آئندہ زندگی میں کچھ کام آ جائے گا لیکن یہ ریڈیو تو محض وقت کا ضیاع ہے۔'' میں ان کے لیکچروں کو ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا آخر قدرت نے دو کان دیئے کس لیے تھے۔ دو کان ہونے کا بہترین استعمال جو ہو سکتا تھا وہ میں کر رہا تھا۔

اسکول کی ہاکی ٹیم کا کپتان ہونے کی وجہ سے مجھے سب سے پہلے جانا ہوتا تھا اور سب سے آخر میں نکلتا تھا۔ انٹر اسکول ہوا تو ہمارا اسکول فائنل جیت گیا اب کراچی کے اسکولوں کی ٹیم کی باری تھی میں اس میں بھی سلیکٹ ہوا۔ بڑی خالہ کے لیے ہضم کرنا ناممکن تھا وہ اور ان کے شوہر اسکول پہنچ گئے۔ پرنسپل صاحب نے بڑے غور سے ان کی فریاد سنی اور کہا۔''جو لڑکا اسکول کی ٹیم میں نہ آ سکا وہ بورڈ کی ٹیم میں کیسے آ سکتا ہے۔''

''آپ اپنے تعلقات استعمال کر کے شاہد کو ٹیم میں لا سکتے ہیں۔'' بڑی خالہ نے کہا تھا۔

''بی بی آپ غلط جگہ آ گئی ہیں۔'' پرنسپل صاحب کا لہجہ نرم تھا۔

''آپ ہمیں سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ ہم آپ کے اسکول سے اپنا بیٹا ہٹا کر کسی اور اسکول میں داخلہ کروا دیں۔'' بڑی خالہ کے شوہر نے کہا تھا۔

''سال کے آخر میں اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اپنے بچے کے ساتھ ظلم کریں گے یاد رکھیں کہ یہ اس کا میٹرک کا سال ہے اور اس کا رجسٹریشن ہمارے اسکول سے گیا ہے۔''

''اس کا تو وعدہ کر لیں کہ اسے کرکٹ کی ٹیم میں تو شامل کروا دیں گے۔'' بڑی خالہ نے کہا تھا''کرکٹ وہ بہت اچھی کھیلتا ہے۔''

بڑی خالہ کا فتوہ ختم ہوا تو گیمز انچارج جسے پرنسپل صاحب نے بلوا لیا تھا انہوں نے کہا تھا۔''یہ بھی آپ کی غلط فہمی ہے وہ کرکٹ میں بھی آپ کے بیٹے سے بہتر ہے۔'' مجھے گیمز انچارج نے یہ بتایا تو میں نے اپیا کو یہ بتا دیا۔

''اب یہ عورت میرے ہاتھوں سے بچ نہیں پائے گی۔'' اپیا بھرپور طیش میں تھی۔

''تمہیں کیا ضرورت ہے اس کے منہ لگنے کی اس کی قسمت میں ذلت لکھی تھی وہ ذلیل ہو کر آ گئی۔'' فرحت آپا کے بڑے بھائی جسے ہم سب بھائی جان کہتے ہیں سمجھانے کی کوشش کی اور اپیا مان گئیں۔ ٹیوشن شروع کرنے کے چھ ماہ میں اپیا اور فرحت آپا نے اتنے پیسے جمع کر لیے تھے کہ ان کی گاڑی خریدنے کا خواب پورا ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ ریڈیو پر میری مصروفیت اس طرح بڑھی کہ بزم طلبہ کے ساتھ سائنس لیگزن بھی مجھے ملنے لگا پھر یہ ہوا کہ بزم طلبہ میں خطوط کے جوابات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جس کا اسکرپٹ بھی میرے ذمے تھا اور اسکرپٹ لکھنے کے تیس روپے الگ ملتے یعنی اب ہر پروگرام کے پچاس

TAGPK.COM

روپے ملتے تھے۔ آج شاید پچاس روپے کوئی حیثیت نہیں رکھتے لیکن تب پچاس روپے ایک حیثیت رکھتے تھے، جب مہینا بھر کام کرنے والوں کی تنخواہ چند سو روپوں سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھی۔ اب میں ہفتہ میں تین اور مہینے میں بارہ پروگرام کرنے لگا تھا جن میں بزم طلبہ کے علاوہ سائنس میگزین اور کچھ اور پروگرام شامل تھے... پھر جب شہر نامہ کا پروگرام ملا تو خاندان میں عجب طرح کی ایک دھمال تھی مگر اپیا اس کی بھی شاکی رہی تھیں۔ پہلے یہ طے کرلے کہ تجھے مستقبل میں کیا بننا ہے، ان کا کہنا تھا۔

بڑی خالہ اسے ایک دوسرا رنگ دیتی رہی تھیں۔ ''شاہد فضول کاموں میں وقت ضائع نہیں کرتا اس کا کام تو صرف پڑھنا ہے۔'' وہ ہر بار یہاں سے اپنی بات شروع کرتی تھیں۔ جب میرا سلیکشن بورڈ کی ٹیم میں ہوگیا اور مجھے انٹر بورڈ کے لیے لاہور جانے کے لیے کہا گیا تو اپیا نے نیا کہرام کھڑا کردیا۔ یہ ضروری تھا کہ امتحانوں سے مہینا بھر پہلے یہ ٹورنامنٹ کروائے جائیں لیکن وہ انٹر بورڈ کو تو راضی کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ گھر پر بھی کوئی ان کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نانا کی دی ہوئی نصیحتوں کے ساتھ میں لاہور گیا۔ تقریباً روز ہی رات میں فون پر اپیا کے لیکچر سنتا۔ ہر بار ایک ہی سوال ہوتا تھا: ''کب آرہے ہو، امتحان سر پر ہیں۔''

میں ہر بار یہی کہتا: ''دعا کریں ہماری ٹیم فائنل کھیلے بلکہ فائنل جیت کر آئے۔'' میں یہ کہتا اور اپیا کا کہنا ہوتا کہ کیا ٹس جائے گا اگر فائنل جیت بھی گئے۔ ان کی کاؤنٹنگ جاری رہتی تھی، امتحان میں اٹھارہ دن رہ گئے.. پھر اگلے روز کہتیں صرف سترہ دن رہ گئے ہیں۔ ''میرا جواب ہوتا: ''اپیا میں یہاں بھی پڑھ رہا ہوں۔'' وہ کہتیں: ''جب تو یہاں پڑھنے سے بھاگتا تھا تو وہاں کیا پڑھ رہا ہوگا'' اور مجھے بتانا پڑتا کہ میں نانا کے دوست کے گھر رہ رہا ہوں اور ان کی بڑی بیٹی رابعہ روز مجھے شام میں پڑھاتی ہیں۔ تو اپیا کہتیں: ''کیا خاک پڑھاتی ہوگی اور تو خاک پڑھتا ہوگا۔''

اس دوران مجھے باقی خبریں بھی ملتی رہی تھیں۔ اپیا اور فرحت آپا نے کار خرید لی تھی۔ کچھ رقم جو کم پڑ رہی تھی وہ نانا نے بطور ادھار دی تھی لیکن دونوں ماموں نے بھی حصہ ڈالا تھا، وہ ادھار نہیں تھا۔ نانا نے کہا تھا کار خرید لینا کافی نہیں اس کے پیٹرول کا خرچ بھی تو ہوگا لیکن اپیا نے اس کا حل پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ خاندان کی عورتوں کو کہیں جانا ہوتا تو اپیا کہتیں۔ ''منکی فل کروادیں میں لے جاؤں گی۔''

ماموں کی بیویوں نے اعتراض کیا لیکن دونوں ماموں اپیا کی طرف تھے کہ تم ٹیکسی منگواتی ہو۔ یہاں سے تو تم ساتھ جاؤ گی اور ڈرائیور بھی انتظار میں ہوگا پھر تمہیں اعتراض کس بات پر ہے۔ ''پھر جب ڈرائیور گریجویٹ بھی ہو'' فرحت آپا نے حمایت کی تھی۔

''میں لاہور سے واپس آیا تو اپیا نے نئی بات شروع کردی'' مجھے یقین ہوتا جارہا ہے کہ بڑی خالہ صحیح کہہ رہی ہیں کہ شاہد اب کور کرلے گا۔

''وہ اکیس فیصد کم ہے کتنا کور کرے گا۔'' فرحت آپا نے میری حمایت میں کمر کس لی تھی۔

''تم جیسے لوگ ہی خراب کرتے ہو۔'' اپیا نے کہا اور فرحت آپا پیچھے نہیں رہیں۔

''تمہیں اللہ نے زمین پر اتارا ہی ٹینشن دینے کے لیے ہے۔''

میٹرک کے امتحانات شروع ہوئے پہلا پرچہ اردو کا تھا جو بہترین ہوا اور میری خود اعتمادی میں اضافہ بھی ہوا۔ اب اپیا نے ایک اور باب کھول لیا۔ ''کس کالج میں داخلہ لوگے۔''

جب میں نے بتایا کہ نیشنل کالج میں تو کہا وہاں داخلہ کے لیے فرسٹ ڈویژن ضروری ہے اور تمہاری تو آنی نہیں۔''

ایک جانب اپیا کا یہ رویہ تھا تو دوسری جانب بڑی خالہ کا ورد جاری تھا کہ ان کے بیٹے کے پاس کالج کے ٹیچرز آرہے ہیں کہ ہمارے کالج میں داخلہ لینا۔ یہ جھوٹ اس لیے بنایا گیا تھا کہ میں نے نانا سے تذکرہ کیا تھا کہ جب ہمارا اسکول فائنل کھیل رہا تھا تو نیشنل کالج کے وائس پرنسپل نے مجھے اپنے کالج میں داخلہ لینے کے لیے کہا تھا۔ میں تو خود یہی چاہتا تھا کیونکہ نیشنل کالج کی ہاکی ٹیم بہت بہتر تھی اور وہاں سے کھیلنے کا مطلب یہی تھا کہ میں بہت سے ان لوگوں کی نظروں میں آجاؤں جو میچز کراتے ہیں۔ نانا نے اس کا ذکر بیٹی سے کردیا اور بڑی خالہ نے نیا جھوٹ تراش لیا۔

میٹرک کا رزلٹ آیا تو بڑی خالہ نے اپنی توپوں میں نیا بارود ڈالا۔ شاہد کی پرسنٹیج اکیاون سے بڑھ کر باون ہوگئی اور میری بہتر سے کم ہوکر ستر ہوگئی۔ خالہ کا زور اپنے بیٹے کی ایک فیصد بڑھنے سے زیادہ میری پرسنٹیج کم ہونے پر ہوتی تھی۔

نیشنل کالج میں شاہد نے بھی فارم بھرا لیکن اس کا داخلہ نہ ہوسکا، میرا داخلہ البتہ اسپورٹس کی بنیاد پر ہوگیا تھا۔ وائس پرنسپل جو گیمز انچارج بھی تھے ان کے پاس جب میں پہنچا تو انہوں نے سوال کیا، میٹرک کرلیا اور میں نے اثبات میں

جواب دیا۔ انہوں نے چپراسی کو بلوانے کے لیے بیل بجائی جب چپراسی آیا تو انہوں نے کہا ایک فارم لاؤ ایڈمیشن کا۔

میں نے کہا میں فارم بھر کر لایا ہوں۔ مکرم صاحب نے ایک نظر فارم پر ڈالی، تم نے تو تصویریں بھی لگوا رکھی ہیں اور میں ہنس دیا۔

''سر فارم میں لکھا تھا۔'' میں نے کہا اور کمرے میں موجود تمام لوگ مسکرا دیئے تھے۔ پھر انہوں نے دراز کھولی اور فل فری شپ کی مہر نکال کر میرے فارم پر لگا دی۔

ایک روز پہلے جب میں فارم لینے آیا تھا میں نے فیس کا پتا کیا تھا اور نانا نے بغیر کوئی سوال کیے مجھے اتنی ہی رقم دے دی تھی اب اسپورٹس کی بنیاد پر ایڈمیشن ہوا تو میں نے بقایا رقم نانا کو واپس کرنی چاہی مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ''یہ تمہاری محنت کا انعام ہے۔''

''بگاڑیں..... بگاڑیں۔'' اپیا نے کہا۔

''کم از کم آج کے دن تو خاموش رہو۔'' نانا کا انداز ڈانٹنے والا تھا اور اپیا نانا کی ناراضگی محسوس کرتے ہوئے خاموش ہو گئیں مگر اس وقت تک جب ہم اپنے کمرے میں نہیں پہنچ گئے۔

اپیا اور فرحت آپا نے جامعہ میں داخلہ لیا تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی تھی۔ اپیا اور فرحت آپا یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھے اتار دیتی تھیں۔ فرحت آپا ڈرائیونگ سیٹ پر ہوتیں تو کالج کے گیٹ تک چھوڑ دیتی تھیں۔ اپیا البتہ سڑک کے اس طرف اتارتی تھیں جہاں مجھے سڑک کراس کر کے پیدل جانا ہوتا تھا۔ ایک روز جب سویرے سے ہی بارش ہو رہی تھی تو اپیا نے کار روک کر مجھے اترنے کے لیے کہا تو فرحت آپا نے کہا۔ ''ظالم نہ بنو موسلا دھار بارش ہو رہی ہے گیٹ تک ہی چھوڑ دو۔''

''چھوڑ دیتی ہوں ہمدرد دواخانہ۔'' اپیا کا جواب تھا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے کار آگے بڑھا دی۔ میں نے گیٹ پر اترتے ہوئے شکریہ کہا تو اپیا نے کہا میرا نہیں ہمدرد دواخانہ کو شکریہ کہو۔ میں نے فرحت آپا کو تھینک یو کہا اور فرحت آپا جواب میں مسکرا دی تھیں۔

فرحت آپا اور اپیا کی دوستی کی مثالیں دی جاتی تھیں مگر اچانک ان دونوں میں ناچاقی ہو گئی۔ اپیا نے فرحت آپا کو چھوڑ کر اکیلے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ اپیا نے اکیلے ہی تمام لڑکیوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ میں نے کئی بار ناچاقی کی وجہ جاننی چاہی لیکن ان دونوں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ پندرہ روز اسی طرح گزر گئے پھر ایک رات اپیا نے ہی زبان کھولی۔ ''ناچاقی نہیں صرف ناراضگی ہے۔''

''پھر وہی بتا دیں ناراضگی کس بات پر ہے۔'' میں نے سوال کیا۔

''یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں تم ابھی چھوٹے ہو۔'' اپیا نے کہا تھا۔

''جب آپ کی عمر تک پہنچوں گا تو آپ اس وقت بھی مجھ سے سات برس بڑی ہوں گی۔''

''تمہیں یاد ہے بھائی جان کا ایک دوست آیا تھا امریکا سے۔'' اپیا نے کہا اور مجھے اسے یاد کرنے میں دیر نہیں لگی۔

''وہ جسے آپ نے گھونچو کہا تھا۔'' میں نے انہیں یاد دلایا اور اپیا مسکرا دی تھیں۔

''وہ گھونچو چند دن قبل آیا تھا یونیورسٹی مجھ سے ملنے۔'' اپیا نے کہا تو میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

''اس نے مجھے پرپوز کر دیا۔''

''یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔'' میں نے کہا اور اپیا مسکرا دیں۔

میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے کسی بڑے کو بھیجے تو ان سے بات ہو گی۔ اس پر اس نے کہا میری والدہ کی آپ کی مامی سے ایک شادی میں ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے آپ کے رشتہ کے حوالہ سے بات بھی کی تھی... مگر انہوں نے کہا وہ تو میری بہو بنے گی اور بات شروع ہونے سے پہلے ہی انہوں نے ختم کر دی تھی۔

وہ میرے ساتھ کیفے ٹیریا میں تھا کہ فرحت وہاں آ گئی۔ اسے وہاں دیکھ کر فرحت کو حیرت ہوئی تھی پھر اس نے براہِ راست اس سے سوال کر دیا۔ ''آپ یہاں کیسے آ گئے۔'' فرحت نے کہا تھا۔

''میں نے اسے گھونچو سمجھا تھا لیکن یہ گھونچو نہیں ہے۔'' اپیا نے کہا۔

''یہ کیسے ثابت ہوا۔'' میرا سوال تھا۔

اس نے ایک لمحہ سوچا اور پھر فرحت کو جواب دیا تھا۔ ''جو بات آپ کی امی نے ختم کر دی تھی میں اسے آگے بڑھانے آیا ہوں۔'' اس نے کہا تھا اور فرحت کا چہرہ اتر گیا تھا۔

''آپ اس سے شادی کی خواہش رکھتے ہیں جو آپ کے پیچھے آپ کو گھونچو کہتی ہے۔'' فرحت نے کہا تھا۔

''یہ شادی سے پہلے مجھے کچھ بھی کہے لیکن میں آپ

TAGPK.COM

سے شادی نہیں کروں گا جس کی تجویز آپ کی امی نے دی تھی۔'' گھونچو یعنی ارشد نے کہا تھا اور فرحت کا چہرہ مزید اتر گیا تھا۔

''آپ کسی دن میرے نانا سے آکر بات کریں۔'' میں نے کہا تھا اور ارشد سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

''اتوار کا دن صحیح رہے گا۔'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''آپ مجھے اپنا موبائل نمبر دے دیں میں نانا سے بات کر کے انظام کر دوں گی۔'' میں نے اس سے کہا تھا اور اس نے مجھے اپنا مقامی نمبر دے دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے آیا ہوں اس لیے تمام نمبرز امریکا کے ہیں۔ یہ نمبر تو میرے کزن کا ہے جس کے گھر ہمارا قیام ہے۔ ارشد نے بتایا تھا۔

رات میں اپیا نے مجھے یہ بات بتائی اور رات میں ہی اس نے نانا سے بھی بات کر لی پھر میرے سامنے اپیا نے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری جانب سے فون اٹھایا گیا تو اپیا نے اپنا تعارف کروایا۔

''میں گھونچو کی والدہ بول رہی ہوں۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''آنی آپ بھی نا۔'' اپیا نے شرمائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ اس وقت اپیا مجھے زندگی میں پہلی بار اچھی لگی تھیں۔

''تم نے تو اب کہا ہے مجھے تو جب یہ جھولے میں تھا تب سے گھونچو لگتا ہے۔'' ارشد کی والدہ نے کہا تھا۔

''بہت اچھی گزرے گی آپ کے ساتھ۔'' اپیا نے کہا تھا۔

''ارشد بتا رہا تھا کہ تم نے اپنے نانا سے بات کرنے کا کہا تھا۔'' ارشد کی والدہ نے کہا تھا۔

''میں نے نانا سے بات کر لی ہے انہوں نے کہا ہے اتوار کو ڈنر پر بلوا لو۔'' اپیا نے کہا تھا۔

''تم نے اپنی مامی کی بات بتائی انہیں۔'' ارشد کی والدہ کا سوال تھا۔

''کچھ میں نے بتا دی ہیں کچھ آپ بتا دیجیے گا۔'' اپیا نے کہا۔

''نانا کا ردعمل کیا تھا۔'' ارشد کی والدہ نے کہا۔

''نانا کے کمرے میں میٹنگ چل رہی ہے اس میں دونوں ماموں اپنی بیویوں کے ساتھ موجود ہیں۔''

پھر وہ میٹنگ رات دو بجے تک چلتی رہی۔ تقریباً ڈھائی بجے کے قریب ہمارے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو نانا ابو کھڑے تھے۔

''ابھی تو نہیں صبح ارشد کو فون کر دینا کہ وہ اتوار کو ڈنر پر آئیں لیکن ہمارے گھر نہیں بلکہ ہم انہیں کسی اور جگہ مدعو کریں گے۔''

''کس جگہ۔'' اپیا نے کہا۔

''کوئی بھی جگہ ہو سکتی ہے کوئی ہوٹل بھی ہو سکتا ہے یا تمہارے والد کا گھر بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہوٹل پر مجھے اعتراض نہیں لیکن اس گھر پر ہم کبھی نہیں جائیں گے جس نے ہمیں کسی تہوار پر بھی یاد نہیں کیا۔''

''سیما ضد نہ کرو۔'' نانا کا لہجہ سخت تھا۔ ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمہارے باپ نے اپنی بیوی کو اس وقت چھوڑ دیا تھا جب وہ ایک جان لیوا مرض میں مبتلا تھی لیکن یہ نہیں مانوں گا کہ انہوں نے تم دونوں کو تہواروں پر بھی یاد نہیں کیا۔'' نانا نے کہا تھا۔

''کیا عید اور بقرعید پر دو جوڑے بھجوانے سے انہوں نے تمام فرائض ادا کر دیے نہیں نانا نہیں۔'' اپیا نے اصرار کیا۔

''حالات کی نزاکت کو سمجھو۔'' نانا نے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

''میرے دونوں بیٹے اور ان کی بیویاں ارشد اور اس کی امی کی میزبانی کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' نانا نے کہا تھا۔

''مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک چلے جائیں گے۔'' اپیا نے تقریباً رونے والے انداز میں کہا تھا۔

''اس لیے میرے پاس آپشن محدود تھے اور ہیں۔'' نانا نے کہا تھا۔

''آپ پہلے ان سے بات کر لیں۔'' اپیا نے کہا تھا۔

''میں نے فون کیا تھا۔'' نانا نے کہا اور ہم سب بھائی بہن نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''کیا جواب تھا ان کا۔'' اپیا نے سوال کیا تھا۔

''تمہارے والد اس وقت گھر پر نہیں تھے اس کی بیوی سے بات ہوئی تھی۔ وہ تو اس وقت آنے کے لیے تیار تھیں لیکن میں نے کہا جب تمہارا شوہر آ جائے تو اس سے مشورہ کر کے کسی فیصلہ پر پہنچنا۔''

''اب سے ایک گھنٹا پہلے تمہارے والد کا بھی فون آیا تھا۔''

TAGPK.COM

''کیا کہا انہوں نے۔'' میں پہلی بار اس گفتگو میں شامل ہوا تھا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ جن فرائض سے میں غفلت برتتا رہا، اگر اب قدرت نے اس کی تلافی کرنے کا موقع دیا ہے تو میں دل و جان سے تیار ہوں۔ آپ ارشد اور اس کے گھر والوں کو میرے گھر مدعو کر لیں مجھ سے جو بھی ہو سکے گا میں ضرور کروں گا۔'' نانا نے کہا تھا۔

''میں ایک بار ماموں اور ان کے گھر والوں سے بات کر سکتی ہوں۔'' اپیا نے کہا تھا۔

''اتنی دیر سے میں کیا کر رہا تھا۔'' نانا نے سوال کے جواب میں سوال کیا اور اپیا خاموش ہو گئیں۔ اپیا کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا بات ان کی سمجھ میں آتی جا رہی ہے۔

اگلے روز صبح والد صاحب اور ان کے ساتھ ان کی دوسری بیوی آئے اور ہم نے جورات میں پیکنگ کر لی تھی وہ ہم نے ان کی کار میں منتقل کی اور ہم اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔ وہاں ہمارے تین بہن بھائی تھے اور اگلے دو گھنٹوں میں اپیا بھی اس سے گھل مل گئیں۔ اجنبیت دور ہوتی گئی۔

اپیا نے ارشد بھائی کو فون کر دیا اور ان سے تبدیل شدہ ایڈریس بھی شیئر کر لیا۔

اتوار کے دن ایک سادہ سی تقریب ہوئی جس میں منگنی کی رسم ادا ہوئی اور اسی وقت جمعہ کو نکاح کی تقریب ہونا قرار پائی۔ دونوں ماموں اور ان کی بیویوں نے بچوں سمیت اس تقریب میں شرکت نہیں کی اور نہ ہی نکاح میں شریک ہوئے جو ایک مقامی ہوٹل میں ہوئی تھی۔ نانا البتہ دونوں تقاریب میں پیش پیش تھے۔ نکاح کے اگلے روز ارشد بھائی اپنی بیوی کے ساتھ نانا کے گھر گئے تھے لیکن اپیا کے بقول ان سب کا رویہ روٹھا ہوا تھا۔

ایک جمعہ کو نکاح اور اگلے جمعہ کو اپیا اپنے شوہر کے ساتھ نیو یارک روانہ ہو گئیں۔ ارشد کی والدہ نے مامی کی جو گفتگو بتائی تھی اس کے مطابق مامی نے کہا تھا کہ شادی تو آپ کر لیں لیکن جہیز کی اُمید نہ رکھیں۔

اپیا کو جہیز میں وہ کچھ ملا جس کی توقع نہ تھی۔ ابا نے انہیں ماریشس کے دو ٹکٹ بھی دیئے تھے لیکن ارشد بھائی نے کہا تھا کہ وہ دس دن کی چھٹیوں پر ہیں اس لیے واپس جانا ضروری ہے۔

اس بات کو اب بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ نانا کی حیات تک اس گھر سے رابطہ رہا تھا لیکن اس کے بعد یہ رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ اپیا کی رخصتی کے بعد نانا نے بھی وہ گھر چھوڑ دیا تھا اور وہیں قریب میں ایک گراؤنڈ فلور کے مکان میں شفٹ ہو گئے تھے۔ فرحت آپا کی شادی ہوئی لیکن چھ ماہ بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور وہ بیوہ ہو کر باپ کے گھر واپس ہو گئیں جس میں اپیا اور میں رہا کرتے تھے اور اب وہ اسکول میں ٹیچر ہیں۔ ان کے بڑے بھائی جنہیں پورا گھر بھائی جان کہتا تھا شادی کے بعد سسر کے پاس لیبیا چلے گئے تھے۔ اب وہ بھی واپس آ گئے ہیں اور ڈیفنس میں انہوں نے اسٹور کھول لیا ہے۔ اپیا اپنے تینوں بچوں کے ساتھ نیو جرسی میں رہ رہی ہے۔ میرا ان سے شدید اختلاف اس وقت ہوا تھا جب انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں ان کی نند سے شادی کر لوں۔ میں نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ میں اس سے کسی صورت میں شادی نہیں کر سکتا جسے میں نے چار لڑکوں کے ساتھ بیہودہ حالت میں دیکھ چکا ہوں۔ ابا بھی اپنے معبود کے پاس جا چکے ہیں انہوں نے وراثت میں جو چھوڑا تھا وہ پانچوں بہن بھائیوں میں تقسیم ہوا۔ کچھ رقم نانا کے وراثت میں میرے اور اپیا کے نام چھوڑی تھی اپیا نے نہ نانا کی دی ہوئی رقم لی تھی اور نہ ابا کا ورثہ لیا تھا۔ وہ سب مجھے ملا تھا۔ میں نے اس سے فلیٹ لے لیا اور اب اس فلیٹ میں ہوں۔ اپیا کی خواہش پر میں نے ایم بی بی ایس کر لیا تھا۔ اب میں اور میری بیوی جو ڈاکٹر ہے اپنی ڈسپنسری چلا رہے ہیں۔ آمدنی اتنی ہو جاتی ہے کہ ہمارا گزارا چل رہا ہے بلکہ کچھ بچت بھی ہو جاتی ہے۔

پرسوں رات میری اپیا سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا۔ ''تم تو یہاں نہیں آئے اپنے بیٹے کو ہی بھیج دو میں اسپانسر کر دوں گی۔''

میری بیوی تو تیار ہو گئی تھی اس کا کہنا تھا ''بھیج دیتے ہیں اس کا مستقبل بن جائے گا'' لیکن میں نے واضح طور پر بلکہ دوٹوک انداز میں انکار کر دیا تھا جس ڈکٹیٹر شپ سے مجھے نجات ملی ہے اس میں اپنے بیٹے کو نہیں جھونک سکتا۔ میں نے کہا تھا اور ماں بیٹے کے منہ بن گئے لیکن میں انہیں نہیں سمجھا سکا کہ میں نے جہنم کے وہ دن کس طرح گزارے تھے... پھر میں سوچتا ہوں کہ اپیا اگر ڈکٹیٹر نہ بنتیں تو شاید میں کارزار حیات کا شہسوار نہ بنتا اور اتنی محنت کا عادی نہ بن پاتا۔

++

TAGPK.COM

جینے کی راہ

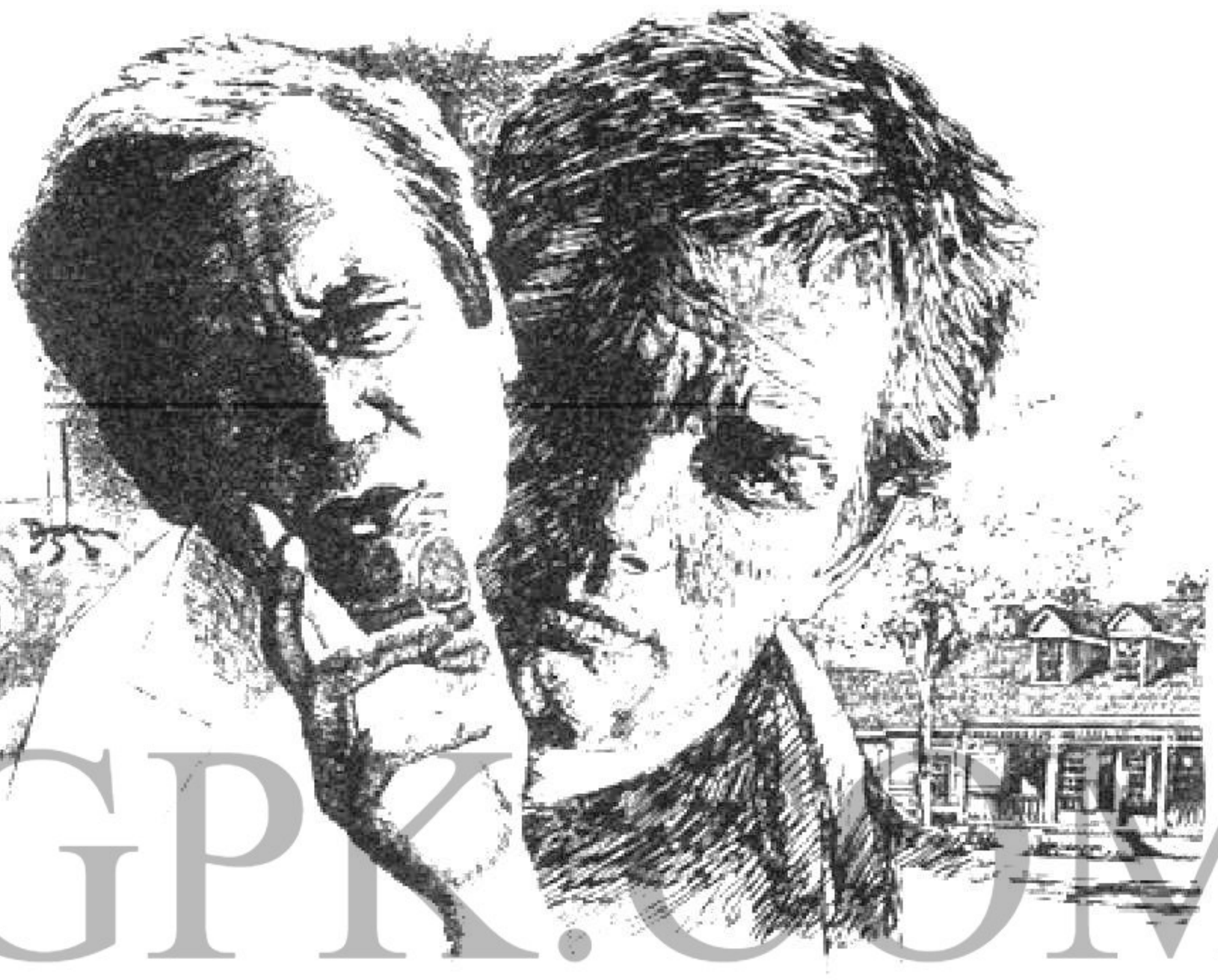
محترم مدیر

السلام علیکم!

ایک سچ بیانی ارسال کررہا ہوں یہ مجھ پر بیتی ہے۔ میرا اپنا واقعہ ہے۔ آج میں کامیاب انسان ہوں لیکن ایک وہ بھی وقت تھا جب مجھے مایوسی نے گھیر لیا تھا۔ میں کیسے اس اندھیرے سے نکلا یہی کچھ بتایا ہے، جو مشعل راہ ہے۔

محمد بلال

(لاہور)



میں نہیں جانتا تھا کہ ریل کی پٹریاں کتنی بے رحم ہوتی ہیں۔

اور جب جسم کے اوپر سے ٹرین گزر جائے تو کیسا احساس ہوتا ہے۔ کتنی تکلیف ہوتی ہے اور یہ تکلیف کتنی دیر کی ہوتی ہے۔ شاید چند لمحے یا ہزاروں سال۔ اخبار میں خبریں آتیں کہ فلاں نے خودکشی کرلی۔ فلاں اس طرح مرگیا۔

بہت عجیب عجیب کہانیاں ہوتی تھیں۔ کوئی اس لیے مر جاتا تھا کہ اس کی نوکری ختم ہوگئی ہے۔ کوئی اس لیے موت کو گلے لگا لیتا تھا کہ وہ بہت دنوں سے بیمار چلا آرہا تھا اور ڈاکٹرز نے بھی مایوسی کا اظہار کردیا تھا۔

بہت سے لوگ اس لیے مر جاتے تھے کہ ان کی محبوبائیں ان کا ساتھ چھوڑ دیتی تھیں۔ یعنی محبت میں ناکام ہو کر مر جاتے تھے اور ایسی اموات کی تعداد زیادہ تھی۔ اس میں نوجوان زیادہ ہوا کرتے تھے۔ یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ فلاں بوڑھے نے محبت میں ناکام ہوکر خودکشی کرلی ہو۔

موت کے بھی کئی طریقے ہوا کرتے تھے۔ جیسے زہر کھا کر، خود کو گولی مار کر یا سمندر میں چھلانگ لگا کر۔

اسے ایک لطیفہ یاد تھا کہ دو آدمی ریل کی پٹری پر لیٹے ہوئے تھے۔ ٹرین کے آنے میں دیر تھی۔ وقت گزارنے کے لیے ایک نے پوچھا۔ ''بھائی۔ تم کیوں خودکشی کر رہے ہو؟''

''میں محبت میں ناکام ہو گیا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ''اور تم کس لیے اپنی جان دے رہے ہو؟''

''میں محبت میں کامیاب ہو گیا ہوں۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

وہ ہنسا کرتا کہ یہ کیسی بے وقوفی ہے کہ ذرا سی بات کے لیے لوگ اپنی جان دے دیتے ہیں۔ زندگی اتنی سستی اور آسان تو نہیں ہوتی کہ اس کو یوں ہی گنوا دیا جائے۔

اور میں اس لیے مر رہا تھا کہ میرے لیے دنیا میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

زندگی میں... کچھ لوگوں کے لیے خوشیوں کا کوئی لمحہ ان کے پاس سے نہیں گزرتا۔ وہ ناکام دنیا میں آتے ہیں اور ناکام ہی چلے جاتے ہیں۔ لوحِ جہاں پر کوئی بھی نقش چھوڑے بغیر۔ میں ان میں سے ایک تھا۔

کیٹس نے کہا تھا کہ ''مفلسی میں پیدا ہونا کوئی جرم نہیں ہے لیکن مفلسی میں مرنا بہت بڑا جرم ہے۔''

میرے ساتھ ایسا ہی تھا۔ میں عاجز آ کر موت کی خواہش کرنے لگا تھا۔ زندگی میں ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ میں اس سے چپکے رہنے پر مجبور ہوتا۔ کون تھا میرا کوئی بھی نہیں۔ والدین بہت پہلے ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ کوئی ایسا رشتے دار بھی نہیں تھا جس پر بھروسا کر سکتا۔ ایک خالہ تھیں۔ وہ بھی اپنے بیٹے کے پاس امریکا جا کر آباد ہو گئی تھیں۔ صرف شاہینہ تھی۔ میری دوست، محبوبہ، رفیق، دم ساز، کچھ بھی سمجھ لیں۔

اسی نے مجھے زندگی کا حوصلہ دیا تھا۔ وہی میری ہمت بڑھاتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں زندگی کی راہ میں آگے بڑھتا جاؤں۔

لیکن میں اس کی آرزوؤں پر بھی پورا نہیں اترا تھا۔ وہ آنسو بہاتی اور مجھے یاد کرتی ہوئی کسی اور کے گھر رخصت ہو گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں کئی دنوں تک ڈپریشن کا شکار رہا تھا۔

زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے جب راستے بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوتا سوائے مایوسی کے اور اس عالم میں صرف ایک ہی نجات کا راستہ نظر آتا ہے اور وہ ہوتا ہے کہ موت کو گلے لگا لیا جائے۔

موت ایک بھیانک حقیقت۔

لیکن مایوس لوگوں کے لیے اس کا بھیانک پن نجات کا راستہ بن جاتا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ کس طرح۔

کئی راستے تھے۔ گلے میں پھندا ڈال کر، ٹرین سے کٹ کر، زہر کھا کر، ندی میں ڈوب کر۔

واہ۔ کیسی عجیب سی بات ہے کہ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی موت تجویز کر رہا تھا۔ ''یہ تعارف ہے موت کا برحق۔ موت بے وقت ہے اچانک ہے۔''

زندگی کو قریب سے دیکھو۔ زندگی موت سے بھیانک ہے۔

تو زندگی میرے لیے موت سے بھی بھیانک ہو گئی تھی۔

اسی لیے میں ان امکانات پر غور کر رہا تھا۔

کئی باتیں ذہن میں آئیں۔ ریل کی پٹری پر سر رکھ کر لیکن جب اس ارادے سے ریلوے پٹری کے پاس پہنچا تو ہمت نہیں ہوئی۔ ایک عجیب سا خوف سرایت کر گیا۔

میں وہاں سے واپس آ گیا۔

سوچتا رہا سوچتا رہا۔ پھر راوی کا خیال آ گیا۔

سنا تھا کہ اس طرح کی موت بہت رومانٹک ہوتی ہے۔

''مانگیں نا درازیٔ عمر کی دعا۔ بے فیض زندگی سے اگر اوب جائیں گے۔

سورج کی ڈوبتی ہوئی کرنوں کے ساتھ ساتھ۔ گہرے سمندروں میں کہیں ڈوب جائیں گے۔''

اور میں ساحل پر آ ہی گیا۔

سامنے راوی دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ لہریں بے تاب ہو کر ساحل سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ کیسا لگ رہا تھا کہ میں اب ان لہروں کو دوبارہ کبھی دیکھ سکوں گا۔ یہ نظارے اب کبھی میرے سامنے نہیں آئیں گے۔ یہ سب ان کے لیے ہوں گے جو زندہ ہیں۔

لوگ میرے سامنے دھومیں مچا رہے تھے۔ پانی میں نہا رہے تھے۔ ان میں ہر عمر کے لوگ تھے لیکن میرا تو دل ہی بجھا ہوا تھا۔ میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر آخری بار سمندر کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک نوجوان تھا۔ سفید قمیص شلوار میں ملبوس۔ اس کی عمر تیس سے کم ہی ہو گی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

TAGPK.COM

''کیا بات ہے۔خودکشی کا ارادہ کررہے ہو نا؟'' اس نے پوچھا۔

میں جھلا گیا تھا۔''تمہیں کیسے معلوم کہ میں خودکشی کا ارادہ کررہا ہوں؟''

''اس لیے کہ یہ تمہارے چہرے پر لکھا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔''تمہاری باڈی لینگویج تمہارے ارادے کا پتا دے رہی ہے۔تم اس وقت سخت ڈپریشن کا شکار ہو۔کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''دیکھو۔میں خودکشی کروں یا نہ کروں۔یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''غلط فہمی ہے تمہاری۔یہ تمہارا ذاتی نہیں بلکہ پورے سماج کا معاملہ ہے۔کسی کی بھی اس طرح کی موت پورے سماج کا معاملہ ہوتی ہے۔تم صرف اپنے ہی نہیں۔بلکہ پورے سماج کے مجرم بننے جارہے ہو۔''

''کس سماج کی بات کررہے ہو؟ کیا دیا ہے اس سماج نے۔کیا دیا ہے اس زندگی نے؟''

''بہت کچھ دیا ہے۔تم سانسیں لے رہے ہو نا۔تمہاری سانسوں کی نالی میں تو کوئی پرابلم یا رکاوٹ نہیں ہے نا؟ بس تو زندگی کا یہ احسان ہی بہت ہے۔''

''اور ناکامیوں کے لیے کیا کہو گے؟''

''پتا نہیں تم ناکامی کس کو کہتے ہو؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''نوکری نہ ملنے کو، محبوبہ کے بچھڑ جانے کو، والدین کے نہ ہونے کو، کوئی پیار کا رشتہ نہ ہونے کو۔کوئی ایسی بیماری کو جس کا بہ ظاہر کوئی علاج نہ ہو۔بس یہی ہے نا؟''

''اور ناکامی کس کو کہتے ہیں؟''

ناکامی؟ اس کا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔''میرے دوست یہ سب عارضی فیز ہیں۔اصل ناکامی کچھ اور ہوتی ہے۔''

''اور وہ کیا ہوتی ہے؟''

''اپنے خدا سے مایوسی۔یہ یقین کرلینا کہ اب میرے لیے زندگی کے سارے راستے بند ہوچکے ہیں۔اب اچھے دن میری زندگی میں نہیں آئیں گے۔اب کوئی میری راہ نہیں دیکھے گا۔اب میرے لیے ہر طرف دیواریں بنا دی گئی ہیں جنہیں میں عبور نہیں کرسکا۔بس یہ ہے اصل ناکامی۔''

میں بہت حیران ہوکر اس نوجوان کی طرف دیکھتا رہا۔اس کی باتیں دل پر اثر کرنے لگی تھیں۔اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن وہ سمجھانے کا ہنر جانتا تھا۔

''میری بات کا جواب دو۔'' اس نے پوچھا۔

''کس بات کا؟''

''یہی کہ تم خدا کی طرف سے مایوس نہیں ہو؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے بتایا۔''بس اتنا ہے کہ ناکامیوں نے مجھے سب سے بددل کردیا ہے۔''

''میرے دوست۔یہی ناکامیاں انسان کو تمیز کرتی ہیں اسے آگے لے کر جاتی ہیں۔جو ہوا اسے بھول جاؤ۔سامنے کی طرف دیکھو۔زندگی کی راہ بہت کشادہ ہے۔ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔پرندے پرواز کررہے ہیں۔بس مالک پر بھروسا رکھو۔سب ٹھیک ہوجائے گا۔سب بدل جائے گا۔''

''میرے دوست۔'' میں نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔''تم نے مجھے جینے کی راہ دکھا دی ہے۔تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام خورشید ہے۔'' اس نے بتایا۔''یعنی خورشید۔جو ہر صبح اپنی کرنوں کے ساتھ جینے کا حوصلہ لے کر آتا ہے۔اب میں چلتا ہوں۔اُمید ہے کہ تم آیندہ سے اس قسم کی حماقت کا نہیں سوچو گے۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' میرے لہجے میں شکستگی نہیں بلکہ ایک عزم تھا۔ایک ولولہ تھا۔

میں ساحل اور ندی کو ایک نئے طرب کے عالم میں دیکھتا ہوا گھر واپس آگیا۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں چونکہ اکیلا تھا اسی لیے عام طور پر باہر کے ہوٹل سے روٹیاں لے لیا کرتا۔میں نے محلے کے تندور سے روٹیاں لیں اور گھر واپس آگیا۔

تندور والے نے روٹیاں اخبار میں لپیٹ کردی تھیں۔

میں نے روٹیاں کھول کر میز پر رکھیں اور اسی وقت میری نگاہ اخبار کی ایک تصویر پر پڑ گئی۔وہ اخبار صرف ایک دن پرانا تھا اور وہ تصویر اسی نوجوان کی تھی جو مجھے ملا تھا۔جس نے میرا حوصلہ بڑھایا تھا۔

اخبار کی خبر کے مطابق اس نوجوان نے زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرلی تھی اور اس کا نام خورشید تھا۔

''میرے خدا۔'' میں نے اپنا سر تھام لیا۔''جب وہ مر چکا تھا تو خدا نے اسے میرے پاس کیوں بھیجا تھا؟ میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے۔مجھے جینے کی راہ دکھانے کے لیے؟''

برسوں گزر گئے ہیں۔میں اب ایک کامیاب انسان ہوں لیکن اس خورشید کا معما اب تک حل نہیں ہوسکا ہے اور شاید کبھی حل بھی نہ ہو۔

++

سیاسی گرگے

محترم مدیر سرگزشت

السلام علیکم!

میں نے اس سچ بیانی میں نام اور مقام بدل دیئے ہیں اور تمام واقعات کو کہانی کے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ صاحب کون ہیں اس کا ذرا سا بھی اشارہ نہیں دیا ہے۔ اُمید ہے پھر بھی یہ سچ بیانی دلچسپ بن گئی ہے۔ قارئین کی رائے کا منتظر رہوں گا۔

شاکر لطیف

(لاہور)

چودھری سکندر اس وقت اپنے ڈیرے میں ایک آرام دہ کرسی پر براجمان تھا۔ اس کا ڈیرہ بھی خاصہ وسیع و عریض تھا اور ڈیرے پر اس کی حفاظت کے لیے تقریباً بیس کے قریب مسلح افراد بھی موجود تھے۔ اس کے سامنے کافی تعداد میں علاقہ کے معززین کے لیے کرسیاں لگائی گئی تھیں جن پر اس کی طرف سے مدعو کردہ افراد موجود تھے۔ ان سب کا شمار اس علاقے کے معزز اور عزت دار لوگوں میں ہوتا تھا۔

پاس ہی زمین پر چادریں وغیرہ بچھائی گئی تھیں جن پر



چودھری کے مزارعے اپنی عورتوں کے ساتھ موجود تھے جبکہ کچھ فاصلے پر مدعو کردہ افراد کے لیے بڑی بڑی دیگوں میں کھانا تیار ہو رہا تھا جس کی اشتہا انگیز خوشبو سب کو مسحور کیے جا رہی تھی۔ مزارعوں کی عورتیں کھانا بنانے میں ان کی مدد کر رہی تھیں۔

چودھری سکندر نے آج صرف گاؤں کے چند عزت دار اور بااثر افراد کو ہی مدعو کیا تھا۔ وہ سیاست میں آنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اسی سلسلے میں چند اہم اعلانات کرنے والا تھا۔ چند دنوں تک وہ اپنے علاقے میں ایک بڑے جلسے کا اہتمام بھی کرنے والا تھا جس میں وہ ملک کی ایک معروف سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی کا اعلان کرنے والا تھا۔ گاؤں کے بااثر افراد کو بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس سلسلے میں انہیں اعتماد میں لیا جا سکے۔ دیہاتی علاقوں میں ذات پات اور برادریوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دیہاتی لوگ اپنی برادری کو چھوڑنا کسی طور بھی گوارا نہیں کرتے حتیٰ کہ چودھری سکندر کے گاؤں میں ایسے واقعات بھی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئے تھے کہ ایک برادری نے کسی دوسری برادری میں شادی بیاہ کیا ہو۔ اس علاقے کے لوگ غیر برادری میں رشتہ کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے چودھری سکندر نے گاؤں کی تمام برادریوں کے بڑوں کو مدعو کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی برادری کا کوئی بڑا اس کی حمایت کا اعلان کرتا ہے تو اسے اس کی ساری برادری کی حمایت خود بخود حاصل ہو جائے گی۔

چودھری سکندر تقریباً ساٹھ سے پینسٹھ سال کی عمر کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کبھی کوئی مشقت والا کام نہیں کیا تھا اس لیے اس کا جسم فربہی کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ اس کی رنگت تو سرخ و سپید تھی مگر چہرے پر موجود ایک پرانے زخم کے نشان کی وجہ سے اس کی شخصیت خاصی خوفناک دکھائی دیتی تھی۔ سر کے بال اڑ چکے تھے مگر اس کے سر پر ہر وقت پگڑی موجود رہتی تھی، اس لیے اس کا گنجا سر کم ہی نظر آتا تھا۔

اسے علاقے کے سیاہ و سفید کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ اس کے گاؤں میں کوئی بھی اہم کام اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ شادی بیاہ جیسے معاملات میں بھی اس کی اجازت لینا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ملکیت میں ہزاروں ایکڑ تک پھیلی زمین تھی جس پر اس کے مزارعے دن رات کام میں لگے رہتے تھے۔ اس کے درباریوں میں بڑے بڑے سیاست دان اور پولیس افسران شامل تھے جو اکثر اس کی قدم بوسی کے لیے حاضری دیتے رہتے۔ چودھری سکندر کوئی کنجوس آدمی نہ تھا۔ وہ اپنے وفاداروں اور درباریوں کو نوازنے میں بھی بے حد فیاض واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے دوستوں اور وفاداروں پر دل کھول کر پیسا خرچ کرتا تھا۔ پیسے کی ویسے بھی اس کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ اس کے دوست اور وفادار اکثر اس کی سخاوت کی تعریف کرتے تھے اور اسے یہ تعریف زیادہ اچھی اس وقت لگتی جب یہ اس کے منہ پر کی جاتی۔ چودھری اپنے دوستوں اور وفاداروں کے معاملے میں جتنا نرم تھا، اپنے مزارعوں کے معاملے میں اتنا ہی سخت تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کمی کمین لوگوں کو زیادہ منہ لگایا جائے تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ آج سے پہلے اس نے کبھی سیاست میں آنے کا نہیں سوچا تھا اور نہ اسے اس کی کبھی ضرورت محسوس ہوئی تھی مگر اب اس نے سیاست میں عملی قدم رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ اس کے لیے ناگزیر بھی ہو چکا تھا کیونکہ اس کا سب سے بڑا مخالف چودھری قاسم بھی سیاست میں قدم رکھ چکا تھا۔ چودھری سکندر اور چودھری قاسم کے درمیان برسوں سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں خاندانوں کے کئی افراد اس دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اگرچہ پچھلے چار سالوں سے اس علاقے میں خاصہ امن و امان پایا جاتا تھا کیونکہ گاؤں کے چند بڑوں نے دونوں خاندانوں کے درمیان صلح کروا دی تھی مگر پھر بھی چودھری سکندر اور چودھری قاسم کی ایک دوسرے کے لیے نفرت ختم نہ ہوئی تھی اور دونوں آج بھی ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے اور اب دونوں میں سیاسی مخاصمت کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔

چودھری سکندر اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اگر چودھری قاسم الیکشن جیت گیا تو وہ اس کے لیے خاصے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ ایک طرح سے اسے چودھری سکندر پر برتری حاصل ہو جاتی اور اگر وہ کوئی وزیر وغیرہ بن جاتا تو پھر چودھری سکندر کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔ چودھری قاسم کی جیت کسی طرح بھی اسے گوارہ نہ تھی، اسی لیے اس نے خود اس کے مقابلے پر آنے کا فیصلہ کیا تھا اور ملک کی ایک معروف سیاسی جماعت کا ٹکٹ بھی حاصل کر لیا تھا۔ اب بس اسے جلسے میں اس کا باقاعدہ اعلان کرنا تھا اور جلسے سے پہلے گاؤں کے بااثر افراد کو اعتماد میں بھی لینا تھا۔ یہ بات اس کے علم میں تھی کہ چودھری قاسم بھی گاؤں کی مختلف برادریوں سے رابطے کر رہا ہے اور اس نے بھی ملک کی ایک معروف پارٹی کا ٹکٹ حاصل کر لیا ہے۔ یہ پارٹی چودھری سکندر کی پارٹی کی سخت ترین حریف سمجھی جاتی تھی، اس لیے وہ جانتا تھا کہ چودھری قاسم کو الیکشن میں شکست دینا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ چودھری قاسم اس

TAGPK.COM

کی ٹکر کا آدمی تھا اس لیے زوردار مقابلہ متوقع تھا۔ چودھری سکندر کے پیچھے اس کا سب سے پرانا اور وفادار آدمی مراد مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ مراد، چودھری کے ساتھ اس وقت سے تھا جب چودھری جوان تھا۔ وہ چودھری کا سب سے خاص آدمی تھا اور ہر وقت اس پر مرمٹنے کو تیار رہتا تھا۔ چودھری سکندر بھی اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مراد مرتو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ غداری نہیں کرسکتا۔ چودھری سکندر کے باقی آدمی بھی مراد کی عزت کرتے تھے اور اس کے حکم کو چودھری کا حکم سمجھتے تھے۔

چودھری سکندر کو آنے والی تمام فون کالز مراد ہی اٹینڈ کرتا تھا پھر وہی فیصلے کرتا تھا کہ کس کی بات چودھری سے کروانی ہے اور کس کی نہیں۔ اس وقت بھی وہ موبائل فون ہاتھ میں پکڑے چودھری سکندر کے بالکل پیچھے کھڑا تھا تاکہ اگر کوئی اہم کال آجائے تو وہ کال کرنے والے کی فوری طور پر چودھری سکندر سے بات کرواسکے۔

تقریباً تمام مدعو کردہ افراد آچکے تھے اس لیے چودھری کے اشارے پر مراد نے آگے بڑھ کر بولنا شروع کردیا۔ ''جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ چودھری جی نے اس حلقے سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے مگر انہوں نے سیاست میں عملی قدم کیوں رکھا؟ اس بارے میں چودھری صاحب آپ لوگوں سے خود بات کریں گے۔'' یہ کہہ کر مراد پیچھے ہٹ گیا جبکہ لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کردیں اور زمین پر بیٹھے ہوئے مزارعوں نے نعرے مارنا شروع کردیے۔ ''چودھری سکندر زندہ باد، چودھری سکندر زندہ باد۔'' شاید ان کی ڈیرے پر موجودگی کا مقصد بھی نعرے مارنا ہی تھا۔

''خاموش ہوجائیں۔'' چودھری سکندر نے مسکراتے ہوئے سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور پھر بولا۔ ''جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ میں نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کرلیا ہے، لیکن میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ اس بارے میں بات کرنے کے لیے میں نے آپ سب کو یہاں بلایا ہے کیونکہ آپ سب کے بغیر چودھری سکندر کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا سیاست میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ میں سیاست میں اس لیے آیا ہوں کہ ہمارے گاؤں اور آس پاس کے علاقوں میں غریب اور محنت کش طبقے کی حالت میں بہتری لاسکوں۔ کم از کم انہیں دو وقت کی روٹی تو ملنا چاہیے، مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ چودھری قاسم جیسوں نے لوگوں سے زندہ رہنے کے بنیادی حقوق تک چھین لیے ہیں۔ اس جیسے لوگ خود کو دوسروں سے برتر اور ممتاز مخلوق تصور کرتے ہیں۔ میں اس تفریق کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ انسان ہونے کے ناتے ہم سب برابر ہیں، چاہے ہمارا تعلق کسی بھی برادری سے ہو، کسی بھی ذات سے ہو۔ چاہے ہم امیر ہوں یا غریب، ہیں تو ہم سب انسان ہی۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے کسی غریب کے گھر پیدا نہیں ہوتا ہے۔''

بات کرتے ہوئے چودھری سکندر کا لہجہ جوشیلا ہوگیا۔ ڈیرہ ایک دفعہ پھر نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔

اسی لمحے چودھری کا ایک مزارعہ ڈیرے میں داخل ہوا اور آکر چودھری کے پاس موجود کرسیوں میں سے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چودھری کے ایک گن مین نے فوراً ہی اس کے پاس جاکر اسے ہلکی سی چٹکی کاٹی۔ اگر ڈیرے پر علاقے کے معززین موجود نہ ہوتے تو شاید وہ گن مین اس مزارعے کو کسی اور طرح سمجھاتا۔ مزارعے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ تیزی سے اٹھ کر دوسرے مزارعوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات امڈ آئے تھے کیونکہ چودھری کے پاس موجود کرسیوں پر بیٹھ جانا گویا چودھری کے برابر بیٹھ جانا تھا۔ وہ مزارعہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑسکتا ہے اگرچہ اس نے بے دھیانی میں ہی ایسا کیا تھا۔

چودھری نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ اپنی تقریر شروع کردی، تاہم اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات موجود تھے۔ مراد بھی بڑی کینہ توز نظروں سے اس مزارعے کو دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں انسانوں میں تفریق کا سب سے بڑا مخالف ہوں۔ یہ نہ صرف انسانیت کے خلاف ہے بلکہ انسانیت کی کھلی تذلیل ہے۔ خود کو دوسروں سے افضل سمجھنا غرور اور تکبر کی علامت ہے۔ معاشرہ ایسے لوگوں کو کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ چودھری قاسم کو لوگ اسی لیے اس کی پیٹھ پیچھے گالیوں سے نوازتے ہیں۔'' بات کرتے ہوئے چودھری چند لمحوں کے لیے دم لینے کے لیے رکا۔

وہ دمے کا مریض تھا اس لیے زیادہ لمبی بات کرنے سے اس کی سانس اکھڑنا شروع ہوجاتی تھی۔ اسے اپنی سانسیں بحال کرنے کے لیے کچھ دیر کے لیے رکنا پڑتا تھا۔ سانسوں کو اعتدال پر لانے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''اس کے علاوہ میں آپ سب کی توجہ ایک اہم مسئلے کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ خود بھی جانتے ہی ہوں گے کہ لوگوں

کی زمینوں پر قبضے کیے جا رہے ہیں۔ چند بااثر قبضہ گروپوں نے غریب لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور زبردستی ان کی زمینوں پر قبضہ بھی جما رکھا ہے۔ آپ نے میاں امانت کا ماجرا تو ضرور سنا ہوگا۔ میرے سب سے بڑے دشمن اور سیاسی حریف چودھری قاسم نے کافی عرصے سے اس کی زمین پر قبضہ کر رکھا ہے اور وہ شخص چودھری قاسم کی وجہ سے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اس ظالم انسان نے اس غریب آدمی سے دو وقت کی روٹی بھی چھین لی ہے، اسی وجہ سے میں نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں آپ سب کی موجودگی میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں الیکشن جیت گیا تو میاں امانت کو اس کی زمین واپس دلواؤں گا اور چودھری قاسم کو سبق سکھاؤں گا تاکہ وہ آئندہ کسی کی زمین پر قبضہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔''

ڈیرہ ایک بار پھر نعروں سے گونج اٹھا۔ اس بار مزارعوں کے ساتھ ساتھ گاؤں سے آنے والے معززین کے نعرے بھی شامل تھے۔ سب سے بلند آواز اسی مزارعے کی تھی جس سے چودھری سکندر کے ساتھ بیٹھنے کی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح شاید چودھری اس سے خوش ہو جائے اور اس کے ساتھ بیٹھنے کے جرم میں متوقع چھترول سے اس کی گلوخلاصی ہو جائے۔

اسی لمحے چودھری کے خاص آدمی مراد نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''چودھری صاحب! پٹواری کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ بابا خیر دین تحصیل دار کے پاس پیش ہو گیا ہے۔ تحصیل دار سے رابطہ کریں ورنہ معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

مراد کی بات سن کر چودھری نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر بولا۔ ''تم پٹواری سے کہو کہ ایک جعلی انتقال نامہ تیار کروائے۔ باقی کام میں خود دیکھ لوں گا۔''

''جی بہتر!'' مراد نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

بابا خیر دین بھی اسی گاؤں کا رہائشی تھا اور ایک شریف انسان کے طور پر جانا جاتا تھا۔ چودھری سکندر نے کافی عرصے سے اس کی زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں بابا خیر دین کی کہیں شنوائی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے کچھ ہمدردوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی زمین چودھری سکندر کو فروخت کر دے، وہ اس کی آدھی قیمت دینے کو تیار ہے۔ چودھری کو اُمید تھی کہ بابا خیر دین آخر کار رضامند ہو جائے گا۔

اس نے دوبارہ اپنی تقریر شروع کر دی۔ ''جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میرا آپ کو بلانے کا مقصد آپ کی حمایت حاصل کرنا ہے۔ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی چودھری قاسم کا ساتھ دینا چاہتا ہے تو بے شک وہ ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے۔ بس ایسے شخص سے میری درخواست ہے کہ مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ یہ سارے فساد کی جڑ ہے۔ انسان کو ایک جھوٹ چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنا پڑتے ہیں، اس لیے جو میرا ساتھ نہیں دینا چاہتا، نہ دے مگر جھوٹ مت بولے۔ میرے ساتھ وہی رہے گا جو میری طرح سچ بولنے کی جرأت رکھتا ہو۔ مجھے جھوٹے اور منافق ساتھیوں کی ضرورت نہیں بلکہ آپ جیسے سچے اور مخلص ساتھیوں کی ضرورت ہے۔''

بات کرتے ہوئے اس کی سانس پھولنے لگی۔ اس نے چند لمحوں کے لیے بولنا بند کر دیا تاکہ اپنی سانسوں کو اعتدال میں لا سکے۔ اس بار اس نے اپنے منہ میں دمے کے علاج کے لیے استعمال ہونے والا مخصوص اسپرے بھی کیا۔ یہ اسپرے ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا۔ مراد نے یہ موقع غنیمت جانا اور ایک بار پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''چودھری صاحب! سجاد خان کا فون آیا ہے۔ اس سے کیا کہوں؟ کیا آپ بات کریں گے؟''

سجاد خان بھی اس علاقے میں ڈی ایس پی کے عہدے پر تعینات رہا تھا۔ اس کی چودھری سکندر سے کافی گہری دوستی تھی۔ اس نے چودھری کے لیے بہت سے غیر قانونی کام بھی کیے تھے حتیٰ کہ اس کے کئی مخالفین کو پولیس مقابلوں میں پار بھی کر دیا تھا مگر پھر چودھری قاسم نے اس کا ٹرانسفر کروا دیا، اس لیے اب وہ چودھری سکندر کے کسی کام کا نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے ہی چودھری سے کوئی کام ہو سکتا تھا۔

''تم اسے کہو کہ چودھری صاحب سو رہے ہیں۔ انھیں گے تو بات کروا دوں گا، اور ہاں دوبارہ اس نمبر پر کال اٹینڈ مت کرنا۔'' چودھری نے مراد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا اور پھر دوبارہ لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے جھوٹ بولنے سے سخت نفرت ہے، اس لیے میرے ساتھ وہی چلے گا جس میں سچ بولنے کی طاقت ہو۔ جھوٹے آدمی کو چودھری قاسم کے پاس چلے جانا چاہیے کیونکہ وہ اس علاقے کا جھوٹا ترین انسان ہے، حتیٰ کہ عدالتوں میں تھوڑی سی زمین کے لیے جھوٹی قسمیں کھانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ توبہ توبہ۔'' چودھری سکندر نے

TAGPK.COM

اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے شخص کو الیکشن میں منتخب کر کے آپ اپنے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے؟ جس شخص میں سچ بولنے کی طاقت نہیں، وہ آپ کی خدمت کیا کرے گا؟ مجھے تو آپ سب لوگ جانتے ہی ہیں۔ سیدھا سادا سا آدمی ہوں۔ جھوٹ سے نفرت کرتا ہوں اور گھما پھرا کر بات کرنا بھی مجھے نہیں آتا۔ میں آپ سے جو بھی وعدہ کروں گا، اسے ضرور پورا کروں گا۔ اگر حکومت کی طرف سے ترقیاتی کاموں کے لیے فنڈ نہ بھی ملا تو میں اپنے پاس سے پیسے خرچ کر کے گاؤں میں ترقیاتی کام مکمل کرواؤں گا۔ میرا سیاست میں آنے کا مقصد دولت کمانا نہیں بلکہ دکھی انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔'' بات کرتے ہوئے چودھری کا لہجہ انکسارانہ ہوگیا۔

''چودھری صاحب!'' اسی لمحے مراد نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا بات ہے؟ تمہیں پتا ہے کہ میں تقریر کر رہا ہوں۔ بار بار کیوں تنگ کر رہے ہو۔ اگر کوئی اہم بات ہے تو بعد میں بھی بتائی جا سکتی ہے۔'' چودھری سکندر نے اس بار ناگوار سے لہجے میں کہا۔ شاید اسے مراد کی بار بار مداخلت سے غصہ آ گیا تھا۔

''معاف کر دیں چودھری صاحب!'' مراد نے بھیک مانگنے والے لہجے میں کہا۔ ''دراصل ابھی تھانے دار کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ حوالات میں جاوید کی حالت خراب ہوگئی ہے۔ اس پر پرچا کاٹ دیں یا رہنے دیں؟'' جاوید، چودھری سکندر کی زمینوں پر کام کرنے والا ایک مزارعہ تھا اور چودھری کے گودام سے گندم کی بوری چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اگرچہ اس کا کہنا تھا کہ اسے اس کی ضرورت تھی۔ اس کے گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور اس سے اپنے بچوں کی بھوک دیکھی نہیں جا رہی تھی مگر چودھری سکندر کے گودام میں چوری کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ چودھری کے حکم پر پہلے اس کی خوب ٹھکائی کی گئی اور پھر اسے تھانے میں بند کروا دیا گیا جہاں روزانہ کی بنیاد پر اس کی چھترول کی جا رہی تھی۔

''انہیں کہو کہ ابھی کچھ دن اسے وہیں پڑا رہنے دیں۔ پرچا کاٹنے کی ضرورت نہیں اور اس کی طبیعت خراب نہیں ہے، وہ ڈراما کر رہا ہے۔ میں ان کمین لوگوں کی فطرت کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ تھانے دار کو کہو کہ اسے حوالات سے نکال کر اس کی اور چھترول کرے۔ چھتر اس کی طبیعت ٹھیک کر دیں گے۔ اس سے یہ بھی کہو کہ میرے حکم کی فوراً تعمیل کرے۔'' یہ کہتے ہوئے چودھری نے پھر سے اپنی تقریر شروع کر دی جبکہ مراد معذرت خواہانہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔

''ہاں تو میں آپ لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ میرا سیاست میں آنے کا مقصد دکھی انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔ بطور انسان ہمیں غریب اور نادار لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے۔ کسی بھوکے انسان کو کھانا کھلانا دکھی انسانیت کی بہترین خدمت ہے۔ مگر چودھری قاسم.....!'' بات کرتے ہوئے چودھری سکندر کے لہجے میں نفرت امڈ آئی۔ ''وہ دکھی انسانیت کی کیا خدمت کرے گا۔ وہ تو اس دنیا میں آیا ہی ہے انسانیت کو دکھی کرنے کے لیے۔ اس نے غریب اور مظلوم لوگوں پر ظلم کی حد کر دی ہے اور ان پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے ہیں کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔'' بات کرتے ہوئے چودھری کا لہجہ غمگین ہوگیا اور وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔

قدرے توقف کے بعد اس نے دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''ابھی کچھ عرصے پہلے کی ہی بات ہے، اس کے بیٹے نے ایک غریب کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا، گویا وہ انسان نہیں کوئی جانور تھا۔ اس کی بیوہ تھانے کے چکر لگا لگا کر نیم پاگل ہوگئی مگر پولیس نے ایف آئی آر درج نہ کی اور جب درج کی تو چودھری قاسم کے ایک مزارعے کے خلاف درج کر دی جس نے تھانے میں جا کر اس قتل کا اعتراف کر لیا۔ اس مزدور کے اصل قاتل کو گرفتار تک نہ کیا گیا۔ کسی اور معاشرے میں اگر ایسا ہوتا تو شور مچ جاتا مگر ہم لوگ بے حس ہو چکے ہیں جو ایسی بے انصافیوں پر خاموش رہتے ہیں، مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں ایسے مظالم کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاؤں گا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ کی حمایت سے میں الیکشن جیت گیا تو اس مزدور کی بیوہ کو انصاف دلاؤں گا اور اس کے شوہر کے اصل قاتل کو بھی قانون کے کٹہرے میں کھڑا کر دوں گا۔''

''چودھری سکندر زندہ باد۔ چودھری سکندر زندہ باد۔ جب تک سورج چاند رہے گا، چودھری تیرا نام رہے گا۔''

ڈیرہ ایک بار پھر فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ چودھری کچھ دیر تک خاموشی سے نعرے سنتا رہا اور پھر اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے سب کو چپ ہونے کا کہا۔ ''آپ جانتے ہیں اس مظلوم عورت کو انصاف کیوں نہیں مل سکا؟'' چودھری سکندر نے سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی بولا۔ ''میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ایسا ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے ایک ناسور کی

TAGPK.COM

وجہ سے ہوا جس کا نام کرپشن ہے۔ پولیس نے رشوت لے کر چودھری قاسم کے بیٹے کی بجائے اس مزارعے کو قتل کے جرم میں نامزد کر دیا۔ کرپشن کے اس ناسور نے ہمارے معاشرے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا ہے۔ آپ کسی بھی سرکاری ادارے میں چلے جائیں، کوئی بھی کام ہو، رشوت دینا پڑے گی۔ اس بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ پہلے خود کو بدلیں پھر ہی معاشرہ تبدیل ہوگا۔ ہمیں ایسی کسی بھی صورت حال میں رشوت دینے سے صاف انکار کر دینا چاہیے اور ایسے راشیوں کے خلاف ڈٹ جانا چاہیے۔"

"چودھری صاحب!" مراد کی سرگوشی نے اسے تقریر بند کرنے پر مجبور کر دیا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ مجھے تقریر کے دوران تنگ مت کرنا۔" چودھری نے غصیلے.... لہجے میں کہا۔ تاہم اس نے یہ بات سرگوشی میں ہی کی تھی۔

"معاف کر دیں چودھری صاحب! بات ہی ایسی تھی کہ مجھے آپ کو کہنا پڑا ورنہ میں جانتا ہوں میرا بار بار تنگ کرنا آپ کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔" مراد نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"بولو! کیا بات ہے؟" مراد کا عاجزانہ لہجہ سن کر چودھری نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہ سرکار، ابھی ابھی تھانے دار کا فون آیا ہے، جاوید مر گیا۔ تھانے دار نے آپ کا حکم ملتے ہی اسے حوالات سے نکالا اور اس کی چھترول شروع کروا دی جس سے اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ طبیعت تو اس کی پہلے ہی خراب تھی۔ تھانے دار نے سمجھا کہ شاید وہ ڈراما کر رہا ہے۔ اس نے سپاہیوں کو چھترول جاری رکھنے کا حکم دیا مگر وہ تو سچ مچ ہی مر گیا جناب۔ تھانے دار کا فون آیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اگر یہ بات اعلیٰ افسران تک پہنچ گئی تو اس کی پگڑی اتر جائے گی اور آپ کے لیے بھی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر جاوید کے خاندان والے بھی شور مچائیں گے۔" مراد نے چودھری کو سرگوشیوں میں ہی ساری بات بتاتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" اس کی بات سن کر چودھری کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ تھانے میں کسی کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اگر یہ بات باہر نکل جاتی تو اس کے لیے واقعی خاصے مسائل پیدا ہو سکتے تھے، خاص کر اگر اس واقعے کا علم چودھری قاسم کو ہو جاتا تو وہ اس واقعے کو الیکشن میں اس کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔

"اسے کہو کہ لاش دریا میں پھینک دے۔ اس نے کون سا اس کے خلاف پرچا کاٹ رکھا ہے جو اسے عدالت میں پیش کرنا پڑے گا۔ جاوید کے خاندان والوں کو میں خود سنبھال لوں گا۔ بس یہ بات الیکشن سے پہلے کسی صورت بھی باہر نہیں نکلنا چاہیے ورنہ بڑا مسئلہ ہو جائے گا اور تھانے دار کو یہ بھی کہہ دینا کہ شام تک اسے دو لاکھ روپے مل جائیں گے۔ اب مزید میرے کان مت کھانا۔ اگر کوئی فون آ بھی جائے تو بعد میں بات ہو سکتی ہے۔" چودھری نے سختی سے مراد کو تلقین کرتے

ایک دور میں آرزو تھی کہ سرکاری ملازمت مل جائے۔ اور اب یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آزادی کی موت دے۔ ضمیر بہت مجروح ہو چکا ہے اور اب تو وہ قابل فروخت بھی نہیں رہا۔ شاعری میں نے اخبار کی خالی جگہ پُر کرنے کے لیے کی تھی۔ خبروں میں جہاں جگہ بچ جاتی تھی وہاں شعر لکھ دیا کرتا تھا۔ اب یہ گلے کا ہار ہو گئی ہے۔ صبح اٹھتا ہوں تو غریب کے بچوں کی طرح کالم منہ پھاڑے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا پیٹ بھرتا ہوں اور اس سے میرا پیٹ بھرتا ہے۔ دفتری نظام یہی ہے کہ تم مسل کا پیٹ بھرو مسل تمہارا پیٹ بھرے گی۔

اوّل اوّل سنجیدہ شعر کہتا تھا۔ یہ جب کی بات ہے کہ جب آتش جوان تھا۔ اس کے بعد "سیفٹی قوانین" کی عنایت سے اظہارِ خیال کے لیے طنز و مزاح کو اپنایا۔ "سیفٹی آرڈی ننس" کی کوئی لاکھ مخالفت کرے لیکن میں تو اسے "رحمت خداوندی" سمجھتا ہوں۔ سیفٹی آرڈی ننس کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے مجھے "مزاح نگار" بنا دیا۔ اکبر کو اپنا پیر و مرشد اور نظیر کو اپنا رہنما مانتا ہوں۔ نظیر اکبر آبادی سب سے بڑا عوامی شاعر تھا۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس میں "مسلم لیگ" اور "عوامی لیگ" دونوں متحد ہیں اور اکبر اپنے مقام پر تنہا کھڑا ہے۔ الہ آباد اور اکبر آباد کے دو رائے پر امید و بیم لے آئی ہے۔ دعا کیجئے کہ "دیر و حرم" نہیں تو گھر کا راستہ مل جائے۔ جب سنجیدہ شعر کہتا تھا تو مولانا عبدالمجید سالک سے اصلاح لیتا تھا۔ مزاح میں میرے استاد مولانا انعام الحق قدوسی گنگوہی ہیں۔ جنہیں لسان العصر اکبر الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

اقتباس: مجید لاہوری

ہوئے کہا اور پھر دوبارہ مہمانوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''معاف کیجیے گا، ایک ضروری مسئلہ تھا۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں سب سے کہا اور پھر اپنی تقریر شروع کردی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ رشوت نے ہمارے معاشرے کو تباہ کردیا ہے۔ اس کینسر نے پورے سسٹم کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہمارے تھانوں کا حال آپ لوگوں کے سامنے ہی ہے۔ پیسے دے کر کوئی بھی کام کروالو۔ یہ پولیس والے آپ کے پیچھے ایسے دم ہلاتے پھریں گے جیسے حکومت کے نہیں، آپ کے ملازم ہوں۔ ان تھانوں میں غریب اور مظلوم لوگوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے جاتے ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ان غریب لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق دلوانے کے لیے ہی میں نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' بات کرتے ہوئے شدت جذبات سے چودھری کا چہرہ ٹماٹر کی طرح لال ہوگیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی سانس بھی پھولنے لگی۔ اس نے دمے کے مرض کے لیے مخصوص اسپرے اپنے منہ میں کیا اور سلسلۂ کلام دوبارہ شروع کردیا۔

''ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ میں آپ لوگوں کی توجہ ایک ایسے مسئلے کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں جو ہمارے لیے روٹی سے بھی اہم ہے اور وہ ہے عزت و غیرت۔ ہم دیہاتی لوگ اپنی عزت کے معاملے میں کسی طرح کا سمجھوتا نہیں کرسکتے۔ ہم لوگوں کا تو جینا مرنا ہی اپنی عزت کے لیے ہوتا ہے کیونکہ ہم چودھری قاسم کی طرح بے غیرت نہیں ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ آج کل بدمعاشوں کا ایک ٹولہ گاؤں کی شریف زادیوں کو سرِراہ تنگ کرتا پھر رہا ہے حتیٰ کہ ان کے دوپٹے تک کھینچے جاتے ہیں۔ اس ٹولے کا لیڈر چودھری قاسم کا بیٹا ہے۔ میں آپ لوگوں کے توسط سے چودھری قاسم کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹے کو روکے۔ یہ بے غیرتی اب اس علاقے میں نہیں چلے گی۔ ہم اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں مگر وہ اپنے بیٹے کو کیا روکے گا۔ وہ تو خود اپنے بیٹے سے بھی دو قدم آگے ہے اور خود بھی گاؤں کی بہو بیٹیوں کو بری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بوڑھا گدھ کہیں کا۔'' بات کرتے ہوئے چودھری کے لہجے میں شدید نفرت امڈ آئی۔ ''الیکشن میں ایسے گھٹیا انسان کو منتخب کرکے آپ اپنے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے؟''

اسی لمحے چودھری سکندر کی نظر اپنے مزارعوں کے ساتھ آئی ہوئی عورتوں میں سے ایک لڑکی پر پڑی۔ یہ لڑکی خاصی خوب صورت تھی اور اس نے تازہ تازہ ہی جوانی میں قدم رکھا تھا۔ یہ کون تھی؟ اس کے دل میں سوال ابھرا اور اب تک اس کی نظروں سے کیسے چھپی ہوئی تھی۔ وہ جہاں اپنے مزارعوں کو غلام سمجھتا تھا وہیں ان کی عورتوں کو اپنی لونڈیاں سمجھتا تھا۔ خیر اب اس کی نظروں میں آ ہی گئی ہے تو بچ کر کہاں جائے گی۔ سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو اسے انگلی ٹیڑھی کرنا بھی آتا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی تقریر میں مصروف ہوگیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کسی شخص کا اعلیٰ کردار ہی اسے معاشرے میں بلند مقام دلواتا ہے۔ چودھری قاسم کو تو عورتوں کی عزت کرنا نہیں آتا، لوگوں کی خدمت کیا کرے گا؟ لیکن میں جانتا ہوں کہ عزت کیا ہوتی ہے۔ میرے لیے گاؤں کی ہر عورت ماں، بہن کا درجہ رکھتی ہے۔'' چودھری نے کن انکھیوں سے دوبارہ اس خوب صورت لڑکی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا۔ اپنی بات ختم کرتا ہوں، کھانا کھا کر جایئے گا کیونکہ میرے ڈیرے پر آیا ہوا کوئی مہمان کھانا کھائے بغیر چلا جائے، یہ میری بے عزتی ہے۔ باقی کی باتیں میں اپنے جلسے میں کروں گا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہاں میں ملک کی ایک معروف سیاسی جماعت کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار بھی کروں گا۔ آپ اس جماعت کی نیک نامی سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ ملک کی واحد پارٹی ہے جو اصولوں پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتی اور انتہائی ایماندار اور نیک نامی کی شہرت رکھنے والے افراد کو ہی ٹکٹ دیتی ہے۔'' بات کرتے ہوئے چودھری نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ بھی کرنا شروع کردیا۔ ''اور چودھری قاسم جس پارٹی میں شامل ہوا ہے، اسے بھی آپ جانتے ہیں۔ گویا چوروں اور ٹھگوں کا ایک ٹولہ ہے جس کا اقتدار میں آنے کا مقصد ہی لوٹ مار کرنا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں الیکشن جیت گیا تو ان چوروں اور ڈاکوؤں کو سبق سکھادوں گا۔ خاص کر چودھری قاسم کو تو دن میں تارے نظر آجائیں گے۔ ویسے میرا سیاست میں آنے کا مقصد چودھری قاسم سے انتقام لینا نہیں ہے کیونکہ میں انتقامی سیاست پر یقین نہیں رکھتا۔ میرا سیاست میں آنے کا مقصد صرف اور صرف انسانیت کی خدمت کرنا ہے تاکہ میں اپنی عاقبت سنوار سکوں۔ اب یہ آپ لوگوں پر ہے کہ آپ چودھری قاسم جیسے شیطان صفت آدمی کو انتخابات میں منتخب کرتے ہیں یا مجھ جیسے شریف النفس اور درویش منش انسان کو۔ شکریہ۔''

++

TAGPK.COM



بدنامی

محترم و مکرم مدیر
السلام علیکم!
یہ سرگزشت مجھے جس نے سنائی ہے وہ کافی مشہور شخصیت ہے اس وجہ سے نام مقام بدل دیا ہے۔ مجھے یہ سرگزشت اچھی لگی۔ سبق بھری لگی ہے اس وجہ سے میں اسے سرگزشت میں بھیج رہا ہوں۔

غلام قادر
(کراچی)

وہ جاوید تھا۔ میرا مطلب ہے اسکول کے رجسٹر میں اس کا نام جاوید تھا لیکن باپ کے نام کا خانہ خالی تھا کیوں کہ اس کی ماں ایک پیشہ ور عورت تھی۔ جاوید اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اس کی تینوں بڑی بہنیں بھی اس پیشہ سے وابستہ تھیں جس سے اس کی نانی اور خالائیں رہی تھیں۔ میں اس وقت نویں جماعت میں تھا جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ کلاس میں ہی نہیں وہ پورے اسکول میں اچھوت تھا میری ملاقات اس سے اس وقت ہوئی تھی جب ہم اسکول کی ہاکی ٹیم کی پریکٹس کیا کرتے تھے۔ جاوید روزانہ پریکٹس دیکھنے آتا تھا۔ ہم پریکٹس کر رہے ہوتے اور

وہ سائیڈ لائن پر بیٹھا ہمیں دیکھتا رہتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس نے یہ کیا کہ اس نے گراؤنڈ کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ وہ سائیڈ لائن سے باہر دوڑتا تھا۔ میں اسے غور سے دیکھتا تھا۔ وہ ایک کونے سے بھاگنا شروع کرتا اور دوسرے کونے تک جاتا پھر وہاں چند منٹ رک کر دوبارہ سے دوڑنے لگتا۔ میں اسکول کی ٹیم کا رائٹ ان تھا اور رائٹ آؤٹ کی پوزیشن پر جو لڑکا تھا اس کا نام فرید تھا۔ فرید ایک بھاری جسم کا لڑکا تھا اس کا اسٹک ورک بھی تقریباً صفر ہی تھا مگر وہ گیمز انچارج کا بھتیجا تھا اس لیے شاید کھیل رہا تھا۔

میں جاوید کو روزانہ دوڑتے ہوئے دیکھتا تھا، مجھے محسوس ہو رہا کہ اس کی اسپیڈ تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک شام جب ہم پریکٹس کے لیے گراؤنڈ پہنچے تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور دوڑ لگا رہا تھا۔ میں نے کپتان سے کہا، یہ لڑکا روز ہماری پریکٹس دیکھنے آتا ہے لگتا ہے کہ اسے بھی ہاکی کا شوق ہے۔

''جانتا بھی ہے یہ کون ہے؟'' کپتان کا سوال تھا۔

''اس کا نام جاوید ہے اور یہ سیون اے کا اسٹوڈنٹ ہے۔ لوگ اس سے دور رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''صرف اتنا ہی جانتا ہے۔'' کپتان نے کہا تو میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''اب تم مجھے وہ بات بتاؤ گے جس کی وجہ سے پورے اسکول نے اسے اچھوت بنا دیا ہے لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس میں اس کا کیا قصور ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔

''آخر ہے نا کمیونسٹ باپ کا بیٹا۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''میرے باپ کو درمیان میں کیوں لا رہے ہو۔'' میرا لہجہ تلخ تھا۔ ''میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر اسے شوق ہے تو موقع دینے میں کیا حرج ہے۔'' میں نے کہا۔

''گیمز انچارج ناراض ہوں گے۔'' کپتان نے کہا تھا۔

''ابھی تو ہم اسے صرف اپنے ساتھ پریکٹس کروائیں گے اس پر انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بات صرف ان کی نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ کے لڑکے بھی اس پر تیار نہیں ہوں گے۔'' کپتان نے کہا۔

''تم ہامی بھر لو باقی کو میں سنبھال لوں گا۔'' میں نے کہا تو کپتان نے تمام لڑکوں کو جمع کیا۔ سب سے پہلا اعتراض کرنے والا سلیم شاہ تھا۔ اس کی ماں بہنوں کے بارے میں جاننے کے باوجود آپ اسے اپنے ساتھ کھلانا چاہ رہے ہیں۔'' سلیم شاہ نے کہا تھا۔

''تمہارے والد پولیس میں ہیں کبھی تم نے ان سے سوال کیا کہ ان کی تنخواہ کتنی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''لائن کراس مت کرو۔'' سلیم شاہ نے بھڑکتے ہوئے کہا تھا۔

سلیم شاہ میرا ہم جماعت تھا اور ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا اس لیے بہت سی باتیں مجھ سے چھپتی نہیں تھیں۔

''لائن کراس نہیں کر رہا۔ لائن تو پورا اسکول کراس کر رہا ہے اور تم ان میں سے ایک ہو۔ اسے اس جرم کی سزا دے رہے ہو جو اس کا جرم ہے ہی نہیں۔'' میں نے کہا اور دیکھا کہ ایک دو گردنیں میری حمایت میں ہل گئیں۔

''میں بھی بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ آخر لوگوں نے اسے اچھوت کیوں بنا رکھا ہے۔'' یہ مقصود تھا ہمارے نیم کا سینئر ہاف۔

''بھائی یہ بات مجھ سے دو تین بار کہہ چکا ہے۔'' عطا حسین نے کہا جو مقصود کا چھوٹا بھائی اور ٹیم کا رائٹ ہاف تھا۔

''ایک بات میں ابھی سے کہہ دوں اگر تم لوگوں نے اسے ساتھ کھلایا تو میں ٹیم سے الگ ہو جاؤں گا۔'' شاہ سلیم نے دھمکی دی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تم نہیں کھیلو گے تو ٹیم ختم ہو جائے گی۔'' کپتان نے اس کی دھمکی کے جواب میں کہا تھا۔

''یہ مت بھولو کہ میری وجہ سے ہی ہم گزشتہ سال فائنل میں پہنچے تھے۔''

''اور فائنل میں ہم ہارے بھی تمہاری وجہ سے ہی تھے۔ عطا حسین نے کہا تھا۔ ''تم نے دو پینلٹی اسٹوکس ضائع کیے تھے اور ہم ایک گول سے ہارے تھے۔''

''پانچ پینلٹی کارنرز میں جو گول نہیں ہوا تھا اس کا ذمے دار بھی میں ہوں۔'' شاہ سلیم نے کپتان پر الزام لگایا۔

اس کے بعد تمام لڑکوں میں جاوید کے کھلانے یا نہ کھلانے پر بحث شروع ہو گئی۔ زیادہ لڑکے جاوید کے ساتھ پریکٹس پر آمادہ تھے اس لیے کپتان نے جاوید کو اشارہ کر دیا۔ وہ دوڑا دوڑا آیا۔ ''ہمارے ساتھ کھیلو گے؟'' کپتان نے سوال کیا تو جاوید نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

شاہ سلیم نے اپنے کہے کے مطابق سائیڈ لائن پر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔ دوسرا شخص جس نے اگلے روز شاہ سلیم کو جوائن کیا وہ فرید تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ کپتان نے جاوید کو

TAGPK.COM

رائٹ آؤٹ کی پوزیشن پر کھلوانا تھا۔ فرید اپنی کمزوریاں جانتا تھا اور جاوید کے آنے سے اسے اپنی پوزیشن کمزور ہوتی دکھائی دی تھی۔ دوسرے دن پریکٹس میں دو لڑکوں نے حصہ نہیں لیا تھا۔ گیمز انچارج آئے اور انہوں نے دونوں کو باہر دیکھا تو تفتیش شروع کر دی۔ ان کے علم میں جب پورا معاملہ آیا تو انہوں نے کہا۔ ''اس کا فیصلہ اب فادر ولیم کریں گے۔'' فادر ولیم ہمارے پرنسپل تھے۔ اگلی صبح پوری ہاکی ٹیم سوائے جاوید کے پرنسپل کے کمرے میں تھی۔

''جن کو جاوید کے کھیلنے پر اعتراض ہے وہ دائیں جانب کی کرسیوں پر آ جائیں۔'' انہوں نے کہا۔

شاہ سلیم وہ پہلا لڑکا تھا جو اٹھ کر دائیں جانب گیا تھا باقی سب اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

''تو سولہ میں سے دو کو اعتراض ہے۔'' فادر ولیم نے کہا اور ان دونوں کی گردنیں ہل گئیں۔

''اب اپنا اعتراض بھی بتا دو۔'' فادر ولیم نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔

''سر اس کی والدہ اور بہنوں کے بارے میں بہت بری باتیں سنی ہیں۔'' شاہ سلیم نے کہا۔

''آپ میں سے کون ہے جو حمایت میں کچھ کہنا چاہے گا۔'' فادر ولیم نے ہم چودہ لڑکوں کو مخاطب کیا تو میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔

''تو آپ نمائندگی کریں گے ان سب کی؟'' فادر ولیم نے سوال کیا پھر مڑ کر کپتان سے بولے۔ ''کپتان صاحب آپ کو کوئی اعتراض؟''

''بالکل نہیں سر۔'' اس نے کہا۔ ''اصل میں خاور ہی نے مجھے جاوید کو پریکٹس کروانے کے لیے کہا تھا۔''

''بھئی کیا کہتے ہیں آپ؟'' فادر ولیم نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔

''سر، شاہ سلیم کا اعتراض ہو سکتا ہے صحیح ہو لیکن ٹیم چھوڑنے سے بہتر ہے کہ یہ اسکول ہی چھوڑ دے، ویسے بھی اس کا اعتراض آپ پر ہے کیوں کہ آپ ہی نے اسے اسکول میں ایڈمیشن دیا تھا۔ مجھے کہنے دیں سر کہ آپ اور آپ کے ٹیچرز ہمیں پڑھا تو رہے ہیں لیکن یہ نہیں بتا رہے ہیں کہ ہمیں کس سے نفرت کرنی چاہیے اور کس سے نہیں اور یہ بھی کہ نفرت کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ اس شخص کا ذاتی کردار ہونا چاہیے یا اس کے والدین یا ان میں سے کسی ایک کے کردار کی بنیاد پر نفرت کرنی چاہیے۔'' میں نے اپنی بات مکمل کی اور دوبارہ سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''مجھے خوشی ہوئی تمہاری بات سن کر۔'' فادر ولیم نے کہا۔ ''کوئی بھی مذہب والدین میں سے کسی ایک کے کردار کی بنیاد پر اولاد سے نفرت کی اجازت نہیں دیتا۔'' انہوں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی شاہ سلیم اور فرید کی نظریں جھک گئی تھیں... پھر انہوں نے چپراسی کو بلانے کے لیے بیل بجائی۔ چپراسی آیا تو انہوں نے کہا۔ ''باہر جاوید موجود ہوگا اس سے کہو میں بلا رہا ہوں۔''

جاوید فادر ولیم سے اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی فادر ولیم نے شاہ سلیم سے کہا ''اٹھو اور اس سے گلے ملو۔''

شاہ سلیم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پرنسپل صاحب کے حکم سے انکار کر دیتا۔ وہ ابھی اپنی جگہ سے پوری طرح اٹھ بھی نہیں سکا تھا کہ جاوید نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اس کے بعد اس نے فرید کو بھی گلے لگایا۔ ''مجھ سے کوئی بھی غلطی ہوئی ہو یا میری کوئی بات آپ کو بری لگی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ ہم سب پرنسپل صاحب کے کمرے سے نکل رہے تھے کہ پرنسپل صاحب نے جاوید اور مجھے رکنے کے لیے کہا، ہم دونوں رک گئے۔

''آج کے بعد تمہیں کسی سے بھی چاہے وہ ٹیچر ہو یا کوئی اسٹوڈنٹ کسی بھی طرح کی شکایت ہو مجھ سے کہنا میں اپنے اسکول میں ایک اچھا ماحول دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ''اور تمہارا شکریہ کہ تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔''

ہم دونوں پرنسپل صاحب کے کمرے سے نکل آئے۔ انٹرول تک بات پورے اسکول میں مشہور ہو گئی تھی۔ بہت سے ٹیچرز نے جاوید کو مبارکباد دی۔ اس روز شام میں ہم پریکٹس کرنے گراؤنڈ پر پہنچے تو جاوید نئی اسٹک کے ساتھ گراؤنڈ پر موجود تھا اور ساتھ ہی اسکول کے لڑکوں کی ایک اچھی تعداد بھی پریکٹس دیکھنے آئی ہوئی تھی۔ ابھی پریکٹس جاری تھی کہ جاوید میرے قریب آیا۔ ''شام کی چائے میری طرف سے ہوگی۔''

اس نے پہلے مجھے اور پھر شاہ سلیم سمیت ٹیم کے تمام لڑکوں کو دعوت دی۔

''اتنا خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' کپتان نے کہا۔

''یہ میری جانب سے آپ سب کا شکریہ ہے۔'' اس

TAGPK.COM

کا جواب تھا۔
''جو بھی بل آئے گا اس کا آدھا میں دوں گا۔'' مقصود نے کہا۔
''آپ بعد میں کسی دن دے دیجیے گا ٹیم کو چائے پر دعوت لیکن آج تو میں ماں سے پیسے لے کر آیا ہوں اس کے لیے اور اگر میں نے وہ خرچ نہیں کیے تو یہ بے ایمانی ہوگی۔'' جاوید نے کہا۔
اگلے روز معلوم ہوا کہ جاوید کے کلاس ٹیچر نے اسے مانیٹر بنا دیا تھا۔
جاوید اب ہماری ٹیم کا ریگولر کھلاڑی تھا، پریکٹس کے ساتھ وہ میچ بھی کھیل رہا تھا۔ اس کی کارکردگی روز بروز نکھرتی جا رہی تھی۔ فرید اب مستقل ٹیم سے باہر ہو چکا تھا۔ جب انٹر اسکول کا زمانہ آیا تو گیم انچارج نے کپتان اور مجھے بلوایا اور فرید کو ریگولر ٹیم میں شامل کرنے پر زور دینا چاہا۔
''سر میں رائٹ ان ہوں۔ فرید کی وجہ سے میری کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے۔'' میں نے کہا تھا۔
میرے اور کپتان کی بھرپور مخالفت کی وجہ سے گیم انچارج نے باقی لڑکوں کو بلوالیا اور حیرت انگیز طور پر شاہ سلیم نے جاوید کی حمایت کی۔ ''سر جاوید بہت تیز بھاگتا ہے اور جس طرح وہ گیند پکڑتا ہے وہ فرید بھی نہیں کر سکتا اور اس کی وجہ سے پوری فارورڈ لائن کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔ آپ گزشتہ میچوں کی کارکردگی دیکھ لیں دس میچوں میں ہماری ٹیم نے اٹھارہ گول کیے ہیں اور ہم پر صرف تین گول ہوئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مخالف ٹیم اٹیک کرتی ہے تو جاوید پیچھے جا کر ڈیفنس کرتا ہے اور پھر جب اٹیک ختم ہو جاتا ہے تو پھر سے فارورڈ ہو جاتا ہے۔''
بحث زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی کیوں کہ مقصود اور عطا دونوں بھائیوں نے بھی جاوید کی حمایت کی۔
ہم جو سینئر تھے وہ جاوید کے کلاس کے لڑکوں سے رپورٹ لیتے رہے تھے کہ جاوید مانیٹر کیسا ہے اور ہر لڑکے نے اس کی حمایت میں ہی کہا تھا۔ ہمیں خوشی یہ تھی کہ اب جاوید کی تنہائی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے ہم جماعت تو اس سے خوش تھے ہی بلکہ اسکول کے باقی لڑکوں نے بھی اسے اچھوت سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔
انٹر اسکول شروع ہوا اور ختم ہو گیا۔ ہمارا اسکول پہلی بار چیمپئن ہوا تھا۔ اس روز صبح کے وقت فادر ولیم نے دعا کے موقع پر پورے اسکول کے سامنے ہاکی ٹیم کی تعریف کی اور کپتان کو ٹرافی کے ساتھ اسٹیج پر بلایا لیکن کپتان اپنے ساتھ جاوید کو بھی لے گیا پھر تالیوں کی گونج میں پرنسپل نے کپتان کو مائیک پر بلایا کہ کچھ کہیں۔
''گزشتہ سال بھی ہم فائنل تک پہنچے تھے لیکن جیت نہیں سکے تھے۔ ہم ایک گول سے ہارے تھے لیکن اس سال پھر ہمارا مقابلہ فائنل میں اسی ٹیم سے ہوا مگر ہم نے صفر کے مقابلے میں چار گول سے کامیابی حاصل کی ہے۔ میں اس کامیابی پر اتنا خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ایک ٹیم گیم ہے لیکن اس کی کامیابی میں سب سے بڑا ہاتھ اس کا ہے جس کے پاسز اور کراس پر تین گول ہوئے اور اسی لیے یہ آج میرے ساتھ اسٹیج پر ہے۔'' اس کے بعد ہم سب اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے مگر کچھ دیر بعد فادر ولیم نے ہمیں طلب کیا۔ ہم باری باری ان کے کمرے میں پہنچے تو وہاں جاوید ایک خاتون کے ساتھ موجود تھا۔ جب ہم تمام لڑکے پہنچ گئے تو فادر ولیم نے کہا ''یہ خاتون جاوید کی والدہ ہیں اور یہ کل لنچ پر آپ کو مدعو کرنا چاہ رہی ہیں۔'' فادر ولیم کی بات ابھی مکمل ہی ہوئی تھی کہ کپتان بول پڑا تھا۔
''مگر سر اس کے لیے ہمیں اپنے گھروں سے اجازت لینی ہوگی۔''
''میں نے یہی بات خاتون سے کہی تھی تو انہوں نے کہا کہ دوپہر میں شرفا ان گلیوں کا رخ بھی نہیں کرتے اس لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''
''دوپہر میں تو میرے گھر سے اجازت مل جائے گی۔'' مقصود نے کہا تھا اور باقی لڑکوں نے بھی اسی طرح کی بات کی تھی۔
''میری طرف سے کوئی پابندی نہیں جو جانا چاہتا ہے وہ جائے اور جس کو اعتراض ہو وہ نہ جائے۔'' فادر ولیم نے کہا تھا۔
''دو روز بعد ہم سب اور جاوید کے کلاس ٹیچر لنچ پر موجود تھے۔ فادر ولیم نے البتہ آنے سے گریز کیا تھا۔ لنچ پر جاوید کی تینوں بہنیں بھی موجود تھیں۔
مجھے شکلاً یا اطوار سے وہ ایسی نظر نہ آئیں جو ان کے بارے میں مشہور تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد بھی میں ان لوگوں کے بارے میں غور کرتا رہا لیکن پھر پڑھائی نے موقع نہ دیا کہ میں اس بارے میں غور کرتا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔
اگلے برس میں ہاکی ٹیم کا کپتان بنا اب جاوید ہماری ٹیم کا لازمی حصہ تھا۔ دوسرے برس بھی لگاتار ہم نے

TAGPK.COM

انٹر اسکول جیتا اور میں نے میٹرک کرلیا۔

میں نے کالج میں داخلہ لیا تو اور زیادہ مصروف ہوگیا تھا۔ صبح کالج اور وہاں سے آکر ہاکی کی پریکٹس اور پھر اسلامیہ کلب جاکر ٹیبل ٹینس کی پریکٹس ہوتی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی یہ عمل جاری رہتا تھا۔ ہمارے گھر پر بھی ٹیبل ٹینس کی میز تھی... کیوں کہ ابا پاکستان آنے سے پہلے ٹیبل ٹینس کے اچھے کھلاڑی رہے تھے۔ بڑی بہن نے اس عمل کو جاری رکھا تھا اور میں ان دونوں کی رہنمائی میں آگے بڑھنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ شاہ سلیم نے بھی میرے ہی کالج میں داخلہ لیا تھا مگر اب اس کے کھیل میں پہلے جیسی بات نہیں تھی اب وہ پریکٹس سیشن سے بھی غائب ہوتا تھا۔

کئی سال اسی طرح گزر گئے۔ میں ایم ایس سی میں آگیا۔ اپیا کی شادی ہوگئی۔ اس دوران ایک دن جاوید کی بہن غنچہ کا فون آگیا۔ پہلا فون تب آیا تھا جب جاوید نے نوکری کی تلاش شروع کی تھی اور میں نے اسے دبئی میں رہ رہے اپنے ماموں کا نمبر دے دیا تھا۔ فون نمبر پاکستان کا نہیں تھا۔ اس لیے پوچھا۔ ''کہاں سے بول رہی ہو۔''

''بھائی نے ہم سب کو دبئی بلوالیا تھا۔ اب ہم سب یہیں ہیں۔ تینوں بڑی بہنوں نے بیوٹیشن کے کورس کیے تھے اب وہ تینوں یہاں بیوٹی پارلر میں کام کررہی ہیں۔''

''اور تم کیا کررہی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''طلاق کے بعد میں بھی دبئی میں ہوں۔'' غنچہ کا جواب تھا۔

''طلاق کے بعد؟'' میرا اگلا سوال تھا۔

''میں نے شاہ سلیم سے کورٹ میرج کرلی تھی۔ وہ ہالینڈ شفٹ ہوا تو اس نے مجھے بھی ہالینڈ بلوایا لیکن چھ ماہ میں نے وہاں جس طرح گزارے وہ میں جانتی ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔''

''دبئی میں کیا کررہی ہو؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''اس ہوٹل میں جہاں کے جنرل منیجر آپ کے ماموں ہیں۔ وہیں بھائی بھی چیف الیکٹریشن ہیں۔ بھائی کو نوکری آپ کے ماموں نے آپ کا حوالہ دینے پر دی تھی۔''

''ماموں تو مجھے بھی دبئی بلوا رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''تو آجائیں، کیوں نہیں آرہے؟'' غنچہ نے کہا تو میں مسکرادیا۔

''ماموں کا خیال ہے کہ ان کی بڑی بیٹی کا رشتہ میرے ساتھ ہوجائے۔''

''آپ رضیہ کی بات کررہے ہیں وہ جو ڈاکٹر ہے۔'' غنچہ نے سوال کیا۔ ''اس سے اچھی بیوی آپ کو نہیں مل سکتی۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''اس لیے کہہ رہی ہوں کہ وہ ہر کام میں لائق ہے۔ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ وہ کھانا بھی بہت اچھا بناتی ہے بلکہ کبھی کبھی شوقیہ سلائی بھی بہترین کرتی ہے۔ اپنے اور گھر والوں کی سلائی وہی کرتی ہے۔'' غنچہ کی تعریف کرنے کا انداز بھی مختلف تھا پھر اسی شام میں نے اماں کو رضامندی دے دی اور اگلے ہفتہ رضیہ میری دلہن بن گئی۔

آج ہماری شادی کو دس برس ہوگئے ہیں۔ تین بچے ہیں ہمارے بڑی فاطمہ ہے پھر مریم اور اس سے چھوٹا عباس ہے۔ تینوں امریکا کے اسکولوں میں جارہے ہیں۔ اپیا اور ان کے شوہر کی کوششوں سے میں اور رضیہ شادی کے اگلے برس ہی امریکا آگئے تھے۔ ہم نیوجرسی میں ہیں لیکن ملازمت کے لیے نیویارک جاتے ہیں اور جب ہم دونوں جاب پر ہوتے ہیں تو بچوں کے لیے ہم نے گورنس رکھی ہوئی ہے۔ یہ گورنس وہی ہے جو ہمارے بچوں سے پہلے اپیا کے بچوں کی تربیت کرچکی ہیں۔ یہ اسی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ بڑی بیٹی زینب میڈیکل میں ہے اور دونوں بیٹے انجینئر بن رہے ہیں۔ اور ہاں، ایک بات تو بتانا ہی بھول گیا۔ کہانی کی ابتداء میں جو بتانا چاہیے تھا وہ میں اب بتارہا ہوں۔ جاوید کی ماں، بہن بری اطوار کی نہیں تھیں۔ ایک سازش کا شکار ہوگئی تھیں۔ اس وقت بی ڈی ممبر ہوا کرتے تھے۔ انہیں وہی سیاسی قوت حاصل تھی جو آج کے ایم پی اے کو حاصل ہے۔ جاوید کے علاقے کا بی ڈی ممبر جاوید کی بڑی بہن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جاوید کے ابا کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس بی ڈی ممبر نے یہ سوچا تھا بے سہارا، ماں تین تین بیٹیوں کا ساتھ، وہ فوراً راضی ہوجائے گی مگر ہوا الٹا، وہ کمزور عورت اس سیاسی شخصیت کے آگے ڈٹ گئی۔ غصے میں بی ڈی ممبر نے اپنے حواریوں کی مدد سے محلے بھر میں نہ صرف زبانی بدنام کیا بلکہ پوسٹر چھپوا کر شہر... کی دیواروں پر چسپاں کرادیا تھا اور لوگ انہیں غلط سمجھنے لگے تھے۔ وقت نے ثابت کردیا کہ وہ عورتیں کس قدر شریف تھیں۔ جاوید وہیں دبئی میں رہ رہا ہے اسی کی بہنیں بھی خوش وخرم ہیں۔ اس بی ڈی ممبر کا انجام بہت برا ہوا۔ اس کی سازش نے وقتی پریشانی دی ضرور جو راحت میں بدل گئی۔

++

TAGPK.COM



دستِ مسیحائی

محترم مدیر
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی کچھ الگ انداز کی ہے۔ کورونائی قہر سے لڑتے ایک مسیحا کی ہے۔ اس پر کیا گزری اسے میں نے سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے۔

تنزیلہ احمد
(اوکاڑہ)

آنکھوں کو کالی پٹی سے ڈھانپ کر اسے اچھے سے گھما دیا گیا تھا۔

پھر ''پاپا مجھے ڈھونڈ لیں۔'' کی شرارت بھری آواز اس کی سماعتوں میں اتری اور ساتھ ہی بیٹے اور بیوی کے زندگی سے بھرپور قہقہے سنائی دیے۔ وہ بھی زیرِلب مسکرا دیا تھا۔

کچھ ہی پل میں سب آوازیں یک دم تھم گئیں۔ شاید ''ڈھونڈ لیں۔'' کہنے والا چھپ گیا تھا۔ دونوں بازو ممکن حد تک پھیلا کر ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے وہ اندازے سے انجان سمت میں آگے بڑھا۔ دھیمے دھیمے اٹھتے ننگے پاؤں کو نفاست سے تراشی ہوئی گھاس گدگدی کرتی محسوس ہوئی

تھی۔ اپنے گھر کے لان میں وہ اپنے پانچ سالہ اکلوتے بیٹے کے ساتھ ایک بچہ بنا ہوا تھا۔

''کہاں ہو بھئی؟'' اس نے جاننا چاہا۔

''پاپا ادھر۔'' کوئی عین پاس سے بولا تھا۔ جب تک وہ ادھر کو مڑا کوئی سرسراتا ہوا دور بھاگ گیا تھا۔ اگلے پانچ منٹ تک قہقہے اور آوازیں ماحول کا سکوت تار تار کرتی رہیں۔ بالآخر اس نے سرسراتی ہوا کو یک دم ہاتھ بڑھا کر تھاما اور ''پکڑ لیا'' کا نعرہ بلند کیا۔ آنکھوں سے پٹی کھینچی اور اسے دونوں بازوؤں کے حلقے میں تھام کر متاع جان کی طرح سینے سے بھینچ لیا۔ پورے دس روز کے بعد آج اسے اتنی فرصت ملی تھی کہ بیوی بچے کے ساتھ اچھا وقت بتا سکے۔ تھکے ہوئے اعصاب گھریلو ماحول پاتے ہی پُرسکون اور تازہ دم ہو گئے تھے۔

''شکر میرے مولا! اپنے پیارے کتنی بڑی نعمت ہیں۔ الحمدللہ۔'' دل شکر گزاری کے جذبے سے لبریز تھا۔

''احسان صاحب، چلیے بہت ہو گیا۔ اب مجھ ناچیز پر تھوڑا احسان کیجیے اور اندر چلیے۔ میں کھانا لگانے لگی ہوں!'' لاڈ سے کہتی ہوئی وہ اندر کو چل دی تھیں۔ کچھ ہی منٹوں بعد وہ دونوں باپ بیٹا بھی کھلکھلاتے ہوئے اندر کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

☆☆☆

دنیا پر ناگہانی آفت کی طرح ٹوٹنے والی وبا کسی خون آشام بلا کی مانند اپنے تیز پنجوں سے انسانوں کو نوچنے کھسوٹنے لگی تو دنیا سٹپٹا گئی۔ کوئی بھی اس بلا سے نمٹنے اور اس کے جبڑوں سے تڑپتی بلکتی زندگی کو بازیاب کرانے کے لیے مکمل طور تیار نہ تھا۔ جو سوچتے تھے کہ وہ محفوظ ہیں ان کے سر پر مشکل پڑی تو آئیں ہائیں شائیں کرنے لگے۔ کیسے محفوظ رہیں، کیا کریں، کسے مدد کے لیے پکاریں، بوکھلاہٹ سی بوکھلاہٹ تھی۔ اپنے ملک کی سرحدیں دوسرے ممالک کے شہریوں کے لیے بند کیں، کاروبار زندگی معطل کر کے لوگوں کو گھروں میں محفوظ رہ کر جان بچانے کے سندیسے دیے مگر وبا بے دردی سے اپنے پنجے گاڑتی چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر اور قرب و جوار کے سبھی اسپتال مریضوں سے بھرتے گئے تھے۔ ان کی تعداد زیادہ تھی جنھوں نے احتیاط نہ کی اور وبا نما بلا کو جھٹلاتے رہے۔

مسیحاؤں کی ڈیوٹی تو ویسے ہی صبر آزما ہوتی ہے ایسے میں وبا نے کام اور مشکلات بہت بڑھا دی تھیں۔ سرکاری اسپتال میں وبا سے متاثر ایسے مریض داخل تھے جن کا تعلق خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے بے کس طبقے سے تھا۔ ڈاکٹر احسان سمیت تمام طبی عملہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھے متاثرین کے علاج معالجے میں پیش پیش تھا۔ مسیحائی ان کے لیے صرف پیشہ نہیں بلکہ عبادت تھی اور نیک نیتی عبادت کی شرط ٹھہری۔ ایسی خدمت جس کا صلہ انھیں دونوں جہانوں میں ملنا تھا۔ گو کہ طبی عملہ عام لوگوں سے زیادہ احتیاطی تدابیر سے آشنا ہوتا ہے مگر ان کے متاثر ہونے کے امکان بدقسمتی سے زیادہ تھے۔ عالمی وبا کی پہلی لہر سے بے دریغ لڑنے والے ان فرنٹ لائن فوجیوں کے پاس ضروری حفاظتی سامان کی قلت تھی۔ کوئی پیچیدہ ٹیکنالوجی اور مہنگے آلات درکار نہ تھے صرف ماسک، پلاسٹک کا حفاظتی لباس اور جراثیم کش اسپرے کی ضرورت تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ یہ کمی کسی ایک ملک کا مسئلہ نہ تھی۔ عالمی طاقتیں جیسے امریکا، برطانیہ اور دیگر ممالک سے بھی ایسی خبریں سامنے آئی تھیں جہاں ڈاکٹرز اور طبی عملہ ماسک، حفاظتی لباس اور تحفظ کے ضروری سامان کی عدم دستیابی پر شکوہ کناں تھے۔

دنیا بھر کے اسپتالوں میں جب او پی ڈی بند کر دی گئیں تب پاکستان میں او پی ڈی کھول دی گئی تھی۔ مربوط ضابطہ کار واضح نہ تھا اور نہ ہی جاری شدہ ایس او پیز کا مکمل اطلاق دیکھنے میں آتا تھا۔ دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی کورونا وائرس سے ڈاکٹرز سمیت طبی سہولیات بہم پہنچانے والا عملہ شکار بننے لگا تھا۔ وعدوں کے باوجود حکومت طبی عملے کو مکمل حفاظتی سامان کی فراہمی یقینی نہیں بنا پائی تھی۔

☆☆☆

لاک ڈاؤن کے باعث کام کی صورتِ حال غیر تسلی بخش اور نئے آرڈر نہ ہونے کے برابر تھے۔ اپنے سامنے اسکیچ بک رکھے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''فرنٹ لائن پر خدمات فراہم کرنے والے مسیحاؤں کے لیے پرسنل پروٹیکٹو گیئرز کی کمی بہت بڑا مسئلہ ثابت ہو رہی ہے۔ اس وجہ سے طبی عملہ مہلک وائرس سے بری طرح متاثر ہونے لگا ہے۔ ینگ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کے سربراہ کے مطابق بہت سے اسپتالوں میں ڈاکٹروں کے لیے حفاظتی لباس جسے PPE کہا جاتا بہت کم تعداد میں موجود ہے۔'' ایک نجی چینل پر طرح دار لڑکی نے جیسے ہی خبر بریک کی وہ بری طرح چونک اٹھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد پاس دھرا موبائل اٹھایا اور عجلت میں ایک نمبر ڈائل کیا۔ بیل جا رہی تھی

کچھ ہی پل میں کال اٹھا لی گئی۔

''ہیلو! کریم میں تمہیں کچھ تفصیلات وٹس ایپ کر رہا ہوں۔ اس کے مطابق تمام چیزیں ارینج کرو جلد از جلد۔ سب کو اطلاع کر دو کل ہم یونٹ میں ملیں گے۔''

دوسری جانب سے ''اوکے سر'' سنتے ہی کال کاٹ دی گئی تھی۔ انگلیاں اسمارٹ فون پر تیزی سے کچھ ٹائپ کر رہی تھیں۔

اگلے روز چہروں کو ماسک سے ڈھانپے وہ سب ملک کے مشہور و معروف فیشن ڈیزائنر عاصم جوفا کے اسٹیچنگ یونٹ میں موجود تھے۔

''ہم سب کی شناخت پاکستان ہے۔ میں آج جو بھی ہوں اپنے ملک کی وجہ سے ہوں۔ محبت، نام، پہچان سبھی اس وطن سے وابستہ ہے۔ آزمائش کی اس گھڑی میں ہمیں متحد ہونا ہے۔ مجھے اپنے عملے کی مدد چاہیے۔ کیا آپ سب میرا ساتھ دیں گے؟'' عاصم کے کہنے پر سب نے تحیر سے اسے دیکھا تھا۔ وہ ان کا باس تھا بھلا وہ کسی بھی کام سے انکار کیسے کر سکتے تھے؟

''ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ بتائیے کیا کرنا ہے؟'' یونٹ انچارج کریم نے دو قدم بڑھ کر آگے ہوتے ہوئے کہا تو سب نے اس کی تائید کی۔

''دنیا بھر میں کورونا وائرس کی وبا پھیلنے کی بدولت ہر شخص، ہر شہر اور ہر ملک کو ہی اس سے خطرہ لاحق ہے مگر کورونا کے مریضوں کا علاج کرنے والا طبی عملہ وائرس کے سیدھے نشانے پر ہے۔ ہمیں مسیحاؤں کی مدد کرنی ہے۔ میڈیکل اسٹاف کے لیے PPE's تیار کرنے ہیں۔ وبا سے لڑنے والوں کو حفاظتی لباس تیار کر کے فراہم کرنا ہے۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر ہر لفظ ادا کیا تھا۔

''ہو جائے گا سر۔ آپ کی ہدایت کے مطابق خام مال خریدا جا چکا ہے۔ ہم آج سے ہی سلائی کا کام شروع کریں گے۔'' کریم نے پُرعزم انداز میں کہا تو وہ زیرِ لب مسکرا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد اسے سب اپنے کام میں تندہی سے جتے نظر آئے تھے۔ کٹنگ یونٹ میں دھڑا دھڑ کٹنگ ہونے کے بعد مشینوں پر مستعد بیٹھے عملے کو سلائی کے لیے لباس کے ٹکڑے پہنچائے جا رہے تھے۔ آج شام تک سپلائی کے لیے معقول تعداد تیار ہو سکتی تھی۔ مطمئن ہو کر اس نے موبائل پر ایک اور نمبر ڈائل کیا۔ اسے اس سرکاری اسپتال میں فوری اطلاع کرنی تھی جہاں حفاظتی لباس کی زیادہ ضرورت تھی۔

گزشتہ سات برس سے ''گرین پاکستان کلین پاکستان'' کے نام سے وہ ایک مہم بھی چلا رہا تھا۔ کسی بھی ادارے کی مدد لیے بنا اپنے مل بوتے پر کراچی کے مختلف مقامات پر صفائی کرنے کا نیک کام خوش اسلوبی سے کیا جا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو پاکستان کا ہر حصہ سبزے اور شادابی سے بھر دیتا۔

مطلوبہ معیار کے حفاظتی لباس تیار ہو چکے تھے۔ عاصم کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اسٹیچنگ یونٹ میں PPE تیار کرنے والے سارے عملے نے اجرت لینے سے یہ کہہ کر انکار کیا ''نیکی میں ان کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔'' ان کے اس مثبت عمل کی بدولت اس کے دل میں ان کے لیے عزت و قدر کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ سب بھی وبا کی تباہ کاریوں کا شکار بنے تھے۔ کام نہ ہونے کے باعث ان کے گھروں کے چولہے بھی ٹھنڈے پڑنے والے تھے۔ ایسے میں کام کی اجرت کو اللہ کی رضا اور نیکی کی نیت کی خاطر خود ٹھکرا دینے کے پیچھے احساس نامی جذبہ کارفرما تھا۔ وطن عزیز سے محبت ان سب کے خون میں شامل تھی۔

جلد ہی وہ آئیسولیشن سوٹ، جے پی ایم سی کے علاوہ پولیس، رینجرز، ڈینٹل انسٹیٹیوٹ اور ڈی سی ساؤتھ کو بھی فراہم کرنے والے تھے۔ وہ پُرامید تھا کہ پاکستان بھر میں PPE's بھجوانے کے بھی جلد قابل ہو جائے گا۔

☆☆☆

طبی عملہ اسپتال کے قرنطینہ میں داخل مریضوں کی دن میں 13 گھنٹے تک روزانہ دیکھ بھال کر رہا تھا اور یہ ہمت و حوصلہ کے بل بوتے پر ہی ممکن تھا مگر جب سے ڈاکٹر جاوید کورونا سے متاثر ہوئے تو ان سب میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔

''مریضوں کی تعداد میں اضافہ تشویش ناک تو ہے مگر ہمیں ہنگامی صورتِ حال میں بھی پُرسکون رہنا ہوگا۔ جانتی ہوں کہ سہولیات اور ساز و سامان کم ہے۔ یہ ڈر بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ سامان مزید کم ہو سکتا ہے۔ آنے والے وقت میں حالات کیسے کروٹ لیں ابھی ٹھیک سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' اسپتال کے اسٹاف روم میں ڈاکٹر سیمی کے الفاظ گونجے تھے۔

''ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ مریضوں کے لیے اسپتالوں میں طبی سہولیات، بستروں، ادویات اور

TAGPK.COM

خصوصاً وینٹی لیٹرز کی قلت ہے۔ ہمارے پاس بھی وبا سے بچاؤ کے لیے ذاتی حفاظتی لباس اور کٹس موجود نہیں ہے۔ ہم اپنے جسموں کو پلاسٹک کے شاپروں اور اسکیلنگ کرنے والے چشموں سے ڈھانپ کر ذاتی حفاظتی کٹس کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔'' ڈاکٹر احسان کے کہنے پر ملی جلی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

''دنیا میں نیک لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ مصیبت کی گھڑی میں ایسے ہی نیک لوگ آسانیاں پیدا کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک اچھی خبر ہے۔ ملک کے نامور فیشن ڈیزائنر عاصم صاحب مشکل کی اس گھڑی میں انسانیت کی مدد کی خاطر آگے بڑھے ہیں۔ انھوں نے حفاظتی لباس تیار کر کے ہمیں مفت میں فراہم کیے ہیں۔ جلد ہی ہمارے پاس ایک ماہ کا اسٹاک ہوگا۔'' ڈاکٹر سیمی کے الفاظ ٹھنڈی پھوار کی مانند ان سب کے سلگتے اعصاب پر برسے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب واپس اپنی ڈیوٹی پر چل دیے تھے۔

''یہ مٹی بہت زرخیز ہے۔ کل ہی سنا کہ کراچی کے دو نوجوان بھی اسپتال کو محض اپنی لاگت کی قیمت پر کورونا سے دفاع کے لیے گیارہ ہزار حفاظتی لباس فراہم کر رہے ہیں۔ انھوں نے آئسولیشن سوٹ کی تیاری تب ہی شروع کر دی جب چین کے شہر ووہان میں کورونا وائرس کی وبا پھوٹی اور جب وبا نے پاکستان میں جلوے دکھانے شروع کیے تب تک وہ آئیسولیشن سوٹ تیار کر چکے تھے۔ احتیاطی تدابیر کے پیشِ نظر انھوں نے .....

اسپتال سے رابطہ کیا اور حفاظتی لباس کے نمونے معیار پر پورے اترے۔'' ڈاکٹر احسان کے ہم قدم ڈاکٹر اسامہ نے انھیں آگاہ کیا تھا۔ ان کے چچازاد اسپتال میں ڈاکٹر تھے۔

''سنا ہے کہ ایک PPE پر 650 پاکستانی روپے کے قریب لاگت آتی ہے۔ سلائی کے بعد جراثیم سے پاک کرنے پر الگ خرچا ہوتا ہے۔ آفریں ہے ایسے افراد پر جو بالکل مفت فراہم کر رہے ہیں اور قابلِ داد ہیں وہ بھی جو مشکل کی اس گھڑی میں منافع کمانے کی بجائے اسی لاگت کے برابر قیمت پر ہی فراہم کر رہے ہیں۔'' گفتگو کرتے ہوئے وہ کووڈ کے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں پہنچ گئے تھے۔ ان دونوں کی ڈیوٹی اسی وارڈ میں تھی۔ صرف ایک جذبہ ان پر حاوی تھا اور وہ تھا انسانیت کی خدمت۔ زندگی کے ہر شعبے میں وبا سے لڑنے کی خاطر کام کرنے والے سب ہی اپنی اپنی جگہ پر مسیحا تھے۔

☆☆☆

رات بھر کی ڈیوٹی کے بعد صبح کی سپیدی ظاہر ہونے پر وہ تھکے ہارے گھر میں داخل ہوئے۔ اندر جانے کی بجائے وہ سیدھے باہر والے کمرے میں گھسے تھے۔ گزشتہ چار روز سے ان کا ناتہ گھر والوں سے ٹوٹ چکا تھا۔ جب سے وبا نے شدت اختیار کی اور ان کی ڈیوٹی کووڈ کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں لگی وہ جز وقتی طور پر گھر کے باہر کمرے میں منتقل ہو گئے تھے۔ طبی عملے پر اسپتال کی جانب سے بھی پابندی عائد تھی کہ وہ اسپتال میں پہننے والا لباس باہر استعمال نہ کریں۔ ڈیوٹی سے گھر جاتے وقت اسپتال ہی میں چھوڑ کر جائیں۔ جب سے طبی عملے کو معلوم پڑا تھا کہ ہاتھوں کے بعد سب سے زیادہ خطرناک لباس ہو سکتا ہے انھوں نے احتیاط ہر ممکن حد تک بڑھا دی تھی۔

حفاظتی لباس سے کورونا وائرس تیزی سے منتقل ہوتا کیونکہ سب سے زیادہ جراثیم لباس اور ہاتھوں کو ہی لگتے تھے۔ کسی مریض کا معائنہ کرنے پر مریض کے خون، کھانسی یا منہ سے نکلنے والے بخارات ڈاکٹر یا نرس کے ہاتھوں یا لباس پر لگ جاتے تھے۔ ہدایت کے پیشِ نظر اور گھر والوں کی حفاظت کو فرض کی طرح معتبر گردانتے ہوئے دوسرے ڈاکٹرز کی طرح ڈاکٹر احسان نے بھی خود کو کچھ وقت کے لیے علیحدہ کر لیا تھا۔

وہ واش روم سے نکلے تو لاشعوری طور پر ان کی سماعتیں ایک آواز کی منتظر تھیں۔

''ٹھک ٹھک ٹھک۔'' شیشے کی دیوار گیر کھڑکی پر ننھے ہاتھوں کی دستک سنتے ہی وہ کھل اٹھے۔

''پاپا۔'' پنجوں کے بل اونچا ہو کر فہد کھڑکی کے شیشے سے منہ اور دونوں ہتھیلیاں چپکائے کھڑا تھا۔

''میری جان'' شیشے پر دھرے اس کے ننھے ہاتھ کے عین سامنے ان کی طرف کے شیشے پر انھوں نے اپنا ہاتھ رکھ کر بیٹے سے انسیت کا اظہار کیا۔

''پاپا میں اندر آ جاؤں؟''

معصوم سے سوال پر انھوں نے سر ہلکے سے نفی میں ہلا دیا۔

''پلیز!'' اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے التجا کی تو ان کے دل کو کچھ ہوا۔

TAGPK.COM

''نہیں میری جان!'' اُس کے انکار پر معصوم چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔ بیٹے کا اترا چہرہ دیکھ کر آنسو دھیرے سے اس کے اندر کلبلانے لگے تھے۔ وہ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ گزشتہ ایک روز میں اسپتال میں کورونا سے پانچ ہلاکتیں ہوئی تھیں۔

''یہ لیجیے آپ کا ناشتا تیار ہے۔'' گرما گرم چائے، پراٹھے اور آملیٹ ٹرے میں رکھے ہنستی مسکراتی وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ آہستگی سے اس نے دروازہ کھول کر دیوار کے ساتھ دھرے میز پر ٹرے رکھ دی تھی۔

''میرا پیارا بچہ! آؤ اندر چلیں، آپ کے پاپا بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ناشتا کر کے آرام کریں گے۔'' شوہر کی طرف مسکراہٹ اچھال کر بیٹے کا ہاتھ تھامے وہ گھر میں داخل ہوگئی تھی۔ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی خاندان کے بیچ وہ کسی مسافر کی طرح رہ رہا تھا۔ لمبی ڈیوٹی کے باوجود نیند اس کی تھکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بیوی کے ہاتھ کا بنا ناشتا اسے بہت پسند تھا مگر آج پسندیدہ رزق کے نوالے حلق سے اتارنے مشکل ہو رہے تھے۔ دل کی کیفیت بیاں سے باہر تھی۔

ایک ایک کر کے کئی اداس چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے تھے۔

سب سے پہلا چہرہ ارمانوں سے بھری اک جواں سال چنچل لڑکی کا تھا۔ کبھی وہ زندگی سے بھرپور تھی۔ پیاروں کی آنکھوں نے اس کی خوشیاں دیکھنے کے ارمان سجائے ہوں گے۔ وہ دنیا جیتنا چاہتی ہوں گی۔ بے فکری اور خواہشوں سے بھری اس لڑکی کے ہزاروں خواب و ارمان اس کے ساتھ ہی جھٹکے کھا کھا کر کچھ سیکنڈز میں دم توڑ گئے تھے۔

دوسرا چہرہ تکلیف سے بے حال ہوتی اس بے چاری ماں کا تھا جو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کی حسرت اداس آنکھوں میں سموئے دنیا سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ گئی تھی۔ وہ آخری وقت تک اٹکتے ہوئے کہتی رہی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے اپنے بچوں کے لیے جینا ہے۔'' مگر موت کہاں کسی کی سنتی ہے۔

تیسرا چہرہ اس بدنصیب دکھیارے باپ کا تھا جس نے زندگی کی ساری جمع پونجی اولاد کو قابل بنانے میں لگا دی تھی مگر موذی وبا میں اسی ناہنجار اولاد نے اپنے شجر سایہ دار کو بے آسرا چھوڑنے میں ایک لمحے کے لیے نہ سوچا تھا۔ بوڑھے چہرے پر کندہ تفکر اور لاچاری ان کے ذہن پر نقش ہو چکی تھی۔ آخری وقت تک اس کی بوڑھی نظروں میں انتظار جم کر کھڑا رہا تھا۔ شیشے کے بیرونی دروازے کی جانب اٹھی اس کی نظریں انتظار کی سولی پر لٹکے لٹکے پتھرا گئی تھیں۔ اس بدنصیب کا بوڑھا ناتواں وجود بہت تڑپا تھا۔ شاید جان بھی یوں نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ کتنی خسارے میں تھی ایسی اولاد جنھوں نے بیماری اور موت کے ڈر سے اس باپ کو تنہا مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا جس نے انھیں اپنے خون سے سینچا تھا۔ اندر سے تو وہ شاید اسی روز مر گیا تھا جب دل نے محسوس کیا کہ اس کے پیارے اس سے منہ موڑ چکے ہیں۔ گو کہ ایک روز مرنا تو انھیں بھی تھا۔

یہ مسیحاؤں کی ہمت اور حوصلہ ہی تھا کہ وہ ان کے لیے بھی ہر وقت موجود رہتے جنھیں موت کے ڈر سے اپنوں نے موت کے دشت میں بھٹکنے کے لیے جیتے جی چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

انتہائی نگہداشت کا وارڈ کورونا کے مریضوں سے بھرا پڑا تھا۔ کووڈ کے مریضوں کے علاوہ تمام بیماریوں کا علاج اس وقت ڈاکٹروں کو غیر اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ حتیٰ کہ کینسر کے مریضوں کا معائنہ بھی منسوخ کر دیا گیا تھا۔ متعدد بیماریوں کا شکار افراد کی قوت مدافعت کم ہونے کی بدولت وبا سے انھیں زیادہ خطرہ لاحق تھا۔ عوام کو دو میٹر کے سماجی فاصلہ برقرار رکھنے کا حکم تھا۔ جب کہ طبی عملہ کورونا کے مشتبہ مریضوں کا بیس سینٹی میٹر کے فاصلے سے معائنہ کرتا۔ طبی عملے کا متاثرہ مریضوں سے ایک ہی دن میں کئی بار براہِ راست رابطہ ہوتا جس کی وجہ سے مریض کے جسم سے نکلنے والے مواد کے ذریعے وائرس انھیں منتقل ہو سکتا تھا۔ اسپتالوں میں صفائی کے عملے سے لے کر لیب ٹیکنیشنز، نرسیں، ڈاکٹرز غرض کہ جو بھی وبا سے متاثرہ مریضوں کے ساتھ کام کرتا اس میں وائرس کا شکار بننے کے امکانات موجود رہتے تھے۔

پہلی لہر میں موذی وبا کے بارے میں درست معلومات موجود نہ ہونے کے باعث ڈاکٹرز وائرس کی 'انفیکشس ڈوز' (جراثیم کی کم سے کم مقدار جو کسی انسان کو متاثر کر سکتی ہے) کے بارے میں آگاہ نہ تھے۔ کتنے دکھ کی بات تھی کہ دوسروں کی جان بچانے کے لیے خود کو داؤ پر لگانے والے معلومات کی عدم موجودگی کے ساتھ ساتھ بنیادی ساز و سامان کی کم یابی کی بدولت مکمل طور پر اپنی حفاظت نہیں کر پا رہے تھے۔

ڈاکٹر احسان کے ساتھی ڈاکٹر عمار کی طبیعت نازک

TAGPK.COM

تھی۔ خون میں آکسیجن کی مقدار خطرناک حد تک کم ہوگئی تھی۔ اتنی کم کہ دیکھ بھال کرنے والے طبی عملے کو لگا کہ ''ان کی آکسیجن تو زندہ رہنے کے لیے درکار مقدار سے بھی بہت کم ہے۔'' وہ وینٹی لیٹر پر تھے اور باقی تمام ڈاکٹر دل ہی دل میں پریشان۔

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اللہ میرے بچے کو شفا ضرور دے گا۔'' ان کے چہروں پر مایوسی کے سائے لہراتے دیکھ کر ڈاکٹر عمار کی والدہ پُرامید لہجے میں کہتی تھیں۔ اپنے رب پر مکمل یقین کے بھروسے انھوں نے دعائیں اور نوافل کی انتہا کردی تھی۔ گھر میں بیوی اور اہلِ خانہ بھی ان کی صحت یابی کے لیے خصوصی طور پر دعا گو تھے۔ یہ ان سب کے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھا کہ تین دن انتہائی نازک حالت میں وینٹی لیٹر پر رہ کر ڈاکٹر عمار معجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔ اچھی خبر پر ڈاکٹر احسان سمیت سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

محبت، احساس، کامل یقین اور دعا کی طاقت ان کے سامنے آہستہ آہستہ خود سانس لے رہی تھی۔ ڈاکٹر عمار کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ اب ان سب کو ڈاکٹر اسامہ کی فکر تھی۔ وہ بھی گزشتہ دو روز سے وینٹی لیٹر پر تھے۔ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں داخل کووڈ کے مریضوں کے لیے دوا کے ساتھ اب دعا بھی کی جانے لگی تھی۔ گو کہ اب ان کے اسپتال میں حفاظتی لباس اور ضرورت کا سامان موجود تھا مگر اس سلسلے میں سب سے اہم بات حفاظتی سامان کا درست استعمال کرنا تھا۔

صرف پی پی ای کا ہونا کافی نہ تھا... بلکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ طبی عملہ، مریضوں کو لانے لے جانے والے افراد اور کورونا سے ہلاک ہونے والوں کی آخری رسومات انجام دینے والے لوگ بھی پی پی ای کا درست استعمال جانتے اور کرتے مگر لوگوں کی جانب سے کہیں نہ کہیں کوتاہی کی جارہی تھی اپنے نجی کلینکس پر مریضوں کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹرز بھی وبا سے متاثر ہوئے تھے اور وہ بھی جو اسپتالوں میں قائم کورونا وارڈز میں مریضوں کے علاج کے لیے ڈیوٹی پر موجود رہتے تھے۔ ان متاثرین میں سے بیشتر کو ان کے گھروں میں ہی قرنطینہ کیا گیا تھا۔ جب کہ ایک سو ستّر کے قریب فرنٹ لائن ڈاکٹز، نرسیں اور ہیلتھ کیئر ورکرز اسپتالوں میں زیرِ علاج تھے۔

ڈاکٹرز کو یہ بھی پریشانی تھی کہ بعض متاثرین میں علامات تک ظاہر نہیں ہوئی تھیں۔ اسپتالوں کے او پی ڈی میں معمول کے معائنے کے لیے جانے والے متاثرہ افراد لاشعوری طور پر ڈاکٹرز اور نرسوں کو متاثر کررہے تھے۔ کچھ ڈاکٹرز کے بھی یہی حالات تھے۔ ان کے پاس شفا کے لیے آنے والے مریض نامحسوس طور پہ موذی مرض کو اپنے ساتھ گھر لے جارہے تھے۔

کچھ روز قبل ہی انھیں خبر ملی تھی کہ مالاکنڈ ڈسٹرکٹ میں ڈاکٹر وحید بھی کورونا وائرس کا شکار بن بیٹھے تھے مگر ان کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹر وحید میں بھی بظاہر کوئی علامات جیسے کھانسی یا بخار نہ تھا تاہم ٹیسٹ مثبت آیا۔ انھوں نے خود کو گھر میں ہی قرنطینہ کرلیا تھا اور لوگوں سے بھی محدود رہیں، محفوظ رہیں کی اپیل کی تھی۔

پورے ملک میں دو ہزار کے لگ بھگ پیرامیڈیکل اسٹاف متاثر ہوا اور 30 کے قریب جان کی بازی ہار گئے تھے۔

☆☆☆

گزشتہ تین روز سے ڈاکٹر احسان کو گلے میں خراش اور جسم میں ہلکی سی حرارت محسوس ہورہی تھی۔ ذہنی و جسمانی تھکاوٹ بھی خوب تھی۔ انھیں لگا کہ ایسی حالت دن رات کی سخت ڈیوٹی کی وجہ سے ہے مگر پھر ڈاکٹر سیمی کے اصرار پر آج انھوں نے ٹیسٹ کروالیا تھا۔ جس کی رپورٹ تاحال نہیں ملی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل وہ گھر لوٹا تھا۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہوا ہی تھا کہ موبائل بج اٹھا۔ شناسا نام دیکھتے ہی ہرے رنگ کے دائرے پر انگلی پھیری اور موبائل کان سے لگالیا۔ دوسری جانب سے جلدی میں کوئی خبر سنائی گئی تھی۔

''واٹ۔ اونو۔ ہاؤ اٹ کڈ بی۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹا اور بستر پر گر پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بری طرح چکراتے سر کو تھاما۔ گرم نمکین سیال آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہنے لگا تھا۔

''میرے خدایا۔ یہ کیا ہوگیا۔'' بتیس سالہ ڈاکٹر اسامہ کا جوانی اور زندگی کی لالی چھلکاتا پُرکشش چہرہ اس کی نظروں میں گھومنے لگا تھا۔ ایسے کیسے دیکھتے ہی دیکھتے ایک کڑیل جوان مرد کو وبا اپنے خونی جبڑوں میں دبوچ کر لے گئی تھی۔ اس بار موت کی اٹل حقیقت معجزے پر غالب آگئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر ہنستے مسکراتے باتیں کرتے اپنے دوست ڈاکٹر اسامہ کا چہرہ آرہا تھا۔ موذی وبا کی دوسری لہر تو پہلی سے بھی زیادہ مہلک ثابت

ہونے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

اسپتال سے نکلنے سے پہلے ڈاکٹر احسان نے اپنی بیوی کو موبائل پر میسج کیا۔ خصوصی ہدایت دی کہ کسی بھی صورت فہد کو باہر نہ آنے دیا جائے۔ کووڈ نیگیٹ کی رپورٹ مثبت آئی تھی۔ شدید تھکاوٹ اس کے اعصاب پر غالب آنے لگی تو ساتھی ڈاکٹرز کی طرف سے اسپتال میں قرنطینہ ہونے کی درخواست کی گئی تھی۔ گھر پر اس کی نگہداشت ممکن نہ تھی۔ چودہ روز کے لیے قرنطینہ ہونے سے پہلے وہ ایک بار بیوی اور بچے کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔

چہرے پر ماسک اور ہاتھوں پر دستانے پہنے جب وہ داخلی دروازے سے اپنے گھر میں داخل ہوا تو گھر کے اندرونی دروازے پر فہد ماں کا ہاتھ تھامے منتظر کھڑا تھا۔ بہادری سے مسکراتی اس کی بیوی حاملہ تھی۔ مضطرب سے بیٹے کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بھاگ کر باپ کو چپک جائے۔ ڈاکٹر احسان اپنی جگہ مجبور تھے۔ اس کا بس چلتا تو تین جانوں کو سینے سے یوں لگاتا کہ کبھی جدا نہ ہو سکتے۔

''پاپا.....!'' فہد ان کے پاس آنے کو مچلا تھا۔ ماں نے اس کا ننھا ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

''پاپا لو یو اینڈ یور ماما! میری جان اپنا اور ماما کا بہت خیال رکھنا۔'' بے ساختہ ان کے منہ سے الفاظ پھسلے تھے۔

''ان شاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہماری دعائیں اور پیار آپ کے ساتھ ہے۔'' بیوی نے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ جانتا تھا کہ اس کے نازک دل پر قیامتیں ٹوٹ رہی ہوں گی۔ اور فہد۔ ہاں وہ اسے بھی سنبھال لے گی۔ یہ تو اسے اب معلوم پڑا تھا کہ گھر بار چلانے والا وہ نہیں بلکہ وہ تھی جو تن تنہا پورے گھر اور بچے کو اتنے دنوں سے خوش اسلوبی سے سنبھال رہی تھی۔ آنکھیں میں دھند اترنے لگی تو وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ کچھ ضروری سامان لے کر وہ باہر کھڑی گاڑی کی طرف چل دیا تھا۔

''پاپا پاپا...'' اپنے پیچھے روتے مچلتے فہد کی آواز سنائی دی تو دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو کبھی نہ جا پاتا۔ ہمیشہ کے لیے وہیں پتھر کا ہو جاتا۔

اس نے دروازہ شکستہ قدموں سے پار کیا تو وہ مچلتے بلکتے فہد کو بمشکل اندر لائی۔ اس کی اپنی حالت بھی غیر ہونے کو تھی۔ گھر کا سربراہ موجود نہ تھا۔ رات ڈھلتے ہی گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ پہلے یقین ہوتا کہ چاہے جتنی لمبی ہی کیوں نہ ہو ڈیوٹی سے واپس آجائیں گے مگر اب۔ پتا نہیں اس کا دل اتنا کیوں ڈوب رہا تھا۔ اسپتال سے کی گئی ویڈیو کال پر فہد نے جی بھر کر باپ سے گلے شکوے کیے تھے۔ وہ اسے دیکھنے جانا چاہتی تھی مگر روک دیا گیا تھا۔

دو روز بعد اسپتال سے بلاوا آیا تو وہ گھبرا گئی۔ خاص ماسک اور دستانے خود بھی پہنے، فہد کو بھی پہنائے اور ہولتے دل کے ساتھ اسپتال جا پہنچی۔ اس کی آنکھیں انھی کی منتظر تھیں۔ وہ وینٹی لیٹر پر تھا۔ شیشے کے پار دھندلے سے اپنے دکھائی دیے تو دل کی دھڑکن اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔

آنکھوں کی نمی چھپا کر وہ مسکراتی ہوئی تکلیف کی اس گھڑی میں سب سے مضبوط سہارا ثابت ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ننھی سی جان جس میں ان کی جان بستی تھی۔

کیسی بے بسی تھی کہ وہ جان سے پیاروں کا لمس بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے بیٹے کے ماتھے پر بوسا دے کر اور اس کے ننھے ہاتھ تھام کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ''اپنی ماں اور آنے والے بہن بھائی کا ہمیشہ خیال رکھنا۔'' خوبصورت اور عزیز از جان بیوی کو گلے سے لگا کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔ تمہارے سنگ زندگی کی کئی بہاریں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے اس بچے کی قلقاریاں سننا چاہتا ہوں جس کے دنیا میں آنے میں چند ماہ باقی ہیں۔''

وہ اسے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ ''اتنی دراز عمر چاہیے کہ ہمارے بچے پھلے پھولیں، جوان ہو جائیں اور ہم مل کر ان کی خوشیاں دیکھیں۔''

ضبط کے بندھن ٹوٹنے کو بے تاب تھے۔ سانس کی ڈور کچے دھاگے کی سی تھی۔ آج ڈاکٹر احسان کی آنکھوں پر کوئی پٹی نہ تھی مگر پھر بھی اندھیرا چھانے لگا تھا۔ دماغ پر غنودگی چھا رہی تھی۔ زندگی دھیرے دھیرے اندھیرے میں ڈوب رہی تھی..... مگر دست مسیحائی ہمیشہ کے لیے فاتح ٹھہرا تھا۔

زار زار روتے ہوئے بے دم ہو کر وہ وہیں فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ اپنے شوہر کی زندگی کی خاطر مسز ڈاکٹر احسان رب العالمین کے حضور تہہ دل سے گڑگڑا رہی تھی۔ اشکوں سے تر دامن پھیلائے بیٹھی تھی۔ ایسے عالم میں بھی اس نے آس اور اُمید کا دامن مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ہاں اسے کسی معجزے کا انتظار تھا۔

++

TAGPK.COM

جمال کی عمر دس سال ہوگی جن دنوں اس کے والد اللہ دتہ ایک ٹریفک حادثہ میں شدید زخمی ہوئے تھے۔ وہ موٹر سائیکل پر کام سے واپس آرہے تھے کہ ایک تیز رفتار بس کے ڈرائیور نے سامنے سے آنے والے ایک ٹرک سے بچنے کے لیے ان کی موٹر سائیکل کو پیچھے سے ٹکر ماردی، وہ سڑک پر قلابازیاں کھاتے ہوئے کھیتوں میں جا گرے تھے۔ ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور سر پر بھی شدید چوٹیں آئیں۔ یہ حادثہ اس بس کے پیچھے آنے والے ایک اور موٹر سائیکل سوار نے بھی دیکھا تھا جس نے ان کی مدد کرتے ہوئے گیارہ بائیس پر کال کردی جنہوں نے اسے بروقت اسپتال پہنچادیا۔ اس حادثے

جناب مدیر سرگزشت

سلام مسنون!

یہ ایک سبق آموز سی کہانی ہے کیونکہ سچ میں کڑواہٹ ہوتی ہے۔ اسے کہانی سمجھ کر نہ پڑھیں۔ حالات کے نشیب وفراز کی عکاسی ہے یہ، والدین کا سایہ سر سے ہٹ جائے تو کس طرح رشتے دار پہلو تہی کرلیتے ہیں اس کا بیان ہے ایسے وقت پر کیا فیصلہ کرنا چاہیے یہی کچھ بیان کیا ہے۔

اختر سردار چوہدری
(کسووال)

انمول رشتے



TAGPK.COM

کے تین گھنٹے بعد جمال کے گھر والوں کو علم ہوا۔ جمال اور ننھی فردوس اپنی والدہ اور چچا طفیل کے ساتھ اسپتال جا پہنچے والد کی حالت دیکھ کر جمال سے زیادہ اس کی بہن فردوس جس کی عمر چھ سال ہوگی کی حالت بری ہوگئی۔ وہ پاپا جی۔ پاپا جی کرتی ان سے لپٹ گئی۔

اس وقت تک اس کے والد ہوش میں آ چکے تھے لیکن ڈاکٹروں نے کسی سے بات کرنے اور حرکت کرنے سے منع کیا تھا۔ جب ننھی فردوس اپنے باپ سے جدا ہوئی تو ایک ڈاکٹر نے نرمی سے پکڑ کر اسے جدا کر دیا۔ اس وقت فردوس کا چہرہ دیکھ کر جمال کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ نہ جانے بہن بھائی کے درمیان کون سا محبت کا بندھن ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کا درد محسوس ہو جاتا ہے۔ فردوس کے چہرے پر بے بسی کا وہ عکس جمال کئی دن تک بھول نہ سکا۔

اس کے والد کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی جو باقی بچی تھی وہ ڈاکٹروں نے آپریشن سے کاٹ دی۔ ایک ماہ کے بعد اس کے والد اسپتال سے گھر آ گئے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہو چکے تھے۔ اس ایک ماہ میں ان کے گھر جو جمع پونجی موجود تھی وہ تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ان کے سر قرض بھی بہت چڑھ گیا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ رشتے دار بھی عیادت کرنے آتے رہتے تھے۔ وہ کھانے پینے کے لیے اپنی پسند ایسے بتاتے جیسے کسی ولیمے پر آئے ہوں۔ ''صغراں بہن گوشت چاول بنانا ہو تو مرغے کا گوشت نہ منگوانا مجھے ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔'' کوئی کہتا ''چائے بنا چینی کے بنانا۔ بس کیا کریں یہ عادت جاتی نہیں ہے۔'' کسی کی فرمائش ہوتی۔ ''بھائی صاحب کے لیے سوپ بناؤ تو میرے لیے بھی ایک کپ بنا دیجیے گا۔'' ایک مہمان نے تو حد ہی کر دی کہنے لگے ''بھائی اللہ دتہ کو زیادہ سے زیادہ گوشت کھلائیں۔ لاؤ پیسے میں لا دیتا ہوں۔'' مردوں کا یہ حال تھا اور خواتین بھی ان سے پیچھے نہیں تھیں۔ ان کی فرمائشیں سن کر لگتا جیسے وہ کسی شادی پر آئی ہوں یا کسی پارٹی میں، اپنے بچوں کی پسند بھی بتائی جاتی۔

جمال کی والدہ صغراں اور جمال سارا دن بھاگ بھاگ کر ان کی فرمائشیں پوری کرتے۔ کئی ایک مہمان تو تین تین چار چار دن وہاں ہی ڈیرہ ڈال لیتے۔ دو ماہ بعد ان کے گھر میں کچھ سکون ہوا۔ اب کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ کئی ایک کو اللہ دتہ نے فون بھی کیے کہ ہمیں کچھ پیسے دے جائیں میں نے جیسے ہی کام شروع کیا واپس کر دوں گا۔ تو انہیں بڑے تحمل سے ٹال دیا گیا۔

اب فاقوں نے گھر میں ڈیرہ ڈال لیے تھے۔ کہتے ہیں جب مصیبت آتی ہے تو تنہا نہیں آتی اپنے ساتھ دکھ، پریشانیاں، غلط فیصلے اور دیگر بہت کچھ لے کر آتی ہے۔ ان تنگی دستی کے دنوں میں جو جمال نے سب سے پہلی تبدیلی محسوس کی وہ رشتہ داروں کا بدلتا رویہ تھا۔ جب یہ حالات ہوئے تو جمال کی ماں تلخ مزاج ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف بیساکھی کے سہارے اس کے والد چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے لیکن کوئی کام یا نوکری چھ ماہ میں بھی حاصل نہ کر سکے۔ جس ملک میں صحت مند اور باہنر لوگ بے روزگار ہوں اس ملک میں ایک معذور کو کون نوکری پر رکھتا۔ اس کی بہن فردوس ہر وقت اپنے پاپا کی خدمت میں پیش پیش رہتی پہلے وہ ہنستی مسکراتی، چہچہاتی، کھلکھلاتی رہتی تھی اب اداس اور پریشان رہنے لگی۔ سارا سارا دن چپ چاپ رہتی اور خاموشی سے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتی رہتی۔

جمال کلاس پنجم کا طالب علم تھا۔ وہ ایک گورنمنٹ اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ اس کی والدہ نے لوگوں کے گھروں میں کام کی تلاش شروع کر دی۔ پہلے ان کے گھر میں صفائی کے لیے اور ہفتہ وار کپڑوں کی دھلائی کے لیے نوکرانی رکھی ہوئی تھی۔ اب اسی نوکرانی سے صغراں نے کہا کہ اس کے لیے کسی گھر میں کام تلاش کر دے۔ اس رات جس وقت گھر میں یہ باتیں ہو رہی تھیں جمال کے والد اللہ دتہ کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ ان کے پاس اسپتال لے کر جانے کی سہولت نہ تھی۔ صغراں اپنے خاوند کو تڑپتا دیکھ کر خود اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ پورے گھر میں صرف جمال ہی با حواس تھا، جو خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ بھاگ کر پڑوسیوں کے گھر گیا ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ کافی دیر بعد پوچھا گیا۔ ''کون ہے۔''

''میں جمال ہوں۔ وہ ابو کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

''اچھا تم چلو گھر میں آتا ہوں۔'' جمال واپس پلٹا تو اس کے والد پسینے سے نہائے ہوئے تھے اور والدہ ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ اب اس کے والد نارمل سانس لے رہے تھے اور سیدھے ہو کر بیٹھے تھے۔ پڑوسی اصغر علی کافی دیر بعد آیا۔ حال احوال پوچھ کر واپس چلا گیا۔ دوسرے دن صغراں نے کام پر جانا تھا لیکن اللہ دتہ کی طبیعت خراب ہونے کے سبب نہ جا سکی لیکن اس رات جمال نے ایک فیصلہ کر لیا۔ دوسرے دن وہ اسکول جانے کی بجائے اڈے پر بنے ایک ہوٹل پر چلا گیا۔ اس کے مالک کا نام منظور تھا۔ چچا منظور، اللہ دتہ کا دوست بھی تھا۔ اس ہوٹل پر اللہ دتہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتا

تھا۔ کئی ایک بار جمال اپنے والد کے ساتھ وہاں آچکا تھا کئی بار گھر میں کسی ضروری کام کے لیے وہ اسے اس ہوٹل سے بلا کر لے کر گیا تھا۔ اس ہوٹل کے علاوہ اس کے والد اپنا وقت کہیں اور نہیں گزارتے تھے۔

''بیٹے کیسے آنا ہوا، اب تیرے والد کیسے ہیں۔'' چچا منظور نے اسے دیکھ کر کہا۔

''چچا میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ آپ سے ایک کام ہے۔'' جمال نے اٹک اٹک کر کہا۔

''ہاں بتاؤ۔ میرے کرنے کا ہوا تو ضرور ان شاء اللہ۔'' منظور نے ہمت بندھائی۔

''مجھے آپ کے پاس کام کرنا ہے۔ میں گاہکوں کو کھانا اور چائے پیش کیا کروں گا۔'' آخر جمال نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''تم تو اسکول پڑھنے جایا کرتے ہو کیا تعلیم چھوڑ دو گے؟'' چچا منظور نے حیرت سے پوچھا۔

''جب والد چارپائی سے لگ جائے تو تعلیم میں دل نہیں لگتا۔''

''تمہارے رشتے دار کیا مدد نہیں کر رہے؟ وہ تمہارا ماموں ماجد تو کہہ رہا تھا وہ ہر ماہ خرچا دے رہا ہے۔ ایک دن ملا تھا مجھے۔'' منظور نے مزید حیرت سے کہا۔

یہ بات سن کر جمال کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''نہیں ہمیں کوئی خرچ نہیں دے رہا، ماموں ماجد تو جب سے ابا حادثے کا شکار ہوئے ہیں صرف ایک بار ہمارے گھر آئے ہیں۔'' جمال نے بے زاری سے کہا۔

''اچھا پریشان نہ ہو بیٹا تم یہ دو سو روپے لے جاؤ اور گھر میں راشن دے کر کل سے کام پر آجانا۔'' چچا منظور نے اسے پیسے دیتے ہوئے کہا۔ اس طرح جمال کی زندگی بدل گئی، وہ صبح اسکول جانے کی بجائے ہوٹل پر پہنچ گیا اور وہاں ویٹر بن کر کام کرنے لگا۔ جب اس کے والد کو اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر بڑی دیر تک روتے رہے۔ دن مہینے گزرتے چلے گئے۔ ایک دن اس کے والدین کے درمیان کسی بات پر اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ ''جب سے شادی ہوئی ہے میں نے تمہارے گھر میں کبھی سکھ نہیں دیکھا۔'' صغراں نے کہا۔

''میں نے جان بوجھ کر اپنا ایکسیڈنٹ نہیں کروایا۔ تم تو ہر وقت ناشکری کرتی رہتی ہو، میری بہن فاطمہ کو دیکھ لو کبھی اس کے منہ سے ناشکری کے الفاظ نہیں سنے۔ اس کے خاوند کے انتقال کو کئی سال ہو گئے ہیں اور اس کا کوئی سہارا بھی تو نہیں ہے، اللہ نے اسے اولاد جیسی نعمت سے بھی محروم رکھا ہے وہ پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتی ہے۔'' اس کے والد نے کہا۔

''ہنہ!''

''اللہ نے تمہیں دو پھول جیسے بچے دیے ہیں، بیوی کی وفاداری کا علم مشکل وقت میں اور خاوند کی بے روزگاری میں ہی ہوتا ہے۔'' جمال کے والد نے کہا۔ ایسی باتوں سے بات مزید بڑھی تو اس کی والدہ نے غصے میں اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ جمال اور فردوس روکتے رہے لیکن جب مغرب کی اذان ہو رہی تھی اس کی والدہ فردوس کی انگلی پکڑے گھر سے چلی گئی۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد اس کے والد کو دل کا دوسرا دورہ پڑ گیا۔ جمال کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔

اس کے والد تڑپ رہے تھے اور وہ روئے جا رہا تھا۔ پھر اس کے والد ساکت ہو گئے۔ جمال نے روتے ہوئے اپنے والد کو ہلایا تو وہ ایک طرف کو لڑھک گئے۔ وہ بھاگ کر پڑوسی اصغر علی کے گھر پہنچا۔ جلد ہی اہل محلہ اکٹھے ہو گئے۔ اس کے والد کو اسپتال لے جایا گیا وہاں سے ان کی موت کی تصدیق کر دی گئی۔ سارے خاندان کو خبر ہوئی۔ اس کی والدہ ابھی اپنے میکے پہنچی ہی تھی کہ اس کے خاوند کی موت کی خبر پہنچ گئی۔ وہ فردوس کو انہی قدموں پر ساتھ لیے واپس پلٹ آئی۔

لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جانے والے واپس نہیں پلٹ سکتے تھے۔ چند دن ان کے گھر رشتے داروں اور اہل محلہ کی آمد و رفت رہی اس کے بعد پھر وہی ویرانی اور تنہائی، وہ ہی مسائل بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر تھے۔ اب جمال کو چپ لگ گئی، بیوہ پھوپی فاطمہ جواب ان کے گھر رہ رہی تھی، جمال اس سے کھل کر بات کر لیا کرتا تھا، وہ اپنے والد سے بہت محبت کرتا تھا۔ ایک ہفتے بعد ہی اس نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ اب اس کی والدہ کو بھی کام مل گیا۔ اس نے گھر میں ہی سلائی کا کام شروع کر دیا۔ جمال ہر وقت والد کے خیالوں میں کھویا رہتا۔ وقت تیزی سے گزرا جمال سولہ برس کا ہو گیا۔ اس کی بہن اسکول جایا کرتی، جمال نے موٹر سائیکل لے لیا تھا۔

اپنی بہن کو موٹر سائیکل پر اسکول چھوڑ کر وہ ہوٹل پر چلا جاتا۔ اس نے ہوٹل کا تقریباً سارا کام سیکھ لیا تھا۔ چچا منظور نے ایک طرح سے ہوٹل اس کے سپرد کر دیا تھا۔ ایک دن ایک باریش بزرگ ان کے ہوٹل پر آئے۔ جمال نے انہیں چائے پلائی۔ وہ جمال کے اخلاق سے متاثر ہوئے تو کہنے لگے۔ ''کسی نیک باپ کی اولاد لگتے ہو۔'' ان کی یہ دعا سن کر جمال

TAGPK.COM

کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

''کیا ہوا بیٹے۔ اداس کیوں ہو گئے ہو۔'' بزرگ نے پوچھا۔

''میرے والد اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں ان سے بہت پیار کرتا تھا۔ میں ان کی خدمت نہ کر سکا۔'' جمال نے حسرت سے کہا۔

''افسوس ہوا یہ سب سن کر لیکن ان کی خدمت تو اب بھی کر سکتے ہو۔''

ان کی یہ بات سن کر جمال نے جلدی سے پوچھا۔ ''وہ کیسے ممکن ہے بابا جی۔''

بزرگ کے نورانی چہرے پر نور پھیل گیا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''اگر آپ اپنے والد کے ساتھ ان کی وفات کے بعد خیر خواہی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے نیک کاموں کو کرنا شروع کر دیں اس کا ثواب انہیں ملتا رہے گا۔''

''آپ بتائیں میں ضرور عمل کروں گا۔'' جمال نے کہا۔

''سب سے پہلے نماز قائم کرو اور ہر نماز میں اپنے والد کی بخشش کے لیے دعا کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ۔

''(میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی، ہمارے پروردگار! اور ہماری دعا بھی قبول فرما، ہمارے پروردگار! مجھے اور میرے والدین اور تمام مومنوں کو قیامت کے دن مغفرت عطا فرما۔)''

''بابا جی یہ تو نماز والی دعا ہے۔''

''ہاں بیٹے یہ نماز والی ہی دعا ہے اس لیے میں نے نماز قائم کرنے کا کہا ہے۔ آپ نماز کا ترجمہ یاد کریں اور اہتمام سے نماز قائم کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب انسان فوت ہو جائے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے ماسوائے تین چیزوں کے: صدقہ جاریہ، علم جس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو، نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔ نماز قائم کرنے کے ساتھ اپنے والد کی طرف سے صدقہ خیرات کریں۔'' بابا جی نے یہ کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بیٹے تم ایک نیک انسان ہو میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ آپ کو اپنے والد سے محبت کا بہترین صلہ اور جزا عطا فرمائے اور انہیں معاف فرمائے۔''

اس واقعہ کے بعد جمال نے نماز کا ترجمہ یاد کرنا شروع کر دیا اور جلد ہی اس نے نماز پابندی سے ادا کرنا شروع کر دی۔ اب جب بھی کوئی فقیر اس کے ہوٹل پر آتا ہے، وہ اسے صدقہ خیرات بھی دیتا۔ والد سے محبت کا حق بعد از موت ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

☆☆☆

''سب کی امی تو ان سے بہت پیار کرتی ہیں ہماری امی ہم سے پیار نہیں کرتیں۔'' فردوس نے اپنے بھائی کو بتایا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ ہماری امی نفسیاتی مریض ہیں۔ وہ پیار ہم سے بہت کرتی ہیں۔'' جمال نے اپنی بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ نفسیاتی مریض کیا ہوتا۔'' فردوس کا سوال سن کر جمال نے کافی دیر سوچا لیکن اسے کوئی معقول جواب سمجھ نہیں آیا اس لیے اس نے کہا۔ ''کسی دکھ یا حادثے سے جب کوئی بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے تو اس کا دماغ صحیح طور پر کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔'' جمال نے کافی دیر سوچنے کے بعد اپنی بہن کو بتایا۔

''وہ سلمیٰ ہے ناں، وہ کہہ رہی تھی تمہاری امی پاگل ہے۔'' فردوس نے عام سے لہجے میں کہا تو جمال کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''جو حساس لوگ ہوتے ہیں انہیں لوگ پاگل ہی کہتے ہیں۔ تم ان باتوں کو دل پر نہ لیا کرو۔'' جمال نے اپنی بہن فردوس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

خاندان کے ہتک آمیز رویہ اور لوگوں کے طعنے سن سن کر اس کی والدہ کی طبیعت چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ وہ اکیلے بیٹھے بیٹھے بڑبڑاتی رہتی تھی۔ بات بے بات غصے میں رہنے لگی تھی۔ اس کی وجہ حالات کا دباؤ برداشت نہ کر سکنا بھی تھا۔ حالات کے دباؤ، غربت کا ہونا، ہمارے ہاں غربت کو ویسے بھی جرم سمجھا جاتا ہے۔ ایک مسلمان اکثریتی ملک میں ایسا سمجھنے والے لوگوں کا اسلام سے کتنا تعلق ہے اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، خاندان بھر کے طعنے جیسے خاوند کے حادثے کا وہی سبب ہے، لوگوں کا انہیں حقیر سمجھنا وغیرہ اس کے ذہنی دباؤ کا باعث بن گیا تھا۔

اس سے کہیں زیادہ سبب تھا حالات کو تبدیل نہ کر سکنا۔ اس کا بے بس ہونا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر لی کہ کہیں باعزت کام مل جائے جس سے اپنا اور اپنے بچوں کا بوجھ اٹھا سکے لیکن ایسا اس خود غرض اور حرص و ہوس بھرے معاشرے میں ممکن نہ تھا۔ یہاں لوگ دوسروں کو تنگ، بے بس، مجبور اور پریشان دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔

TAGPK.COM

ایسے حالات میں انسان کس طرح جیے یہ ایک سوالیہ نشان ہے اس پر ایک اور ذہنی دباؤ بھی تھا کہ جس دن اللہ دتہ پر جان لیوا دل کا دورہ پڑا تھا اس دن میاں بیوی میں ناچاقی ہوئی تھی اور وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

ابھی وہ ماں کے گھر پہنچی ہی تھی کہ شوہر کی موت کی اطلاع ملی یعنی کہ اس کی دنیا لٹ چکی ہے، وہ اجڑ چکی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی ہی نظروں سے گر گئی تھی وہ خود کو اپنے خاوند کی موت کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔

انہی سب وجوہات نے اس کے ذہن پر اثر ڈالا اور وہ پاگل پن کے قریب پہنچ گئی۔

ماں کی بگڑتی حالت جمال کے سامنے تھی وہ سب دیکھ اور سمجھ رہا تھا کیونکہ وقت نے اسے عمر سے زیادہ سمجھ دے دی تھی۔

وہ شام ڈھلے جب گھر آتا تو ماں کا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ اب اس کی والدہ کو کبھی کبھار ہی دورہ پڑتا۔ اس کی تو دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ وہ زندہ تھی تو صرف اپنے بچوں کے لیے تھی۔ جمال جو بھی کماتا اس میں سے زیادہ تر تو والدہ کی دواؤں پر لگ جاتا۔ ایک دن وہ صبح کی نماز پڑھنے مسجد گیا تو مولوی حشمت علی صاحب نے اس سے والدہ کی طبیعت کا پوچھا۔

''والدہ کبھی ٹھیک ہو جاتی ہیں تو کام وغیرہ کرتی ہیں، صاف ستھرائی کرتی ہیں، گھر کا کھانا بھی بنا لیتی ہیں لیکن دو تین دن بعد جب بیمار ہو جاتی ہیں تو ہفتوں لگ جاتے ہیں ان کی طبیعت ٹھیک ہونے میں۔'' جمال نے مولوی صاحب کو بتایا۔

''جب بیمار ہوتی ہیں تو کھانے کا انتظام کیسے کرتے ہو۔''

مولوی صاحب کے پوچھنے پر اس نے بتایا: ''میں اکثر شام کا کھانا ہوٹل سے لے آتا ہوں۔ صبح ہم چائے اور ڈبل روٹی وغیرہ سے ناشتا کر لیتے ہیں، دوپہر کو بہن اسکول سے آ جاتی ہے تو رات کا رکھا کھا لیتی ہے۔'' جمال نے مکمل تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''جمال بیٹا اپنی ماں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا کرو، ماں کے قدموں تلے جنت ہے، اپنی والدہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرو۔ اس کا بہت اجر و ثواب بھی ہے۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا۔ اللہ کے رسولؐ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے دوبارہ پوچھا: ان کے بعد؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے پھر کہا کہ ان کے بعد؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے۔۔ ایک بار پھر پوچھا کہ ان کے بعد؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا والد۔ اس لیے بیٹا اپنی ماں کی خوب عزت کرو، خدمت کرو اور ماں کی کسی بھی بات پر اف تک نہ کہو۔'' اتنا کہہ کر رکے پھر سانس لے کر بولے۔

''اس کے علاوہ بیٹا! ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمی پیدل چلے جا رہے تھے کہ بارش ہونے لگی، اس پر انہوں نے پہاڑ میں ایک غار کی پناہ لی، تو اچانک ان کے غار کے منہ پر ایک چٹان آ گری، جس سے غار کا منہ بند ہو گیا، اس پر انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: تم اپنے انتہائی نیک اعمال کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اس پر ان میں سے ایک نے یہ دعا کی: اے اللہ! میرے ماں باپ بہت ہی بوڑھے تھے۔ میں باہر لے جا کر اپنے مویشی چراتا تھا۔ پھر جب شام کو واپس آتا تو ان کا دودھ نکالتا اور برتن میں پہلے اپنے والدین کو پیش کرتا۔ جب میرے والدین پی لیتے تو پھر بچوں کو اور اپنی بیوی کو پلاتا۔ اتفاق سے ایک رات واپسی میں دیر ہو گئی اور جب میں گھر لوٹا تو والدین سو چکے تھے۔ اس نے کہا کہ پھر میں نے پسند نہیں کیا کہ انہیں جگاؤں بچے میرے قدموں میں بھوکے پڑے اونچی آواز میں رو رہے تھے۔ میں برابر دودھ کا پیالہ لیے والدین کے سامنے اسی طرح کھڑا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اے اللہ! اگر تیرے نزدیک میں نے یہ کام صرف تیری رضا حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، تو ہمارے لیے اس چٹان کو ہٹا کر اتنا راستہ تو بنا دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چنانچہ وہ پتھر کچھ ہٹ گیا۔ والدین کی عزت و احترام اور ان کی خدمت، حسن سلوک اولاد پر فرض ہوتا ہے۔''

جمال نے مولوی صاحب سے وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے والد تو اس دنیا سے جا چکے ہیں، ان شاء اللہ میں اپنی پوری کوشش کروں گا اپنی والدہ کی خدمت کرنے کی۔''

جمال اپنی والدہ کا علاج شہر کے بڑے ڈاکٹروں سے بھی کرواتا رہا جن کی ادویات سالہا سال وہ کھاتی رہی لیکن اکثر بیمار ہی رہتی تھی۔ جمال کو اپنی والدہ کے ساتھ بہن کا بھی خیال رکھنا پڑ رہا تھا لیکن وہ ہمت نہیں ہار رہا تھا۔ وہ کام پر جاتے ہوئے اپنی بہن کو اسکول چھوڑ کر جاتا۔ والدہ کی بیماری کے لیے دوا کے ساتھ وہ تعویز اور دم درود کے لیے بھی مولوی

TAGPK.COM

حضرات اور جس کسی پیر وفقیر کا علم ہوتا اس کے پاس لے جاتا۔ وہ بہت حیران ہوتا جب اس کی والدہ بغیر کسی وجہ کے ناراض ہو جاتی۔ اس سے بات کرنا چھوڑ دیتی تھی۔ وہ چپ چاپ ہی رہتی تھی، گم صم سی ہو جاتی اسے کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہتا۔

جمال کو وہ دن بہت یاد آتے تھے جب اس کے والد حیات تھے اور صحت مند زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ روز صبح کے وقت موٹر سائیکل پر شہر کام کرنے جایا کرتے تھے۔ وہ غلہ منڈی میں ایک آڑھت پر منشی تھے۔ وہ روزانہ شام کو گھر واپس آتے ہوئے بھائی بہن کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لاتے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خاص خیال رکھتے۔ والد اور والدہ کی آپس میں نوک جھوک سے دونوں بہن بھائی لطف اندوز ہوتے تھے۔ کتنے حسین دن تھے وہ لیکن اب یہ سب خواب وخیال ہو چکے تھے۔

''بھائی اب ہم کبھی سیر کرنے نہیں جاتے۔'' ایک دن اسے فردوس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ پاپا کے ساتھ چلا گیا۔''

جمال نے بہن کو سمجھایا۔ ''ہمارے پاپا ہی کیوں اللہ کے پاس چلے گئے۔ باقی سب کے باپ تو زندہ ہیں؟'' فردوس نے مشکل سوال کر دیا۔ دونوں بہن بھائی صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے سردیوں کا موسم تھا۔ اس دن عید کا دوسرا دن بھی تھا۔ ہوٹل سے بھی چھٹی تھی۔ کیونکہ عید پر اسے تین چھٹیاں ہوتی تھیں۔ ''چچا منظور کہتا ہے یہ آزمائش ہے۔ ہمیں اس مشکل وقت کا سامنا کرنا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنا ہے اور صبر کرنا ہے۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔'' جمال نے سوچ کر جواب دیا۔

''یہ دن گزر گئے تو کیا پاپا واپس آ جائیں گے۔ ہم پہلے کی طرح سیر کرنے رشتے داروں کے پاس جایا کریں گے۔ ہماری ماں پہلے کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کیا کرے گی'' فردوس نے خوش ہو کر پوچھا۔

جمال ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ ''نہیں بہن ہم بڑے ہو جائیں گے پھر ہمیں صبر آ جائے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''صبر تو ہم اب بھی کر رہے ہیں۔ بھائی! جب ہم کچھ کر نہیں سکتے تو اسے صبر کرنا ہی کہتے ہیں۔'' اس سوال کا جواب جمال کے پاس نہیں تھا۔ اسی وقت ماں نے اسے آواز دی۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر چلا گیا۔ ماں کا رویہ کبھی بہت خوش ہوتا کبھی اداس ہوتا۔ جب دورہ پڑتا تو وہ گالیاں بھی دینے لگتی تھی۔ جمال جانتا تھا کہ ماں ایک نفسیاتی مریض ہے۔ اس لیے وہ ان کی کسی بھی بات کا برا نہیں مناتا تھا، بعد میں جب ان کی طبیعت ٹھیک ہو جاتی تو پھر وہ اپنی غلطی مان بھی لیتی تھیں۔ جمال اپنی ماں کا پہلے سے بہت زیادہ خیال رکھنے لگا۔

وقت کا کام چلتے رہنا ہے اچھا وقت آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ برا وقت بھی آتا ہے گزر جاتا ہے۔ اس کے والد کے جاتے سے پہلے سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا... پھر اچانک برا وقت شروع ہو گیا۔ والد کی وفات کے بعد ان کی زندگی مزید مشکل ہو گئی۔ اس مشکل وقت میں اپنوں کا ساتھ چھوڑ جانا مزید باعث دکھ تھا۔ والد کی وفات کے پانچ سال بعد ہی اس کی والدہ بھی اس دنیا سے کوچ کر گئی۔ دورے تو اسے پڑتے رہتے تھے، وہ چیختی چلاتی تھی خود کو برا بھلا کہتی تھی، اس دن بھی اچانک ایسا ہی ایک دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس نے وہی دوا اپنی والدہ کو دی تھی لیکن اس کے بعد اس نے خون کی الٹیاں کرنا شروع کر دیں۔ جمال اور فردوس کے علاوہ ان کے گھر اس دن اس کا ماموں طفیل بھی آیا ہوا تھا۔ جب تک ماموں طفیل اپنی بہن کو اسپتال لے کر جاتا، وہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ جمال اور فردوس اپنی جنت، اپنی ماں کو کھو چکے تھے۔ ان کی دنیا ہی لٹ چکی تھی۔

ایک بار پھر سارے خاندان والوں نے اپنا منہ دکھایا' اس بار ان میں سے چند ایک نے جمال اور فردوس کو اپنے ساتھ رکھنے کا عندیہ بھی دیا لیکن جمال اب سولہ سال کا ہو چکا تھا۔ اس نے صاف جواب دے دیا۔ ''ہم دونوں بہن بھائی اس آبائی گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔''

کافی دنوں کے بعد ان کی پھوپی فاطمہ جو کہ بیوہ تھی اور کافی ضعیف ہو چکی تھی ان کی اولاد بھی نہیں تھی، ان سے ملنے آئی۔ جمال نے ان سے کہا کہ وہ اپنی خدمت کا موقع انہیں دیں، ہمارے پاس ٹھہر جائیں۔ یوں گھر میں ایک بزرگ کا اضافہ ہو گیا۔

اس کے بعد جمال اپنی بہن کو اسکول چھوڑ کر ہوٹل کام پر چلا جاتا۔ چھٹی کے وقت بہن کو اسکول سے گھر چھوڑ جاتا۔ اس نے موٹر سائیکل بھی خرید لیا تھا۔ ویسے بھی اسکول زیادہ دور نہیں تھا اور محلے سے بہت ساری لڑکیاں پیدل بھی اسکول جایا کرتی تھیں۔ اگر کسی دن جمال فردوس کو واپس نہ لا سکتا تو وہ ان کے ساتھ آ جایا کرتی تھی۔ یوں دونوں بھائی بہن کی زندگی کا سفر ایک نئے موڑ سے شروع ہو گیا۔

☆☆☆

جمال کو وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب اس کے والد

TAGPK.COM

حیات تھے اور والدہ بھی کتنے اچھے اور سہانے دن تھے وہ بھی۔ دونوں بہن بھائی اکھٹے اسکول جایا کرتے، گھر میں اور اسکول میں اکثر وہ اپنی بہن کو تنگ کیا کرتا۔ کبھی بال پکڑ کر کھینچ لیا، کبھی اس کی چیزوں کو چھپا لیا۔ فردوس پاپا کو بھائی کی شکایت لگایا کرتی تھی۔ ''پاپا آج جمال نے میری پینسل تراش کر کے ساری ختم کر دی۔'' پاپا اس کی ساری شکایت سنتے اور جمال کو ڈانٹ دیتے۔ ''تم نے میری بچی کی پینسل کیوں ختم کر دی۔ چلو تمہیں اب نئی پینسل نہیں ملے گی۔ بلکہ میں اپنی بیٹی کو لے کر دوں گا۔'' فردوس اس سے خوش ہو جاتی۔

جب کبھی فردوس ناراض ہوتی تو وہ اپنی پاکٹ منی سے بازار سے کھانے پینے کی کوئی چیز لا دیتا۔ ''یہ لو تیرے لیے لایا ہوں اب تو منہ سیدھا کر لو۔'' وہ کہتا اور فردوس خوش ہو جاتی۔ جب کبھی جمال کی کسی غلطی کی وجہ سے اسے پاپا سے ڈانٹ کا خطرہ ہوتا تو وہی بہن جو روز شکایت لگایا کرتی اس دن اس کی ڈھال بن جاتی۔ ''پاپا بھائی سے غلطی ہو گئی ہے۔ اسے کچھ نہ کہنا۔''

پاپا اس کی سفارش سن کر مسکرا دیتے تھے۔ بچپن میں بہن بھائی کے دم سے ہی گھر میں خوشیاں رنگ بکھیرتی ہیں۔ ان کے گھر میں بھی ان کے دم سے ہی خوشیاں تھیں۔ دونوں بھائی بہن کا الگ الگ کمرا تھا۔ وہ اپنے کمرے کو مختلف چیزوں اور کھلونوں سے سجا کر رکھتے۔ ان کے والد اور والدہ ان کے پیار محبت کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

دونوں ایک دوسرے سے لڑتے، جھگڑتے، روٹھتے اور پھر خود ہی مان بھی جاتے۔ پل بھر میں لڑنا اور پھر خود ہی مان جانا۔ ایسے ہی زندگی گزر رہی تھی۔ جمال اپنی بہن فردوس سے چار سال بڑا تھا۔

☆☆☆

اس وقت جمال کی عمر سولہ ساڑھے سولہ سال ہو چکی تھی اور اس کی بہن فردوس بھی بارہ سال کی ہو گئی تھی۔ جمال تو جماعت ششم کے بعد مزید تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا لیکن اپنی بہن کو پابندی سے اسکول بھیجتا رہا وہ اس وقت ہشتم میں زیر تعلیم تھی۔ فردوس کا اب اسکول میں دل نہیں لگتا تھا وہ پابندی سے اسکول کا کام بھی نہیں کرتی تھی۔ کلاس میں بھی گم صم رہتی۔ اسے ہر وقت مرحوم والد اور بیمار ماں کی یاد ستاتی رہتی۔ وہ کلاس میں بیٹھی تھی سب لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک دوسری سے کہہ رہی تھی۔ ''اف مس رضیہ کس طرح گھورتی ہیں۔'' دوسری نے کہا ''جس وقت وہ گھورتی ہیں ناں سب یاد کیا ہوا بھول جاتی ہوں۔'' اس بات پر سب ہنسنے لگیں۔

فردوس نے ان کو دیکھ کر جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔'' فردوس کی بات پر سب لڑکیاں حیران رہ گئیں۔ وہ پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں تھی مناسب نمبروں سے پاس ہوا کرتی تھی۔ اس کے باوجود ساری کلاس کی لڑکیاں اس کی دوست تھیں۔ وقت پڑنے پر وہ سب کی مدد کرتی تھی۔ اس کی والدہ بیمار ہیں لیکن اس نے کلاس میں یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی تھی۔ اس دن مس نے اس سے کوئی سوال پوچھا وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ ''کیا بات ہے فردوس۔'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کچھ نہیں مس۔'' اس نے ادب سے پوچھا۔

''تم کہاں کھوئی ہوئی ہو۔ میں نے سوال پوچھا ہے۔ اگر اس طرح کلاس میں گم صم ہو کر بیٹھنا ہوتا ہے تو اسکول کیا کرنے آتی ہو۔'' مس نے ناراضی سے کہا۔ لیکن وہ ادب سے خاموش کھڑی رہی۔ دوسرے دن جب مس رضیہ کا پیریڈ شروع ہوا تو فردوس غیر حاضر تھی۔ تیسرے دن بھی وہ غیر حاضر تھی اور چوتھے دن بھی۔ مسلسل اسکول سے غیر حاضری پر مس رضیہ سے رہا نہیں گیا۔ اس نے کلاس کے بچوں سے پوچھا تو انہیں بتایا گیا۔ ''اس کی والدہ شدید بیمار ہیں۔'' اس شام مس رضیہ ان کے گھر جا پہنچی۔ وہاں جا کر اسے اس کے گھر کے حالات کا علم ہوا۔ اس کے بعد وہ فردوس سے خاص طور پر محبت کرنے لگی۔

ایسے حالات میں جذباتی حوصلہ دینے کے لیے ان کی پھوپی فاطمہ بھی انہیں تسلی دیتی، ان کو سینے سے لگاتی خود بھی روتی، ان سے کہا کرتی۔ ''بچو! ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے۔ ایک دن تمہاری والدہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' لیکن صبح نہ ہوتی۔ کچھ راتیں بڑی طویل ہوتی ہیں۔ ان کی والدہ ہنستے ہوئے رونے لگتی، روتے ہوئے ہنسنے لگتی۔ نفسیات کے مطابق انسان کو ایک دن میں کئی قسم کے مزاج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی مزاج ہوتے ہیں جن سے لوگوں میں اُمید پیدا ہوتی ہے اور کچھ ایسے مزاج ہوتے ہیں جن سے نا اُمیدی پیدا ہوتی ہے۔ جب کبھی ان کی والدہ کی طبیعت ہشاش بشاش ہوتی سارا گھر خوشیوں سے بھر جاتا۔ پھر ان پر جب اچانک دورہ پڑتا تو ہر طرف غم کے بادل چھا جاتے۔ خاموشی سی ہو جاتی، اسی بیماری میں مبتلا ان کی والدہ ایک ایک دن گزارتی رہی وہ پانچ سال بعد وفات پا گئی۔

☆☆☆

TAGPK.COM

دونوں پر ایک بار پھر مشکل وقت آن پڑا، دکھوں اور غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، وہ اکیلے ہو گئے، انہیں اس وقت کسی سہارے، حوصلے اور ہمت کی ضرورت تھی جس کے لیے اب مستقل طور پر پھوپی فاطمہ ان کے پاس رہنے لگی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔ بھائی بہن ایک دوسرے کی خوشی ہو یا غم، ایک دوسرے کا ساتھ دینا اپنا فرض سمجھتے۔ جمال بہن کو جب اداس دیکھتا تو کبھی کبھی باتوں ہی باتوں میں ہنسانے کی کوشش کرتا رہتا... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ والدین کے بعد دونوں بہن بھائی ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے، یہ ایک انمول رشتہ ہوتا ہے جسے بھائی نے اپنی بہن کے لیے اور بہن نے اپنے بھائی کے لیے ساری زندگی قائم رکھ کر اس انمول رشتہ کو نبھانا ہوتا ہے۔ جمال کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ وہ اپنی بہن کا دل بہلاتے رہے لیکن دل تھا کہ بہلتا ہی نہیں تھا۔ ہشتم میں فردوس بڑی مشکل سے پاس ہوئی۔ وہ مزید تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے بھائی نے سمجھایا۔

''گھر میں بور ہو جایا کرو گی۔ اسکول جاؤ گی تو مصروف رہو گی اور تمہارا دل بھی لگ جایا کرے گا۔''

جمال نے کہا تو فردوس بے زاری سے بولی۔ ''میں گھر کے کام کیا کروں گی۔'' اس کے لہجے میں تھکاوٹ تھی۔ ''گھر کے کام کون سے ہوتے ہیں۔ پھر پھوپی ہے ناں۔''

جمال نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اسکول کی تعلیم جاری رکھے۔ وہ صبح بہن کو اسکول لے کر جاتا اور چھٹی کے وقت اسے پابندی سے اسکول سے گھر چھوڑ جاتا۔ پہلے تو کافی عرصہ انہیں والدین کا صدمہ رہا پھر رفتہ رفتہ اس کے زخم تو رہے... لیکن پہلے جیسی شدت نہیں رہی۔ انہوں نے والدین کے ایصال ثواب کے لیے خیرات پابندی سے ادا کرنا شروع کر دی ہے۔ ہر روز ان کے لیے دعائیں کرتے۔ صبح قرآن خوانی کرتے۔ ہر جمعرات کو دونوں نے والدین کی قبروں پر جانے کو اپنا معمول بنا لیا۔

☆☆☆

وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ فردوس نے میٹرک کر لیا۔ اب اسے بھی مزید پڑھنے کا شوق ہو چکا تھا... کیونکہ والد اور والدہ کو فوت ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ ان کی یاد تو انہیں روز آتی تھی وہ اکثر ان کی باتیں کرتے لیکن پہلے کی طرح زندگی سے اب مایوس نہ رہے تھے۔ ان کی پھوپی فاطمہ ان پر ماں باپ کی طرح سایہ بن کر رہی۔ اس کی اولاد نہیں تھی وہ اکثر کہا کرتی۔ ''اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اللہ نے تمہاری دیکھ بھال کے لیے مجھے اولاد نہیں دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم جیسی اولاد ملی ہے۔'' جمال اور فردوس بھی اپنی پھوپی کو ماں کی طرح چاہتے تھے اس کی خدمت کرتے اس کی تابع داری کرتے۔ اس کی بات کو حرف آخر سمجھتے۔ ان کے ماں باپ نہیں تھے اس لیے بھی اور اس لیے بھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ پھوپی کا دل نہیں دکھانا وہ کیا سوچے گی کہ اس کی سگی اولاد نہیں تھے۔ اب ان کے حالات بھی کافی بدل گئے تھے۔

اب ایک بار پھر سب رشتے دار ان سے ملنے لگے تھے۔ برے وقت میں جنہوں نے ان کو اپنی شکل نہیں دکھائی تھی اب وہ اکثر آ جایا کرتے۔ چچا طفیل، ماموں ماجد، خالہ شمیم وغیرہ میں سے کوئی نا کوئی ہر ہفتے ضرور آتا۔ جو بھی آتا ان کے لیے کوئی نا کوئی تحفہ ضرور لاتا۔ جمال تو ہوٹل میں ہوتا تھا۔ مہمان اس سے ہوٹل میں بھی ملنے جاتے اور گھر کا چکر بھی لگاتے۔ جمال سے ایک دن اس کی پھوپی فاطمہ نے کہا۔ ''بیٹے یہ ان سب کو اب اچانک تم لوگوں سے رشتے داری کیوں یاد آ گئی ہے۔'' اس کے بھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

جمال دنیا کو دیکھ چکا تھا۔ بچپن سے اب تک اس نے حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ ایک نظر میں لوگوں کو پرکھنے کا فن سیکھ چکا تھا اس میں اس کے استاد منظور علی اور مولوی حشمت نے بہت رہنمائی کی تھی وہ ان دونوں کی بہت قدر کرتا تھا۔

''میں جانتا ہوں پھوپی۔ اب ہمارے حالات بھی بدل گئے ہیں اور ہم اس عمر میں پہنچ چکے ہیں کہ سارے رشتے دار ہم سے رشتے داری کرنا چاہتے ہیں۔'' جمال نے پھوپو کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کام سے آیا تھا۔ فردوس کھانا گرم کرنے گئی ہوئی تھی۔

''پھر کیا سوچا ہے؟'' پھوپی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ سے یہ بات کرنے کا کس نے کہا ہے، کون آیا تھا؟'' جمال نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

''تمہاری خالہ شمیم آئی تھی اس نے اپنے بیٹے طاہر کے لیے فردوس کے رشتے کا کہا ہے۔'' جمال خاموش ہی رہا۔ ''وہ خود تو گاؤں میں رہتے ہیں لیکن بیٹے نے تعلیم حاصل کر کے شہر میں میڈیکل اسٹور بنایا ہے۔'' پھوپی فاطمہ نے اپنی بات مکمل کی۔

''فردوس کو اس بات کا علم ہے۔'' جمال کے پوچھنے پر

TAGPK.COM

دلکش اور متنوع تحریروں سے سجا جولائی 2021ء کا شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

پاکیزہ قارئین کے لیے

ایک اور تحفہ معروف لکھاری

دلشاد نسیم کا نیا ناول

صراطِ عشق کی پہلی قسط

افشاں آفریدی اور **نایاب جیلانی** کے مسلسل ناول اختتامی مراحل کی جانب گامزن

عورت کہانی فرحین اظفر کے قلم سے لکھی کئی انوکھی تحریر

شیریں حیدر کے ماہرانہ قلم کی موشگافیاں پُراثر کہانی کی صورت

سینئر رائٹر **عفت گل اعزاز** کا دلگداز ناولٹ **بے درد**

فرح بھٹو کا خوب صورت ناولٹ **چاہ کی راہ میں**

اصلاحی مقالات کی خالق

محترمہ اختر شجاعت کا ایک اور ایمان افروز مقالہ

حقوق اولاد..... حکم الٰہی ایک پُرمغز تحریر

شائستہ زریں کی تحقیق اور ان تھک محنت کا ثبوت **خصوصی سروے**

اس کے علاوہ

پڑھیے **نزہت جبیں ضیا، عنبرین ابدال، تسنیم منیر علوی،**
فرحی نعیم، ہما علی، عائشہ تنویر کی دل نشیں تحریریں.....

پُرتنوع سلسلوں سے سجا، خوب صورت تراشوں پر مبنی، شعر و شاعری سے مرصع اور حُسنِ صحت کے متعلق متن سے آراستہ ماہنامہ پاکیزہ صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے.....

TAGPK.COM

فاطمہ نے بتایا کہ ''فردوس کے سامنے ہی اس نے کہا تھا۔''

جمال سوچ میں پڑ گیا وہ خود سے اپنی بہن کو دور نہیں کر سکتا تھا۔ خاص کر دوسرے شہر تو بالکل بھی نہیں۔ ''اچھا اس پر بات کریں گے ابھی تو فردوس کا ایف اے کا رزلٹ نہیں آیا۔'' اس نے بات ختم کر دی تھی۔

فردوس کھانا بنا چکی تھی۔ پھوپی نے کہا۔ ''میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ میں جیتے جی اپنی بیٹی اور بیٹے کی خوشیاں ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' جیسے ہی اس نے بات ختم کی تو فردوس کھانا لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے جمال کا چہرہ دیکھا جس پر سوچ کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے بھائی۔ کہیں پھوپو نے آپ کو خالہ شمیم کی بات تو نہیں بتا دی؟'' اس کے لہجے میں چہکار تھی۔

''ہاں وہی بات کر رہے تھے۔'' جمال نے کہا۔ ''میری بات سن لیں۔ میں اپنے بھائی سے کبھی بھی، کہیں بھی دور نہیں جاؤں گی۔'' پھوپی اس کے بعد شروع ہو گئیں نصیحتوں سے بھرپور باتیں۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے فاطمہ پھوپی کا لیکچر سنتے رہے۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ شادی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ہر بیٹی کی شادی کرنا ہوتی ہے۔ وہ بیٹی اپنا گھر چھوڑ کر اپنے گھر جاتی ہے۔ یہ دنیا اسی سسٹم کے تحت چل رہی ہے۔ پیغمبروں نے بادشاہوں نے اپنی بیٹیوں کی شادی کی ہے۔ جدائی ہی زندگی کا حاصل ہے۔

جمال اور فردوس مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سنتے ہوئے کھانا کھاتے رہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب گھر میں شادی کا ذکر ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ ذکر روز ہونے لگا۔ طفیل چچا نے بھی چند دن بعد فردوس کا رشتہ مانگ لیا اور ماموں ماجد نے اشاروں سے پھوپی سے کہا کہ جمال کے لیے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ لیا جائے۔ اسی دوران فردوس کا رزلٹ آیا اس نے اچھے نمبروں سے ایف اے پاس کر لیا تھا۔

جیسے ہی یہ بات مشہور ہوئی چند دن بعد ہی خالہ شمیم اپنی ایک بیٹی اور بیٹے کے ساتھ وہاں آن پہنچی، بیٹے کا نام پرویز تھا جس نے میڈیکل اسٹور شہر میں بنایا تھا۔ فردوس نے ان کی خوب خدمت کی۔ پرویز نے اپنی والدہ اور بہن کو وہاں ہی چھوڑا اور خود جمال کے پاس ہوٹل سے ہوتا ہوا اپنے شہر چلا گیا۔ اس کی والدہ نے آج رات جمال سے اس کے رشتے کی بات کرنا تھی۔

مغرب کے بعد جمال نے ہوٹل سے چھٹی کی اور گھر جانے سے پہلے مسجد جا پہنچا۔ مولوی حشمت کا گھر مسجد کے ساتھ ہی تھا۔ جماعت ہو چکی تھی اس نے مسجد میں نماز مغرب ادا کی اور مولوی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ وہ ابھی گھر پہنچے ہی تھے۔ جمال کو دیکھ کر اسے اندر بلا لیا۔ جمال بچپن سے اس گھر کا ایک فرد تھا اس سے کوئی پردہ نہیں تھا۔ ویسے بھی مولوی صاحب کا ایک بیٹا جمال کی عمر کا ہی تھا جس نے قرآن حفظ کرنے کے بعد شہر میں ہی کپڑوں کی دکان بنا لی تھی۔

دو بیٹیاں مولوی صاحب نے بیاہ دی تھیں۔ بیوی کو فوت ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ آج کل بڑی بیٹی بچوں سمیت والد کے گھر رہ رہی تھی۔ جمال نے مولوی حشمت کو سلام کرنے کے بعد آپی خدیجہ سے اس کے میاں، بچوں کا حال پوچھا۔ وہ چائے بنانے چلی گئی تو مولوی حشمت نے کہا۔ ''کیا بات ہے جمال؟ اتنی زیادہ ماتھے پر تفکرات کی لائنیں؟''

جمال نے مسکراتے ہوئے ساری بات انہیں بتا دی اور کہا۔ ''یوں خالہ کا دباؤ مناسب نہیں ہے خاص کر اسے اپنے بیٹے کو نہیں لانا چاہیے تھا۔ اب یہ بہانہ بنایا کہ وہ موٹر سائیکل پر صرف چھوڑنے آیا ہے۔''

مولوی حشمت نے کہا۔ ''پریشان نہ ہو جب بیٹیاں ہوتی ہیں تو رشتے آتے ہی ہیں۔'' اس وقت تک خدیجہ بھی چائے بنا کر لے آئی اور ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مولوی حشمت نے بات جاری رکھی۔ ''جب میری بیٹیاں جوان ہوئی تھیں تو ایسا ہی ہوا تھا لیکن ان کی ماں اس وقت زندہ تھی وہ سب سے ابتدائی بات کرتی رہی تھی۔ تم پریشان نہ ہو۔''

''میں پریشان نہیں ہوں میں ان دونوں کو اپنی بہن کا رشتہ نہیں دینا چاہتا۔ یہ وہ رشتے دار ہیں جنہوں نے ہمارے مشکل ترین دور میں ہمیں پوچھا تک نہیں۔ یہ دس سال میں اتنی دفعہ ہمارے گھر نہیں آئے جتنی دفعہ اب دس ماہ میں آ چکے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ دن یاد آ جاتے ہیں۔'' جمال نے دل کی بات بیان کی۔

خدیجہ کافی دیر تک ان کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اچانک اس نے کہا۔ ''بھائی جمال اگر تجھے برا نہ لگے تو کل میں اور ابو جان تمہارے گھر آتے ہیں۔ میرے بھائی علی کے لیے۔ ان رشتے داروں سے جان بھی چھوٹ جائے گی اور علی تیرا دوست بھی ہے تو اسے جانتا ہے۔

''صرف ہمارے قوم کا فرق ہے۔''

جمال کو ایک حیرت کا خوشگوار جھٹکا لگا۔ ''یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہوگی لیکن میں فردوس کی خوشی کو دیکھوں گا پھر اس کا جواب دوں گا۔'' اس نے صاف بات کی حالانکہ وہ جانتا

تھا جب انتخاب کا مرحلہ آئے گا اور فیصلہ فردوس پر چھوڑ دیا گیا تو وہ علی کے حق میں ہی فیصلہ کرے گی... کیونکہ وہ دوسرے شہر اپنے بھائی سے دور نہیں جانا چاہتی اور علی کو وہ بھی بچپن سے جانتی تھی بلکہ بہن بھائی نے قرآن پاک علی اور دیگر محلے کے بہت سے بچوں کے ساتھ مل کر ہی پڑھا تھا۔

جمال جتنا پریشان مولوی کے گھر جاتے ہوئے تھا اس سے کہیں زیادہ واپسی پر تھا کیوں کہ مولوی حشمت کبوہ تھے اور جمال کی قوم ملک تھی۔ ایسی ہی سوچوں میں گم وہ گھر پہنچ گیا۔ خالہ نعیمہ نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ ''کافی دن سے آپ کو ملنے نہ آسکی تو سوچا کہ آج اپنے بچوں سے مل آؤں۔''

جمال نے شکریہ کہا۔

''تمہارا بھائی پرویز مجھے یہاں چھوڑ کر گیا تھا میں نے اس سے کہا تھا کہ تم سے ملتا جائے۔ تمہارا ہے بھی کون اس دنیا میں ہمارے سوا۔''

خالہ کی اس بات پر جمال نے ایک لمحہ کو سوچا کہ اسے کھری سنا دے پھر اس نے اس بات کو بھی برداشت کر لیا۔ وہ ایسی باتیں ہی کرتی رہی، جمال ہوں ہاں سے جواب دیتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد جب وہ سب بیٹھے ہوئے تھے تو خالہ ایک بار پھر شروع ہو گئی۔

''ویسے تو مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی بتانے کی ضرورت ہے کیونکہ تم ہو ہی ہمارے اپنے، اب جب ماں اور باپ دونوں میں سے ایک بھی سر پر نہیں ہے تو تمہارے مستقبل کے فیصلے ہم بڑوں نے ہی کرنا ہیں ناں۔''

اب تک اس کی ہر بات ''ہوں ہاں'' کرنے والے جمال نے اس بات کا جواب اس کی توقع کے خلاف کیا۔

''خالہ جان کل بھی آپ سب موجود تھے۔ جب میرے والد فوت ہوئے تو والدہ ذہنی مریض بن گئی کس وجہ سے۔ صرف اس لیے کہ آپ جیسے ہمارے اپنوں نے ہمیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی اس دنیا سے چلی گئی۔'' جمال ایک لمحہ کو سانس لینے رکا اور فردوس کو دیکھا جس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے اپنی بہن کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھتے ہوئے خالہ سے کہا۔ ''جب ہم دونوں اکیلے رہ گئے تو ہماری پھوپی نے ہمارا ساتھ دیا ہمیں ماں بن کر پالا، ہمارے آنسو پونچھے اس وقت آپ اور انکل ماجد کہاں تھے؟'' جمال نے خالہ کا چہرہ دیکھا جس پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ''خالہ جان آپ جب چاہو ملنے آؤ۔ آپ ہمارے اپنے ہیں لیکن جہاں تک فردوس یا میرے رشتے کی بات ہے اس کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔'' اس کے بعد خالہ جان ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی اور دوسرے دن وہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔ جاتے ہوئے کہہ گئی۔

''آپ ہم سے ملیں یا ماجد سے ملیں۔ ماجد سے تو تمہیں رشتہ مل بھی سکتا ہے اس کی بیٹیاں بھی جوان ہیں۔ اب میری تو کوئی بیٹی نہیں ہے۔''

جمال نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد رشتے دار آتے رہے اور پھوپی اور جمال انہیں کہتے رہے کہ جب تک فردوس بی اے نہیں کر لیتی ہم کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ یہ ہی بات جمال نے مولوی حشمت کو بتا دی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ پھوپی کا اصرار بڑھنے لگا کہ جلدی سے شادی کر لیں۔ اسی طرح تمام رشتے دار کہنے لگے کہ بے شک منگنی کر لیں شادی جب تم کہو گے کر لیں گے۔ ایسے ہی دو سال مزید گزر گئے۔ ان دو سال میں جمال نے اپنی بہن کا اور فردوس نے اپنے بھائی کے لیے تمام سامان وغیرہ بنا لیا۔ پھوپی فاطمہ کو دونوں بہن بھائی کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ برادری میں کس سے رشتہ کریں گے... کیونکہ دونوں اب تک کسی کے گھر بھی نہیں گئے تھے حالانکہ انہیں ہر بار جو بھی ملنے آتا آنے کی تاکید کرتا.. پھر ایک دن جمال نے منظور صاحب سے بات کی اور مولوی حشمت کے بارے بتایا۔ اپنی خالہ اور ماموں کے بارے بھی بتایا۔ کیونکہ اس دن اسے اطلاع ملی تھی کہ آج اس کے ماموں جان آئے ہوئے ہیں۔

موبائل فون کا دور آچکا تھا۔ فردوس نے فون کر کے اسے بتایا۔ ''ماموں ماجد، ممانی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔''

دونوں بہن بھائیوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی لیکن وہ دونوں جانتے تھے کہ انہیں ان رشتے داروں سے کیسے نمٹنا ہے۔ اس وقت جمال نے انکل منظور سے ساری بات کھل کر کی ''بہن نے اب بی اے کا امتحان دینا ہے۔ میں سوچتا ہوں اس کے بعد اس کی شادی کر دوں۔ پھوپی بیمار رہتی ہیں وہ بھی روز کہتی ہے کہ میرے جیتے جی سہرا سجا لو۔'' جمال نے شرمیلے سے لہجے میں انکل منظور سے کہا۔

''ہاں.....'' انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ ذمے داری پوری کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ویسے تم نے کچھ تو سوچا ہوگا۔'' منظور نے جمال سے کہا۔

''میں سوچتا تو رہتا ہوں فیصلہ کوئی نہیں کیا۔'' جمال نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''فیصلہ تم دونوں بہن بھائی مل کر کر لو۔ آج اپنے ماموں کو بھیج دو اس کے بعد اپنی بہن سے کھل کر بات کر

TAGPK.COM

لو۔'' جمال کو یہ بات اچھی لگی۔

وہ شام کو گھر آیا اس رات اس کے ماموں نے اسے دبئی سیٹ پر رشتے کرنے کا کہا۔ ''میں نے اور تمہاری ممانی نے فیصلہ کیا ہے کہ میری بیٹی اس گھر میں آجائے گی اور اس گھر کی بیٹی اس گھر میں چلی جائے گی۔''

''ماموں جان ابھی ہم نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ فردوس نے بی اے کا امتحان دے دیا ہے ہمیں اس کے نتیجہ کا انتظار ہے۔ اس کے بعد ہی فیصلہ کریں گے۔'' اس بات کے بعد اس کے ماموں اور ممانی اسے بڑی دیر تک سمجھاتے اور مناتے رہے لیکن اس نے اپنی ایک ہی بات رکھی۔ دو دن وہاں رہنے کے بعد وہ چلے گئے۔ اس کے بعد ایک دن جمال نے فردوس کو اپنے پاس کمرے میں بلایا اور جب وہ بیٹھی تو کہنے لگا۔

''فردوس اب ہمیں شادی کر لینا چاہیے۔ ساری برادری کہہ رہی ہے۔ ہر کوئی اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتا۔ پھوپی بھی دن رات اسی بات کا ورد کرتی ہیں۔''

فردوس نے سر جھکا لیا۔

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں، تم کہاں چاہتی ہو کہ تمہاری شادی وہاں ہو۔'' جمال نے اس کا چہرہ ایک ہاتھ سے اوپر اٹھایا۔

''بھائی میری تو کوئی پسند نہیں ہے۔ جہاں آپ کہیں گے کر لوں گی لیکن میں آپ سے دور اور اس شہر سے باہر نہیں جانا چاہتی۔'' فردوس نے وہی بات کی جو جمال ہمیشہ سوچتا رہتا تھا۔ وہ اپنی بہن کو خود سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مولوی حشمت صاحب کے بیٹے عمی کو تو تم نے دیکھا ہے۔ اگر پسند ہو تو بات چلاؤں۔'' جمال نے بہن کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کس سے شادی کریں گے اپنے لیے بھی کچھ سوچا ہے۔'' فردوس نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔ اس سوال میں ہی جواب تھا۔ اگر اسے انکار ہوتا تو وہ لازمی بتاتی۔

''میں نے سوچا ہے کل تم انکل منظور کے گھر چلی جاؤ۔ پھوپی کو ساتھ لے جانا۔ ان کی بیٹی سندس کا رشتہ پوچھ لو۔'' جمال نے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ سندس کو تو طلاق ہوئی ہے۔'' فردوس نے حیرت سے کہا۔

''پھر کیا ہوا۔ طلاق ہوئی ہے تو انکل منظور کے ہم پر بہت سارے احسانات ہیں ویسے بھی طلاق ہوئی ہے تو کیا اب اس سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ ہمارے نبیؐ کی اکثر شادیاں بیوہ یا مطلقہ سے ہوئی تھیں۔'' جمال نے کہا تو فردوس نے سر جھکا دیا۔

دوسرے دن جمال جب ہوٹل پر پہنچا تو انکل منظور کو بتایا۔ ''آپ گھر جائیں آپ کے گھر مہمان آرہے ہیں۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''کون..... کس لیے۔'' منظور نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''آپ گھر جائیں گے تو آپ کو علم ہو جائے گا۔ آپ جلدی چلے جائیں مہمان پہنچ بھی گئے ہوں گے۔'' منظور صاحب کو دو تین بار کہنے سے وہ گھر جانے کے لیے نکل گئے۔

وہاں فردوس اور پھوپی فاطمہ آئی ہوئی تھیں اور جب انہیں ان کی آمد کے سبب کا علم ہوا تو حیرت سے، ان کا منہ کھلا رہ گیا۔ پھر خوشی سے آنسو نکل آئے۔ یہ بات سندس کے لیے بھی باعث حیرت تھی۔ اسی شام مولوی حشمت کو بھی اس خوشی میں شامل کر لیا گیا۔

دو تین دن میں یہ بات برادری میں پھیل گئی کہ جمال اور فردوس نے اپنی زندگی کا فیصلہ خود ہی کر لیا ہے۔ برادری نے طرح طرح کی باتیں کیں۔ ان کے گھر میں آکر سمجھایا کہ غیر برادری میں شادی نہ کریں۔

جمال ایک ہی جواب سب کو دیتا رہا۔ ''اسلام میں کوئی قوم کسی قوم سے اعلیٰ نہیں ہے سب برابر ہیں۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کیا ہے۔''

ان کی ایسی باتوں سے وہی برادری جو دن رات ان کے گھر ملنے آیا کرتی تھی اور جن کو ان سے بے پناہ محبت تھی ان کے خلاف ہوتی چلی گئی۔ ایک بار پھر انہیں سب نے چھوڑ دیا۔ اس بار ان کے چھوڑ جانے کا انہیں کوئی دکھ نہیں تھا۔ وہ ابھی تک ان دنوں کو بھولے نہیں تھے جب انہیں ان سب کی، ان سب اپنوں کی بے حد ضرورت تھی تو سب نے انہیں دنیا میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی منگنی میں بھی ان کے نہ کوئی ماموں آیا نہ چچا نہ خالہ صرف پڑوسی، ہوٹل پر کام کرنے والے، فردوس کے کالج کی چند لڑکیاں، اساتذہ اور محلے داروں نے شرکت کی۔ دونوں بہن بھائیوں کی ایک ہی دن منگنی ہوئی۔ منگنی سے ایک ماہ بعد دونوں بہن بھائیوں کی دھوم دھام سے شادی ہوئی، نئی زندگی کی نئے سرے سے شروعات، نئے رشتوں سے ہوگئی۔

++

TAGPK.COM



تدبیر

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

ایک سچ بیانی ارسالِ خدمت ہے۔ یہ کہانی قاسم، نازو اور وکی کی ہے۔ غریب کی قسمت پھوٹی ہوتی ہے اگر نازو جیسی عقل نہ رکھتی ہو۔

سنبل
(کراچی)

وکی نے اس سبک خرام مورنی کو دیکھا جو کہ کچن سے باہر نکل کر اس کی ماما کے کمرے کی جانب ٹرالی لیے بڑھ رہی تھی اور ٹرالی میں سلیقے سے ناشتا سجا ہوا تھا اور اس نے سامنے سے گزرتی ہوئی میڈ کو روک کر اس مورنی کا حدود اربع پوچھا تھا۔

"چھوٹے صاحب! ہاجرہ نی دسی ہے آج ہاجرہ کی طبیعت کچھ اوپر نیچے ہے تو اس نے نازو کو بھیج دیا ہے اپنی جگہ۔" میڈ بھوری نے بتایا۔

"تو کیا یہ کام نہیں کرتی ہے؟" اس نے دوسرا سوال داغا کیونکہ وہ آج پہلی بار اسے یہاں نظر آئی تھی۔

''جی چھوٹے صاحب! یہ یہاں کام نہیں کرتی اس کے دماغ بڑے اوچے (اونچے) ہیں پڑھ رہی ہے۔ کہتی ہے پڑھ لکھ کر اچھا کمائے گی پھر اپنے ماں باوا کو کمانے نہیں دے گی۔'' بھوری کچھ زیادہ ہی جلی ہوئی تھی، نازو اسی کی ہم عمر تھی مگر اس کے اماں ابا اور بھایا کو اس سے کوئی بھی ہمدردی نہیں تھی نہ ہی وہ اس کے کوئی ناز اٹھانے کو تیار تھے بلکہ وہ تو تیز بخار میں بھی اسے کام کرنے کے لیے روانہ کر دیتے تھے۔

''امیزنگ! ایسے ہی کردار تو اٹریکٹ کرتے ہیں۔'' اس کا لہجہ سرگوشی سے قطعی بھی زیادہ نہیں تھا۔

''ویسے دیکھنے میں میڈ لگتی نہیں ہے۔'' اس نے دوبارہ کہا۔

''وہی تو چھوٹے صاحب! پڑھ لکھ کر دماغ تو خراب ہوئے ہی ہیں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی خوب آگیا ہے۔ دونوں چھوٹی بی بیوں کے کپڑے لالی سرخی اور گہنے۔ لگتی ہی نہیں کہ ماسی کی دھی ہے بلکہ دھی کہاں سے دھی رانی ہے۔'' بھوری کی جلن اس کے الفاظ میں بول رہی تھی۔

وکی نے پُرسوچ نظروں سے مام کے روم کی جانب دیکھا جہاں وہ گئی تھی۔ اس وسیع و عریض محل جیسے گھر کے وہ پانچ مکین تھے۔ فاروق افگن اس کے فادر، تہمینہ افگن اس کی مام، ٹینا اور مینا اس کی بہنیں اور وہ خود وقاص افگن عرف وکی۔ جیسا وسیع اور عریض ان کا گھر تھا ویسا ہی وسیع و عریض ان کا کاروبار تھا۔ جدی پشتی کاروبار، زمین، باغات ملز تو الگ تھے تہمینہ کا جیولری میکنگ میں بڑا نام تھا۔ ''افگنز'' کے نام سے ان کی جیولری کے کئی آؤٹ لیٹس پورے ملک میں موجود تھے اور ان کی جیولری نا صرف بہت پسند کی جاتی تھی بلکہ اس کی بڑی مانگ تھی ان کو اس سلسلے میں بڑے بڑے آرڈرز ملتے تھے۔

ٹینا اور مینا نے فیشن ڈیزائننگ کا کورس کیا ہوا تھا اور ان کا بھی ''افگنز'' کے نام سے ملبوسات کا برینڈ تھا اور اس کی بھی ملک اور بیرون ملک خصوصاً مشرقی وسطیٰ میں بڑی مانگ تھی۔ خود وکی نے بھی ایک میوزک بینڈ بنا رکھا تھا جس میں اس کے اپنے ہی جیسے بے فکر، معاشی اور معاشرتی فکروں سے آزاد دوست تھے اور ہر برینڈ کی طرح وہ بھی کسی کی بھی صلاحیات پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ خود ہی شاعر، خود ہی میوزیشن خود ہی کمپوزر ایسے لوگوں کو مشورہ دینے کو دل چاہتا ہے کہ پھر سن بھی خود ہی لیا کرو.. مگر ان بڑے باپوں کی بگڑی ہوئی اولادوں کو اسپانسر کرنے والے بھی بہت ہوتے ہیں سو وہ آہستہ آہستہ شہرت کی بلندیوں کی جانب گامزن تھے۔

اتنی بے تحاشہ دولت اپنے ساتھ بے تحاشہ برائیاں بھی لاتی ہے، سو وکی میں بھی سارے ہی شرعی عیب تھے۔ شراب و شباب، جوا وغیرہ تو عام بات تھی وہ لوگ اپنے ایڈونچر کے لیے چھوٹی موٹی چوری وڈکیتی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

بہرحال ہاجرہ ان کے گھر میں کچن کی ہیڈ تھی وہ خود بھی بہت صاف ستھری اور تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھی اور کھنڈر بتاتے تھے کہ عمارت کبھی حسین رہ چکی تھی اور اسی ہاجرہ کی بیٹی تھی یہ نازو۔ جس کا نام نازنین تھا اور وہ واقعی نازنین تھی۔

تیکھے نقوش اور چمپئی رنگت والی جس کی چال میں ایک وقار اور تمکنت تھی وہ واقعی میڈ بننے کے لائق نہیں تھی۔ وہ جہاں ہوتی تھی وہاں صرف وہی نظر آتی تھی۔ اس کے موجود ہونے سے جگہ بھری جاتی تھی۔

وکی کے اندر اس مورنی سی لڑکی کو دیکھ کر ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور وہ اس آگ کو اس کے وجود سے سیراب ہو کر بجھانا چاہتا تھا مگر اس سے اس لڑکی کو سمجھنے میں بھول ہوئی تھی۔ وہ ایک عام سے غریب گھر میں پیدا ہونے والی لڑکی ضرور تھی مگر نہ تو وہ خود عام تھی اور نہ ہی اس کی سوچیں غریب تھیں۔

☆☆☆

ہاجرہ کھانا بہت اچھا بناتی تھی اسی لیے وہ کچن کی ہیڈ تھی باقی سب اس کے انڈر کام کرتی تھیں۔ ہاجرہ اور سلیم کی ایک ہی اولاد تھی نازو اور وہ دونوں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ ان کی بہت لاڈلی تھی۔ ہاجرہ کچن کے کام کرتی تھی اور سلیم مالی کا کام کرتا تھا، وہ دونوں بہت محنتی تھے۔ بہت محنت سے کام کرتے تھے مگر جب بھی مالکوں کا دماغ خراب ہوتا تھا دو منٹ میں عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دیتے تھے۔ یہ بات نازو کو بہت کھلتی تھی اور وہ اسی لیے پڑھ لکھ کر اپنے ماں باپ کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ ان کی لاڈو رانی کچھ چاہے اور وہ ہاجرہ اور سلیم نہ کریں یہ ناممکن تھا۔ نازو انٹر کر چکی تھی ابھی اسے رزلٹ کا انتظار تھا اور تب ہی وہ وکی کی نظروں میں آگئی۔

☆☆☆

TAGPK.COM

''کافی بنا کر میرے کمرے میں لاؤ۔'' وکی نے تحکمانہ لہجے میں کچن میں کام کرتی نازو سے کہا۔

''جی بھجواتی ہوں؟'' نازو نے کہا اور وکی کو واضح محسوس ہوا کہ اس نے دانستہ طور پر صاحب نہیں کہا ہے۔

''بھجوانا نہیں خود لانا ہے۔'' وکی نے سابقہ لہجے میں کہا۔

''یہ میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔'' اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

''اچھا کل تو شامل تھا۔'' وکی کھول ہی اٹھا تھا۔

''کل پروین بی بی کام پر نہیں آئی تھیں اس لیے مجھے ان کے حصے کا کام کرنا پڑا تھا۔'' اس کا بھی لہجہ بے لچک تھا۔

''لیکن میرے کمرے میں کافی تم ہی لے کر آؤ گی۔'' اس نے اپنا حکمیہ انداز برقرار رکھا، ابھی وہ کچھ جواب دیتی کہ ہاجرہ اندر داخل ہوئی۔

''جادھی رانی! تجھے تیرا ابا بلا رہا ہے، تجھے اپنی نمبروں کا پرچہ لینے جانا ہے ناں!'' اس نے آتے ہی کہا۔

''مگر اماں! ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم جا کر آرام کرو میں کسی اور دن جا کر لے آؤں گی مارکس شیٹ۔'' اس نے ماں کو دیکھ کر کہا۔

''نہیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں اور تیرے ابے کے پاس بھی بس آج ہی فراغت ہے۔'' ہاجرہ نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چمچہ لیا اور اسے باہر کی جانب دھکیلا اور تب اس کی نظریں وکی پر پڑی۔ ''چھوٹے صاحب جی! کوئی کام تھا۔'' اس نے جھٹ سے وکی کو سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' کہتے ہوئے وکی نے سلگتی ہوئی نظروں سے نازو کو دیکھا۔

''اور اپنی بیٹی کو سکھاؤ کہ مالکوں سے کیسا برتاؤ کرتے ہیں؟'' وہ کرخت آواز میں بولا تھا۔

''سیکھ جائے گی صاحب ابھی نئی نئی ہے۔'' ہاجرہ کا لہجہ خوشامدی تھا۔

''نہیں اماں اپنے چھوٹے مالک کو بتاؤ کہ یہاں کام تم کرتی ہو میں نہیں اور مجھے یہاں کام کرنا بھی نہیں ہے جہاں انسان کی عزت اس کے مرتبے کی بنا پر کی جاتی ہے۔'' کہہ کر وہ جھٹکے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

''معاف کردیں صاحب! نادان ہے اسے پتا نہیں ہے وہ کس سے بات کر رہی ہے۔'' ہاجرہ گڑگڑانے لگی۔

لیکن وکی کی نظریں تو باہر جاتی ہوئی نازو پر جمی ہوئی تھیں یہ لڑکی آہستہ آہستہ اس کی ضد بنتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد وکی نے بہت کوششیں کیں کہ وہ کسی طرح نازو کو حاصل کرلے مگر اس نے تو آنا ہی چھوڑ دیا تھا سلیم کا کام مگر زنگ تھا جو کہ وہ عموماً علی الصبح ہی کرلیتا تھا۔ اس کے بعد عموماً وہ سرونٹ کوارٹر میں ہی ہوتا تھا باہر کے کام کرنے کے لیے دوسرے نوکر تھے اس لیے بلاوجہ اگر سلیم کو باہر بھیجا جاتا تو اس کا شک میں پڑنا بنتا تھا اور وکی اسی ادھیڑ پن میں تھا کہ کس راستے پر چل کر نازو تک پہنچے۔

اور پھر ایک دن اسے موقع مل ہی گیا۔ وہ دن وکی کی بہن ثمینا کی منگنی کا دن تھا۔ تقریب کا ارینج منٹ گھر میں ہی تھا۔ سارے ملازمین بشمول سلیم اور ہاجرہ تقریب کے سلسلے میں مصروف تھے، ایسے میں وکی صرف ایک گھنٹے کے لیے تقریب سے غائب ہوا تھا اور وہ نازو کی زندگی اجاڑ آیا تھا۔

لیکن نازو کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ انہی پھٹے حالوں تقریب میں پہنچ گئی اور اس نے چیخ چیخ کر سب کو خود پر ہونے والے ظلم کی روداد سنائی اور وہاں موجود ہر ملازم اور تقریب میں آئی ہوئی ہر شخصیت جانتی تھی کہ وہ درست کہہ رہی ہے کیونکہ وکی کے چہرے پر لگے ناخنوں کے نشانات اور اس کا بدلا ہوا لباس نازو کی کہی ہوئی ہر بات کی گواہی دے رہے تھے مگر.. وہ تو نقار خانے کی توتی تھی اس کا کہا کس نے سننا تھا۔

ہاں تہمینہ گویا اڑتی ہوئی اس تک پہنچی تھی اور انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کیا تھا۔

''حرافہ! اچھا طریقہ ہے میرے بیٹے کو بلیک میل کر کے ہمارے خاندان سے پیسے وصولنے کا۔ اگر پیسا ہی چاہیے تھا تو مجھ سے بولتی میں دیتی مگر تم کمی کمینوں کو تو عادت ہوتی ہے موقع سے فائدہ اٹھانے کی۔'' کہہ کر تہمینہ افگن نے اسے دھکا دیا۔

''ہاجرہ! سلیم!'' انہوں نے بلند آواز میں نازو کے اماں ابا کو بلایا اور وہ دونوں لرزتے ہوئے ڈرے سہمے بھاگتے ہوئے آئے۔

''اٹھاؤ اس گندگی کی پوٹ کو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں اب تمہیں اپنے گھر میں نہ دیکھوں۔ ساری تقریب کا ستیاناس مار کر رکھ دیا۔'' انہوں نے بھڑک کر کہا اور ان دونوں لرزتے ہوئے وجودوں نے اس مضروب

TAGPK.COM

گرے ہوئے وجود کو سہارا دے کر اٹھایا۔

''ابا، اماں۔'' اس نے سسکتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا۔

''جو سامان لینا ہے وہ لو یہاں سے اپنا اور نکلو باہر۔'' تہمینہ نے سفاکیت کی انتہا کر دی۔

''میری لوٹی ہوئی عزت دے دو مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔'' وہ سسکی تھی مگر سلیم اور ہاجرہ اسے لے کر سرونٹ کوارٹرز کی طرف بڑھے تھے۔

''اگر تمہاری بیٹی اس ڈرامے کے لیے آج کے دن کا انتخاب نہ کرتی تو میں یقیناً کچھ نہ کچھ دے دلا کر رخصت کرتی مگر اب تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں۔'' وہ پھنکاری تھیں۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ تینوں وجود اپنی مختصر سی متاع سمیت اس گھر سے نکل گئے مگر تقریب کا وہ رنگ نہیں جم سکا جو کہ پہلے تھا۔

☆☆☆

''وکی! تم شروع سے ہی مجھ سے جلتے ہو تمہیں آج کا ہی دن ملا تھا اس چڑیا کو قابو کرنے کے لیے لے کر ساری تقریب خراب کر کے رکھ دی۔'' ٹینا بہت غصے میں تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے بس عام دنوں میں وہ چڑیا قابو میں نہیں آ رہی تھی۔'' وکی نے بے پروائی سے کہا۔

''میرے سارے ان لاز عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اتنا آکورڈ فیل ہو رہا تھا۔'' ٹینا کے دکھ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''اوہ پلیز! ان سب کے گھروں کی بھی یہی کہانی ہے اپنے ان لاز کو زیادہ پارسا ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو۔'' وکی نے ہاتھ اٹھا کر طنزیہ انداز میں کہا۔

''ہوگی مگر وہ اس کے لیے وقت اور موقع ضرور دیکھ لیتے ہوں گے۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''چلو تمہاری شادی میں خیال رکھوں گا۔'' وہ بے غیرتی سے بولا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے بے حس انسان۔'' ٹینا کو اب بھی اتنا ہی احساس تھا وہ جو اس گھر میں لٹ گئی تھی۔ تباہ و برباد ہو گئی تھی اس کی کسی کو احساس نہیں تھا۔

☆☆☆

''اپنے بیٹے سے کہو آپے میں رہا کرے اگر ہمارے مفادات مشترک نہ ہوتے تو ٹینا کے ان لاز یہیں کھڑے کھڑے رشتہ ختم کر دیتے۔'' فاروق افگن نے غصے سے کہا۔

''بچہ ہے سمجھ جائے گا۔'' انہوں نے بے پروائی سے کہا۔

''بچے یہ کام نہیں کرتے بیگم صاحبہ!'' انہوں نے چبا چبا کر کہا۔

''عقاب چڑیوں کا شکار کر ہی لیا کرتے ہیں بڑی بات کیا ہے اور ان کے بچے اپنے پیرنٹس سے یا تو یہ سب سیکھ لیتے ہیں یا یہ سب انہیں وراثت میں مل جاتا ہے۔'' تہمینہ کے لہجے اور آنکھوں میں طنز اتر آیا اور فاروق نے تیزی سے نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔

''مگر میں نے بھی اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولے۔

''وہ بھی کھیلتے کھیلتے سیکھ جائے گا۔'' تہمینہ کہہ کر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

یہاں سے نکل کر وہ لوگ بالکل بے ٹھکانا ہو گئے تھے۔ ایدھی اور عالمگیر کے لنگر خانے سے کھا لیتے تھے مگر مسئلہ ساری رات گزارنے کا تھا۔ دو عورتوں کے ساتھ سلیم کے لیے بہت مشکل ہو رہی تھی اگر سلیم اکیلا ہوتا تو وہ کہیں بھی پڑ جاتا کسی پارک میں کسی تھڑے پر مگر سارا مسئلہ ہاجرہ اور نازو کا تھا یہاں ان کا کوئی بھی رشتے دار نہیں تھا۔ سب گاؤں میں تھے۔ کوٹھی والوں میں سے کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا ورنہ وہ بھی نکال باہر کیا جاتا۔

آخر اتنا بڑا جرم ہوا تھا نازو سے اس نے ان کے بیٹے کا ظلم خاموشی سے برداشت نہیں کیا تھا بلکہ عالم آشکار کر دیا تھا۔ سلیم نے بیوی، بیٹی کو ایدھی سینٹر چھوڑا۔

سلیم نے کام ڈھونڈنا شروع کر دیا اور جلد ہی اسے ایک دوسرے بنگلے میں کام مل گیا ہاجرہ کو بھی اس نے اسی بنگلے میں ساتھ ہی لگوا لیا مگر اب نازو کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اس کا دل مرجھا گیا تھا۔ اب وہ یہاں پر سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے۔

ہاجرہ اور سلیم اکثر اسے پڑھائی دوبارہ شروع کرنے پر زور دیتے تھے۔ ''میرا بچہ! کب سے کالج جائے گا؟'' ہاجرہ نے ایک دن اس سے پوچھا۔

''کبھی نہیں۔'' اس نے دوٹوک کہا۔

''کیوں میری بچی! انہوں نے اگر تیرے ساتھ ظلم کیا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے تو اپنے خوابوں سے کیوں

TAGPK.COM

دستبردار ہوتی ہے۔'' ہاجرہ کو حقیقتاً تکلیف ہوئی تھی۔

''اماں! میں نے کون سا پڑھ لکھ کر منسٹر یا کمشنر لگ جانا ہے بہت بھی ہوا تو کہیں استانی یا کسی آفس میں پی اے لگ جانا ہے اور ہر صورت میں میری حیثیت یہی رہنی ہے کسی بھی پیسے والے نے کہیں بھی مجھے اپنی ضد بنا کر شکار کر لینا ہے۔'' وہ بڑی تلخی سے بولی تھی۔

''دھی رانی! ہر پیسے والا برا نہیں ہوتا۔'' ہاجرہ نے سمجھانا چاہا۔

''ہوگا مگر مجھے بڑا تلخ تجربہ کروا گیا ہے۔'' وہ رو پڑی تھی اور اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی وہ دونوں اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگے تھے وہاں ان پر انکشاف ہوا کہ نازو ماں بننے والی ہے۔

☆☆☆

اس دن ثنا بڑی بھری ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔

''مما! آپ کے بیٹے نے میری پوزیشن بڑی آکورڈ کر دی ہے رضا کے سامنے۔ اسے کسی بھی غلطی پر پکڑو، وہ کہتا تمہیں تو ان سب کا عادی ہونا چاہیے تمہارے گھر میں تو یہ سب کھلے عام ہوتا ہے۔'' وہ روہانسی ہو چکی تھی۔

''تو پھر وقت ہے فیصلہ کرنے کا۔'' تہمینہ نے دوٹوک کہا۔ ''اگر ساری زندگی یہ ذلت برداشت کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ خود کو اس رشتے سے آزاد کروا لو۔'' ان کا لہجہ ویسا ہی دوٹوک تھا۔

''مما!'' اس نے بڑے دکھ اور حیرانی سے ماں کو دیکھا۔

''Mumma I Love Him'' وہ جذب سے بولی۔

''تو پھر برداشت کرو ویسے ہی جیسے تمہاری ماں نے تمام عمر تمہارے باپ کی بدکاریاں برداشت کی ہیں کیونکہ یہ قوم سدھرنے والی نہیں ہوتی۔ اپنے کرتوت تمہارے گھر والوں کے اعمال میں لپیٹ کر ان کو متبرک مقام عطا کرنے والی قوم۔'' وہ تلخی سے بولی تھیں۔

''اگر ایسا ہوا ناں مما تو اسے بھی برابر کا جواب ملے گا کیونکہ میں بھی اس نسل سے ہوں آپ کی والی نسل سے نہیں۔'' وہ کہہ کر تن فن کرتی باہر نکل گئی اور تہمینہ نے پُرسوچ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

☆☆☆

وہ دوپہر کا وقت تھا جب وکی سو کر اٹھا تھا۔ رات انہوں نے فارم ہاؤس پر گذاری تھی اور صبح فجر میں ان کی واپسی ہوئی تھی۔ اٹھنے کے بعد اسے چائے کی شدید طلب محسوس ہوئی تھی سامنے کوئی میڈ موجود نہیں تھی غالباً سب اپنے کام کر کے سرونٹ کوارٹرز کی طرف چلی گئی تھیں اور وہ بڑی بے زاری سے کچن کی طرف آیا تھا لیکن اسے باہر ہی رک جانا پڑا۔ اندر تین چار میڈز موجود تھیں اور وہ کوئی بات کر رہی تھیں۔

''تو کس کی بات کر رہی ہے بھوری!'' اندر سے آواز آئی۔

''اسی نازو کی جو بڑی اڑی اڑی پھرتی تھی۔'' بھوری کی آواز میں استہزاء تھا۔

''نازو! اسے کیا ہوا ہے۔'' ایک دوسری آواز ابھری۔

''ہونا کیا ہے ماں بننے والی ہے بن بیاہی ماں!'' وہ تمسخر سے بولی تھی ''ساری پڑھائی وڑھائی بھول چکی ہے منہ چھپاتی پھرتی ہے دنیا سے۔'' وہ پھر بولی۔

''تجھے کیسے پتا چلا۔'' کسی نے پوچھا۔

''میری خالہ جس بنگلے پر کام کرتی ہے اسی کے ساتھ والے بنگلے میں کام کرتے ہیں اس کے اماں باوا!'' بھوری کے لیے یہ خاصی چٹخارے دار اسٹوری تھی۔

''ظلم بھی تو ہوا تھا اس کے ساتھ۔'' کوئی اور آواز آئی تھی۔

''تو چپ کر کے بیٹھ ایسا نہ ہو کہ یہ ہمدردی تجھے مہنگی پڑ جائے اور تو بھی بے آسرا و بے ٹھکانا نہ ہو جائے۔'' بھوری کو تو نازو کی طرف داری پر ہی پتنگے لگ گئے۔

''میرا آسرا اور میرا ٹھکانا میرے رب کے ذمے ہے مگر میں اس خوف سے جھوٹ نہیں بول سکتی نہ ہی اس مظلوم کی بلی اڑا سکتی ہوں۔ کل کو یہ سب تیرے اور میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ بہر حال وکی باؤ عیاش ہیں اور اس دن انہیں سرونٹ کوارٹرز کی طرف جاتے اور آتے کئی ملازمین نے دیکھا تھا جاتے اور آتے وقت کا حلیہ بھی دیکھا تھا نازو کو نکالے جانے کے بعد بھی مہمان دبے دبے لہجے میں یہی بات کر رہے تھے کہ وہ لڑکی ... جائز (ناجائز) پسی ہے۔'' کسی کی آواز کیا پورا لیکچر آیا تھا اور سب ہی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگی تھیں اور بھوری پر چپ ہوتے ہی بنی تھی وہ وہیں سے واپس ہو گیا تھا۔ اس کے لبوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ بکھری تھی۔

TAGPK.COM

''مجھے چیلنج کیا تھا اس نے اپنے رویے سے ...اور مجھے ایسے لوگوں کو توڑنا آتا ہے۔'' اس نے سوچا شاید کبھی فرعون بھی ایسا ہی سوچتا ہوگا کچھ لوگ خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے اعمال سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھر اس نے اس کے بعد کہیں سے بھی نازو کا نام نہیں سنا۔ اس نے بھی اپنی سرگرمیوں کے لیے میڈز وغیرہ کی جانب دیکھنا بند کر دیا تھا۔

ٹینا کی شادی ہوگئی مینا کی منگنی ہوگئی ان کے برانڈز، کاروبار اور زمینیں باغات سب جگہ سے اندھی دولت آ رہی تھی۔ ٹینا کی رضا سے بنتی نہیں تھی آئے دن لڑ بھڑ کر گھر آ بیٹھتی تھی اور اسی بنا پر اس کی وکی سے بھی اکثر منہ ماری ہو جاتی تھی۔

ایک کنسرٹ سے واپسی پر تیز ڈرائیونگ اور نشے میں ڈوبے مستیاں کرنے کے باعث ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ دو دوست تو موقع پر ہی ہلاک ہوگئے باقی یہ تین بہت بری طرح سے زخمی تھے جن میں وکی بھی شامل تھا۔ آٹھ نو مہینے بعد وہ چلنے کے قابل ہوا تھا۔ چہرے پر کٹس کے نشانات جسم کے مختلف مقامات پر ٹانکوں کے نشانات اب وہ، وہ وکی نہیں رہا تھا جس پر اس کی کلاس کی لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح گرا کرتی تھیں اب اس لنگڑاہٹ اور کافی حد تک بدہیئت چہرے کے ساتھ کوئی بھی لڑکی اس کی جانب دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ بس دولت کے آسرے پر ہی اب وہ لڑکیوں تک رسائی حاصل کر پاتا تھا۔

پھر اس نے تہمینہ سے شادی کے لیے کہنا شروع کیا اور تہمینہ نے بھی آس پاس کی لڑکیوں کو دیکھنا شروع کیا مگر کوئی لڑکی اس سے شادی پر راضی نہیں تھی۔

اور جو راضی ہوئی وہ ناقبول صورت اور اس سے عمر میں بھی بڑی تھی۔ وکی جھنجلا گیا، وہ تو کم عمر اور حسین صورتوں کا دلدادہ تھا۔

''مما! میں پلاسٹک سرجری کروالوں گا عنقریب۔ آپ پلیز میرے لیے کوئی لڑکی تلاش کریں مجھے نہیں شادی کرنی اس آنٹی ٹائپ لڑکی سے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''سرجری تو ہو جائے گی مگر اس پیر کا اور اس کی لنگراہٹ کا کیا کرو گے؟'' تہمینہ نے ہمیشہ کی طرح صاف گوئی سے کہا تو وہ ڈھے گیا۔

''جیسے تمہیں پرفیکشن پسند ہے وہی اس کلاس کی ہر لڑکی کی ڈیمانڈ ہے۔'' تہمینہ نے اسے آئینہ دکھایا۔

''اور بریرہ بھی کوئی بری نہیں ہے بس ایج Age تھوڑی سی زیادہ ہوگئی ہے اسی وجہ سے وہ مان بھی گئی ہے ورنہ شاید...'' تہمینہ خاموش ہوگئیں، وکی سناٹوں میں گھر گیا۔

☆☆☆

وکی اور مینا کی شادی ساتھ ہی رکھی گئی شادی ہو کر بریرہ اس گھر میں آ گئی اور نخرے بریرہ کے بھی کسی طور کم نہ تھے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی ان کی زندگی کا سورج تھی وہ اس کے مدار میں چکراتے تھے۔ پھر حق مہر کروڑوں میں تھا کہ اگر وکی کچھ سوچتا بھی تو کیونکر اور پھر شادی کو تین سال کا عرصہ گزر گیا اور ان کے گھر اولاد نہیں ہوئی وکی سارا ملبا بریرہ کی عمر پر ڈال دیتا تھا۔

''مما! Age بھی تو زیادہ ہے آپ کی بہو کی۔'' اس کے پاس ہر بات کا یہی جواب تھا۔

''وکی! اس کی Age زیادہ ضرور ہے مگر اتنی زیادہ نہیں کہ وہ ماں نہ بن سکے تم دونوں کل ہی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لو اور چیک اپ کرواؤ مکمل!'' تہمینہ نے آرڈر دیا۔

ان دونوں نے ہی اپنا چیک اپ کروایا اور وہاں اس پر یہ انکشاف ہوا کہ ایکسیڈنٹ میں وہ اپنے باپ بننے کی صلاحیت کو کھو چکا ہے مگر وہ وکی تھا اس نے پیسے کھلا کر اپنی رپورٹ بھی اوکے کروالی۔

اب سب کو انتظار تھا کہ کب رب کا کرم ہوتا ہے مگر وکی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ کرم کبھی نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس سلسلے میں ڈس ایبل تھا اور یہ بات اسے پہلی بار معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اسے یہ بات ایکسیڈنٹ کے فوراً بعد معلوم ہو چکی تھی مگر اس نے اپنا Test صرف ماں اور بیوی کو دکھانے کے لیے کروایا تھا ورنہ وہ جانتا تھا کہ اس کے لاولد ہونے میں خود اس کا ہی قصور ہے۔ اسی وجہ سے وہ بریرہ کو عمر کے سلسلے میں طعنے دیتا تھا کہ کسی کی بھی توجہ اس کی خامی کی طرف نہ جائے اور پھر اسی طرح سات سال گزر گئے۔

☆☆☆

اب تو دونوں ہی ایک دوسرے پر الزام دیتے اور لڑتے رہتے تھے۔

انہی گزرتے دنوں میں ایک دن واپسی میں اس نے نازو کو کسی مرد کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ہمراہ

TAGPK.COM

ایک سات آٹھ سالہ لڑکا اور ایک چار پانچ سال کی لڑکی تھی۔

اس لڑکے کو دیکھتے ہی وکی کا ذہن اس نو سال پہلے والے واقعے کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے وہ گفتگو بھی یاد آئی جو اس نے اس دن ان میڈز کی سنی تھی اور پھر اسے ایک لگن سی لگ گئی نازو کو ڈھونڈنے کی۔ نازو کو ڈھونڈنا کون سا مشکل تھا جب کہ وہ اسی علاقے کے کسی دوسرے بلاک میں تھی۔

وکی نے بہت ہی جلد اس کے متعلق معلومات حاصل کرلیں، واقعی نازو کے بیٹے احمد کی عمر آٹھ سال تھی اور اس واقعے کے فوراً بعد اس کی شادی قاسم سے کردی گئی تھی اس کے بعد اس کا یہ بیٹا ہوا تھا۔

''تو اس کا مطلب ہے یہ میرا بیٹا ہے۔'' اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ ''میں اب بے نام ونسب نہیں مروں گا۔'' اس نے سوچا۔

وہ اس گھات میں رہنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح نازو اسے اکیلے مل جائے اور وہ اس سے اپنا بیٹا ذرا دھمکا کر ہتھیالے۔

اس سلسلے میں اس نے بریرہ سے بھی بات کرلی تھی کہ وہ ایک آٹھ سالہ بچہ گود لے رہا ہے۔ بریرہ کو اس بچے کے آٹھ سالہ ہونے پر اعتراض تھا اور یہی اعتراض ماما کو بھی تھا مگر ماما کو اس نے اکیلے میں حقیقت سے آگاہ کردیا تھا۔

''تمہارا دماغ خراب ہوا ہے وکی! جو اتنی بڑی عمر کا بچہ گود لے رہے ہو لینا ہی ہے تو کوئی نیو بورن بچہ گود لو۔ اتنا بڑا بچہ سمجھدار ہوتا ہے اور اس کی Memories بھی کام کرتی ہیں۔ وہ ساری عمر تمہیں وہ حیثیت نہیں دے سکے گا جو ایک نیو بورن بچہ فوراً دے دے گا بچہ گود لینے سے قبل تم دونوں ملک سے باہر چلے جانا اس طرح ہم لوگوں سے یہ بھی کہہ دیں گے کہ بچہ تمہارا ہی ہے۔'' تہمینہ افگن نے پورا پلان بتایا۔

''یہی بات آنٹی میں بھی انہیں کب سے سمجھانے کی کوشش کررہی ہوں مگر انہیں سمجھ ہی نہیں آرہی ہے۔'' بریرہ نے جھنجلا کر کہا۔

''بس اب میں فیصلہ کرچکا ہوں اور بات بھی کرچکا ہوں اور میں اپنی بات قطعی خراب نہیں کروں گا۔'' وہ چڑ کر بولا تھا..... اس کے انداز کو تہمینہ نے غور سے دیکھا اور چپ ہوگئیں۔ بریرہ کاندھے اچکاتی ہوئی باہر نکل گئی اسے جم جانا تھا۔

''ہاں اب بتاؤ اصل بات کیا ہے؟'' تہمینہ نے بغور بیٹے کو دیکھا۔

''مما! وہ آپ کا پوتا ہے میرا بیٹا!'' اس نے دھماکا کیا تہمینہ نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

''مما! وہ ہماری پرانی میڈ نازو کا بیٹا ہے جسے ہم نے.....'' اور اس کی بات درمیان میں ہی تھی کہ تہمینہ نے اسے روک دیا۔

''نازو تمہیں کہاں ملی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ یہیں دو بلاک چھوڑ کر کام کرتے ہیں سب۔'' اس نے بتایا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

TAGPK.COM

''وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ ہم سے انتقام لینا چاہ رہی ہوگی؟'' تہمینہ نے کہا۔

''اسے تو پتا بھی نہیں ہے کہ میں اس راز سے واقف ہوں۔ اس واقعے کے بعد وہ Pregnant ہوگئی تھی یہ مجھے شروع سے ہی پتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اگر اسے کچھ پتا نہیں ہے تو تم اتنے دعوے سے کیسے کہہ رہے ہو کہ وہ تمہیں اپنا بچہ دے دے گی۔'' تہمینہ نے اسے دیکھا۔

''پیسے میں بڑی طاقت ہے ماما! اور اگر پیسے سے نہیں مانی تو طاقت سے مانے گی، پہلے بھی کیا کر سکی تھی۔ اپنا بیٹا تو میں اس سے لے کر رہوں گا۔'' اس کے لہجے میں فرعونیت اتر آئی۔

''دیکھتے ہیں۔'' کہہ کر تہمینہ اٹھ کھڑی ہوئیں گویا انہوں نے بیٹے کو چیلنج کر دیا۔

☆☆☆

ایک دن وکی نے اسے جالیا وہ اپنے دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے ہوئے انہیں غالباً اسکول چھوڑنے جا رہی تھی کیونکہ دونوں کے بیگ اس نے خود پکڑے ہوئے تھے اور بچے یونیفارم میں ملبوس تھے اسے دیکھ کر وہ ایک دم سے خوفزدہ ہوگئی تھی کیونکہ اس بھیڑیے کی درندگی کا وہ ایک بار شکار ہو چکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔

''سامنے سے ہٹو۔'' وہ اسی دبنگ لہجے میں بولی تھی جو کہ اس کا خاصہ تھا۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔'' وکی خباثت سے بولا۔

''راستے سے ہٹو اور اپنا راستہ ناپو ورنہ ابھی شور مچا دوں گی، اس غریب بستی کے من چلوں کو تم جیسے شرفاء کو کوٹنے کا بڑا شوق چڑھتا رہتا ہے۔'' وہ اسپاٹ لہجے میں بولی۔

''یہ میرا بیٹا ہے ناں!'' اس نے بچے کی جانب اشارہ کر کے خباثت سے کہا۔

''اے چل ہٹ یہاں سے یہ میرا بیٹا ہے بڑا آیا باپ بننے والا۔'' اس نے تیزی سے اپنے بیٹے کو خود سے لگایا۔

''بیٹا! کیا نام ہے تمہارا میرے ساتھ چلو گے میں تمہیں کھلونے، کپڑے اور چاکلیٹس دلواؤں گا۔'' اس نے بچے سے ڈائریکٹ پوچھا اور بچے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

''میرا نام اریب ہے۔'' بچے نے معصومیت سے کہا۔

''اریب وقاص۔'' وکی زیر لب بڑبڑایا۔

''نہیں اریب قاسم۔'' وہ غصے سے پھنکاری۔

''بیٹا تو میں تم سے اپنا لے ہی لوں گا شرافت سے نہیں دو گی تو چھین لوں گا اغوا کروا لوں گا۔'' وہ بھی غرایا تھا اور نازو نے ایک بار پھر اپنے دونوں بچوں کو خود سے لگا لیا تھا۔

وقاص واپس مڑ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا تھا اس نے گاڑی میں بیٹھ کر دوبارہ بچے کو دیکھا جو کہ خود بھی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا ایسے معمولی معمولی چیزوں کے لیے ترسے ہوئے بچے کو تو وہ بڑی شاندار آفر دے کر گیا تھا اس پر بچہ مسکراتا بھی نہ..... اور نازو نے بڑی خوفزدہ نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ اس بچے کو تو وکی خود ہی بہلا پھسلا کر آرام سے اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ اتنی خوفزدہ ہوگئی کہ اس نے دونوں بچوں کو اسکول بھیجنا ہی بند کر دیا۔ اب وہ سرونٹ کوارٹر سے بھی اندر کی طرف کام کرنے جاتی تھی تو باہر سے دروازے پر تالا ڈال کر دونوں بچوں کو اندر بند کر کے جاتی تھی حالانکہ سرونٹ کوارٹرز تک کسی باہر کے بندے کی رسائی ناممکن تھی... مگر دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اور وہ ایک بار اس ناگ کی ڈسی ہوئی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کیا پتا اس کے بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے وہ یہاں ڈکیتی وغیرہ جیسی کوئی واردات نہ کروا دے جس کے ساتھ ہی وہ اس کا بچہ بھی اغوا کروا دے مگر اب وکی بھی اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ ایسی حرکتیں کرتا اسے ان کی مجبوریاں خریدنی تھیں۔

☆☆☆

یہ سب کون سا مشکل کام تھا اس نے ان دونوں کو کام سے نکلوا دیا... اب وہ دونوں پھر روڈ پر آ گئے تھے۔ وہ اپنی جمع پونجی کے ساتھ ایک بار پھر اسی ایک شخص کے ہاتھوں بے گھر ہو چکی تھی۔ انہوں نے ایک خالی پلاٹ پر جھونپڑی بنالی مگر قاسم کے پاس ابھی کوئی کام نہیں تھا وہ کام کے لیے بھی گھر سے باہر نکلنے کو تیار نہیں تھی حالانکہ اسے گھروں میں کام مل سکتا تھا مگر وہ اپنے بیٹے کو کھونے کے ڈر سے خوفزدہ ہوگئی تھی۔

قاسم دن بھر مارا مارا پھرتا مگر رات میں وہ ناکام ہی

TAGPK.COM

لوٹتا ہاں کسی نہ کسی لنگر سے کھانا ضرور لے آتا تھا۔ ان کی جمع پونجی بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی اور ایسے ہی ایک دن وکی پھر ان کی کٹیا میں آن دھمکا۔

''میری بات مان جاؤ تم دونوں۔ اس بچے کی لائف بن جائے گی اور تم دونوں کو بھی اچھی ملازمتیں دلوادوں گا۔'' وکی نے دوبارہ آفر کی .... تازو نے ایک نظر قاسم کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے کہا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے....'' قاسم نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسا کہ اس کا دماغ چل گیا ہو۔

''دماغ ٹھیک ہے تیرا پگلا گئی ہے کیا؟'' وہ غصے سے بولا۔

''قاسو! ہم ان بڑے لوگوں سے نہیں بھاگ سکتے۔ ہم ان لوگوں سے بھاگ کر اپنے بچے کو کیا دے رہے ہیں۔ بھوک و افلاس، ڈر و خوف، در بدری۔ تو کیا بہتر نہیں ہے کہ ہم اس کو ایک محفوظ و پُرسکون مستقبل دے دیں۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی تھی۔

''میں جان سکتا ہوں کہ انہیں میرے بچے کا درد کیوں اٹھ رہا ہے۔'' وہ بلبلا کر بولا تھا۔

''کیونکہ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے یہ اسے گود لینا چاہتے ہیں۔'' تازو نے کہا۔

''کیوں شہر بھر کے یتیم خانے بند ہو گئے ہیں جو یہ ہمارا بچہ چھیننا چاہتے ہیں وہاں سے تو انہیں کوئی چھوٹا بچہ بھی مل سکتا ہے۔'' قاسم نے جھنجلا کر کہا۔

''ہاں یہ ایسا ہی چاہتے ہیں اور یہ ایسا اس لیے چاہتے ہیں کیونکہ اریب ان کا ہی بیٹا ہے۔'' تازو نے کہا اور قاسم کی زبان بند ہو گئی اس نے بڑی شاکی نظروں سے بیوی کو دیکھا تھا۔

''میری کچھ شرائط ہیں اگر وہ آپ کو منظور ہوں تو میں اپنا بیٹا آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں۔'' تازو نے کہا تو وکی نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''میری اور قاسو کی ملازمت آپ کے اپنے ہاں ہو گی۔ میں اپنے بچے سے بہت محبت کرتی ہوں میں اس سے دور نہیں رہ سکتی۔ آپ ہمیں ملازمت کے علاوہ بھی ہر ماہ ایک پُرکشش اماؤنٹ دیں گے کہ میں اپنی بیٹی کو بھی اچھا پڑھانا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا تو وکی نے لمحے بھر کے لیے سوچا۔

''ٹھیک ہے مگر تم دونوں کی زبان بند رہنی چاہیے ورنہ جس دن بھی تمہاری زبان کھلی.....'' ابھی وکی کی بات درمیان میں ہی تھی کہ تازو نے کاٹ دی۔

''اس بات کی میں گارنٹی دیتی ہوں کہ یہ راز راز ہی رہے گا۔ میرے دونوں بچوں کی زندگی بن جائے مجھے اور کیا چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔'' دوسرے ہی دن ان دونوں کی ملازمت بنگلے میں ہو گئی مگر اریب کو بنگلے میں آنے میں دو ڈھائی ماہ لگے پہلے اس نے اس گھر میں لانے کے لیے اریب کو گرومنگ کیا تھا اسے بولنے چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے تھے پھر وہ اسے یہاں لایا تھا تازو تو اسے دیکھتے ہی صدقے واری جاتی تھی کہ وہ تو اب شہزادہ دکھنے لگا تھا۔ اریب کا سرونٹس کوارٹرز کی طرف داخلہ بند تھا اور ان تینوں کا گھر کے اندر، پھر بھی تہمینہ تازو اور قاسم کے یہاں ہونے پر جز بز ہوتی تھیں۔ بریرہ کو تو پہلے ہی کوئی مسئلہ نہیں تھا سوائے عمر کے اور اب اریب کے پاس دنیا کی ہر آسائش تھی۔ لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر شہر کے مہنگے ترین اسکول میں جاتا تھا۔ بہترین کپڑے پہنتا تھا۔ کھلونوں کی بھرمار تھی اس کے پاس اور اپنی پسند کے کھانے فرمائش کر کے بنواتا تھا۔ تہمینہ کو اعتراض تھا کہ ''اگر اسے قاسم اور تازو کی مدد ہی کرنی ہے یا ان کا کچھ باندھا ہے تو وہ انہیں کہیں بھی دے سکتا ہے ان دونوں کو سر پر لا کر بٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''مما! میں بہت جلد ان کو یہاں سے اچھی جابز دلوا کر چلتا کروں گا یا کسی اچھی بستی میں گھر کا انتظام کر دوں گا اور مہینا باندھ دوں گا یہی تازو کی شرط ہے اس لیے مجھے ماننا پڑی۔'' وکی نے اپنا پلان بتایا۔

اب وکی ان کے لیے کچھ بھی کرتا۔ ان کی پانچوں ہی نہیں دسوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔

''کیوں تم ان سے دب کیوں رہے ہو۔ کیا تمہارے پاس پیسے، طاقت اور اختیارات میں سے کسی چیز کی کمی ہے۔'' تہمینہ افگن نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔

''کسی چیز کی کمی نہیں ہے مام! مگر اگر کوئی بات ان کے منہ سے نکلی زمانے کے سامنے آ گئی اور یہ کمی کمین اپنے مفاد پورے نہ ہونے پر کتنے کمینے ہو جاتے ہیں اندازہ تو ہے آپ کو۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اور میں اپنے بیٹے پر ناجائز کا فیگ نہیں لگوانا چاہتا۔'' وہ بولا تھا۔

''تازو کے میاں کو اٹھوا دو۔'' انہوں نے فرعونیت

سے کہا تھا۔

''آپ کو پتا تو ہے آج کل میڈیا کتنا پاور فل ہے ان لوگوں کے منہ سے کچھ نکل گیا تو؟'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''تو مروا دو دونوں کو۔'' وہ سفاکی سے بولی تھیں۔

''نہیں مام! اتنے عرصے میں، میں نے ایک بات سیکھی ہے کہ گناہ انسان کا پیچھا کرتے ہیں۔'' میں نے نازو کے ساتھ برا کیا اس نے ناجائز اولاد کو جنم دیا تو مجھے اللہ نے جائز اولاد بھی نہیں دی ... تہمینہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا۔ ''اور یوں بھی مام! ہماری ذرا سی بے احتیاطی بریرہ کو چوکنا کر سکتی ہے اور اسے ذرا سی بھنک پڑ گئی نا تو وہ۔ وہ طوفان اٹھائے گی کہ سب کو سب پتا چل جائے گا اور پھر وہی بات میں اپنے بیٹے پر ناجائز کا ٹیگ نہیں لگوانا چاہتا۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے جو بہتر سمجھو کرو مگر آنکھیں کھلی رکھنا اور جو کرنا احتیاط سے کرنا۔'' انہوں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

قاسم نے مسکرا کر نازو کو دیکھا۔

''مجھے نہیں پتا تھا تو اتنی عقلمند ہے مجھے تو لگتا تھا تو نے پڑھ لکھ کر سب گنوا دیا۔'' قاسم نے کہا۔

''میرے بڑے بڑے خواب تھے مجھے پڑھ لکھ کر اپنے ماں باپ کا بازو بننا تھا۔ مجھے ماسی نہیں بننا تھا مجھے ایک وائٹ کالر جاب چاہیے تھی۔ مجھے اپنے ماں باپ کو ایک اچھی زندگی دینی تھی یہ روتی سسکتی زندگی نہیں... مگر اس شخص کے ظلم نے مجھ سے میرے سارے خواب چھین لیے... پھر بس میں ایک جگہ رک گئی مجھ سے آگے بڑھا ہی نہیں گیا۔ اس نے مجھ پر ثابت کر دیا کہ غریب کو خواب دیکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ غریب کے خواب ہمیشہ امیر کے جوتے تلے مسلے جاتے ہیں اور میں نے مان بھی لیا تھا شاید ذہنی طور پر مگر اس شخص نے دوبارہ میرے سامنے آ کر مجھے میرے خواب یاد دلا دیے اور مجھے موقع بھی دیا کہ میں اپنے خواب پورے کر لوں۔'' وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

''تجھے ڈر نہیں لگا اگر راز کھل جاتا۔'' قاسم نے پوچھا۔

''کیسے کھلتا میرے اور میری ماں کے سوا اس بات کا کوئی گواہ نہیں تھا، وہ نڈ وائف بھی مر گئی جس نے کیس کیا تھا۔'' اس نے آرام سے کہا۔

''پھر بھی اگر وہ تحقیقات کروا لیتا تو؟'' قاسم ابھی بھی خوفزدہ تھا اور نازو بڑی زور سے ہنسی تھی۔

''قاسو! وہ صحرا میں پھنسا ہوا ایک ایسا شخص ہے جسے اریب کی شکل میں نخلستان مل گیا وہ شادی کے سات سالوں سے لاولد ہے اور کچھ معتبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ خرابی خود اس کے اندر ہے۔'' اس نے کہا۔

''اتنے اندر کی بات تجھے کیسے پتا چلی؟'' قاسم مشکوک تھا۔

''اس کے انداز سے۔ ذہین ترین اسٹوڈنٹ تھی میں۔ اتنا اہم پوائنٹ نہ پکڑتی۔ اگر وہ باپ بن سکتا تو اپنی جائز اولاد کی کوشش کرتا ناجائز اولاد کے پیچھے کیوں بھاگتا۔'' وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

''بات میں دم تو ہے۔'' وہ بولا تھا اور پھر وہ دونوں ہی ہنسنے لگے۔

ان کے ہنسنے کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ تھی۔

اریب قاسم اور نازو کا ہی بیٹا تھا۔ ہاجرہ کو جیسے ہی اس کے ماں بننے کا پتا چلا انہوں نے ایک سرکاری اسپتال کی ریٹائرڈ نرس سے اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ہی ختم کروا دیا تھا اور وہ نرس بھی اب اس دنیا میں نہیں تھی۔

اس قصے کے پاک ہوتے ہی ہاجرہ اور سلیم نے نازو کی شادی قاسم سے کر دی تھی، شادی کے نو ماہ بعد ہی وہ ماں بن گئی تھی۔ وکی سمجھ رہا تھا کہ اریب اس کی اولاد ہے۔ اور سمجھ رہا تھا تو سمجھنے دو، ان کا کیا جا رہا تھا انہی کی اولاد کی لائف بن گئی تھی — اب تو ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ اگر یہ سب چلتا رہتا تو بھی ٹھیک تھا اور آگے چل کر بند بھی ہو جاتا تو بھی ٹھیک تھا۔ وہ دونوں اچھا خاصہ وکی سے کما چکے تھے اور مسلسل کما کر جمع کر رہے تھے۔ اگر انہیں یہاں سے نکلنا پڑتا تو بھی وہ اب زندگی میں کچھ نہ کچھ کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ اریب سے جدائی اگر کسی بھی پڑتی تب بھی اس کی زندگی بن تو جاتی تھی اور اولاد بعض اوقات پڑھنے کے لیے بھی تو ماں باپ سے جدا ہو جاتی ہے۔ وہ پہلے ہی اس طرف سے دل سخت کر چکے تھے ہاں انہیں روما کو معاشرے میں عزت سے جینا سکھانا تھا اور وہ اسی کی تیاری کر رہے تھے۔

یہ سب کچھ نازو کی بروقت کی گئی تدبیر کا ہی نتیجہ تھا اور قاسم اسے مان چکا تھا۔

++

TAGPK.COM



ادھورے خواب

محترم و مکرم
السلام علیکم!

سرگزشت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ میں اسے پابندی سے پڑھتی ہوں۔ دوسروں کی اپ بیتیاں پڑھتے پڑھتے سوچا کہ اپنی زندگی کا ایک حصّہ بطور کہانی پیش کردوں۔ یہ میری پہلی تحریر ہے اس لیے غلطیاں ہوں گی۔ اسے درست کرکے شائع ضرور کردیں میں ممنون رہوں گی

سیمی فراز
(کراچی)

اس روز موسم صبح سے ہی خوشگوار تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔ میں کھڑکی میں کھڑی موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تین بج رہے تھے۔ گویا فراز کے آنے میں تین گھنٹے باقی تھے۔ موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ بادل کھل کر برسیں گے۔ میں نے سوچا کہ فراز کو فون کرکے کہوں کہ جلدی گھر آجائیں کیونکہ اگر تیز بارش ہوئی تو چند ہی منٹوں میں سڑکیں دریا بن جائیں گی اور موٹر سائیکل پر گھر آنا مشکل ہوجائے گا۔

میں نے فون کرکے فراز کو موسم کی صورتِ حال سے آگاہ

کیا اور کہا کہ وہ بارش شروع ہونے سے پہلے گھر آجائیں ورنہ سڑکوں پر پانی بھر جائے گا۔ ان کا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر تھا اور ہم عزیز آباد میں رہتے تھے۔ شام کو ویسے بھی سڑکوں پر رش ہوتا ہے اور ٹریفک جام جیسی صورت حال ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے عام دنوں میں بھی گھر تک پہنچنے میں چالیس پچاس منٹ لگ جاتے تھے، اگر بارش ہوگئی تو نہ جانے انہیں آنے میں کتنی دیر لگ جائے۔

یہی سب سوچ کر میں نے فراز کو فون کیا لیکن انہوں نے میری بات کو ہوا میں اڑا دیا اور بولے۔ ''پاگل ہوگئی ہو۔ کیا بارش صرف میرا راستہ روکے گی۔ یہاں سب لوگ اطمینان سے بیٹھے اپنا کام کر رہے ہیں۔ کسی کو گھر جانے کی جلدی نہیں ہے۔ پھر میں کیسے اٹھ سکتا ہوں اور تم آج کام پر نہیں گئیں۔''

''آج مجھے ایک دو کام کرنے تھے اس لیے چھٹی کرلی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم موسم کو انجوائے کرو۔ میں ان شاء اللہ وقت پر پہنچ جاؤں گا۔''

بارش کا موسم میری کمزوری تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں بارش شروع ہوتے ہی ہم سب بچے گھر کے صحن میں آجاتے اور دیر تک بارش میں نہاتے رہتے۔ اماں لاکھ منع کرتیں، چیختیں چلاتیں لیکن ہم پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ خوب اچھی طرح بھیگنے کے بعد ہم چپکے سے گھر میں آکر تولیا سے اپنا سر اور چہرہ صاف کرتے اور کپڑے تبدیل کرکے برآمدہ میں بیٹھ کر بارش کا نظارہ کرتے۔ اتنی دیر میں اماں چولہے پر کڑھائی چڑھا کر پکوڑے اور سموسے تلنا شروع کردیتیں اور ہم سب مزے لے کر کھاتے۔ اگر بارش رک جاتی تو ابا کسی کو بھیج کر حلوائی کی دکان سے جلیبیاں بھی منگوا لیتے اور یوں پکوان کا مزہ دوبالا ہوجاتا۔

بچپن کی یاد آتے ہی مجھے بھی پکوان کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم پکوڑے ہی تل لوں۔ میں نے فراز کو دوبارہ فون کیا کہ وہ راستے میں کسی حلوائی کی دکان پر رک کر تھوڑی سی جلیبیاں لیتے آئیں۔ وہ حیرت سے بولے۔ ''خیریت تو ہے۔ آج جلیبیاں کیسے یاد آگئیں؟''

میں نے کہا۔ ''آپ بھی بڑے بدذوق ہیں۔ برسات کا موسم ہے۔ میں پکوڑے بنا رہی ہوں۔ شام کی چائے کے ساتھ پیش کروں گی۔''

وہ ہنسنے لگے۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر بارش تیز نہ ہوئی اور مجھے کہیں رکنے کا موقع مل گیا تو لیتا آؤں گا۔''

میں فون بند کرکے کچن میں آئی۔ گھر میں خاموشی تھی۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ساس کے کمرے میں جھانکا... وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے لیٹی تھیں اور میری دونوں نندیں حسب معمول موبائل لیے بیٹھی تھیں۔ میں نے دل میں کہا کہ انتہائی بدذوق لوگ ہیں۔ اس حسین موسم میں بھی کمرا بند کیے بیٹھی ہیں۔ کم از کم کھڑکی سے ہی باہر کا نظارہ کرلیتیں۔ اس موبائل نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ کالج سے آنے کے بعد ان کا پورا وقت اسی شوق کی نذر ہوجاتا۔ گھر کے کام کاج سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سارا کام میں اور میری ساس ہی کرتے تھے۔

مجھ پر دوہری ذمے داری تھی۔ صبح سے شام تک بینک میں سر کھپاتی اور گھر واپس آنے کے بعد کچن میں گھس جاتی۔ رات کا کھانا بنانا میری ذمے داری تھی۔ میری ساس نے کبھی اپنی بیٹیوں سے نہیں کہا کہ وہ میرا ہاتھ بٹائیں۔ اوپر کے کاموں کے لیے ماسی تھی جو برتن اور کپڑے دھونے کے علاوہ گھر کی جھاڑ پونچھ بھی کرتی۔ دوپہر کے کھانے پر میں اور فراز گھر میں نہیں ہوتے تھے۔ میں رات کو ہی دونوں وقت کا کھانا بنا دیتی تھی۔ ساس صاحبہ کو صرف تین آدمیوں کے لیے روٹی ڈالنا ہوتی وہ بھی اکثر بازار سے ہی آجاتی۔ غرض یہ کہ ان لوگوں کو بالکل فراغت تھی۔

میں پکوڑے بنانے کے لیے بیسن گھول رہی تھی کہ ساس صاحبہ کچن میں آگئیں۔ انہوں نے منہ بنا کر کہا۔ ''کیا کر رہی ہو؟''

جی چاہا کہ دوں نظر نہیں آرہا کہ بیسن گھول رہی ہوں لیکن ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''پکوڑے بنا رہی ہوں۔''

''کس خوشی میں؟''

''بس یونہی دل چاہ رہا تھا۔''

''تو بازار سے منگوا لیتیں۔ گھر میں جو تھوڑا بہت بیسن تھا وہ تم نے ختم کردیا۔ اب مجھے اور منگوانا پڑے گا۔ ویسے ہی گھر کا خرچ بڑی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں کل ہی ایک کلو بیسن منگوالوں گی۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے یہ احسان کرنے کی۔ جب سارا خرچ میں ہی اٹھا رہی ہوں تو یہ نقصان بھی برداشت کرلوں گی۔''

اوہ میرے خدا۔ میں نے زیادہ سے زیادہ آدھ پاؤ پیسن لیا ہوگا۔ اسے وہ نقصان قرار دے رہی تھیں۔ سارا مسئلہ ہی یہ تھا کہ میں اس گھر میں اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرسکتی تھی۔ سارا کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔ کھانے کا مینو بھی وہی بناتی تھیں۔ گوشت، مرغی اور مچھلی تو بہت کم نصیب ہوتی تھی۔ زیادہ تر دال چاول اور سبزیاں ہی بنتی تھیں۔ خیر مجھے کھانے کی تو اتنی پرواہ نہیں تھی کیونکہ میں لنچ میں اپنی مرضی کا کھانا منگوا لیتی تھی۔ البتہ فراز کو روزانہ آلو کا بھرتا، آلو کی ٹکیاں، آلو پالک اور اسی طرح کی ڈشز پر گزارہ کرنا پڑتا لیکن وہ بڑے صابر انسان تھے اور کبھی کوئی فرمائش نہ کرتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی والدہ فوراً پیسوں کی کمی کا رونا لے کر بیٹھ جائیں گی حالانکہ وہ ہر ماہ گھر کے خرچ کے لیے ایک معقول رقم انہیں دیتے۔ اس کے علاوہ بلوں کی ادائیگی، بہنوں کا جیب خرچ اور ان کی دیگر ضروریات پوری کرنا بھی ان کی ذمے داری تھی۔ اس کے باوجود میری ساس کو تنگی کی شکایت رہتی تھی۔

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ واویلا کس لیے ہے۔ دراصل وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی گھر کے خرچ میں اپنا حصہ ڈالوں۔ انہوں نے براہِ راست تو مجھ سے نہیں کہا لیکن اپنے بیٹے کے ذریعے مجھ تک یہ پیغام پہنچا دیا۔ میں نے ان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ اچھی طرح جانتی تھی کہ انہیں واقعتاً کوئی تنگی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بیک وقت دو کمیٹیاں نہیں ڈال سکتی تھیں جب میں نے یہی بات فراز سے کہی تو انہوں نے بھی اپنی ماں کی طرف داری کی اور بولے۔ ''یہ تو ان کی سلیقہ مندی ہے کہ وہ بچت کر کے بیٹیوں کی شادی کے لیے کچھ جوڑ جمع کر رہی ہیں۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ میری کوئی سیونگ نہیں ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ ساس صاحبہ اپنی بیٹیوں کی شادی کے لیے فکرمند ہیں اسی لیے وہ چاہتی تھیں کہ میں گھر کے خرچ میں حصہ ڈالوں تاکہ وہ مزید بچت کر کے ایک دو کمیٹیاں اور ڈال لیں لیکن میں جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہوگا اور میری دی ہوئی رقم اللے تللے میں خرچ ہو جائے گی۔ ساس صاحبہ تو بہت کفایت شعار تھیں لیکن ان کی بیٹیاں بڑی فضول خرچ تھیں۔ وہ ہر مہینے نئے کپڑے بناتیں۔ سہیلیوں کے ساتھ باہر کھانا کھاتیں اور باقاعدگی سے موبائل میں بیلنس ڈلواتیں اس کے باوجود مہینے کے آخر میں ان کا بیلنس ختم ہو جاتا تھا۔

اسی لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ ساس صاحبہ کچھ بھی کہتی رہیں۔ میں اپنی تنخواہ میں سے کچھ نہیں دوں گی۔ اب ان کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی تھی۔ انہوں نے اسی لیے فراز کی شادی مجھ سے کی تھی کہ میں بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھی۔ شروع میں مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کیونکہ جب میں دلہن بن کر اس گھر میں آئی تو انہوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہر وقت میرے آگے پیچھے پھرتیں۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا۔ ان کا بس چلتا تو نوالہ بھی توڑ کر میرے منہ میں رکھتیں۔ یہی حال میری نندوں کا تھا۔ بھابی بھابی کہتے ان کا منہ نہ سوکھتا تھا، اپنی سہیلیوں اور ہر آئے گئے کے سامنے میری تعریفوں کے پل باندھتی تھیں۔

یہ فلم ایک مہینے تک چلی اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ڈبوں میں بند ہوگئی۔ شادی کے پندرہ دن بعد میں نے بینک جوائن کرلیا تھا۔ پہلی تاریخ کو میں بازار گئی اور فراز کے علاوہ ساس نندوں کے لیے بھی جوڑے خریدے۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے لائے ہوئے تحفے دیکھ کر خوش ہو جائیں گی لیکن ان کا ردِعمل کچھ مختلف تھا۔ فراز اور نندوں نے تو کپڑے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا لیکن میری ساس منہ بناتے ہوئے بولیں۔

''ہمارے پاس تو بہت کپڑے ہیں۔ اس کی بجائے تم کچھ نقد دے دیتیں تو مجھے گھر کے خرچ میں سہولت ہو جاتی۔''

میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا اور میں سمجھ گئی کہ ان کی نظریں میری تنخواہ پر ہیں۔ وہ توقع کر رہی تھیں کہ میں پرس کھول کر انہیں کچھ نوٹ پکڑا دوں گی لیکن میں نے خاموشی اختیار کرلی اور اپنے کمرے میں چلی گئی لیکن دل میں تہیہ کرلیا کہ آئندہ ان لوگوں کے لیے کوئی چیز نہیں لاؤں گی۔

انہوں نے کچھ دن تو انتظار کیا پھر ان سے برداشت نہیں ہوا اور انہوں نے فراز کے ذریعے کہلوا دیا کہ مجھے بھی گھر کے خرچ میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ جب میں نے دیکھا کہ فراز بھی انہی کی طرف داری کر رہے ہیں تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''میں جانتی ہوں کہ لڑکی کی شادی کے لیے کافی بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تشویش جائز ہے جب بھی وہ وقت آیا تو میں حتی المقدور آپ کی مدد کروں گی لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر کے خرچ میں حصہ ڈالوں۔''

''آخر کیوں؟''

''اس لیے کہ میرے بھی کچھ پلان ہیں۔''

''کیسے پلان؟''

''سب سے پہلے تو مجھے گاڑی خریدنی ہے۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا کہ آپ دفتر جانے کے لیے بعد موٹر سائیکل استعمال کریں۔ یہ خطرناک سواری ہونے کے ساتھ سردی گرمی اور برسات میں بہت تکلیف دہ ہے، اس لیے میں اپنی پوری تنخواہ جمع کررہی ہوں۔ صرف وین کے کرایہ اور اوپر کے اخراجات کے لیے کچھ رقم نکال لیتی ہوں۔''

''اس کے علاوہ؟''

''دوسرا پلان ذرا بڑا ہے۔ گاڑی خریدنے کے بعد مجھے ایک فلیٹ بک کروانا ہے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے پاس ذاتی مکان ہے۔''

''اس مکان میں صرف دو بیڈ روم ہیں۔ ایک میں ہم دونوں اور دوسرے کمروں میں امی اور عابدہ، راشدہ سوتی ہیں۔ کل کو ہمارے بچے ہوں گے۔ انہیں کہاں سلائیں گے اور ویسے بھی میں انویسٹ منٹ کی غرض سے یہ فلیٹ بک کروانا چاہتی ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ پراپرٹی کی قیمتیں کتنی تیزی سے بڑھتی ہیں۔''

''لیکن یہ تو بہت بڑی انویسٹ منٹ ہے۔ ماہانہ قسط کے علاوہ وقفے وقفے سے ایک بڑی رقم بھی ادا کرنی ہوتی ہے۔ کیا تم اسے افورڈ کرلوگی؟''

''بالکل۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ عنقریب میری پروموشن ہونے والی ہے۔ اس کے بعد میری تنخواہ میں اچھا خاصہ اضافہ ہوجائے گا اور میں فلیٹ کی قسطیں باآسانی ادا کرسکوں گی۔''

''سوچ لو۔ میں تو اس کے حق میں نہیں ہوں کیونکہ اکثر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ بلڈرز پوری قیمت وصول کرنے کے بعد بھی وقت پر فلیٹ کا قبضہ نہیں دیتے۔ کبھی تعمیراتی کام مکمل نہیں ہوتا تو کبھی گیس بجلی کے کنکشن نہ ملنے کا بہانہ۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ گاہک تنگ آکر اپنی رقم واپس لے لے اور وہ اس فلیٹ کو زیادہ قیمت پر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیں۔''

''سب ایسے نہیں ہوتے۔ تھوڑی بہت تاخیر ضرور ہوتی ہے لیکن قبضہ مل جاتا ہے ورنہ اس شہر میں لاکھوں فلیٹ آباد نہ ہوتے۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولے۔ ''لیکن تمہیں تھوڑا بہت گھر کا بھی خیال ہونا چاہیے۔''

وہ بھی اپنی ماں کی زبان بول رہے تھے۔ میں نے ان سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن دل میں تہیہ کرلیا کہ یہ لوگ چاہے کچھ بھی کہتے رہیں لیکن میں وہی کروں گی جو میں نے سوچا ہے۔ اس سے گھر میں ایک تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ساس صاحبہ نے اور زیادہ شدت کے ساتھ بڑھتے ہوئے اخراجات اور پیسوں کی کمی کا رونا شروع کردیا اور کئی مدوں میں کٹوتی کردی۔ سب سے زیادہ شور بجلی کے بل پر ہوا۔ دونوں کمروں میں اے سی لگے ہوئے تھے لیکن انہیں میرے کمرے کے اے سی پر اعتراض تھا۔ میں نے غصہ میں آکر اے سی چلانا چھوڑ دیا۔ مجھے ویسے ہی اس کی عادت نہیں تھی۔ میرے لیے پنکھے کی ہوا ہی کافی تھی لیکن فراز پہلے ہی روز بے چین ہوگئے اور جھلاتے ہوئے بولے۔ ''کیا بات ہے؟ اے سی کیوں نہیں چلایا؟''

''امی کا خیال ہے کہ ہمارے کمرے کے اے سی کی وجہ سے بجلی کا بل زیادہ آرہا ہے۔''

''ان کی جیب سے کیا جارہا ہے۔ بجلی کا بل تو میں دیتا ہوں۔''

''یہ آپ انہی سے پوچھیں۔'' میں نے بڑے رسان سے کہا۔

فراز نے اٹھ کر اے سی آن کردیا اور بولے۔ ''اب اگر وہ کچھ کہیں تو تم خاموش رہنا۔ میں انہیں جواب دوں گا۔''

اس کے علاوہ اور بھی کئی باتیں تھیں جن پر انہیں اعتراض ہونے لگا۔ میں چھٹی والے دن مشین لگا کر اپنے اور فراز کے کپڑے دھوتی کیونکہ مجھے ماسی کے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑے پسند نہیں تھے۔ وہ صرف مشین میں کپڑے ڈالتی اور پندرہ منٹ بعد انہیں نکال لیتی۔ اسے کئی مرتبہ سمجھایا کہ زیادہ میلے حصوں کو برش سے صاف کیا کرو لیکن اس کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ مجبوراً میں نے اپنے اور فراز کے کپڑے خود دھونا شروع کردیے۔

اس دن جب میں نے مشین لگائی تو میری ساس نے کہا ''ذرا احتیاط سے واشنگ پاؤڈر خرچ کرنا مجھے یہ پیکٹ پورے مہینے چلانا ہے۔''

میری تو جان ہی جل گئی۔ جی میں آیا کہ وہی پیکٹ ان کے منہ پر دے ماروں۔ بڑی مشکل سے غصہ ضبط کیا اور

تھوڑا سا پاؤڈر مشین میں ڈال کر کپڑے دھونے لگی۔ اگلے دن میں نے گھر واپس آتے ہوئے گروسری اسٹور پر رک کر واشنگ پاؤڈر، صابن اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ خریدا تھا تاکہ آئندہ انہیں کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ وہ روزانہ کسی نہ کسی بہانے کفایت شعاری پر لیکچر دیتیں۔ مجھے شام کو چائے پینے کی عادت تھی۔ میں اور فراز اکٹھے ہی چائے پیتے تھے۔ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ دو کپ سے زیادہ نہ بناؤں۔ ایک دن اتفاق سے تھوڑی زیادہ چائے بن گئی۔ میری ساس ٹہلتی ہوئی کچن میں گئیں اور کیتلی کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ اس میں انہیں تقریباً آدھ کپ چائے نظر آ گئی۔ انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور میرے سر آ کر بولیں۔

''آج کیا مہمان آ رہے ہیں جو کیتلی بھر کر چائے بنائی گئی ہے۔''

میں اس سفید جھوٹ پر حیران رہ گئی لیکن فراز کے سامنے کچھ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ اگلے روز میں نے احتجاجاً صرف فراز کے لیے ایک کپ چائے بنائی اور ان کے آگے رکھ دی، وہ حیران ہو کر بولے۔ ''یہ کیا۔ تم نہیں پیو گی؟''

''نہیں۔'' میں نے منہ پھلا کر کہا۔ ''میری چائے سے آپ کے گھر کا بجٹ فیل ہو جاتا ہے۔''

''کم آن یمی۔ تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر مت لیا کرو۔ ان کی تو عادت ہے بولنے کی۔ وہ بھی کیا کریں۔ انہیں اسی بجٹ میں مہینا پورا کرنا ہوتا ہے۔''

میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ فراز اپنی ماں کی بہت زیادہ طرف داری کرنے لگے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ میں گھر کے خرچ میں حصہ ڈالوں۔ اگر یہ مطالبہ جائز ہوتا تو شاید میں اس پر غور کرتی لیکن میرے خیال میں ساس صاحبہ کا شور شرابہ بلاجواز تھا۔ انہیں پیسوں کی کوئی تنگی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنی بیٹیوں پر کھلا خرچ بھی نہ کرتیں۔ ان کی ہر ضرورت پوری کی جاتی۔ موسم کے مطابق سے نئے کپڑے بنتے۔ پکنک، پارٹیاں اور سہیلیوں کی دعوتیں ہوتیں لیکن میں اگر معمول سے ہٹ کر کوئی کام کر لیتی تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ میں اس روز روز کی بک بک سے تنگ آ چکی تھی۔ کئی بار سوچا کہ الگ ہو جاؤں لیکن اس میں بھی میرا ہی نقصان تھا۔ مکان کا کرایہ، کچن کا خرچ اور گیس بجلی کے بلوں میں اچھی خاصی رقم خرچ ہو جاتی اور میرے منصوبے کبھی پورے نہ ہوتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فراز بھی کبھی اس پر تیار نہ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی ماں بہنوں کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتے تھے اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ فی الحال خاموش رہ کر حالات کا مقابلہ کروں۔ وہ کچھ بھی کہتی رہیں لیکن میں جواب میں کچھ نہیں کہوں گی۔

مثل مشہور ہے کہ ایک چپ سو کو ہراتی ہے اور میں اسی پر عمل کر رہی تھی۔ شادی سے پہلے ہی امی نے مجھے یہ بات سمجھا دی تھی کہ میں نے اپنی زبان بند رکھنی ہے اور خاص طور پر ان سے کوئی بحث نہیں کرنی کیونکہ یہ ہمارے معاشرے کا کلچر ہے کہ ساس سسر یا سسرال کے دوسرے لوگ کچھ بھی کہتے رہیں۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتا لیکن اگر بہو نے کسیلی جواب دے دیا تو اس پر فوراً زبان دراز ہونے کا الزام لگ جائے گا۔

میں اسی لیے محتاط تھی اور ساس کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر بھی خاموش رہتی۔ مجھے ایک آئیڈیا آیا۔ میں نے کسی انڈین فلم میں ایک مکالمہ سنا تھا ''میں ٹینشن لیتا نہیں دیتا ہوں۔'' میں نے سوچا کہ جان بوجھ کر ایسا کام کیا جائے جس سے انہیں پریشانی ہو۔ ابھی میں اس بارے میں سوچ بچار کر رہی تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے مجھے وقتی طور پر یہ آئیڈیا ترک کرنا پڑا۔

ہوا یوں کہ انہی دنوں میری پروموشن ہو گئی۔ اس کی مبارکباد دینے امی ابو ہمارے گھر آئے، چھٹی کا دن تھا۔ وہ شام چھ بجے کے قریب آئے تھے۔ میں نے فراز کو بھیج کر بازار سے ناشتے کا سامان منگوایا اور چائے بنا کر میز سجا دی۔ میری ساس اور نندوں کی عادت تھی کہ جب میرا کوئی مہمان آتا تو وہ کمرے میں گھس جاتیں اور کھانے کی میز پر ہمارا ساتھ نہ دیتیں۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ امی اور ابو دونوں نے اس بات کو محسوس کیا۔ ابو تو خاموش رہے لیکن امی سے برداشت نہ ہوا، اور وہ بول اٹھیں۔

''معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری ساس کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگا۔''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں جلدی سے بولی۔ ''دراصل آج ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے وہ آرام کر رہی ہیں۔''

فراز نے بھی اس بات کو محسوس کیا۔ امی ابو کے جانے کے بعد میری ساس کمرے سے باہر آئیں تو وہ ان سے الجھ پڑے اور تلخ لہجے میں کہا: ''یمی کے امی ابو سے کیا ناراضگی

TAGPK.COM

ہے جو آپ کمرے سے باہر نہیں آئیں؟''

وہ منہ بناتے ہوئے بولیں۔ ''میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔''

''پھر آپ نے ناشتے میں ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیا؟''

''اس لیے کہ مجھے یہ فضول خرچی پسند نہیں۔ غضب خدا کا۔ دو آدمیوں کے لیے اتنی ساری چیزیں منگوالیں۔ ان پیسوں میں تو چار دن کا کھانا بن سکتا تھا۔''

''آپ کو کیا پریشانی ہے۔ سیمی نے گھر کی کوئی چیز تو استعمال نہیں کی۔ سب کچھ اپنے پاس سے منگوایا ہے۔''

''بس رہنے دو۔ انہیں اگر ہماری مشکلات کا احساس ہوتا تو یوں مٹھی بند کیے نہ بیٹھی رہتیں۔''

میں نے دل میں کہا۔ ''بڑی بی۔ تم چاہے کچھ بھی کہو۔ یہ مٹھی یونہی بند رہے گی۔''

دن اسی طرح گزرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ساس صاحبہ کا کنٹرول بھی سخت ہوتا گیا۔ میں ہفتے میں پانچ دن گھر سے باہر ہوتی تھی اس لیے نہانے کا وقت نہیں ملتا تھا اور چھٹی والے دن ہی مجھے نہانے کا موقع ملتا۔ البتہ گرمیوں میں جب بدن پسینے سے چپکنے لگتا تو میں ایک دن چھوڑ کر صبح کے وقت شاور لے لیتی۔

ان دنوں ہمارے علاقے میں پانی کی قلت تھی اور ایک دن چھوڑ کر پانی آتا تھا اور کبھی کبھی تین چار دن کا ناغہ بھی ہو جاتا۔ ایک دو مرتبہ تو ٹینکر بھی ڈلوانا پڑ گیا۔ ویسے تو میں اور فراز سارا دن ہی گھر سے باہر ہوتے اور میری ساس نندیں ہی پانی کا استعمال کرتی تھیں۔ اس کے باوجود میں اپنی طرف سے کنٹرول کرنے کی پوری کوشش کرتی لیکن جب بدن بہت ہی چپکنے لگتا تو مجبوراً مجھے شاور لینا پڑتا۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ ہمارے کمرے کا اے سی خراب ہو گیا تھا اور فراز کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ کسی مکینک کو بلا کر دکھاتے۔ میں صبح سو کر اٹھی تو پورا بدن پسینے سے چپک رہا تھا۔ مجبوراً مجھے نہانا پڑا۔ میں نے باتھ روم سے نکل کر اپنے گیلے بال خشک کیے۔ لباس تبدیل کیا اور ناشتا بنانے کے ارادے سے کمرے سے باہر آ گئی۔ لاؤنج میں ساس صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ میرے گیلے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

''اچھی طرح جانتی ہو کہ پانی کی کتنی قلت ہے۔ اس کے باوجود تم نہانے چلی گئیں۔ اگر پانی ختم ہو گیا تو میری اتنی گنجائش نہیں کہ ٹینکر ڈلوا سکوں۔''

مجھے ان کی بات سن کر بہت غصہ آیا۔ گرمیوں میں ان سمیت گھر کے سبھی افراد تقریباً روزانہ ہی نہاتے تھے لیکن انہیں صرف میں ہی نظر آئی۔ میں نے جل کر کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں ٹینکر ڈلوا لوں گی۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولیں۔ ''رہنے دو۔ حاتم طائی بننے کی ضرورت نہیں جب سارا خرچ میں ہی اٹھا رہی ہوں تو یہ بھی سہی۔ تمہیں تو کسی بات کا احساس ہی نہیں۔''

اسی وقت فراز بھی کمرے سے باہر آ گئے۔ ماں کے جانے کے بعد بولے۔ ''کیا کہہ رہی تھیں؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''کوئی خاص بات نہیں۔ وہی جو روز کا معمول ہے۔ اب انہیں میرے نہانے پر بھی اعتراض ہو گیا ہے کہہ رہی تھیں کہ اگر پانی ختم ہو گیا تو وہ ٹینکر نہیں ڈلوائیں گی۔''

''وہ کیوں فکر کر رہی ہیں۔ ٹینکر تو میں ڈلواتا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن ان سے کون بحث کرے۔''

''تم ان کا مطالبہ پورا کر دو۔ یہ سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔''

''مجھے اُمید نہیں۔ میں پانچ ہزار دوں گی تو وہ بھی انہیں کم لگیں گے۔ دس ہزار کر دوں گی تب بھی وہ مطمئن نہیں ہوں گی۔ شاید وہ چاہتی ہیں کہ میں پوری تنخواہ ان کے ہاتھ پر رکھ دوں۔ اس طرح تو میرے سارے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔''

وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔ ناشتا دے دو۔''

اس کے بعد ساس صاحبہ کی نگرانی اور سخت ہو گئی۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی اعتراض کرنے لگیں۔ میں شام کو کھانا بنانے کچن میں جاتی تو... وہ بھی میرے پیچھے آ جاتیں۔ جبکہ مینیو بھی انہی کا تجویز کردہ ہوتا تھا۔ اس کا ذکر میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ وہ اپنے ہاتھ سے سامان نکال کر مجھے دیتیں۔ یہاں تک کہ آلو، پیاز، نمک مرچ اور کوکنگ آئل بھی ناپ تول کر دیا جاتا۔ میں سخت گھٹن محسوس کر رہی تھی کیونکہ جب تک پکانے والے کو اپنی مرضی سے چیزیں استعمال کرنے کی آزادی نہ ہو۔ کھانوں میں ذائقہ نہیں آ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنے ہی بنائے ہوئے کھانے بدمزہ لگنے لگے۔ فراز نے کئی دنوں تک برداشت کیا لیکن پھر انہوں نے بھی شکایت کر دی۔ میں نے ان کی ماں

کے سامنے ہی کہہ دیا۔

''میں کیا کروں۔ مجھے جتنا سامان ملے گا۔ اسی حساب سے ذائقہ بھی آئے گا۔''

انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا: ''اگر ایسا نہ کرو تو تم پندرہ دن میں ہی سارا سامان ختم کردو گی۔''

میں نے سوچا کہہ دوں کہ اگر یہی کرنا ہے تو خود ہی کھانا بنالیا کریں مجھے کیوں گرمی میں چولہے کے سامنے کھڑا کرتی ہیں لیکن بات بڑھنے کے خیال سے خاموش رہی۔

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ نہ انہوں نے اپنی روش بدلی اور نہ میں نے مٹھی کھولی۔ میری نظریں اپنے ٹارگٹ پر تھیں۔ میں ہر مہینے باقاعدگی سے اپنا بینک اکاؤنٹ چیک کرتی۔ میں چاہ رہی تھی کہ جلد از جلد کار خریدنے کے قابل ہوجاؤں لیکن منزل ابھی دور تھی۔ میں جس طرح کی کار خریدنا چاہ رہی تھی اس کے لیے کم از کم چھ سات لاکھ روپے درکار تھے۔ اس کے باوجود میں نے اخبار میں کار برائے فروخت کے اشتہار دیکھنا شروع کردیے۔ میں ایسی کار خریدنا چاہ رہی تھی جو زیادہ پرانی نہ ہوتا کہ آئے دن مکینک کے پاس نہ جانا پڑے۔ میری پہلی چوائس سوزوکی کلٹس تھی۔ اشتہارات سے اندازہ ہوا کہ ایسی کار پانچ سے سات لاکھ کے درمیان مل جائے گی لیکن میری ایک کولیگ کا کہنا تھا کہ ان اشتہارات پر مت جاؤ۔ بہتر ہے کسی شوروم سے معلوم کرو۔

میں نے ایسا ہی کیا اور ایک دن خالد بن ولید روڈ چلی گئی۔ وہاں جاکر پتا چلا کہ میں جیسی کار چاہتی ہوں وہ دس لاکھ سے کم میں نہیں ملے گی۔ میں نے وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ نئی کاروں کی قیمت بڑھنے سے پرانی کاروں کی مانگ میں اضافہ ہوگیا ہے اور اسی وجہ سے ان کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔ میں مایوس ہوکر گھر آگئی۔ اب مجھے مزید انتظار کرنا تھا۔

میری ساس نے ایک اور شوشا چھوڑا، انہوں نے فراز کو پٹی پڑھائی کہ اگر یہی کوشش کرے تو ہمیں مکان کی اوپری منزل بنانے کے لیے بینک سے قرض مل سکتا ہے۔ اسے کرایہ پر چڑھادیں گے۔ اس طرح ہمیں کچھ اضافی آمدنی ہوجائے گی۔ فراز اپنی ماں کی باتوں میں آگئے اور انہوں نے یہ تجویز میرے سامنے رکھی تو میرا پہلا سوال یہ تھا کہ قرض کی قسط کیسے ادا ہوگی؟

وہ بولے: ''مکان کے کرایہ سے۔''

میں نے کہا: ''پھر کیا فائدہ ہوا۔ جو کرایہ آئے گا وہی قسط میں چلا جائے گا۔''

''تم غلط سوچ رہی ہو۔'' وہ بولے۔ ''کرایہ میں ہر سال دس فیصد اضافہ ہوتا ہے جبکہ قسط ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے۔''

''اچھا آپ کسی ٹھیکے دار کو بلا کر تخمینہ لگوائیں کہ اوپر کی منزل پر کتنا خرچ آئے گا... پھر میں دیکھتی ہوں کہ ہمیں اتنا قرض مل سکتا ہے یا نہیں۔''

وہ دوسرے ہی دن ٹھیکے دار کو لے کر آگئے۔ اس نے حساب لگا کر بتایا کہ کم از کم بیس لاکھ کا خرچا ہے۔ فراز حیرت زدہ ہوکر بولے: ''میرا تو خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ دس لاکھ میں کام ہوجائے گا۔''

واصل بن عطا

نام واصل بن عطا، لقب الغزل۔ مدینہ میں 80ھ۔ 70-699ء میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے بصرہ چلے گئے اور حسن البصری کے اصحاب میں شامل ہوئے۔ ان کی زوجہ عمر بن عبید ابو عثمان کی بہن تھیں۔ آپ نے کہا کہ جو مسلمان گناہ کرتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا بلکہ کفر کے قریب تر چلا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں کسی صحابی کا قتل بھی کفر ہے۔ احکام شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ حق برحق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں۔ قرآن ناطق، حدیث مقفق علیہ، اجماع امت اور قیاس۔

مرسلہ: سلطان شیخ، سرائے عالمگیر

چاندی کا استعمال اینٹی بائیوٹک ادویات کو مزید موثر بناتا ہے: ماہرین

امریکی ماہرین نے کہا ہے کہ متعدد امراض کے لیے استعمال ہونے والی اینٹی بائیوٹک ادویات میں چاندی کا استعمال اسے ایک ہزار گنا زیادہ موثر بنادیتا ہے۔ ماہرین کے مطابق چاندی کو صدیوں سے اینٹی مائیکروبیل کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے جس کا چٹکی بھر استعمال بھی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ چاندی منفی بیکٹیریا کے خلاف بھی کام کرتی ہے اور پھیلے ہوئے وبائی امراض کی پیدائش کو روکتی ہے اور انہیں جلد ٹھیک کرنے میں موثر ثابت ہوتی ہے۔

مرسلہ: احمد توحید میو، بہاولپور

''دس تو نہیں پندرہ لاکھ میں اوپر کی منزل بن سکتی ہے لیکن اس کی فنشنگ بالکل سادہ ہوگی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اچھا کرایہ ملے تو اس کے لیے زیادہ گڑ ڈالنا ہوگا کیونکہ آج کل کرایہ دار یہی چیزیں دیکھتے ہیں۔ ٹائل فلورنگ، امریکن کچن، باتھ روم میں ٹائل اور فینسی فٹنگ وغیرہ وغیرہ۔''

فراز کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ انہیں اتنا قرضہ ملے لیکن پھر بھی میں نے بینک سے معلوم کرلیا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا جو میں سوچ رہی تھی۔ متعلقہ آفیسر نے حساب لگا کر بتایا کہ فراز کو زیادہ سے زیادہ آٹھ لاکھ قرض مل سکتا ہے اور اس کے لیے بھی مکان گروی رکھنا پڑے گا۔

میں نے یہی بات فراز کو بتائی تو وہ بولے ''تم اپنے نام سے قرض لے لو۔''

''اس کے لیے مکان میرے نام کرنا ہوگا۔''

میری ساس کبھی یہ کڑوی گولی نگلنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ ''اس لیے یہ آئیڈیا ڈراپ ہوگیا لیکن اس کا الزام بھی انہوں نے مجھے ہی دیا اور کہا کہ اگر میں کوشش کرتی تو ہمیں قرض مل سکتا تھا۔ ان کا کہنا صحیح تھا۔ واقعی میں نے کوشش نہیں کی کیونکہ متعلقہ آفیسر نے مجھے بتایا تھا کہ اگر میں گارنٹی لے لوں تو پورے بیس لاکھ قرض مل سکتا ہے۔ میں اتنی بڑی حماقت نہیں کرسکتی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ بعد میں کیا ہونا ہے۔ مکان کا جو کرایہ آتا۔ وہ ساس صاحبہ دبا کر بیٹھ جاتیں اور قرضہ کی قسط میری تنخواہ سے کٹ جاتی اس لیے میں نے گارنٹی والی بات گول کردی۔ ویسے بھی میں بینک سے قرض لینے کے خلاف تھی کیونکہ اس میں سود دینا پڑتا جو ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے۔

میری بڑی نند عابدہ نے گریجویشن کرلیا تھا اور اب وہ گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پڑھائی ختم ہونے کے بعد وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لے گی لیکن اس کی پرانی روش برقرار رہی پہلے تو وہ کالج جانے کی وجہ سے صبح جلدی اٹھ جاتی تھی لیکن اب اس نے دیر تک سونا شروع کردیا ایسا لگتا تھا کہ ماں بیٹی میں سونے کا مقابلہ ہورہا ہے۔ دونوں بارہ بجے کمرے سے باہر آتیں۔ میری ساس چائے بناتیں اور عابدہ ناشتا کرکے دوبارہ کمرے میں گھس جاتی۔ اس کے بعد وہ اور موبائل۔ گھنٹوں سہیلیوں سے باتیں ہوتیں اور بقیہ وقت میں یوٹیوب پر اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھے جاتے۔ ہماری ساس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ لڑکی کو پرائے گھر جانا ہوتا ہے اس لیے اسے گھر گرہستی کے کاموں میں لگایا جائے۔

پھر یوں ہوا کہ اچانک ہی انہیں عابدہ کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ دراصل انہیں ایک ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا تو وہ گھبرا گئیں اور ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو ان کی بیٹیوں کا کیا ہوگا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی زندگی میں ہی دونوں کی شادی ہوجائے اس لیے انہوں نے ہر آنے جانے والے سے عابدہ کے رشتہ کے لیے کہنا شروع کردیا۔ ان کی کوششیں رنگ لائیں اور چند ماہ بعد عابدہ کی شادی ایک اچھی جگہ طے پاگئی۔

لڑکا کسی ملٹی نیشنل فرم میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ذاتی مکان، گاڑی، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ عابدہ کی تو قسمت کھل گئی۔ البتہ وہ لوگ جلد شادی پر اصرار کررہے تھے اس لیے کہ لڑکے کے والدین کا حج پر جانے کا ارادہ تھا۔ جبکہ ہماری ساس چاہ رہی تھیں کہ شادی دو سال بعد ہوتا کہ تیاری کے لیے کچھ وقت مل جائے۔ میں نے فراز کو سمجھایا کہ ہمیں لڑکے والوں کی بات مان لینی چاہیے کیونکہ اگر مہلت مل بھی گئی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہماری کوئی لاٹری نہیں نکلنے والی۔ جو کچھ آج ہمارے پاس ہے وہی دو سال بعد بھی ہوگا۔ آپ اللہ کا نام لے کر تیاری شروع کریں۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔

''وہ کیسے؟'' فراز نے پوچھا۔

''امی نے کمیٹیاں ڈال کر جو پیسے جمع کیے ہیں۔ ان سے وہ جہیز بنانا شروع کریں۔ برات کے کھانے اور ہال کی بکنگ کے لیے آپ دفتر سے قرض لیں۔ باقی رہا فرنیچر اور الیکٹرونکس کا سامان تو اس کا بندوبست میں کروں گی۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''کیوں؟ کیا آپ کا بوجھ بانٹنا میرا فرض نہیں۔ میں نے جو کہا ہے۔ وہ ضرور کروں گی۔''

لڑکے کے گھر والوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ان کے گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ اس لیے فریج، ٹی وی، واشنگ مشین اور فرنیچر نہ دیا جائے۔ اس کے باوجود میں نے جہیز میں دینے کے لیے بیڈ روم سیٹ، اس کے کمرے کے لیے ایک چھوٹا ٹی وی، ڈنر سیٹ، کٹلری سیٹ اور کچن آئٹمز مثلاً ٹوسٹر، جوسر، بلینڈر اور مائیکرو ویو اوون وغیرہ خریدے اور میرے بینک اکاؤنٹ سے اچھی خاصی رقم نکل گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے پلان اے، یعنی کار

خریدنے کے لیے مزید انتظار کرنا پڑے گا۔

بہرحال عابدہ کی شادی بخیروخوبی انجام پائی اور وہ رخصت ہوکر اپنے سسرال چلی گئی۔ سب کچھ اسی طرح ہوا جو میں نے پلان کیا تھا۔ اس کے باوجود ساس صاحبہ خوش نہیں تھیں اب انہیں یہ فکر ستائے جارہی تھی کہ فراز نے عابدہ کی شادی پر دفتر سے جو قرض لیا تھا۔ اس کی قسط بھی ادا کرنی ہوگی اور فراز گھر کے خرچ کے لیے جو پیسے دیتے ہیں۔ اس میں کٹوتی ہوجائے گی۔ وہ بار بار یہی بات کہتیں اب گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ میری نظر میں یہ قبل از مرگ واویلا تھا کیونکہ شادی کو تین ماہ ہوگئے تھے لیکن فراز نے ان کے پیسوں میں کوئی کمی نہیں کی تھی مجھے نہیں معلوم کہ وہ قرض کی قسط کس طرح ادا کررہے تھے۔

دراصل ساس صاحبہ کی نظر اب بھی میری تنخواہ پر تھی۔ اب تو وہ ہر آنے جانے والے سے کہنے لگی تھیں کہ ہمیں تو ان کی نوکری سے کوئی فائدہ نہیں۔ گھر میں یہ ایک پیسا نہیں دیتیں میرا ہی دل جانتا ہے کہ کس طرح گزارہ کررہی ہوں۔

میں ایسی باتیں سنتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ میں نے شادی میں جو کچھ کیا۔ اس کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی ان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اور میں نے صرف فراز کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی تھی۔

زندگی پھر اپنے معمول پر آگئی۔ عابدہ اپنی سسرال میں خوش تھی اور ہفتہ میں ایک مرتبہ اپنے شوہر ندیم کے ساتھ ہم سے ملنے آتی۔ وہ بڑے اچھے اخلاق کا مالک تھا اور ہم لوگوں سے بہت اچھی طرح پیش آتا۔ عابدہ نے بھی گھرداری میں دلچسپی لینا شروع کردی تھی اور کئی اچھی ڈشز بنانا سیکھ لی تھیں۔ وہ جب بھی کسی نئی ڈش کے بارے میں بتاتی تو میری ساس کا منہ بن جاتا اور وہ تنگ کر کہتیں "تمہیں کیا ضرورت ہے، چولہے میں سر کھپانے کی۔ کام کرنے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ کچھ دن تو آرام کرلو۔"

عابدہ بہت عقلمند لڑکی تھی۔ اس نے ماں کی باتوں کو بالکل اہمیت نہیں دی اور بولی۔ "امی سارا دن آرام ہی کرتی ہوں۔ مجھ سے کوئی کام کے لیے نہیں کہتا۔ یہ تو میں اپنا شوق پورا کرتی ہوں۔"

"ایسا نہ ہو کہ شوق شوق میں ساری ذمے داری تم پر آجائے۔"

"تو کیا ہوا۔ مجھے اپنے گھر کا کام کرنے میں کوئی عار نہیں اور آپ بھی راشدہ سے تھوڑا بہت کام کروایا کریں تاکہ اسے ابھی سے عادت پڑ جائے۔"

"وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی پڑھائی خراب ہو۔"

میں ان دونوں ماں بیٹی کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ البتہ مجھے اپنی ساس کی سمجھ نہیں آتی۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بیٹی کو کام نہ کرنے اور آرام کرنے کی ترغیب دے رہی تھیں بلکہ دوسری بیٹی کو بھی پڑھائی کے بہانے کام سے دور رکھا ہوا تھا جبکہ میں دن بھر کی تھکی ہاری شام چھ بجے گھر واپس آتے ہی کچن میں گھس جاتی اور کھانا بنانے، برتن وغیرہ سمیٹنے میں دس بج جاتے۔ وہ انہیں نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے بہو اور بیٹیوں کے لیے الگ الگ معیار بنایا ہوا تھا لیکن مجھے کام کرنے میں عار نہیں تھا۔ میں اس کی عادی تھی۔ البتہ ان کے رویّہ سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری نے میرا جینا عذاب کردیا تھا۔

اب انہیں دوسری بیٹی کی شادی کی فکر سوار ہوگئی اور انہوں نے تیسری کمیٹی بھی ڈال دی۔ دوسری طرف میں نے پوری توجہ اپنے ٹارگٹ پر مرکوز کررکھی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میرے اکاؤنٹ میں جلد از جلد اتنے پیسے جمع ہوجائیں کہ میں کار خرید سکوں۔ اس سے ہمیں دو فائدے ہوتے۔ ایک تو فراز کو آنے جانے میں آسانی ہوجاتی اور دوسرے مجھے بھی میکے یا کسی دوست رشتے دار کے گھر جانے میں سہولت ہوجاتی کیونکہ ٹیکسی میں اچھے خاصے پیسے خرچ ہوجاتے تھے۔

میں نے اپنی مٹھی سختی سے بند کررکھی تھی اور میری ساری تنخواہ بینک میں جمع ہورہی تھی۔ میں صرف ون کے کرایہ اور اوپر کے اخراجات کے لیے تھوڑی بہت رقم نکالتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر اس طرح میں بچت کرتی رہی تو دو سال کے اندر کار خریدنے کے قابل ہوجاؤں گی لیکن انسان سوچتا کچھ اور ہوتا کچھ ہے۔

ایک دن میں شام کو بینک سے واپس آئی تو دیکھا کہ راشدہ دروازے پر کھڑی کسی لڑکے سے باتیں کررہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکا چلا گیا اور میں راشدہ کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

"کون تھا یہ؟" میں نے راشدہ سے پوچھا۔

''فہیم۔'' اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔
''تم اسے کب سے جانتی ہو اور یہ تم سے کیا باتیں کر رہا تھا؟''
''زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اسی محلے میں رہتا ہے۔ کافی دنوں سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ آج گھر تک آ گیا۔''
''کیا کہہ رہا تھا؟''
''یہی کہ میں اسے اچھی لگتی ہوں اور وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' راشدہ نے شرماتے ہوئے کہا۔
''کرتا کیا ہے؟''
''ابھی تو کچھ نہیں کرتا۔''
''اور تعلیم؟'' میں نے پوچھا۔
''انٹر آرٹس۔''
''تمہارا اس سے کوئی میچ نہیں پھر بھی میں ایک چانس دے رہی ہوں۔ اس سے کہو کہ اگر وہ واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اپنے ماں باپ کو رشتہ کے لیے بھیجے۔''
''میں نے کہا تھا۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''وہ کہتا ہے کہ پہلے اس کی دو بہنوں کی شادی ہوگی پھر اس کا نمبر آئے گا اور جب تک اسے بھی کوئی جاب مل جائے گی۔''
''اسے تو کوئی چپراسی کی نوکری بھی نہیں دے گا۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''راشدہ۔ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ تم اس سے ملنا چھوڑ دو اور اگر زیادہ تنگ کرے تو مجھے بتانا۔ میں اس کا دماغ ٹھیک کر دوں گی۔''
میرا خیال تھا کہ راشدہ کے منع کرنے کے بعد وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے گا لیکن دو دن بعد وہ پھر ہمارے گھر کے سامنے ٹہلتا ہوا نظر آ گیا۔ میں نے اسے اشارہ سے بلایا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے پاس آیا تو میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے جانتے ہو؟''
''جی..... جی..... وہ.....'' وہ گھگھیانے لگا۔
''کیا جی جی لگا رکھی ہے۔ میں اس کی بھابی ہوں۔ راشدہ نے تم سے کیا کہا تھا؟''
''یہی کہ میں اپنے گھر والوں کو رشتہ کے لیے بھیجوں لیکن میں نے اسے بتا دیا کہ فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ پہلے میری بہنوں کی شادی ہوگی۔''
''ٹھیک ہے پھر تم اس وقت کا انتظار کرو جب وہ تیار ہو جائیں۔ اس سے پہلے تم راشدہ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے اور اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔''
وہ میری دھمکی سے خوفزدہ ہو گیا اور گھگھیاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے جو آپ کہہ رہی ہیں وہی ہوگا۔''
میں نے پہلی نظر میں ہی بھانپ لیا تھا کہ وہ فطرتاً ڈرپوک ہے اور آئندہ وہ راشدہ کو تنگ نہیں کرے گا پھر بھی میں نے احتیاطاً راشدہ سے پوچھ لیا کہ اس نے فہیم کو اپنا فون نمبر تو نہیں دیا تو اس نے کہا کہ ابھی اس کی نوبت نہیں آئی۔ میں مطمئن ہو گئی لیکن سوچ لیا تھا کہ اگر ذرا بھی شک ہوا تو فراز کو بتا دوں گی۔
اس کے ساتھ ہی میں نے راشدہ کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ساس صاحبہ سے تو کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ کبھی میری بات پر یقین نہیں کرتیں اور یہی سمجھتیں کہ میں ان کی بیٹی پر الزام لگا رہی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں راشدہ کی طرف سے فکرمند ہو گئی تھی۔ اس آوارہ لڑکے نے سیدھی سادی لڑکی کے دل میں پیار کی جوت جگا دی تھی۔ ایک بار کوئی لڑکی اس راستے پر چل پڑے تو اس کے بھٹکنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کوئی اور لڑکا اسے ورغلانے میں کامیاب ہو جائے اس لیے بہتر یہی تھا کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے۔
میں نے اپنے تمام ملنے جلنے والوں اور قریبی ساتھیوں سے اس بارے میں بات کی اور کہا کہ اگر ان کی نظر میں کوئی لڑکا ہو تو بتائیں۔ اس کے علاوہ میں دو تین شادی دفتروں میں بھی گئی لیکن ان کی شرائط سے مطمئن نہ ہوئی۔ وہ صرف رجسٹریشن کے نام پر اچھی خاصی رقم اینٹھ رہے تھے۔
میری کوششیں جاری تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے راشدہ پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے سالانہ امتحانات ہونے والے تھے اور وہ پوری تندہی کے ساتھ پڑھائی میں مصروف تھی۔ پھر اک دن یوں ہوا کہ فراز کی خالہ آئیں اور انہوں نے اپنے بیٹے خالد کے لیے راشدہ کا رشتہ مانگ لیا۔ میری ساس یہ سن کر ہکا بکا رہ گئیں کیونکہ دونوں کے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھے اور برائے نام ملنا جلنا تھا اور اس کی وجہ بھی میری ساس کا سرد رویہ تھا۔ وہ اپنی سگی بہن کو دیکھ کر بھی پریشان ہو جاتی تھیں اور انہیں یہ خوف دامنگیر ہو جاتا کہ ان کی خاطر تواضع بھی کرنا پڑے گی جس سے ان کا بجٹ متاثر ہوگا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان کے گھر آئے یا وہ کہیں جائیں۔ اسی سرد رویہ کی وجہ سے ان کے کئی رشتے داروں نے ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔
ایک طرف تو وہ راشدہ کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں تو

دوسری جانب گھر آیا رشتہ دیکھ کر بوکھلا گئیں۔ گو کہ ان کی بوکھلاہٹ جائز تھی۔ وہ چند ماہ پہلے ایک لڑکی کی شادی سے فارغ ہوئی تھیں اور اتنی جلدی دوسری شادی کا انتظام کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے انہوں نے اپنی بہن کو کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ ابھی تو راشدہ پڑھ رہی ہے۔ خالہ نے کہا کہ انہیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ امتحان سے فارغ ہوجائے تو شادی کی تاریخ طے کرلیں گے۔ ساس صاحبہ نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ اس پر خالہ بولیں۔ ''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ خالد کوئی غیر نہیں تمہارا بھانجا ہے۔ ماشاءاللہ اس کا اپنا کاروبار ہے۔ اللہ کے فضل سے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ میں راشدہ کو اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی۔''

اب ساس صاحبہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ بولیں۔ ''ٹھیک ہے۔ مجھے یہ رشتہ منظور ہے لیکن مجھے بیٹی سے بھی پوچھنا ہوگا۔ میں ایک دو روز بعد جواب دوں گی۔''

''ضرور پوچھو۔ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گی۔''

''ایک بات اور'' ساس صاحبہ بولیں۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ابھی ایک بیٹی کی شادی سے فارغ ہوئی ہوں۔ اتنی جلدی دوسری شادی کا انتظام نہیں کرسکتی۔ مجھے کم از کم دو سال کی مہلت دو۔''

''تم جہیز کی فکر مت کرو۔'' خالہ بولیں۔ ''ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ تم لڑکی کو دو کپڑوں میں بھی رخصت کروگی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

''پھر بھی آپا۔ میں لڑکی کو خالی ہاتھ تو رخصت نہیں کرسکتی۔ تھوڑا بہت انتظام تو کرنا ہوگا۔''

خالہ مان گئیں اور راشدہ کا رشتہ خالد سے طے ہوگیا۔ ایک بار پھر وہی تاریخ دہرائی گئی ساس صاحبہ نے دو سالوں میں کمیٹیاں ڈال کر جو کچھ جمع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے لڑکی کے جوڑے اور جہیز کا دوسرا سامان تیار کیا۔ میں نے پہلے کی طرح بیڈ روم سیٹ اور دیگر متفرق اشیاء خریدیں اور فراز نے دفتر سے قرض لے کر کھانے کا انتظام کیا اور راشدہ بھی رخصت ہوکر اپنی سسرال چلی گئی۔

میرا خیال تھا کہ دونوں بیٹیوں کی شادی کے بعد ساس صاحبہ پُرسکون ہوجائیں گی اور انہیں کمیٹیاں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی گھر کے دو افراد کم ہونے سے اخراجات میں کمی ہونی چاہیے تھی لیکن اس کے بعد بھی وہ اپنی پرانی روش پر قائم رہیں۔ انہیں اب بھی تنگی کی شکایت تھی اور وہ ہر وقت پیسوں کی کمی کا رونا روتی رہتیں جبکہ میرے بینک اکاؤنٹ کا یہ حال تھا کہ میں دو قدم آگے بڑھتی تو چار قدم پیچھے ہٹنا پڑتا۔ یہ ایک طرح سے سانپ اور سیڑھی کا کھیل تھا۔ ان دو نندوں کی شادیوں میں میرے اکاؤنٹ سے اچھی خاصی رقم نکل چکی تھی اور مجھے نئے سرے سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھنا تھا۔

میں ایک بار پھر پیسے جوڑنے میں مصروف ہوگئی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ اب کوئی بڑا خرچ نہیں اور چند ماہ بعد میرے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ہوجائیں گے کہ میں اپنی پسند کی کار خرید سکوں۔ میں نے ساس کی باتوں کی پرواہ کرنا بالکل چھوڑ دی تھی۔ میں ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے اپنا اکاؤنٹ چیک کرتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ اب میری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔

پھر وہ دن بھی آگیا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ میں نے فراز کو یہ خوش خبری سنائی اور کہا کہ کسی دن وقت نکال کر گاڑی دیکھنے چلیں۔ وہ بولے۔ ''میں اس معاملہ میں بالکل کورا ہوں اور مجھے کاروں کی پہچان نہیں ہے۔ کیوں نہ ہم خالد سے کہیں۔ وہ کاروباری آدمی ہے یقیناً وہ کسی کار ڈیلر کو جانتا ہوگا۔ اس کے توسط سے ہمیں اچھی کار مل سکتی ہے۔''

مجھے یہ تجویز پسند آئی اور میں نے اسی روز خالد کو فون کرکے اپنا مسئلہ بتایا۔ وہ بولا۔ ''بھابی آپ فکر نہ کریں میں چند کار ڈیلرز کو جانتا ہوں ان سے بات کروں گا لیکن اس کے لیے آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا کیونکہ اچھی گاڑی ذرا مشکل سے ملتی ہے۔''

میں بھی اس معاملہ میں جلدی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے خالد کے فون کا انتظار کرنے لگی کہ وہ کب مجھے گاڑی ملنے کی خبر سناتا ہے پھر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ میرے سارے خواب بکھر کر رہ گئے۔ اس روز میری ساس رات کے کھانے کے بعد خلاف معمول جلدی سونے چلی گئیں ورنہ وہ عموماً رات کو دیر تک ٹی وی دیکھا کرتی تھیں۔ میں نے بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا اور اپنے کاموں میں لگ گئی۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ میں اور فراز دونوں ہی گھر پر تھے۔ چھٹی والے دن ہماری صبح ذرا دیر سے ہوتی تھی۔ میں تقریباً دس بجے سو کر اٹھی اور منہ ہاتھ دھو کر ناشتا بنانے چلی

گئی۔ اتنی دیر میں فراز بھی فریش ہو کر ناشتے کی میز پر آ گئے لیکن ساس صاحبہ ابھی تک اپنے کمرے میں ہی تھیں۔

میں انہیں بلانے کے لیے گئی تو وہ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ میں نے آواز دی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

"کیا بات ہے۔ آپ ابھی تک لیٹی ہوئی ہیں۔ طبیعت کو ٹھیک ہے؟" میں نے کہا۔

"میرے سینے میں بہت درد ہو رہا ہے۔" ان کی آواز میں نقاہت تھی۔

میں نے قریب جا کر دیکھا۔ ان کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ میں دوڑتی ہوئی باہر آئی اور فراز کو بتایا۔ وہ بھی گھبرا گئے اور بولے "امی کو فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔"

میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور ہم انہیں لے کر ایک پرائیویٹ اسپتال گئے۔ وہاں ان کا تفصیلی معائنہ ہوا۔ ان کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ ان کی انجیو گرافی ہوئی اور ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کی دو شریانیں بند ہیں اور تیسری پچاس فیصد کام کر رہی ہے اس لیے بائی پاس آپریشن کرنا ہوگا اور اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے کیونکہ دوسرا دورہ جان لیوا ہو سکتا ہے۔

یہ سب سن کر فراز کا منہ لٹک گیا۔ اس آپریشن کے لیے دس لاکھ روپوں کی ضرورت تھی جبکہ ان کے اکاؤنٹ میں دس ہزار بھی نہیں تھے۔ اس لمحہ مجھے ان پر بڑا ترس آیا اور میں نے فوراً ہی ایک فیصلہ کر لیا۔

"ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ آپریشن کی تیاری کریں۔"

فراز کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا جیسے انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا ہو۔ میں انہیں ایک طرف لے گئی اور کہا "میں جانتی ہوں کہ آپ اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ہیں۔ یہ آپریشن میں کرواؤں گی۔"

"لیکن تم تو کار خریدو رہی تھیں۔"

"وہ بعد میں بھی آ سکتی ہے۔ فی الحال امی کی زندگی اہم ہے۔"

اس وقت فراز کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ میرے قدموں میں سر رکھ دیتے۔ میں نے اے ٹی ایم سے پیسے نکالے اور ایڈوانس میں کچھ رقم ادا کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ساس صاحبہ کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ دو دن بعد ان کا آپریشن ہوا جو اللہ کے فضل سے کامیاب رہا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر آ گئیں۔

میں نے فراز کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ کسی کو بھی نہ بتائے کہ اس آپریشن کے اخراجات میں نے برداشت کیے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی ماں اور بہنوں کو بھی نہیں کیونکہ میں اس کی قائل ہوں کہ اگر ایک ہاتھ سے کسی کو کچھ دیا جائے تو دوسرے ہاتھ کو بھی پتا نہ چلے ورنہ نیکی کا اثر زائل ہو جاتا ہے لیکن میری ساس اتنی بھولی نہیں تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ فراز کی اتنی گنجائش نہیں کہ وہ اس آپریشن کے اخراجات برداشت کر سکیں چنانچہ ایک روز انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ "میرے آپریشن کے پیسے کس نے دیئے تھے؟"

میں نے انہیں ٹالنے کی غرض سے کہا "چھوڑیں اس بات کو۔ آپ کا آپریشن ہو گیا اور آپ اللہ کے فضل سے بالکل صحت یاب ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔"

"پھر بھی مجھے معلوم تو ہونا چاہیے۔"

"کیا کریں گی جان کر؟"

"بے شک تم نہ بتاؤ لیکن میں سمجھ گئی ہوں کہ اس آپریشن کا خرچا تم نے برداشت کیا ہے۔"

"اگر سمجھ گئی ہیں تو اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔ کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"بہو مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ اگر تم دور اندیشی سے کام نہ لیتیں تو اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے ہوتا۔"

"آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض پورا کیا ہے۔ اگر میرا پیسا وقت پر کام نہ آئے تو کس کام کا۔"

اتنی بڑی رقم نکلنے کے بعد میرا اکاؤنٹ بالکل خالی ہو گیا اور میرے خواب بکھر کر رہ گئے۔ میں ایک بار پھر زیرو پر آ گئی ہوں اور مجھے نئے سرے سے پیسے جوڑنے پڑ رہے ہیں۔ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ کار کب خریدوں گی اور فلیٹ کی بکنگ کب ہو سکے گی لیکن اس واقعہ سے ایک سبق ضرور مل گیا کہ ہم چاہے کتنے ہی منصوبے بنا لیں لیکن ہوگا وہی جو قدرت کو منظور ہے۔ اس کا ایک فائدہ ہوا ہے کہ ساس صاحبہ کا رویہ بالکل بدل گیا ہے۔ اب وہ مجھے بیٹیوں پر ترجیح دینے لگی ہیں۔

++

TAGPK.COM